محل نور تجلی است رائے انور شاہؒ
چوں قرب او طلبی در صفائے نیت کوش

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ پر منعقد سیمینار
سرینگر کشمیر ۱۹۷۷ء اور مطبوعہ حیات انورؒ سے ماخوذ
گرانقدر علمی مقالات کا مرقعہ و دل آویز حسین گلدستہ

ترتیب و جمع

حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری (صاحب زید مجدہٗ)

طابع و ناشر

معہد الانور علامہ انور شاہ روڈ
عقب عیدگاہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

محل نور تجلی است رائے انور شاہؒ
چوں قرب او طلبی در صفائے نیت کوش

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ پر منعقد سیمینار سرینگر کشمیر ۱۹۷۷ء (اور مطبوعہ
حیات انورؒ) سے ماخوذ گرانقدر علمی مقالات کا مرقعہ و دلآویز حسین گلدستہ

ترتیب و جمع

(حضرت مولانا) سید انظر شاہ مسعودی کشمیری (صاحبزادہ مدظلہ)

طابع و ناشر

معہد الانور علامہ انور شاہ روڈ،
عقب عیدگاہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفصیلات

نام کتاب : تصویر انور

ترتیب وجمع : حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری صاحب مدظلہ

سن اشاعت : جمادی الاول ۱۴۲۵ھ

ناشر : معہد الانور علامہ شاہ روڈ، عقب عیدگاہ دیوبند۔

باہتمام : مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری صاحب

صفحات : ۴۸۰

قیمت : ۰۰-۱۴۰ (ایک سو چالیس روپے)

کمپیوٹر کتابت : (محمد لقاء الرحمٰن) الفضل کمپیوٹرس، دیوبند (موبائل نمبر: 09412525824)

فہرست مضامین

عنوان

فاتحة الکتاب

تقریباً ستائیس سال پہلے کشمیر کے مرحوم وزیراعلیٰ شیخ عبداللہ کی ذاتی دلچسپی اور جموں وکشمیر اوقاف کی جانب سے کشمیر کے نامور اشخاص وہستیوں کو زندہ وجاوید رکھنے کے لیے سرینگر میں اک سیمینار علامہؒ پر منعقد ہوا اس وقت حضرت علامہ کشمیریؒ کے مشہور تلامذہ موجود تھے شیخ صاحب نے ان سب ارباب علم ودانش کو سیمینار کے لیے دعوت دی تلامذہ کو اپنے استاذ علیہ الرحمہ سے جو والہانہ تعلق بدرجہ عشق تھا کشاں کشاں کشمیر لے پہنچا حالانکہ یہ گراں قدر شخصیتیں اپنی وسیع مصروفیات کی بناء پر ہندو بیرون ہند کی مہتم بالشان مجالس کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتی تھیں تین دن سیمینار رہا شیخ صاحب نے افتتاحی خطبہ دیا متصلاً حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی اپنے مخصوص لب ولہجہ میں بھاری بھرکم تقریر ہوئی اور اس کے بعد علمی مقالات کا سلسلہ رہا یہ حقیر اور اس کے برادر بزرگ مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ سابق مدیر دارالعلوم دیوبند اپنے طرز میں یگانہ ادیب وانشاء پرداز بھی شریک تھے۔ سیمینار شباب پر تھا کہ حضرت علامہ کشمیریؒ کے ممتاز تلمیذ محدث عصر مولانا سید یوسف بنوری کی وفات حسرت آیاۃ کی دلدوز خبر پہنچی اس الم ناک خبر پر شرکاء سیمینار نے مجھ بے بضاعت کو تجویز تعزیت اور سیاق وسباق میں کچھ کہنے کے لیے مامور کیا یہ مقالات عرصہ سے نایاب تھے حالاں کہ ان کی قدر وقیمت تقاضہ کرتی کہ انہیں شائع کیا جائے تا کہ علامہ مرحوم کی انفرادیت وعبقریت جامع کمالات ہستی وشخصیت روبرو ہوا حقر نے معہد الانور کی جانب سے ان ہی تقاضوں کے تحت طباعت کا انتظام کیا ان مقالات کو جناب عبدالرحمٰن کو

ندو نے کتابی صورت میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کی بہت پہلے برادر اکبرؒ نے حیات انور کے نام سے حضرت علامہ کے خصوصی تلامذہ کے تاثرات شائع کیے تھے، یہ بھی اب کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہے۔

خاکسار نے ہر دو کے اہم مقالات کو یکجا کر دیا کو ندو صاحب نے نام تجلیات انور رکھا تھا اس بے بضاعت نے اب تصویر انور نام تجویز کیا۔

حقیر زادہ مولوی سید احمد خضر شاہ استاذ وقف دار العلوم جو معہد الانور کے معتمد ہیں ان کی کاوشوں اور بلیغ مساعی کے نتیجہ میں یہ مجموعہ اسد رخواست ویقین کے ساتھ پیش ہے۔

تو صاحبِ نظری بگیراین دستۂ گل از من
کہ گل بدستِ تو ازشاخ تازہ تر ماند

وانا الاحقر الافقر

محمد انظر الشاہ الکشمیری المسعودی

خادم التدریس بدار العلوم وقف

وقائد تنظیم علماء ہند دیوبند

۳؍ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیغام

از: جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ

صدر آل جموں و کشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ، وزیر اعلیٰ جموں کشمیر

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ آل جموں و کشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے متعلق سیمینار کی روداد شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، حضرت علامہؒ کی زندگی سرزمین کشمیر کے عظیم فرزندانِ توحید کے لئے جو ہر علم و دانش کی ایک نہایت روشن قندیل کی طرح ہے، انہوں نے نہ صرف اسلامی علوم و فلسفے کی گہرائیوں کو عصر جدید کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ کردیا بلکہ اپنی اعلیٰ خدمات سے پورے برّصغیر کے مسلمانوں میں دینی، سماجی اور سیاسی قدروں کی بازیافت کا ایک تعمیری احساس بھی پیدا کیا۔

مجھے امید ہے کہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں اور تاثرات کی اشاعت سے ایک ایسی مستند تاریخی دستاویز تیار ہو سکے گی جو آج کے معاشرے میں اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی اصلاح اور راہنمائی کا حق ادا کرسکے گی۔ میری دعاء ہے کہ حضرت علامہ نے جن مقاصد کی طرف ہماری راہنمائی کی، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

شیخ محمد عبداللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

از: غلام رسول ڈار

سکریٹری مسلم اوقاف ٹرسٹ

آل جموں و کشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ کے زیر اہتمام ۱۹/۲۰/اور ۲۱/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو سرینگر کے کالج آف ایجوکیشن میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی یاد میں ایک کل ہند سہ روزہ سیمینار (مجلسِ مباحثہ) منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے نامور علماء وفضلاء نے حضرت علامہ مرحوم کی حیات اور کمالاتِ علمی و عملی کے مختلف گوشوں پر بصیرت افروز مقالات پڑھے۔

سیمینار کی ضرورت اور تحریک

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی وفات ۱۹۳۳ء میں ہوئی ہے، اسوقت سے آج تک آپ کے علوم کا چرچا پوری دنیائے اسلام کے علمی حلقوں میں ہوتا رہا ہے، متعدد زبانوں خاص کر عربی اور اردو میں آپ کی حیات و کمالات پر کئی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں اور آئے دن کثیر تعدادِ میں مضامین اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اہلِ کشمیر کے لئے توجہ طلب امر یہ تھا کہ خطۂ کشمیر کو حضرت شاہ صاحبؒ کا مولد و منشا اور وطن عزیز ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن اس طویل مدت میں یہاں کے اہلِ علم نے موجودہ نسل کے لوگوں سے آپ کو متعارف کرانے کے لئے اپنا فرض انجام دینے میں غفلت برتی تھی، مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ آپ کی عظیم المرتبت شخصیت کا علم بھی صرف ان چند عمر رسیدہ بزرگوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، جنہوں نے آج سے پچاس ساٹھ سال قبل حضرت شاہ صاحب کو دیکھا تھا یا آپ کی مجالسِ وعظ و تذکیر میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا تھا۔

اس فروگذاشت کی تلافی کے لئے کشمیر کے اندر اور ریاست سے باہر قدر شناسانِ انور چند سال سے سوچ رہے تھے کہ کوئی ایسا مؤثر قدم اٹھایا جائے جس کے ذریعے زمانہء

حال کے عوام بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقے کو علوم و معارفِ انوریہ سے باخبر کیا جائے، کچھ مدت سے حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردِ رشید حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور علامہ مرحوم کے ہر دو فرزندان (مولانا ازہر شاہ قیصر اور مولانا انظر شاہ) نے خطوط لکھ کر جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو اس کام کی طرف متوجہ کیا، خود جناب شیخ صاحب کو حضرت علامہ مرحوم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ہمیشہ سے عقیدت ہے، جس کا اظہار آپ نے وقتاً فوقتاً کیا ہے، چنانچہ جناب شیخ صاحب کی اس والہانہ عقیدت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان ہی کی ہدایت اور مشورے پر آل جموں و کشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ نے علامہ مرحوم کی یاد میں اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ایک علمی سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور اس کے انتظام و اہتمام کی تیاری شروع کی، چنانچہ ملک کے چوٹی کے علماء بالخصوص علامہؒ کے نامور تلامذہ کو اس تقریب میں شرکت کرنے اور مقالات پڑھنے کی دعوت دی گئی۔

بیرونِ ریاست کے علماء کی تشریف آوری

سیمینار سے ایک دن قبل علمائے کرام اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے عقیدت مند وارد کشمیر ہوئے۔ معزز مہمانوں کے سفر اور طعام و قیام کا مناسب انتظام ٹرسٹ کی طرف کیا گیا تھا۔

افتتاحی اجلاس

اس علمی سیمینار کے لئے موزوں ترین جگہ کالج آف ایجوکیشن سرینگر کا انتخاب کیا گیا اور اس کالج کے وسیع ہال کو مخصوص کیا گیا تھا۔ افتتاحی اجلاس کالج کے احاطے میں منعقد ہوا ایک سجے سجائے پلیٹ فارم پر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب کی صدارت میں پہلا اجلاس ۱۹/ اکتوبر صبح دس بجے منعقد ہوا آل جموں و کشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ کے چیئرمین اور میزبان اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ نے اپنی افتتاحی تقریر پڑھ کر سنائی۔ اپنے پُر از معلومات خطبہ میں شیخ صاحب نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم بھی کیا اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے علمی کمالات پر بصیرت افروز روشنی بھی ڈالی۔ آپ نے اپنی تقریر میں ہندوستان

کی تحریکِ آزادی میں علماء دیوبند کی قربانیوں کا ذکر بھی کیا اور حضرت شاہ صاحبؒ کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے عقیدت کے پھول بھی نچھاور کئے۔ شیخ صاحب کی یہ تقریر مجموعہ ہذا کے اگلے صفحات میں من وعن شامل کی جارہی ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تقریر

جناب شیخ صاحب کی افتتاحی تقریر کے بعد مجلس مباحثہ کی پہلی تقریر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے فرمائی جو سامعین نے انتہائی عقیدت سے سنی، فخر المحدثین حضرت علامہ کشمیریؒ جیسے عظیم الشان استاذ کے علمی مدارج کو حضرت قاری صاحب جیسا شاگردِ رشید اس محویتِ عشق ومحبت سے بیان کررہا تھا کہ اس کا نقشہ لفظوں میں نہیں کھینچا جاسکتا۔ حضرت موصوف نے اپنی تقریرِ دل پذیر میں جب حضرت شاہ صاحبؒ کے بڑے بڑے شاگردوں کے نام لئے تو مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کا اسم گرامی لیتے ہی فرمایا کہ کل ہی پاکستان میں حضرت کشمیریؒ کے علوم ومعارف کے اس خزینہ دار کا وصال ہوگیا ہے، حاضرین مجلس بالخصوص مولانا بنوریؒ کے مرتبہ شناسوں نے افسوس اور صدمے کے احساسات کیساتھ یہ رنجیدہ خبر سنی (۱)۔

(سیمینار کے دوسرے اجلاس میں مرحوم کو ثوابِ فاتحہ ایصال کیا گیا اور ایک قرارداد کے ذریعہ اس صدمہ جانکاہ پر اظہار افسوس بھی کیا گیا)

مولانا اکبرآبادی اور مولانا بجنوری کے مقالات

حضرت قاری صاحب کی عالمانہ تقریر کے بعد اس نشست میں حسبِ پروگرام مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا سید احمد رضا بجنوری نے اپنے فاضلانہ مقالات پڑھے اور اسی کے ساتھ پہلی نشست اختتام پذیر ہوئی۔

دوسری نشست

ڈھائی بجے دن دوسری نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت حضرت مولانا مفتی

(۱) حضرت مولانا بنوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع (سابق مفتی اعظم پاکستان) کے حالات پر مشتمل دو مضمون کتاب ہذا کے تتمہ میں درج ہیں۔

عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے فرمائی۔اس نشست میں مولانا محمد انظر شاہ مسعودی، مولانا محمد عثمان دیوبندی، مولانا عبداللہ جاوید، مولانا ندیم الواجدی، مولانا عبدالاحد جامعی، مولانا غلام حیدر رزالی اور امیر مجلس مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔

۲۰/ اکتوبر پہلی نشست

۲۰/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو حسبِ معمول صبح دس بجے پہلی نشست منعقد ہوئی اور صدارت کے فرائض مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے انجام دیئے۔اس نشست میں مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا ازہر شاہ قیصر، مولانا عبدالسبحان، مولانا بدرالحسن دربھنگوی، پروفیسر محمد ابراہیم اور مولانا نجم الدین وغیرہ حضرات نے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔

مولانا بدرالحسن کا عربی مقالہ

اس نشست میں مولانا بدرالحسن صاحب نے اپنا عربی مقالہ پڑھا، فصیح و بلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس عربی زبان میں اپنے موضوع پر برجستہ مقالہ انتہائی توجہ اور دلچسپی کا مرکز رہا۔

سیمینار کی آخری نشست

۲۱/ اکتوبر کو مولانا حامد الانصاری غازی کی صدارت میں اس نشست کا انعقاد ہوا اور اس میں بھی چند مقالات پڑھے گئے جن میں مولانا غلام مصطفیٰ اندرابی کا مقالہ ''حضرت شاہ صاحبؒ اور عقیدۂ ختم نبوت'' اور مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کا محققانہ مقالہ ''حضرت شاہ صاحبؒ کا ذوق تفسیری'' قابل ذکر ہیں۔

حضرت بل میں اختتامی اجلاس

۲۱/ اکتوبر بعد نماز جمعہ اس یادگار اجتماع کا اختتامی اجلاس حضرت بل میں منعقد ہوا اس اجتماع میں عوام کا جم غفیر تھا، عامۃ المسلمین نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی زبان سے خطبہ سنا اور آپ کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی۔نماز کی ادائیگی کے بعد اختتامی اجلاس کا آغاز ہوا اور صدارت کے فرائض حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے

انجام دیئے۔ مولانا قاری عبداللہ سلیم کی تلاوت کلام پاک کے بعد جناب شیخ محمد عبداللہ
چیئرمین مسلم اوقاف ٹرسٹ نے اپنی تقریر میں باہر سے آئے ہوئے علمائے دین کا شکریہ ادا
کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں فخر ہے کہ آج یہاں ہمارے درمیان ہندوستان کے چوٹی کے
علماء وفضلاء موجود ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا
کہ عرب وعجم کے علماء کو علامہ موصوف کی تحقیقی شان کا اعتراف ہے اور ساری دنیا ان کے علم
کے آگے سرخم ہے۔ شیخ صاحب نے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ان کو اپنی زندگی کے
سفر میں اپنے اسلاف کے نقوش پا سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

حضرت مفتی صاحب کی تقریر

شیخ صاحب کی تقریر کے بعد حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے تفصیل
سے سیمینار کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی، آپ نے نہایت محبت بھرے الفاظ میں شیخ صاحب
کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یہ علمی اجتماع منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کی۔ آپ نے کہا کہ شیخ
صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ پر یہ سیمینار منعقد کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اس کا اندازہ
لگانا اس وقت مشکل ہے۔ آگے چل کر اوقافِ اسلامیہ کے اس اقدام کی اہمیت آشکارا ہو جائیگی
اور آئندہ آنے والی نسلیں جناب شیخ صاحب کو یہ قدم اٹھانے پر خراج تحسین ادا کرتی رہیں گی۔

حضرت قاری صاحب کی تقریر ودعاء

جلسہ کے اختتام پر حضرت قاری محمد طیب صاحب نے اپنی تقریر میں اراکین مسلم اوقاف
ٹرسٹ خصوصاً جناب شیخ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ آپ کی پر اثر دعاء کے بعد یہ اجتماع اختتام پذیر ہوا۔

دیگر اجتماعات

حضرت شاہ صاحب کی حیات سراپا کمالات پر مقالات تو کالج آف ایجوکیشن میں
منعقد سیمینار میں پڑھے گئے جن سے اہل علم وفضل کا ایک مخصوص طبقہ ہی زیادہ تر مستفید
ہوتا رہا لیکن علمائے کرام کے ارشادات سننے کی جو پیاس عوام کے دلوں میں بھڑک اٹھی تھی

اس کا تقاضا یہی تھا کہ اب بڑے بڑے عوامی اجتماعات میں ان بزرگوں کے ارشادات سے اہل کشمیر کو استفادہ کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے مختلف اجتماعات سری نگر اور سری نگر سے باہر ہوئے اور اس طرح عوام وخواص کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچایا گیا۔

سیمینار کو پُروقار اور عالی شان طور پر کامیاب بنانے کے لئے جناب خواجہ غلام محمد بٹ وائس چیئرمین آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ کی سرپرستی میں تمام اراکین واہل کارانِ ٹرسٹ نے گٹھی بندھی ٹیم کی طرح نہایت لگن اور محنت سے رات دن کام کیا، مولانا مفتی عبدالغنی ازہری صدر شعبۂ عربی کشمیر یونیورسٹی، پروفیسر ریحان الحق شعبہ عربی کشمیر یونیورسٹی اور جناب عبدالرحمٰن صاحب کوندو (مصنف الانور) کے علاوہ ریڈیو کشمیر سرینگر، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ اور مقامی اخبارات نے جس تعاون کا اظہار کیا اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

خلوص وایثار کا یہ بہت بڑا کارنامہ اس سیمینار کی کامیابی کا مظہر ہے جس کا انعقاد ایمان وایقان کو تازہ اور مستحکم کرنے کے لئے تھا اور حضرت علامہ کشمیریؒ کے انوارِ علم اور تجلیات عمل کی ضیا پاشیوں سے یہاں کے مسلمانوں کے قلوب واذہان کو جلوہ فگن اور نور افروز بنانا تھا۔

سیمینار میں علمائے کرام نے جو مقالات پڑھے وہ علوم دین کے موضوعات پر ایک بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اور سیمینار کے انعقاد کے دوران ہی یہ مقالات ادارۂ اوقاف نے علمائے کرام سے حاصل کئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ادارہ کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی میٹنگ میں جسکی صدارت جناب شیخ محمد عبداللہ نے فرمائی، فیصلہ لیا گیا کہ ان علمی اور تحقیقی شہ پاروں کو کتابی صورت دی جائے چنانچہ اسکی ترتیب وتدوین کا شرف جناب عبدالرحمٰن صاحب کوندو کو حاصل ہوا اور وجیہ احمد اندرابی نے اس کام میں انہیں بھرپور تعاون پیش کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ سارا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا اور ادارہ اس قابل ہوا کہ آج اس کو کتاب کی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

احقر غلام رسول ڈار

سکریٹری آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ

خطبۂ افتتاحیہ

از: جناب شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر
وصدر آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ وَنصلّیْ عَلیٰ رَسُوْلِہِ الکَرِیم.

حضرات علماء کرام ومعزز حاضرین! آج ہم سرزمین کشمیر کے مایۂ ناز فرزند محدث جلیل مولانا انور شاہ صاحبؒ کا ذکر جمیل کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔

قبل اسکے کہ میں حضرت موصوف کے بارے میں اپنے تاثرات اور کچھ معلومات کا ذکر کروں میرا فرض ہے کہ میں اُن معزز ومکرم مہمانوں کا خیر مقدم کروں جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود ازراہِ کرم ہماری دعوت قبول فرمائی اور اس سیمینار میں شریک ہوئے۔ خاص کر بیرونِ ریاست کے جن برگزیدہ اور مقتدر حضرات علماء نے طویل سفر کی محنت شاقہ برداشت کر کے اس محفل مذاکرہ کو زینت بخشنے کے لیے شرکت فرمائی، میں اپنی طرف سے، اوقافِ اسلامیہ کے اراکین اور سیمینار کے منتظمین کی طرف سے ان کا شکر گزار ہوں۔ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

سرزمین کشمیر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پناہ عنایتوں سے نوازا ہے۔ ایک طرف جہاں یہ قدرت کی کاریگری اور صناعی کا ایک بے مثال نمونہ ہے تو دوسری طرف اس کے باکمال فرزندوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت وفطانت، علوم وفنون کی جامعیت مجتہدانہ بصیرت، ناقدانہ مہارت اور روحانی کمالات کی بنا پر اسے چار دانگِ عالم میں روشن کیا۔

زمانۂ قدیم یعنی ویدک پیریڈ میں بھی یہ سرزمین رشیوں، منیوں اور وِدوانوں سے بھری پڑی تھی اور جب ۱۳۲۵ء میں ایک مردِ خدا حضرت سید عبدالرحمٰن بلبلؒ نے باضابطہ کشمیر

میں مذہبِ اسلام کی اشاعت کی تو اس کے بعد دنیا کے اطراف و اکناف سے بے شمار علمائے ربانی اور اولیائے کرام واردِ کشمیر ہوئے جن میں سید السادات حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ اور حضرت میر محمد ہمدانیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد خود اس سرزمین سے ایسے اولیائے کاملین، علمائے راسخین مشائخ عظام اور محدثین کرام پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے وطن عزیز کا نام روشن کیا، تاریخ ان باکمال اولیاء واصفیاء کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اگر اولیائے کاملین میں سے اس سرزمین نے حضرت شیخ نور الدین نورانیؒ، اور سلطان العارفین شیخ حمزہ کشمیریؒ جیسے اہل اللہ کو جنم دیا تو محدثین میں جامع الکمالات حضرت یعقوب صرفیؒ اور حضرت بابا داوٗد مشکوٰتی کے کمالاتِ علمی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کی عبقریت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت سرہندیؒ نے علم حدیث کی تحصیل آپ ہی سے کی۔ حضرت بابا داوٗد مشکوٰتی کو حدیث شریف کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف متناً وسنداً زبانی یاد تھی اور اسی لئے ''مشکوٰتی'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس وادیٔ مینوسواد سے بہت سے گھرانے مرورِ زمانہ کے ساتھ ہجرت کر گئے تو ان خانوادوں سے بھی یگانۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں مثلاً شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے والد ماجد کشمیری الاصل تھے، تجارت کے سلسلے میں امرتسر تشریف لے گئے اور وہیں مولانا ثناء اللہ صاحب جیسے مردِ جلیل کی ولادت ہوئی جو امام المناظرین کے نام سے مشہور ہوئے اور جنہوں نے اپنی تحریروں، اور تقریروں سے اپنے آبائی وطن کشمیر کا نام روشن کیا۔ یہی حال شاعر مشرق علامہ اقبالؒ اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ وغیرہم کا بھی ہے۔

ماضی قریب میں اس خطہ جنت نظیر نے استاذ العلماء والمفسرین رئیس الفقہاء والمحدثین حضرت علامہ انور شاہؒ جیسی عظیم المرتبت ہستی کو جنم دیا۔ آپ نے علومِ قرآن وحدیث، تفسیر ومنطق غرضیکہ عقلی ونقلی علوم وفنون میں وہ غیر معمولی مہارت وحذاقت حاصل کی کہ امام العصر کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کے علمی کمالات پر کچھ کہنا علمائے کرام ہی کا حصہ ہے، خاص کر جن

اقبال مندوں کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے، وہی آپ کی درسی خصوصیات کی نکتہ آفرینیاں بھی بیان کر سکتے ہیں اور وہی علوم وفنون میں آپ کی جامعیت کے بارے میں بھی اظہار خیال کرنے کے مستحق ہیں۔ تاہم آپ کے تبحرِ علمی کا اندازہ آپ کے معاصرین کی ان آراء سے بخوبی لگایا جاتا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ: ''مولانا انور شاہ کا مسلمان ہونا اسلام کی حقانیت کی ایک بڑی دلیل ہے''۔ ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ: ''اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ آپ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے'' سیرتِ خاتم النبیین کے فقید المثال ترجمان مولانا سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا ہے کہ: ''آپ وسعتِ نظر، قوت حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علومِ حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعروسخن سے بہرہ منداور زہدوتقویٰ میں کامل تھے''۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا ہے کہ: ''میں نے تبحرِ علمی، وسعتِ معلومات اور علومِ نقلیہ وعقلیہ کے احاطہ میں آپ کا کوئی نظیر نہیں پایا''۔

علامہ مفتی محمد کفایت اللہ نے فرمایا ہے کہ: ''آپ کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے''۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ پر اگر ایک طرف اہل کشمیر متفخر ہیں تو دوسری طرف سرزمین دیوبند اس نابغۂ عصر (Genius) پر نازاں ہے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم بجا فرما چکے ہیں۔

شادباش وشاد ذی اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
اس میں قاسمؒ ہوں کہ انور شاہؒ کہ محمود الحسنؒ
سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

دارالعلوم دیوبند نے گذشتہ ایک صدی کے زائد عرصہ میں نہ صرف یہ کہ مفسرین قرآن، محدثین کرام، مناظرین ومصنفین، مورخین ومبلغین، ائمہ سلوک اور مشائخ کی ایک کثیر تعداد پیدا کی بلکہ مجاہدین وقائدین کی ایک مثالی اور سرفروش جماعت بھی یہیں سے تربیت پاکر نکلی

جس نے دین وشریعت کے علاوہ ملکی سیاست میں نا قابل فراموش کارنامے انجام دیئے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندی، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا منصور انصاری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا شبیر احمد عثانی اور رئیس الاحرار مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی سیاسی خدمات سے کون واقف نہیں۔ تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں، صرف اس قدر بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ان سبھی حضرات نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے انگریزی حکومت کی قوتِ قاہرہ کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھی جب تک کہ سامراجی طاقت نے اپنا بوریا بستر باندھ کر ساحلِ بمبئی کو الوداع نہ کہہ دیا۔ برطانوی امپریلزم کے خلاف علم جہاد بلند رکھنا ان سب کو اپنے باکمال اساتذہ اور پیرانِ طریقت حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے وراثت میں ملا تھا، جس دور میں ملک کے اکثر و بیشتر لیڈر سامراج کے زیر سایہ چند ایک رعایات کا نام ''ہوم رول'' رکھ کر آئینی اصلاحات کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہتے تھے، اکابرینِ دیو بند خصوصاً حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندیؒ اوران کے رفقائے کار اس زمانہ میں مکمل انقلاب اور مکمل آزادی کے سوا ہندوستان کے مستقبل کے لئے کسی دوسرے نقشے کا تصور تک کرنا بھی فضول سمجھتے تھے۔

تاریخ گواہ ہے کہ مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندیؒ نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سلسلے میں عالم پیری میں ہزار میل دور سمندر میں مالٹا نامی ایک جزیرہ میں نظر بندی اور اسیری کو لبیک کہا اوران تمام مشکلات و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

انکی اس بے مثال قربانی کی قدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور گاندھی جی جیسے محبان وطن کو تھی۔ جب حضرت شیخ الہند اوران کے رفقاء قریباً پانچ سال کی طویل اسارت اور جلاوطنی کے بعد واپس وطن آئے تو مولانا عبدالباری لکھنؤ سے اور گاندھی جی احمد آباد سے ان کا استقبال کرنے کے لئے ساحلِ بمبئی پر پہنچ گئے۔

تحریک حریت ہند کے سلسلہ میں اِمامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ تو پچیس سال کی طویل جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاکِ طینت را

جہاں تک مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا تعلق ہے آپ اگر چہ سراسر ایک علمی شخصیت کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود آپ کی سیاسی خدمات کی سراہنا کئے بغیر رہنا سراسر ناانصافی ہے۔

اپریل ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام اور لاہور کے مارشل لاء وغیرہ کے واقعات نے ملک بھر میں ایک قسم کا زلزلہ پیدا کیا اور اس المناک واقعہ سے ہر محبِّ وطن ہندوستانی سر بکف ہو جانے پر تیار ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انڈین نیشنل کانگریس میں نئی جان پڑ گئی اور اس کی اعانت کے لئے مجلس خلافت اور جمعیۃ علماء ہند جیسی تنظیمیں معرض وجود میں آئیں جنہوں نے مسلمانان ہند کو جنگ آزادی لڑنے کے لئے متحرک و متحد کیا۔ مجلس خلافت سے بھی زیادہ جس تنظیم نے نمایاں رول ادا کیا وہ یہی جمعیۃ العلمائے ہند تھی۔ اس کا ایک اجلاس مولانا ابوالکلام آزادؒ کی صدارت میں لاہور میں، دوسرا مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا ہندوستان کے دیگر حریت نواز اور حریت پسند علماء کی طرح مولانا انور شاہ صاحبؒ بھی ہمیشہ جمعیۃ العلماء ہند کے ایک رکن رکین رہے۔ ۱۹۲۷ء میں جب آپ جمعیۃ العلماء کے صدر تھے تو آپ کی صدارت میں جمعیۃ العلماء کا رکن رہے ۱۹۲۷ء آٹھواں سالانہ اجلاس پشاور میں منعقد ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شدھی سنگٹھن اور ہندو مسلم جھگڑوں کے طویل سلسلہ نے پورے ہندوستان کی فضاء کو مکدر کر رکھا تھا۔ ان پُر آشوب حالات میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کے مطالعہ سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملکی وملی معاملات ومسائل پر آپ کی کتنی گہری نگاہ تھی۔ چنانچہ مولانا اپنے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں کہ:

ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے، ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گذر گئیں انہوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت ورفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب وگلِ سے ہے۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان مذہبی

اور تمدنی یادگاریں ہیں۔ کروڑوں روپے کی جائدادیں ہیں، عالیشان تعمیروں اور وسیع قطعات زمین کے مالک ہیں، ان کو ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے، جیسے ایک سچے محبّ وطن کو ہونی چاہیے۔ اور کیوں نہ ہو، جب ان کے سامنے اپنے سید و مولیٰ محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حب وطن میں اُسوۂ حسنہ موجود ہے، وہ یہ کہ حضور علیہ ﷺ نے کفار کے جور و ستم سے مجبور ہو کر حکم خداوندی کے تحت اپنے پیارے وطن مکہ معظّمہ سے ہجرت کے وقت وطنِ عزیز کو خطاب کر کے فرمایا:

"خدا کی قسم! تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے۔ اور اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا"۔

اپنے خطبہ صُدارت میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس اہم اصول کی جانب بھی خصوصی توجہ دلائی کہ کسی حکومت سے آزادی عطا کئے جانے کی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہئے اس لئے کہ آزادی عطا نہیں کی جاتی، بلکہ وہ اپنی طاقت اور ہمت سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی طرح مشہور واقعہ ہے کہ جب گاندھی جی نے نمک کے قانون کی رسول نافرمانی شروع کی تو عام لوگوں نے بالخصوص مسلمانوں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کیا، حتیٰ کہ بعض مسلم اخبارات نے (جو ملکی تحریک سے علیحدہ تھے) گاندھی جی کی اس تحریک پر سوقیانہ پھبتیاں بھی اڑائی تھیں، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے لاہور "انجمن خدام الدین" کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی کہ پانی خودرو گھاس اور نمک مباح الاصل ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حکومت ان چیزوں پر ٹیکس نہیں لگا سکتی اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے اس اعلان حق کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کے عام طبقہ کو نمک کی تحریک سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ گاندھی جی نے آپ ہی کے فتویٰ کا سہارا لے کر اس تحریک کو کامیاب بنایا۔

میں نے سنا ہے کہ گاندھی جی اس زمانے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی بیان کردہ اس حدیث شریف کے ترجمے کو آپ کے حوالے سے اپنے انگریزی اور ہندی اخبار "ینگ انڈیا" اور "نوجیون" کے پہلے صفحہ پر نمایاں طور پر شائع کراتے رہے۔ اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں حضرت شاہ صاحبؒ کے دو ممتاز شاگرد مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (سابق ممبر پارلیمنٹ) اور

فیق محترم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ گاندھی جی کو اپنا بھرپور عملی تعاون دیتے رہے۔

بہر کیف یہ ملکی سطح پر بات ہورہی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ علمی و دینی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ کس حد تک اور کس قدر سیاسی معاملات میں بھی پیش پیش تھے۔

۱۹۳۰ء میں جب ہم یہاں شخصی راج کے خلاف کمر بستہ ہوئے تو اس دور میں بھی مجلس احرار کو آپ کی تمام تر ہمدردیاں حاصل تھیں، نیز آپ کے ارشاد و ترغیب پر ہی آپ کے متعدد کشمیری شاگرد اور آپ کے عزیز و اقارب حتیٰ کہ آپ کے دو حقیقی بھائی تحریک حریت کشمیر کے ساتھ والہانہ طور وابستہ ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں جب پولیس نے ہندواڑہ کی جامع مسجد سے نکلتے ہوئے ہجوم پر نماز جمعہ کے بعد گولیاں چلائیں تو چوں کہ آپ کے دو بھائی مولانا سیف اللہ شاہ و سلیمان شاہ شخصی راج کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے اس لئے وہ بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔

جب ڈوگرہ حکومت نے ہندواڑہ میں فوج بھیج کر ان دونوں صاحبوں کو گرفتار کیا اور ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے علاقۂ کامراج میں اپنی متوازی حکومت قائم کر کے مولانا سیف اللہ شاہ کو حاکم اعلیٰ اور سلیمان شاہ کو چیف جسٹس بنا رکھا ہے۔ ڈوگرہ فوج نے ان دونوں بزرگوں کو برف اور کیچڑ بھرے راستوں سے کئی دن تک پیدل چلا کر سنٹرل جیل میں بند کر دیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد (غالباً ۱۹۳۴ء کی ابتداء میں) میں آپ کے والد بزرگوار مولانا پیر معظم شاہ کی خدمت میں موضع ورنو حاضر ہوا، آپ ان دنوں مرجعِ خاص و عام تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور میں آج بھی اس پر متفخر ہوں کہ حضرت موصوف نے اس وقت نہ صرف یہ کہ مجھے نیک دعائیں دیں بلکہ آپ نے میری دستار بندی بھی کی۔

اسی طرح کے متعدد ایسے واقعات ہیں جن کا احاطہ کرنا اس مختصر تقریر میں مشکل ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی وفات سے آج تک پینتالیس سال کا طویل عرصہ گذر گیا۔ اس دوران آپ کی شہرت کا حلقہ بلادِ اسلامیہ قاہرہ سے مراکو تک وسیع ہو گیا۔ لیکن آپ اپنے وطن عزیز کشمیر میں عملاً گمنام رہے اور یہاں اب نئی نسل آہستہ آہستہ ان کے کمالات سے بے خبر ہو رہی تھی۔

کچھ عرصہ ہوا یہاں کے ایک فاضل نوجوان عزیزم عبدالرحمٰن صاحب کوندو نے حضرت

شاہ صاحبؒ کی حیات وکمالات پر ''الانور'' نام سے ایک ضخیم اور جامع کتاب مرتب کی، جسے برصغیر کے مشہور علمی ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا ہے۔ بقول مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، قدرت کی کارفرمائیوں کے عجیب وغریب نمونے ہر وقت دنیا کے سامنے آتے رہتے ہیں ''الانور'' کا وجود میں آنا بھی قدرت کی کارفرمائی کا ایک ایسا ہی کرشمہ ہے۔ کون کہہ سکتا تھا جو کام مسلسل ارادے اور تمنا کے باوجود ''ندوۃ المصنفین'' کے ذریعہ سے نہ ہو سکا، وہ کشمیر کے ایک سیماب صفت نوجوان عبدالرحمٰن صاحب کوندو کے واسطے سے عالم شہود میں آئے گا۔

پچھلے سال آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ نے فیصلہ کیا کہ حضرت علامہ کشمیریؒ کی یاد میں ایک ملک گیر سطح کے سیمینار کا انعقاد کیا جائے لیکن بعض ناگزیر مصروفیات کی بناء پر پچھلے سال ہم یہ سیمینار منعقد نہ کر سکے۔ اب اس سال کئی مہینوں کی تگ ودو اور محنت ومشقت کے بعد اوقاف اسلامیہ نے اس علمی اجتماع کا اہتمام کیا۔ امید ہے کہ اس سیمینار میں حضرت علامہ مرحوم کی حیات مجموعۂ کمالات کے مختلف گوشوں پر بصیرت افروز روشنی پڑے گی۔

آخر میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی اس فلسفیانہ تحریر کے ساتھ میں اپنی افتتاحی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

''نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز ومحور ہیں، مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم۔ تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام ومراکز کے کشف کے لئے کتنا زمانہ درکار ہوگا۔ تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے، اور جس طرح نظام شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اس لئے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں۔ زمین والوں پر ہی موقوف نہیں آسمانوں میں بھی صرف ان ہی کے کارناموں کی پکار ہوتی ہے''۔

مقام: کالج آف ایجوکیشن
مولانا آزاد روڈ، سرینگر

والسلام بالاحترام
شیخ محمد عبداللہ ۱۹/ اکتوبر ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الشیخ الانورؒ

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

کمالات بشری کتنے بھی ہوں انہیں اصولاً سمیٹا جائے تو وہ صرف دونوعوں میں سمٹ آتے ہیں جو عالم بشریت کو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ ایک کمالات علمی اور ایک کمالاتِ عملی، ان ہی دو سے انسان کی انسانیت کی ساری خوبیاں وابستہ ہیں۔ نہ جاہل انسان کا کوئی وقار دلوں میں قائم ہوتا ہے نہ بے عمل انسان ہی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، گویا انسانیت کے پرکھنے کی یہی کسوٹی ہے کہ اس کے علم اور عمل کے آئینہ میں اسے دیکھا جائے۔

گویہ بھی انسان کا ایک طبعی وطیرہ ہے کہ اگر کسی انسان پر علمی اور فکری قوتیں غالب ہوتی ہیں تو عملی قوت جوش زن نہیں ہوتی، بلکہ ایک حد تک سست اور کمزور رہتی ہے اور فرائض وواجبات کو چھوڑ کر تطوعات اور تنفلات کا زیادہ ابھار نہیں ہوتا، بلکہ علمی سوچ بچار ہی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو عملی میدان میں آگے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں ان کے اوقات علمی اور فکری سوچ بچار کے لئے فارغ نہیں رہتے اور وہ ہمہ وقت عملی تدبر اور فکری سوچ بچار ہی میں منہمک رہتے ہیں۔ اس فطرت کا جب کہ وہ انسان کا ایک بشری خاصہ ہے، شریعت نے بھی اعتبار کیا ہے۔ جن روایات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ عالم کے لئے علم عبادت سے زیادہ افضل ہے، اور بقول حضرت امام شافعیؒ کے کہ عالم کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ نوافل اور تطوعات کی کثرت کے بجائے علمی تدبر اور فکری بصیرت ہی کو متحرک رکھے تو اس قسم کی روایات اسی زیادتِ علم پر محمول کی گئی ہیں کہ یہی علمی فطرت کا قدرتی تقاضا تھا اور جو لوگ عمل وعبادت کے دلدادہ ہیں اور اس سلسلہ سے ان کی علمی بصیرت کم یا کالعدم ہوتی ہے تو ایسی ہی روایات جن میں عمل کی مختلف نوعیتوں پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ زہد وعبادت میں وقت

لگائیں اپنی عملی قوتوں سے کام لیں۔ وہ اس عملی فطرت پر مجبول ہوں کی جو اہل عمل کی فطرت کا طبعی تقاضا ہے۔ کسی نے حضرت اقدس مولانا تھانویؒ کو لکھا کہ فلاں واقعہ دیکھ کر میں آپ کے کشف کا قائل ہو گیا ہوں۔ حضرت نے جواباً تحریر فرمایا کہ یہ محض آپ کا حسن ظن ہے مجھے کبھی کشف نہیں ہوا، بلکہ ہو بھی نہیں سکتا۔ وجہ یہ تحریر فرمائی کہ میری قوت فکریہ ہر وقت متحرک رہتی ہے اور میں ہمہ وقت علمی کھوج اور سوچ بچار میں لگا رہتا ہوں اور کشف کے لئے یکسوئی اور عمل میں قلبی استغراق ضروری ہے جو مجھے حاصل نہیں، اس لئے مجھے نہ صرف یہ کہ کبھی کشف نہیں ہوا بلکہ ہو بھی نہیں سکتا۔ گو حضرت نے تواضعاً ہی یہ تحریر فرمایا ہے لیکن حضرت کے اس مقولہ کا محمل یہی تھا کہ جو لوگ ہمہ وقت عملی نشیب و فراز اور علمی اسرار وغوامض کی کھوج میں لگے رہتے ہیں ان کا رخ عملی قوتوں سے یکسو ہو جاتا ہے چہ جائے کہ عملی کرشموں اور خوارق سے ہمکنار ہو۔ ان کی عبادت ہی فکر و تدبر اور علمی تلاش و جستجو ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ ہمہ وقت زہد و قناعت، طاعت و ریاضت اور مجاہدہ و عبادت میں منہمک رہتے ہیں انہیں علمی فکر و تدبر اور حکم و اسرار سے گہرا تعلق نہیں رہتا۔ اسے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ کشف ان دونوں قسم کے افراد کو ہوتا ہے لیکن کشف ہی کی دو قسمیں ہیں ایک کشف الٰہی ہے جو علمی قوتوں کی راہ سے ابھرتا ہے اور ایک کشف کونی ہے جو عملی ریاضتوں سے رونما ہوتا ہے، مگر یہ قدرتی بات ہے کہ جو جس کشف کا مورد بنتا ہے اس کا قلب دوسرے کشف کی طرف طبعاً متوجہ ہی نہیں ہوتا "مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ" لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کے بندے ایسے بھی پردۂ دنیا پر نمودار ہوئے اور ہوتے رہے ہیں جن کی جامع فطرت دونوں نوعوں کی طرف یکسانی کے ساتھ دوڑتی ہے۔ جو زہد و ریاضت، طاعت و عبادت اور فرائض و تطوعات کے ساتھ ساتھ علم و فکر اور علمی گہرائیوں میں بھی اترے ہوئے ہوتے ہیں، اگر مسائل کے میدان میں انہیں چھیڑا جائے تو وہ علم کا ایک ایسا دریا نظر آتے ہیں جن کا کہیں کنارہ نظر نہ آئے اور عملی میدان آئے تو وہ فرائض و واجبات ہی نہیں سنن و مستحبات اور آداب بھی ان کی گرفت سے باہر نہیں ہوتے اور علم و عمل کے دونوں ہی میدان یکسانی کے ساتھ ان کی جولان گاہ بنے رہتے ہیں۔ ان ہی جامع اور چیدہ و منتخب

قسم کے افراد میں الاستاذ الاکبر علامہ انور شاہ کشمیریؒ بھی ہیں جن کے علم کو دیکھو تو وہ ایک دریائے ناپیدا کنار نظر آتا تھا کہ جس فن اور جس مسئلہ میں گفتگو کی جائے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید انہوں نے ساری عمر اسی مسئلہ کی کھوج میں گذاری ہے اور اس کے مالہٗ وماعلیہ میں عمر بھر لگے رہے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ کا روایتی اور درایتی، عقلی اور نقلی اور اس کا مالہ وماعلیہ اس انداز سے ارشاد فرماتے کہ جیسے اس مسئلہ کے سوا انہیں کسی اور مسئلہ سے سروکار ہی نہیں ہے، پھر نہ صرف دینی فنون کے وہ علوم متداولہ جن کی درس وتدریس اور فکر ومطالعہ ہمہ وقت ان کا مشغلہ تھا بلکہ ایسے غیر معروف علوم وفنون جن میں شغل تو دور کی بات ہے ان سے تعلق بھی ان کی زندگی میں محسوس نہ ہوتا تھا حتی کہ علم رمل اور جفر اور فن نجوم وغیرہ میں بھی تبحر کی وہ شان محسوس ہوتی تھی کہ شاید انہوں نے عمر اُن ہی فنون کی تفتیش میں گذاری ہے اس پر علمی وقار اور علم کی شان رفعت اس شان سے چہرہ پر نمایاں رہتی تھی کہ اس میں اس تبحر سے کوئی فخر یا تعلّی نمایاں ہو نہ اس میں تذبذب یا تذلل کی کوئی شکن بروئے کار آئے۔ حدیث کے درس میں اس شان ووقار سے بیٹھتے تھے جیسے کوئی بادشاہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ احکام جاری کرر ہا ہے جس میں نہ تذبذب ہے نہ تردّد، نہ حیرانی ہے نہ تحیر۔ درس ترمذی وبخاری میں اس شان غنا واستغناء اور شان تواضع وفروتنی سے صرف حدیثی بحثیں ہی نہیں آتی تھیں اور حدیث ہی کے دقائق نہیں کھلتے تھے بلکہ فقہ، تفسیر، کلام، اصول، احسان وتصوف حتی کہ علوم معقولہ فلسفہ ومنطق، ریاضی وہندسہ اور فن طب تک کے مسائل پر بھی اسی تبحر اور تفقہ کی شان سے کلام ہوتا تھا۔ یہ ناکارہ اور آوارہ درس ترمذی وبخاری میں یہ جامعیت علم وفنون دیکھ کر تقریر لکھنے کے لئے بیٹھا تو نہایت چوڑی تقطیع کی طویل وعریض کاپی لے کر حاضر ہوتا تھا اور اس کاپی میں پانچ چھ کالم بنا رکھے تھے جس میں ہر کلام کے سرورق پر فنون کے عنوانات ڈال رکھے تھے۔ ایک کالم پر حدیث، ایک پر اسمائے رجال، ایک پر تفسیر، ایک پر فقہ، ایک پر کلام ایک پر احسان وتصوف ایک پر نحو وصرف اور بلاغۃ اور ایک پر علوم فلسفیہ وعقلیہ وغیرہ۔ اس لئے جو مسئلہ جس فن کا آتا اسی کالم میں اس کا اندراج کر لیتا تھا، اور بعد میں تقریری صورت میں انہیں ترتیب دے لیتا تھا، افسوس کہ عمر کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کاپی جو ایک ضخیم جلد

کی صورت میں مرتب شدہ تھی اور جس میں تحت مسائل موقعہ بموقعہ تمام علوم وفنون کے دقائق اس انداز سے درج شدہ تھے کہ ان تمام فنی مسائل کا ربط اور جوڑ حدیث زیرِ بحث سے نمایاں ہو جاتا تھا، بعض معتمد قسم کے لوگوں نے مطالعہ کے لئے مانگی مگر پھر واپس نہ دی اور حیلہ حوالہ کر کے اسے دبا بیٹھے جس کا برسوں مجھے قلق رہا، مگر میں نے ان صاحب کو بھی کبھی ان علوم سے کچھ منتفع ہوتا ہوا نہ دیکھا بلکہ نفسِ علم سے مناسبت تک بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

بہر حال ایک طرف تو حضرت ممدوح میں علمی فکر وتدبر کی یہ وسعت تھی اور دوسری طرف عملی قدروں میں جزئی عمل کا غلبہ اور وہ بھی اتباعِ سنت کے ساتھ حتی کہ ان کی پوری زندگی پر یہ اتباعِ سنت اس درجہ غالب تھا کہ بہت سے مسائل میں ہم حضرت ممدوح کا عمل دیکھ کر معلوم کر لیتے تھے، اور بالآخر کتابوں میں مسئلہ وہی نکلتا تھا جو ان کے عمل سے نمایاں ہوتا تھا، گویا علم اور عمل مندمج ہو کر ان کی ذات میں سما گیا تھا، پھر یہ اتباعِ سنت صرف عبادات ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ ان کی عام معاشرتی زندگی پر بھی پوری طرح حاوی تھا حتی کہ چال تک سے بھی اتباعِ سنت کا رنگ چھلکتا ہوا نظر آتا تھا جیسا کہ احادیث نبوی میں حضور کی چال کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ کَانَ یَمْشِیْ تَعَلُّعًا آپ اس قوت وطاقت سے زمین پر قدم رکھتے تھے جیسے زمین کو کھود ڈالیں گے اور گویا زمین کی تہہ میں اتر رہے ہیں تو یہی نقشہ انکی چال میں محسوس ہوتا تھا، نگاہیں نیچی ہوتی تھیں اور قدم اس قوت سے زمین پر رکھتے تھے جیسے زمین میں اتر رہے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو کے وقت مخاطب کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ کن انکھیوں اور ترچھی نگاہوں سے مخاطب کی طرف متوجہ ہوتے تھے، یہی نقشہ ہم نے حضرت شاہ صاحبؒ کا دیکھا کہ کبھی سامنے والے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ گوشۂ چشم سے دیکھ کر مکالمہ فرماتے تھے۔

کھانا برسوں ان کے ساتھ اپنے مکان پر کھایا ہے۔ ہمیشہ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ روٹی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں توڑتے تھے جیسا کہ عام عادت ہے بلکہ ایک ہاتھ میں روٹی لے کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ٹکڑا توڑ کر تناول فرماتے تھے۔

بہر حال چال ڈھال، افعال اعمال، عوارض واحوال، اور بینائی وشنوائی سب کے

سب سنت میں ڈھلے ہوئے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس ذات گرامی کے ظواہر افعال اتباع سنت میں ڈھلے ہوئے ہوں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے باطن میں سنت کا عمل دخل نہ ہو اور قلب اس سے خالی رہے۔ ہم دیکھتے تھے کہ اگر کسی شخص نے ان کی مجلس میں کسی کی غیبت یا برائی بیان کرنے کا پرداز ڈالا تو اوّل وحدت ہی میں فرمادیتے کہ بھائی ہمیں ان باتوں کی فرصت نہیں ہے، کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ چپ رہو یا چلے جاؤ، اس لئے کبھی بھی ان کی مجلس غیبت سے آلودہ نہیں ہوتی تھی، ہمہ وقتی شغل مطالعۂ کتب تھا اور مطالعۂ کتب اس ادب واحترام کے ساتھ کہ جیسے استاد کے سامنے بیٹھے ہیں۔ خود بھی ایک بار فرمایا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے آج تک دینیات کی کسی کتاب کا بے وضو مطالعہ نہیں کیا۔ کہنے کو بات چھوٹی سی محسوس ہوتی ہے لیکن ان جزئیات پر استقامت ایک عظیم ترین کرامت ہے جسے وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کے رگ و پے میں اتباع سنت کا رنگ پلا دیا گیا ہو۔ اگر کتاب سامنے ہوتی تھی تو فکر و تدبر اور شرعی سوچ بچار میں استغراق رہتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے ہمہ وقت حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔ کا کلمہ زبان پر رہتا تھا۔ باوجودیکہ حدیث وتحدیث ہی کا ہمہ وقت غلبہ تھا اور یہی ان کی زندگی کا خاص موضوع تھا لیکن مسائل فقہیہ جب زیر سوال آئے تو نہ صرف یہ کہ مسئلہ ہی برجستہ ارشاد فرمادیتے تھے بلکہ بیانِ مسئلہ میں کبھی ہم نے تردد یا تذبذب محسوس نہیں کیا بلکہ ہر مسئلہ میں دوٹوک بات فرماتے اور حکم پوری خوداعتمادی سے ظاہر فرماتے تھے۔ درس میں کتب حدیث سامنے میز پر رکھی ہوتی تھیں جب کسی کتاب کا حوالہ دیتے تو اسی وقت وہ کتاب اٹھا کر کھولتے اور انداز اتنا صحیح اور تقریباً اتنا قطعی ہو چکا تھا کہ کتاب کھولتے ہی وہی صفحہ اوّل وحدت میں نکل آتا تھا جس سے حوالہ دینا ہوتا تھا، یا ایک آدھ ورق پس و پیش الٹ کر وہ صفحہ نکال لیتے تھے۔ حافظہ حق تعالیٰ نے امتیازی اور غیر معمولی عطا فرمایا تھا، ایک دفعہ فرمایا کہ آج میری عمر پچاس برس سے زائد کی ہو چکی ہے لیکن پانچ سال کی عمر سے اب تک جو مسائل دیکھ چکا یا سن چکا ہوں وہ تقریباً سب ذہن میں محفوظ ہیں۔ عمر کا ذکر آنے پر کبھی مذاقاً فرماتے کہ جاہلین! تم نے کبھی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے؟ فرماتے کہ وہ میں ہوں کیوں

کہ اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی۔

کشمیر سے بہ نیتِ ہجرت مکہ مکرمہ جانے کے قصد سے نکلے اور اپنے اساتذہ سے ملنے کے لئے دیوبند اترے۔ حضرت شیخ الہندؒ ان کے جوہروں کو جانتے تھے کہ سنکر قدرے قیام کا مشورہ دیا، اور سنن ابوداؤد کا سبق حوالہ فرمایا، اس درس سے حضرت ممدوح کے تبحر، تفقہ اور دقتِ علم کا راز فاش ہونا شروع ہوا، یہی زمانہ تھا کہ شیخ الہندؒ نے حج کا ارادہ فرمایا، اس سفر میں مکہ مکرمہ ہی میں انگریزوں نے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا۔ حضرت شیخ الہند نے ارادۂ سفر کے بعد کہہ سن کر انہیں اپنا قائم مقام بنایا اور حدیث کے انتہائی اسباق سپرد فرمائے۔ مشاہرہ کے لئے عرض کیا گیا مگر راضی نہیں ہوئے اور حسبۃً اللہ درس کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے، کامل دس سال اسی طرح گذارے۔ میرے حضرت والد صاحب نے باصرار اس پر راضی کر لیا کہ کھانا ان کے ساتھ کھائیں گے۔ چنانچہ دس سال اسی شان سے گذرے۔ میری دادی صاحبہ کبھی کہلاتی کہ شاہ صاحب کوئی مرغوب طبع چیز ہو تو بے تکلف فرما دیا کریں، تو فرماتے کہ حضرت ''میں اتنی نعمتیں کھا رہا ہوں کہ اندیشہ ہے کہ میری جنت کی نعمتیں یہیں تو تمام نہیں کی جا رہی ہیں اس دس سال میں حضرت والدِ ماجد اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کو یہ خطرہ برابر لاحق رہتا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مکہ مکرمہ کی راہ نہ لیں۔ اس لئے ان حضرات نے بطور تدبیر ان کی شادی کا پرداز ڈالا، راضی نہیں ہوتے تھے مگر کہہ سنکر مجبور کیا گیا تو راضی ہو گئے اور بھوپال کے ایک سادات کے خاندان سے جو اصل میں گنگوہ کا خاندان تھا یہ رشتہ لگایا گیا اور شادی ہو گئی دلہن ہمارے ہی مکان پر آ کر اُتری جو سارے گھر میں گھر کی ہی بہو بیٹیوں کی طرح رہتی تھیں لیکن اب حضرت شاہ صاحب کو یہ بار اپنے ذہن میں بوجھ محسوس ہونے لگا اور میرے والد صاحب سے فرمایا کہ حضرت اب میرے لئے کرایہ کے مکان کا بندوبست فرمایا جائے اور بمشکل کہہ سن کر اس پر تیار کر لیا تو ہمارے مکان کے قریب دیوان میں ایک مکان کرایہ پر لیا گیا جس میں بودوباش اختیار فرمائی۔ اس موقعہ پر ذمہ دارانِ دارالعلوم کی طرف سے تنخواہ لینے پر مجبور کیا گیا تو بالآخر اسے قبول فرما لیا اور اس طرح ان کے اک دم چلے جانے کے خطرات رفع ہو گئے پھر تو ان کے علوم کی وہ شہرت ہوئی

کہ مدارس کے چیدہ چیدہ اساتذہ بھی کمالِ فن پیدا کرنے کے لئے دارالعوم دیو بند میں بطور طالب علم کے آنے لگے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے حلقۂ درس سے مستفید ہونے لگے۔ ادبیت اور علوم عربیت پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ بے تکان عربی میں تقریریں فرماتے تھے۔

علامہ رشید رضا مصری مدیر ''المنار'' قاہرہ جو شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید تھے دیو بند آئے اور تقریباً پانچ چھ دن قیام فرمایا ان کے خیر مقدم کا جلسہ ہوا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے برجستہ عربی میں تقریر فرمائی تو رشید رضا دنگ تھےاور کہتے تھے کہ عربی زبان باوجودیکہ ہماری مادری زبان ہے لیکن اس پر اتنی قدرت خود ہم بھی محسوس نہیں کرتے جو حضرت شاہ صاحبؒ میں دیکھی اور پھر متعلمانہ انداز میں حضرت کے درس میں بھی شریک ہوئے۔

عربی شاعری میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا دارالعلوم میں جب کبھی انعامی جلسے یا مؤقر افراد کے آنے پر خیر مقدم کے جلسے ہوتے تھے تو حضرت شاہ صاحب بھی اپنے عربی قصائد سے سامعین کو محوِ حیرت بنادیا کرتے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ایک بار دارالعلوم کی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا جس کے سننے والوں میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا کہ عربی منطقوں کے مختلف ممالک میں گیا ہوں۔ وہاں کے علماء و مشائخ سے بھی سابقہ رہا ہے لیکن میں نے حضرت شاہ صاحب کا نظیر اور مثل کہیں نہیں پایا۔ قسمت میں یہ شرف مقدر تھا کہ ہم جیسے نااہل بھی حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوں۔ چنانچہ ترمذی اور بخاری حضرت ممدوح ہی کے یہاں ہوئی۔ اکثر پیار و محبت سے طلبہ کو جاہلین کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے اگر کوئی طالب علم بے ڈھنگا سوال کرتا تو فرماتے کہ ارے جاہل! تو نہیں جانتا کہ میں اسناد متصل کردیتا ہوں۔ فرمایا کہ اسناد متصل کرنے کے معنی سمجھایا نہیں؟ وہ یہ ہیں کہ میں اپنے پاس والے کے تھپڑ ماردوں گا وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ رسید کرے گا اور بالآخر سند تجھ تک پہنچ جائے گی، ششماہی امتحان کے بعد بخاری عصر مغرب کے درمیان ہوتی تھی۔ کبھی کبھی طلبہ سے مزاح فرماتے، مغرب کا وقت آجاتا تو فرماتے کہ جب بھائی شمس الدین نہیں ٹھہرے تو پڑھانے کا لطف ہی کیا باقی رہا اور یہ کہہ کر کتاب بند کردیتے، طلبہ سمجھتے کہ شمس الدین صاحب کوئی مہمان ہوں گے جن کا تذکرہ فرمایا، لیکن اشارہ

ہوتا تھا غروب شمس کی طرف کہ جب بھائی شمس الدین ہی جا رہے ہیں، تو پڑھانے میں کیا جی لگ سکتا ہے، بہر حال درس ترمذی و بخاری علوم ہی کا نہیں، اخلاق و ماحول کا بھی مجموعہ ہوتا تھا اور یوماً فیوماً حضرت شاہ صاحب کی جامعیت علوم کا دلوں پر سکہ بیٹھا رہتا تھا۔

میں نے اس زمانہ طالب علمی میں ایک عربی قصیدہ بنام نونیۃ الاحاد لکھا جو مشاہیر امت کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے جس میں امت کے ان تمام ممتاز افراد کی فہرست گنائی ہے جو کسی نہ کسی فن میں یکتا گذرے ہیں۔ جیسے حدیث میں امام بخاریؒ، کلام میں ابوالحسن اشعری، نحو میں سیبویہ، فقہ میں ابوحنیفہ وغیرہ۔ اس میں ایک شخصیت کا نام ابوالحسن بھی آیا ہے جو جھوٹ بولنے میں یکتا گذرا ہے۔ مجھے اس کے حالات کی جستجو تھی مگر کسی کتاب میں دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ آخر کار ہماری دوڑ حضرت شاہ صاحب کی طرف ہوتی تھی، چنانچہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ابوالحسن کذاب کے بارے میں کچھ پوچھوں۔ یہ حضرت کی عمر کا بالکل اخیر دور تھا اور وفات میں غالباً چند ماہ ہی باقی رہ گئے تھے، ضعف کافی ہو چکا تھا، تو میں نے ابوالحسن کذاب کے بارے میں عرض کیا کہ حضرت مجھے اس کے حالات کسی کتاب میں بھی کذب کے زیر عنوان نہیں ملے، فرمایا مولوی صاحب آپ نے بھی کمال کر دیا، صفت کذب کیا کوئی مستحسن صفت ہے کہ لوگ اس کا عنوان قائم کر کے کذابین کے حالات قلم بند کر دیتے، یہ حالات ادب و تاریخ کی کتابوں میں کہیں نہ کہیں منتشر طور پر مل جائیں گے۔ ورنہ کوئی باب الکذب تھوڑا ہی قائم کرے گا کہ کذابین کی فہرست اس کے نیچے درج کرے، اور یہ فرمایا کر چھ سات کتابوں کے نام بتلا دیئے، کہ ابن خلدون میں فلاں جگہ دیکھئے اور ابن خلکان میں فلاں جگہ وغیرہ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو کتابوں کے یہ اتنے نام بھی یاد نہیں رہیں گے۔ پس حضرت ہی اس کی کوئی مختصر سی سوانح بیان فرما دیں تو میں حضرت کے حوالہ ہی سے اسے نقل کر دوں گا، اس پر تھوڑے سے تامل کے بعد ابوالحسن کذاب کی سوانح عمری بیان فرمانی شروع کی کہ یہ شخص فلاں سنہ میں پیدا ہوا، اتنی عمر پائی، جھوٹ میں یکتا مانا گیا۔ بڑے بڑے جھوٹ بولے اور مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا اور لوگوں کو تشویش میں ڈال گیا۔ اور فلاں سن میں فوت ہوا، میں حیرت سے

سن رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ غالباً ابھی حال میں کہیں اس کی یہ سوانح مطالعہ فرمائی ہوگی، جو اس روانی کے ساتھ اس کی سوانح حیات بیان فرمارہے ہیں اور جرأت کر کے عرض بھی کر دیا کہ شاید حال ہی میں یہ سوانح مطالعہ فرمائی ہوگی، فرمایا جی نہیں مولوی صاحب تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا تھا، تو خدیوی کتب خانہ میں پہنچ گیا اور اتفاق سے ایک رسالہ ابوالحسن کذاب کے حالات پر مشتمل سامنے آگیا مجھے دلچسپی ہوئی اور میں نے اسی فرصت میں پورا پڑھ لیا، آج آپ کے سوال کرنے پر جب ذہن ادھر منتقل ہوا تو وہ سارا رسالہ ذہن میں مستحضر ہوگیا ورنہ مجھے کہاں فرصت کہ لوگوں کے جھوٹ سچ یا مکروفریب یا چوری ڈکیتی کے واقعات کے مطالعہ میں وقت ضائع کروں۔ ظاہر ہے کہ اس حافظہ کو ایک موہبتِ ربانی کے سوا اور کیا کہا جائے، ورنہ طبعی حافظے اس طرح کے نہیں ہوتے ہیں، بالخصوص آج کے دور میں اگر ڈائری جیب میں پڑی ہوئی نہ ہو تو صبح کی بات شام کو یاد نہیں رہتی۔ اس لئے یہ حافظہ محض قوت غریزی کا حافظہ نہیں تھا جو عموماً انسانوں میں بطور طبعی غریزی کے ودیعت ہوتا ہے بلکہ قوت قدسیہ کا اثر تھا جو ذہن کی صفائی اور تشویشات سے بالاتر ہونے کی علامت ہے۔ جیسے بعض اہل اللہ کے حالات میں ہے کہ جو بات بھی ان کے کان میں پڑ جاتی تھی تو وہ اسے بھولتے نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کی باتیں سننے سے گریز کرنا شروع کر دیا تھا کہ جو کچھ سنوں گا وہ دماغ میں محفوظ ہوجائے گا تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے دماغ کو رطب ویابس سے بھرتا رہوں۔ اس میں جتنا بھی ذخیرہ ہو وہ صرف کلام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا رہے۔ یہی صورت حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی تھی کہ وہ اِدھر اُدھر کے قصوں کو کبھی دلچسپی سے نہیں سنتے تھے۔ اور بعض احیان حکماً روک دیتے تھے غالباً اس لئے کہ وہ مل ملا کر دماغ میں محفوظ ہوجائیں گے اور پھر تشویش کا باعث بنیں گے۔ جس سے علمی فکر وتدبر میں خلل پڑے گا اس لئے زیادہ سے زیادہ وقت ان کا صرف مطالعۂ کتب یا علوم میں فکر وتدبر کرنے ہی میں گذرتا تھا۔

درس کی تقریریں نہایت جامع اور وجیز ہوتی تھیں، مواد ہی مواد ہوتا تھا، لفظ آرائی اور تعبیر پیرائی کی ان کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، عموماً مسئلہ کا لب لباب ہوتا تھا، افسوس ہے کہ ہم

ناکاروں نے ان کی اوران کے جامع جملوں کی قدر نہ پہچانی۔اب بھی جو جملہ کسی بھی فن کا ذہن میں محفوظ ہےتو معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم کا ایک سمندر ہے جسے کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

تقدیر کے مسئلہ میں ایک دفعہ فرمایا کہ آخرت میں کسی کا معذب ہونا انتقام نہیں ہے، محض صورت انتقام ہے۔وہ حقیقت میں تسبیب وتشمیر ہے۔اس جملہ سے تمام وہ شبہات دور ہو جاتے ہیں جو مسئلہ جبر وقدر میں پیدا ہوتے ہیں۔اب اگر اس کی تفصیل کی طرف جائے تو وہ ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔فن اصول فقہ میں کتاب وسنت کے عام اور خاص کی بحث آتی ہے،تو میں نے عام کی تعریف پوچھی فرمایا کہ ہر صیغی اور لفظی جمع کو عام کہتے ہیں اس سے اصل جمع اور عام کا فرق کھل جاتا ہے کہ حقیقی جمع کسی مفرد پر جمع کی علامت لگا دینے سے بنتی ہے۔مادّہ مفرد کا ہی رہتا ہے،اضافۂ علامت سے جمع بن جاتا ہے۔جیسے عالم کی جمع عوالم، عالم کی جمع علماء، زیادہ کی جمع زیادات یا مفرد کی جمع مفردات، یا کلمہ کی جمع کلمات وغیرہ لیکن عام کا لفظ خود ہی ہو جاتا، جس پر کسی بھی علامت جمع کا اضافہ نہیں ہوتا۔مگر پھر بھی معنی جمع کے دیتا ہے۔جیسے ما کا کلمہ جس کے معنی ''وہ'' کے ہیں اور عموم رکھتا ہے کہ جو بھی لفظ وہ کا مصداق ہوگا وہ اس کا فرد بن جائے گا۔مگر اس پر کوئی بھی علامت جمع کی نہیں اور پھر بھی یہی جمع ہے تو اسے کتنے مختصر لفظوں میں بیان فرمادیا کہ ہر صیغی اور لفظی جمع کو عام کہتے ہیں۔صیغہ مفرد کا ہو، معنی کے لحاظ سے بلا علامت جمع وہ جمع ہو یعنی محض لفظ کا ابہام ہی اس میں جمع کے معنی پیدا کر دیتا ہے اس لئے وہ جمع حقیقی نہیں ہوتا بلکہ صرف لفظی ہوتا ہے اس لئے کس قدر جامع، واضح اور مانع تعریف ہے کہ ہر صیغی جمع کو عام کہتے ہیں۔بہر حال علوم وفنون پر حاوی ہونے کی وجہ سے حقائق ومسائل کی بنیادیں ان پر حق تعالیٰ نے منکشف فرمادی تھیں تو لمبے لمبے مسائل کو چھوٹے چھوٹے جامع اور حاوی جملوں سے ادا فرمادیتے تھے۔

یہی صورت حدیث کی تشریحات کی بھی تھی کہ لمبی بحثوں اور اخلاقی مسائل کے معرکوں کو چند جامع جملوں میں ادا فرما کر مسئلہ کی بنیاد سمجھا دیتے تھے کہ طالب علم اس پر حاوی ہو کر لمبی بحثیں خود ہی اس جملہ سے نکال لانے پر قادر ہو جاتا تھا۔گویا بحث لمبی کر کے اس

کا خلاصہ نہیں نکالتے تھے بلکہ خلاصہ اور ملخص بیان کر کے بھی بحثوں کی استعداد طالب علم میں پیدا فرما دیتے تھے اس لئے دیکھا یہ جاتا تھا کہ ذی استعداد طالب علم ہی ان سے حقیقی استفادہ کر سکتا تھا، ناقص الاستعداد یا بھرتی کا طالب علم زیادہ تر تحیر ہی میں غرق ہو کر رہ جاتا تھا۔ البتہ علم کی برکت سے محروم نہیں رہتا تھا۔ بعض دفعہ ایسے ہی قلیل الاستعداد اور غرق حیرت طالب علم کو مزاحاً فرما دیا کرتے تھے۔ کَاَنَّھُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَۃٌ کی قسم سے معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال علم یہ تھا جو اضافات علوم پر حاوی تھا اور عمل وہ تھا جو عمل بالحدیث عمل بالفقہ اور عمل بالقرآن میں غرق تھا اور ہر ہر نقل و حرکت میں اتباع سنت، تدین اور تقوائے باطن عیاں نظر آتا تھا، اس علوِ شان کے ساتھ اپنے اکابر کا ادب و احترام بھی مثالی تھا، میرے حضرت والد صاحبؒ ایک واقعہ کے سلسلہ میں ایک بار اچانک حضرت شاہ صاحبؒ کے مکان پر پہنچ گئے۔ ابھی مکان تک نہیں پہنچے تھے، کہ کسی نے اطلاع کر دی کہ حضرت مہتمم صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اسی وقت گھبرا کر چارپائی سے اٹھے اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے مکان سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا، گھر میں لائے، حضرت والد صاحب نے اس واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ حضرت میرا بھی کوئی حق آپ پر ہے یا نہیں؟ فرمایا حضرت اتنا ہے کہ اگر میری کھال کی جوتیاں بنا کر آپ استعمال فرماویں گے تو میرے لئے فخر کا باعث ہوگا اور پھر حضرت والد ماجد نے جو فرمایا اس پر سَمْعًا وَّ طَاعَۃً کہہ کر راضی ہو گئے۔ بہر حال اس علوِ مقام کے ساتھ یہ تواضع اور فروتنی کسی تقی و نقی ہی میں جمع ہو سکتی ہے۔

فن حدیث میں ابتداءً اختلافی مسائل میں جو حنفیہ شافعیہ وغیرہ میں ہوئے ہیں اور زیب فقہ ہیں، رفع اختلاف کا معمول تھا اگر امام شافعیؒ کا مسلک حنفیہ کے خلاف ہوتا تھا، تو حنفیہ کے دلائل بیان کر کے ائمہ حنفیہ کے ایسے اقوال سامنے رکھتے تھے جو مسلک شافعی کے مؤید ہوتے تھے۔ مقصدِ اختلاف کو مضمحل دکھلا کر طلباء و علماء کو ائمہ کی شان میں تقابل کی صورت پیدا کرنے سے بچانا اور تمام ائمۂ ہدایت کی حقانیت کو زیادہ سے زیادہ دلوں میں بٹھلانا پیش نظر رہتا تھا۔ لیکن آخری دور میں فرمایا کہ سالہا سال ابو حنیفہؒ کی نمک حرامی کی ہے۔ اب آخر عمر میں اس کی جرأت نہیں کر سکتا اور پھر ترجیحی دلائل کو نہایت مضبوطی اور

استحکام کے ساتھ بیان فرماتے اور مذہب حنفی کی تائید اور ترجیح پیش نظر رہنے لگی تھی، غالباً اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقولہ سامنے رہتا تھا کہ ''امام ابوحنیفہؒ جس مسئلہ میں منفرد ہوتے ہیں اور تمام ائمہ دوسری سمت تو میں بطور خاص اس میں امام صاحب کی تقلید ضرور کرتا ہوں۔ اور نظر آتا ہے کہ جس مدرک تک امام پہنچے ہیں وہاں تک دوسرے نہیں پہنچے'' یہ تو یاد نہیں کہ یہ مقولہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہو، لیکن عمل بہرحال آخری دور میں اسی مقولہ پر تھا، اور اب تطبیق کے بجائے ترجیح پر زیادہ زور دیتے تھے جو بجائے خود عزازتِ علم اور عمق فہم کی ایک مستقل دلیل ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی احوال پر کلام کرنا، واقعہ یہ ہے کہ ہم جیسے ناکاروں کا کام نہیں۔ ان کے تلامذہ میں مولانا یوسف بنوریؒ اس کے اہل تھے یا اس کام کو سرانجام دینے میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مرحوم نے کام کر کے دکھلایا کہ ان کے علوم کا تحطی کر کے دوسروں کو وہ امانت پہنچائی۔ بالخصوص مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ مرحوم نے اپنے متعدد مصنفات میں اس امانت کی ادائیگی کا حق ادا فرمادیا ہے۔ اس سیمینار کے سلسلہ میں قلتِ فرصت، کم ہمتی اور قلیل الاستعدادی کے ساتھ سرسری طور پر یہ چند منتشر اور غیر مربوط خیالات ذہن میں آئے جنہیں بتعمیل ارشاد عزیز محترم مولوی ازہر شاہ ابن حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سپرد قلم کر دیا ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرت مرحوم کی کوئی علمی یا عملی سوانح نہیں ہے کیوں کہ وہ ہم جیسوں سے ممکن نہیں بلکہ ان کے تذکرہ کو خواہ وہ حقیر و قلیل ہی ہو محض حصول سعادت و برکت کے لئے بطور خانہ پری کے پیش کر دینے کی جرأت کی ہے۔

میرے سب سے بڑے اُستاذ

از: حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی
ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنّفین دہلی

(۱) شیخ الاسلام، سرتاج محدثین، حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ کی سیرت اور کمالات وخصوصیات پر قلم اٹھانا آسان نہیں ہے۔ جب کبھی حضرت الاستاذ کے متعلق کچھ کہنے کا خیال آتا ہے ابوالطیب متنبّی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے جو اس نے اپنے ممدوح سیف الدولہ کی تعریف میں کہا تھا۔

مَضَتِ الدُّهُورُ وَمَا اَتَيْنَ بِمِثْلِهٖ ۞ وَلَقَدْ اَتٰى فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِهٖ

زمانہ کی کتنی ہی گردشیں گذر گئیں مگر یہ گردشیں میرے ممدوح جیسا نہ لاسکیں اور اب وہ ممدوح آگیا تو اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ودرماندہ ہیں۔

عرب کے اس مشہور ومقبول شاعر نے تو اپنے ممدوح کی مدح سرائی میں یقیناً مبالغہ سے کام لیا تھا اور درباری شاعروں کو اس طرح کے مبالغوں سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ لیکن حضرت الاستاذ کی ذات والاصفاتِ پر اس شعر کا ایک ایک حرف صادق آتا ہے اور اس میں ذرّہ بھر بھی شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے کاش! شاعر نے یہ شعر حضرت الاستاذ کی تعریف میں کہا ہوتا۔

(۲) حضرت الاستاذ کی ایک غیر معمولی بلکہ بے مثال خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف محدث ہی نہیں تھے۔ بڑے بڑے محدثین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے میدان کے تو شہسوار ہوتے ہیں مگر دوسرے علوم وفنون سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتے یا کم سے کم ان میں مہارت نہیں رکھتے مثلاً محدث شہیر ابوبکر محمد بن خزیمہ نیشاپوری (م ۳۱۱ھ) کہ علم حدیث کے بحر ذخّار تھے ان کی ''صحیح'' حدیث کا نادر ترین سرمایہ ہے اور صدیوں کے انتظار واشتیاق کے بعد اب اس کی صرف تین جلدیں شائع ہوئی ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ وہ علم اصول وعقائد سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتے تھے اسی لئے ان کی کتاب ''التوحید''

پر علمائے اصول نے تنقیدیں کی ہیں۔ایسے ہی دوسرے بڑے بڑے محدثین گذرے ہیں جو علم فروع وفقہ میں کمزور تھے۔بعض محدثین کا پایۂ علم معقول وفلسفہ میں کمزور تھا۔بعض فن اسماء الرجال کے حاذق نہ تھے۔اس لئے ان کی حدیثی تالیفات میں حد درجہ ضعیف احادیث بھی موجود ہیں،اس کے برخلاف حضرت الاستاذ کی شان یہ تھی کہ وہ اگر ایک طرف جلیل القدر محدث تھے تو دوسری طرف تفسیر،فقہ،اصول فقہ،تصوف،معانی وبیان،ادب وبلاغت،تاریخ وفلسفۂ تاریخ،فلسفہ ومنطق،ہیئت قدیم وجدید،وغیرہ سب ہی علوم وفنون میں محققانہ اور ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے۔اسی وجہ سے ان کا درس حدیث تحقیق آثار ومتونِ حدیث بحثِ رجال واجتہاد اور دوسرے علوم وفنون کے مہماتِ مسائل پر سیر حاصل تبصروں کے باعث جامعیت کا ایک عجیب وغریب نمونہ ہوگیا تھا۔جن خوش قسمتوں کو حضرت کے درس میں شرکت کی سعادت ملی ہے وہی آپ کے علوم ومعارف کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں اس کو کسی مختصر تحریر میں سمجھانا آسان نہیں ہے۔

(۳) علم حدیث کا تمام تر مدار حفظ متونِ حدیث ومعرفتِ رجالِ حدیث پر ہے۔اسی لئے حضرت الاستاذ ہر حدیث پر کلام کے وقت اس کے تمام طرق ومتون کو جمع فرما کر بحث کیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ رجال ورواۃِ حدیث کی تحقیق ضروری سمجھتے تھے اور اس بارے میں جن محدثین سے فروگذاشتیں ہوئی ہیں یا انہوں نے تنگ نظری سے کام لیا ہے ان پر کڑی تنقیدیں فرمایا کرتے تھے۔

دوسری اہم چیز جس پر حضرت زور دیا کرتے تھے یہ تھی کہ احادیث سے فروعی مسائل استنباط کرتے تھے۔جن حضرات نے فقہی رائے قائم کرکے حدیث سے تائید لینے کی کوشش کی اس کی بھی سخت تردید کرتے تھے،اور فرمایا کرتے تھے کہ حدیث سے فقہ کی طرف آنا چاہئے نہ کہ فقہ سے حدیث کی طرف،اسی اصول پر حضرت بہت سے مسائل میں محدثین وفقہاء پر نقد کیا کرتے تھے۔درس بخاری شریف میں اس امر کو بھی خاص طور سے نمایاں فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاریؒ نے صرف اپنی فقہی رائے کی موافقت والی حدیثیں جمع کی ہیں۔دوسری فقہی آراء اور ان کی مؤید احادیث کو چھوڑ دیا ہے۔برخلاف اس کے امام ترمذی،

ابوداؤد و مسلم وغیرہ نے دوسری آراء کے موافق و مؤید احادیث کو بھی درج کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں نہ صرف حنفیہ بلکہ مالکیہ شافعیہ حنابلہ کے خلاف بھی کافی ذخیرہ موجود ہے اور دوسری کتب حدیث میں ہر مسلک کے موافق و مخالف حدیثیں ملتی ہیں۔

(۴) اختلافی مسائل میں وسعت نظر کے ساتھ انتہائی رواداری حضرت مرحوم کی زبردست خصوصیت تھی اور حضرت اس امر کی سعیٔ بلیغ فرماتے تھے کہ اختلاف کی نوعیت کو سبک اور ہلکا کر کے سامنے لایا جائے۔ اسکی ایک نمایاں مثال رفع یدین کا مسئلہ ہے جس پر ہمیشہ سے بحثیں ہوتی رہی ہیں اور بعض فقہائے احناف نے اس کو مکروہ لکھا ہے مگر حضرت کی نظر میں یہ سب نادرست اور حد سے تجاوز تھا۔ آپ نے حافظ ابوبکر جصّاص رازی حنفی کی احکام القرآن سے عدم کراہت ثابت کی اور فرمایا کہ اس بارے میں یہ نقل سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ دوسرا حوالہ ''برہان شرح مواہب الرحمٰن'' کا دیا کرتے تھے جو فقہ حنفی کی مستند و مفید کتاب ہے اور دسرے اکابر علمائے مذاہب سے بھی یہی تصریحات نقل کرتے تھے کہ اختلاف صرف اوّلیت و افضلیت میں ہے مثلاً علامہ ابن عبدالبر مالکی سے اور علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم حنبلی وغیرہ سے۔ امام بخاری کے رسالہ رفع یدین کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق دوسرے نقطۂ نظر کو گرانے کے لئے یہ بھی دعویٰ کر دیا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے ترکِ رفع ثابت نہیں ہے۔ حالاں کہ خود ان کے تلمیذ رشید امام ترمذی نے ہی اس دعویٰ کی تغلیط کر دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ترکِ رفع کے قائل بھی بہت سے اہل علم اصحابِ نبی و تابعین تھے اور یہی مسلک سفیان و اہل کوفہ کا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ کی تحقیق فرماتے ہوئے کئی جگہ حافظ ابن حجرؒ کی فروگذاشتیں بھی پیش کی ہیں۔ اس تنقیح کے بعد ترکِ رفع کی احادیث پر بحث کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث جس کو عام محدثین اثر موقوف سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے، حضرت الاستاذ نے اس کی وہ سند مہیا کی کہ محدثین کو حیرت میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے جس مسئلہ پر امام بخاری، حافظ ابن حجرؒ، ایسے ماہرین فن نے پورے جماؤ کے ساتھ تحقیق کا حق ادا کیا اس پر حضرتؒ کی تنقیحات و تحقیقات اور محدثانہ نقد و جرح شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور

یہی حال اخفاء اور جہر آمین، قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ نزاعی مسائل میں تحقیق کا ہے۔

(۵) حضرت الاستاذ کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ وہ تحقیق و بحث کے وقت اقدار رجال کی بہت رعایت فرماتے تھے مثلاً اوپر ہی کے مسئلہ میں آپ نے فقہ حنفی کی مشہور کتب بدائع، کبیری، وغیرہ کے قول کراہیت رفع یدین کو مرجوح اور محقق جصاص (م ۳۷۰ھ) کے قول کو راجح قرار دیا اور فرمایا کہ جصّاص چوتھی صدی کے ہیں اور محقق شہیر علامہ کرخی حنفی (م ۳۴۰ھ) کے تلمیذ ہیں۔علامہ کرخی محدث امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) کے معاصر تھے لہٰذا جصّاص کا مرتبہ صاحبِ بدائع وکبیری سے بلند ہے۔اگرچہ کبیری سے صاحبِ بدائع کا مرتبہ بہت بلند ہے ایسے ہی شمس الائمہ حلوانی (م ۴۴۸ھ) کے اقوال کو بعد کے فقہاء صاحب منیہ وشارح حلبی وغیرہ کی تنقیح وتحقیق پر ترجیح دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ شمس الائمہ کا مرتبہ ان حضرات سے بلند تر ہے۔

تراویح کی بیس رکعتوں کے مؤکدہ ہونے کے بارے میں فقہائے حنفیہ کے بہت سے اقوال منقول ہیں اور ان پر لمبی لمبی بحثیں چھیڑی ہیں مگر حضرت شیخ ابن الہمام کی فتح القدیر کے قول کو ترجیح دیتے تھے کہ آٹھ رکعات مؤکدہ باقی بارہ مستحب کے درجہ میں ہیں۔یہ تمام بحثیں تفصیل کی طالب ہیں، میں نے صرف اشارات پر اکتفاء کیا ہے منشاء یہ ہے کہ حضرت الاستاذ پر محققانہ ومحدثانہ رنگ غالب تھا اور اس کے ساتھ وہ محدثین وفقہاء کے مرتبوں اور درجوں کا بھی خاص طور سے لحاظ فرماتے تھے۔

(۶) آپ کا پسندیدہ معمول حدیث کی شرح حدیث سے کرنا تھا۔ تاویل کے طریقہ کو ناپسند کرتے تھے۔چنانچہ حدیث قلّتین وغیرہ کی شرح وتحقیق اسی اصول پر فرماتے تھے اور جو تاویلیں دوسری صریح حدیثوں کے خلاف ہوتی تھیں ان کو بے تکلف رد فرمادیتے تھے۔

(۷) حضرت الاستاذ کو فتح الباری کے مباحث پر مکمل عبور تھا۔اسی لئے حافظ ابن حجرؒ کی فروگذاشتوں پر بے دھڑک تنقید کیا کرتے تھے۔اسی کے ساتھ علامہ عینی حنفی کے بعض تعقبات میں شدت اور نوک جھوک بھی پسند نہ تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ عالم خواب میں ان سے ملاقات ہوئی تو اس کا شکوہ کیا جس پر علامہ عینی نے جواب دیا کہ یہ بات ان سے (یعنی حافظ ابن حجر سے) بھی کہہ دو۔مطلب یہ تھا کہ اوّل زیادتی ان کی طرف سے ہوتی ہے مجھے

مدافعت کرنی پڑتی ہے۔

(۸) آپ فن اسماء الرجال کے بھی امام تھے اور ناموں کی تصحیح اور عام الفاظ کی تصحیح کا بھی غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے مثلاً ابن منیر کی صحت اور فرماتے تھے کہ میں نے بڑے بڑے مؤرخوں کو یہ نام غلط پڑھتے سنا ہے۔ وہ منیّر کی جگہ منیر پڑھتے تھے۔

(۹) فن حدیث میں علل حدیث کی معرفت بھی نہایت اہم اور ضروری ہے۔ بعض محدثین کا حافظہ بہت قوی، اسناد و اسماء الرجال پر عبور، الفاظ حدیث کے فروق پر بھی نظر کامل ہوتی تھی مگر علل حدیث پر ان کی نظر گہری نہیں ہوتی اور پوشیدہ علتوں پر انکی گرفت نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک محدث کے لئے بڑا نقص ہے۔ حضرت الاستاذ میں خدا کے فضل سے یہ کمی بھی نہیں تھی۔

(۱۰) حضرت فرماتے تھے کہ امام اعظم کے علوم کو امام محمدؒ نے مدوّن کر کے پھیلایا تھا۔ امام طحاوی نے ان علوم کو مدلل اور مبرہن کیا اور میں نے ان دلائل و براہین کے لئے شواہد و مؤیدات جمع کرنے میں اپنے عزیز اوقات صرف کئے ہیں اور اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ آج تک کسی نے نہیں کیا تھا، تین بکس میری یادداشتوں کے اسی پر ہیں۔

(۱۱) علم اصول و عقائد اور مسائل کلام میں بھی حضرت الاستاذ کا تبحر بے مثال تھا۔ اس فن میں امام بیہقیؒ کی کتاب ''الاسماء والصفات'' بڑے پایہ کی مستند کتاب مانی گئی ہے۔ تاہم اس کے بعض تسامحات پر علامہ کوثریؒ نے حواشی لکھ کر احقاق حق اور دقتِ نظر کے کمالات دکھلائے ہیں۔ اسی طرح صحیح بخاری کی ''کتاب التوحید'' کے بہت سے موقعوں پر حضرت الاستاذ کے افادات بھی تحقیقی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ حضرت کے درس بخاری شریف کے کلامی افادات پوری طرح قلم بند نہیں ہو سکے۔ پھر بھی ان کا کچھ نمونہ انوار المحمود شرح ابوداؤد میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱۲) حضرت الاستاذ کی علمی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ ہر فن کے مشکل مسائل کا حل کرنا تھا۔ جس کے لئے ہر وقت فکر و جستجو کیا کرتے تھے۔ اسی ذیل میں مشکلات القرآن بھی آتی تھیں۔ آپ نے عمدہ تفاسیر اور قوی احادیث و آثار کی روشنی میں قرآن مجید کی حل مشکلات کی نشاندہی فرما کر امت مرحومہ پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ اس میں قصہ ہاروت و ماروت،

واقعۂ حضرت داوٗدؑ وحقیقت یا جوج وما جوج وغیرہ لائق مطالعہ ہیں اور سوۂ والنجم میں رؤیت باری تعالیٰ کا مسئلہ بھی ہے۔ ''مشکلات القرآن'' شائع ہو چکی ہے، جو حضرات تالیفی کام کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اکثر شارحین مسائل مشکلہ کا ذکر تک نہیں کرتے کیوں کہ ان کو حل نہیں کر سکے۔ حضرت الاستاذ کا خاص ذوق ہی یہ تھا کہ جن مشکلات کے حل کی طرف دوسروں نے توجہ نہیں کی، ان سے ضرور تعرض کریں اور کافی وشافی جوابات مہیا کریں۔

(۱۳) مولوی محمد علی صاحب لاہوری کی تفسیر قرآن اور ترجمہ بخاری اردو کی تلبیسات پر مطلع ہو کر اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ اردو تحریر کی زیادہ سے زیادہ مشق کریں۔ صحیح ترجمہ وتفسیر کے درس کو بھی عام کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اردو لکھنے کو معیوب سمجھا تھا۔ اب افسوس کرتا ہوں۔ مولانا آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' شائع ہوئی تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور فرمایا یہ تفسیر انجیل کے طرز پر لکھی گئی۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن مجید کے ساتھ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تفسیری فوائد شائع ہوئے تو آپ کی مسرت دیکھنے کے قابل تھی۔ آپ نے ان تفسیری فوائد کی تحریر کے دوران مولانا کی بڑی امداد بھی کی تھی اور برابر مشورہ دیا کرتے تھے۔

(۱۴) حضرت الاستاذ فقہ کو اصعب الفنون فرمایا کرتے تھے اور اس کی خوب خوب وضاحت کیا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ میری ہر فن میں اپنی رائے ہے مگر فقہ میں نہیں۔ شیخ ابن ہمامؒ کو اصول فقہ میں اعلیٰ درجہ کا متقن بلکہ امام مانتے تھے لیکن حدیث میں نہیں۔ حدیث میں شیخ جمال الدین زیلعی کے زیادہ قائل تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کو فقیہ النفس فرمایا کرتے تھے اور بعض خصوصیات میں ان کو شامی پر ترجیح دیتے تھے۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب ''بدایع الصنایع'' کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب فقیہ النفس بنانے والی ہے۔

(۱۵) حضرت الاستاذ کی عادت تھی کہ جس فن کا جو مسئلہ ہوتا اس کی پوری تحقیق فرمادیا کرتے تھے۔

(۱۶) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور علامہ ابن تیمیہ سے یکساں احترام کا تعلق حضرت الاستاد کی لاجواب خصوصیت تھی۔

(۱۷) حضرت کو علوم ظاہری کے علاوہ علومِ باطنی میں بھی کمال حاصل تھا۔لیکن انتہائی اخفاء کی وجہ سے ان کا یہ کمال ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اس میں دوسری وجوہ کے علاوہ شاید عام مشائخ طریقت کی یورشوں کا بھی دخل تھا۔

(۱۸) ہیئتِ قدیم کی نسبت سے ہیئتِ جدید کو اسلام سے زیادہ قریب سمجھتے تھے اور دونوں پر آپ کو کامل عبور تھا۔

(۱۹) پشاور کے خطبۂ صدارت ''جمعیۃ علمائے ہند'' میں دارالاسلام، دارالحرب اور دارالامن کی تحقیق اپنے انداز کی نرالی تحقیق ہے اور دوسرے ملکی وملی مسائل پر جو کچھ ارشادات فرمائے ہیں وہ آپ کی سیاسی بصیرت پر شاہدِ عدل ہیں۔

(۲۰) مجتہدانہ نظر رکھنے کے باوجود پختہ حنفی تھے اور کوشش کرتے تھے کہ حنفیہ کے اس مسلک کی دلپذیر وضاحت کریں جو اقرب الی الحدیث ہے۔

(۲۱) ایک دفعہ میرے سامنے ایک بڑے حنبلی عالم سے فرمایا کہ میں امام اعظمؒ کا اس لئے مقلد نہیں ہوں کے ان کو سب سے بڑا عالم مانتا ہوں بلکہ اس لئے ہوں کہ انکا مسلک بھی حدیث کے مطابق ہے اور میرے بڑے بھی حنفی تھے۔حضرت کے زمانہ صدارت دارالعلوم دیوبند میں ایک مشہور عالم مصری محدث علی حنبلی جو ''صحیحین'' کے حافظ تھے مصر سے سورت اور راندیر آئے پھر دیوبند بھی پہنچے اور حضرت الاستاذ کے درس بخاری شریف میں کئی روز تک شرکت کی۔اثنائے درس میں سوالات بھی کرتے رہے اور حضرت جوابات دیتے رہے اور آپ نے پورا درس ان کی رعایت سے عربی میں ہی دیا تھا۔اس کے بعد علامہ مصری نے کہا کہ میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور بڑے بڑے محدثین سے ملا اوران کے ساتھ حدیثی مباحث کئے ہیں، خود مصر میں کئی سال حدیث کا درس دیا ہے لیکن میں نے اب تک اس شان کا محدث نہیں دیکھا جو امام بخاری، حافظ ابن حجر، علامہ ابن تیمیہ، ابن حزم وشوکانی وغیر کے نظریات پر تنقیدی نظر ومحاکمہ کرسکتا ہو۔اوران حضرات کی جلالت قدر کا پورا لحاظ رکھ کر بحث وتحقیق کا حق ادا کرسکے۔میں نے ان کو ہر طرح بند کرنے کی سعی کی لیکن ان کے استحضار علوم، تیقظ، حفظ واتقان، ذکاوت اور حسن نظر سے حیران ہوگیا۔علامہ موصوف نے

دارالعلوم میں تین ہفتے قیام کیا اور حضرت الاستاذ سے برابر استفادہ کرتے رہے اور سند حدیث بھی حاصل کی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر میں حلف اٹھالوں کہ شاہ صاحب امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو مجھے امید ہے کہ حانث نہ ہوں گا۔ حضرت شاہ صاحب کو یہ جملہ کسی نے پہنچایا تو بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ہمیں امام صاحب کے مدراک اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے۔ امام اعظمؒ کا اتباع میرے لئے وجہِ فخر ہے۔

(۲۲) حضرت الاستاذؒ معقول وفلسفہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ابطال جزءلا یتجزیٰ فلسفہ کا عام مسئلہ ہے۔ تمام فلاسفہ اس کے ابطال پر متفق ہیں۔ حضرت نے فلسفہ کے اس دعویٰ کی اس وقت دھجیاں اڑائی تھیں جب کسی نے ایٹمی توانائی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

(۲۳) درس بخاری شریف میں نہ صرف علوم حدیث پر کلام فرماتے تھے بلکہ دوسرے اہم مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کرتے تھے۔ اس طرح سے مجموعی اعتبار سے آپ سے قبل کسی کا یہ جامع طریقہء درس نہیں رہا ہے۔

(۲۴) جہاں تک فنونِ حدیث کا تعلق ہے میرے خیال میں حضرت الاستاذؒ کا اتقان اور وسعت نظر علامہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ سے بڑھ کر تھی۔

(۲۵) حافظ ابن حجر کی کمزوریوں کی نشاندہی درس بخاری میں خاص طور سے فرمایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حنفیہ کے موافق احادیث کو اپنے مواقع سے ہٹا کر ادھر ادھر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۲۶) عربی کے بے شمار اشعار یاد تھے اور ان سے جابجا استدلال فرمایا کرتے تھے۔ خود بھی عربی وفارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کی بہت سی نظمیں اور نعتیں مشہور ومعروف اور مقبول ہیں۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم آپ کی فنی حذاقت کی زندہ مثال ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے۔

(۲۷) حضرت الاستاذ کے علمی وعملی کمالات کی جامعیت کے لئے یہ سند سب سے بڑی ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے آپ ہی کو صدارت دارالعلوم دیوبند کے

لئے اپنا قائم مقام اور نائب نامزد کیا تھا۔ اس سے حضرت کے نورِ باطن کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۲۸) حضرت کے ذاتی اوصاف وکمالات بھی بلند پایہ تھے اور ان کمالات واوصاف میں علم کی گہرائی اور گیرائی اور قناعت وخودداری کا بہت بڑا درجہ تھا۔

(۲۹) چہرۂ انور پر عجیب طرح کا نور برستا تھا۔ گفتار، رفتار، کردار سب ہی اُسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قالب میں ڈھلے ہوئے تھے۔

(۳۰) تواضع وانکساری اس درجہ تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ دارالعلوم دیوبند کے تاریخی اختلافات کے زمانہ میں جب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو حضرت الاستاذ کی جگہ لایا گیا تو طلبہ کا بے حد اصرار تھا کہ خانقاہ کی مسجد میں بخاری شریف کا درس دیا کریں لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اس کے لئے کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔ جب بہت ہی اصرار کیا گیا تو فرمایا کہ حدیث کی کوئی چھوٹی کتاب پڑھادوں گا بخاری نہیں۔ اس سے حضرت کے وسعت ظرف اور وسیع القلبی کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۳۱) حضرت الاستاذ کی مجلس غیبت وعیب گوئی سے پاک ہوتی تھی۔ اس بارے میں بہت ہی محتاط تھے۔ سخت آزمائش کے موقع پر بھی اسی اصول پر قائم رہتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ مجمع بیٹھا ہوا ہے اور کسی نے کسی کے متعلق کوئی ایسی بات کہی جو حضرت کی رائے میں غیبت کی حدود میں آتی تھی تو حسبنا اللہ کہہ کر مجمع سے اٹھ جاتے تھے۔

(۳۲) اپنے ہم عصروں اور رفیقوں کے ساتھ بہترین سلوک کے عادی تھے ایک زمانہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ساتھ چند مسائل کا اختلاف پیش آیا تھا جس سے کچھ باہمی رنجش بھی پیدا ہوگئی تھی ان کو مکہ معظّمہ خط لکھ کر معذرت چاہی اور لکھا کہ غلط فہمیوں کے تحت آپ کے خلاف کچھ کہا تھا، اس کو معاف کریں۔

(۳۳) حق وصداقت کی راہ سے سرمو انحراف پر قادر نہ تھے۔ اختلافِ دیوبند کے زمانے میں سخت سے سخت آزمائشوں سے گذرے اور جسمانی وروحانی اذیتیں برداشت کیں مگر کلمۂ حق سے روگردانی نہیں کی۔

(۳۴) اپنے بڑے کے احترام واکرام میں غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے۔ میرے

والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ سے تعلق تھا۔ سفر میں ان کو امیر بناتے اور ادب واحترام حد سے زیادہ فرماتے تھے۔

(۳۵) آپ کے ادب واحترام کی شان اکابر تک ہی محدود نہ تھی بلکہ درس حدیث کے لئے دارالحدیث تشریف لے جاتے تھے، تو حدیث کے ادب کے خیال سے پہلے وضو فرماتے جس میں خاص طور سے مسواک خوب کرتے تھے اور حالانکہ تمباکو اور پان کی بہت عادت تھی مگر دوران درس میں جو بعض اوقات کئی کئی گھنٹوں کا ہوتا تھا پان نہیں کھاتے تھے۔

(۳۶) میں ہمیشہ سے آزاد رہا ہوں یہاں تک کہ فقہی مسائل میں بھی آزادی کی طرف مائل تھا اور اگر حضرت الاستاذؒ سے تلمذ و استفادے موقعہ نہ ملتا تو شاید حنفی نہ رہتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کے فیض صحبت سے اپنے جہل کا یقین ہو گیا۔ میں نے قلت فرصت و نا سازئ طبع کے باوجود کوشش کی کہ حضرت الاستاذ کے فضائل وکمالات کا تھوڑا سا عکس پیش کروں مگر ظاہر ہے کہ یہ حضرتؒ کے کمالات وخصائص کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ ع

گل تواں گفت و لے چیدن نیست

(۳۷) حضرت الاستاذؒ کی زندگی کا ایک نہایت اہم کارنامہ فتنۂ قادیانیت کا سدّ باب ہے۔ یہ فتنہ آپ کے زمانے میں جس قوت وشدت سے رونما ہوا اور برٹش سامراج کی نصرت وحمایت سے پروان چڑھا، پھر بانی فتنہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جو دلائل اپنی صداقت کے لئے پیش کئے۔ ان سے علمائے وقت کا بھی مرعوب ہو جانا ایسے حالات تھے کہ حق و باطل میں امتیاز دشوار ہو گیا تھا۔ حضرت نے اس بارے میں اپنی تمام توجہات مرکوز کر دیں اور علمائے امت کو اس فتنہ کے مہیب وخطرات سے آگاہ کیا۔ قادیانی دلائل کے دجل وفریب کو عالم آشکارا کیا۔ اسلام کے بنیادی عقائد کو مستحکم دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ ختم نبوت اور حیات ونزول مسیح علیہ السلام کو قطعی دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ثابت کیا۔ اکفار الملحدین، عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح میں قرآن وحدیث کے علاوہ نقول کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا کہ رہتی دنیا تک ان مسائل میں اضافہ کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ آپ کی یہ تمام تالیفات اسلامی ممالک میں

گئیں جن سے وہاں کے علماء وعوام بھی متاثر ومستفید ہوئے اور الحمدللہ آج پوری دنیائے اسلام قادیانیت کو خالص زیغ والحاد تسلیم کرنے پر متحد ومتفق ہوگئی ہے۔

مسئلہ ختم نبوت پر آپ کی ایک گراں مایہ تالیف خاتم النّبیین ہے جو آپ نے تقریباً عالم نزع میں تالیف فرمائی تھی۔ یہی آپ کی آخری علمی وتحقیقی کاوش ہے جو آپ نے فارسی زبان میں خاص طور پر اپنے وطن کشمیر کے لئے تحریر فرمائی تھی۔

(۳۸) تحقیق مسائل میں حضرت الاستاذ کا معیار نہایت اعلیٰ وارفع تھا۔ حضرت کسی بھی اہم مسئلہ کی تحقیق کے وقت قرآن وسنت کے بعد تیرہ سو سال کے اکابر ملت کے فیصلوں پر نظر ڈالتے تھے اور ان کے مراتب کے لحاظ سے ان کے فیصلوں کی قدر وقیمت قائم کرتے تھے۔ تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ لٹریچر جو میسر ہوسکتا تھا وہ آپ کے سامنے تھا۔ ان کے فیصلوں کو صحیح طور پر سمجھنے میں بھی اگر کسی سے کوتاہی ہوئی ہے تو وہ بھی نظر میں تھی اور اسکی نشاندہی فرما کر تصحیح کرتے تھے۔ یہی تحقیق کا طریقہ ہم نے اپنے قریبی دور کے محقق علامہ کوثری کا بھی دیکھا ہے۔

(۳۹) حضرت الاستاذ کے وسعت مطالعہ کی شان بھی عجیب تھی۔ خود فرماتے تھے کہ اب بعض کتابیں نئی طبع ہوکر مصر وغیرہ سے آتی ہیں۔ کئی کئی جلدوں کا مطالعہ کرتا ہوں تو بہت کم کوئی نئی بات حاصل ہوتی ہے۔ تقریباً ساری مطبوعات کا مطالعہ فرما چکے تھے اور اس شان سے کہ ان کے مضامین صفحہ وسطر تک کے حوالہ کے ساتھ دسیوں برس تک آپ کے حافظہ میں موجود رہتے تھے۔ کیوں کہ کثرتِ مطالعہ کے ساتھ حافظہ بھی بے نظیر تھا۔

(۴۰) حضرتؒ کو کسی بھی محقق کی اگر کوئی چیز زیادہ کھٹکتی تھی تو وہ اس کا تفرد ہوتا تھا۔ حضرتؒ کا نہایت پسندیدہ اور فطری وذوق سلیم یہ تھا کہ جمہور امت اور سلف کے خلاف کوئی بات اختیار نہ کی جائے۔ اور اس معیار سے اگر وہ کسی بھی بڑے شخص کا تفرد ملاحظہ فرماتے تو اس کی نشاندہی اور نقد ضرور فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے اساتذہ واکابر کی بھی ایسی کوئی بات ہوئی تو نرم انداز میں اس سے اختلاف کا اظہار ضرور فرمادیا کرتے تھے۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو حضرت کی ایک یہی خوبی دوسری سب خوبیوں سے فائق تھی۔

اب اپنی گذارشات کو ان سطروں پر ختم کرتا ہوں۔

محترم شیخ محمد عبداللہ صاحب کی ہدایت پر آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ نے اس سیمینار کا اہتمام کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔ حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہؒ کی ذات گرامی کشمیر ہی کے لئے نہیں پورے ملک بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لئے مایۂ صد ناز ہستی تھی۔ ایسا جامع کمالات صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے بعد سے اتنا بڑا محدث جس کی نظر حدیث اور اس سے متعلق فنون پر اتنی وسیع اور عمیق ہو نہیں آیا تھا۔ علامہ زاہد الکوثری کے بیانات اس سلسلہ میں لائق مطالعہ ہیں۔ جیسے جیسے وقت گذریگا اور علم وتحقیق کے قدم آگے بڑھیں گے اندازہ ہوگا کہ اوقافِ اسلامیہ نے یہ کتنی عظیم الشان علمی خدمت کی ہے۔ اس مرحلہ پر میں شیخ صاحب اور ان کے رفقائے کار کو مبارکباد دیتا ہوں۔ وادیٔ لولاب کو سلام جس نے ایسے عدیم المثال محدث کی اپنی آغوش میں پرورش کی۔ حضرت الاستاذؒ کی کوئی یادگار ان کے شایان شان سوپور یا سرینگر یا کسی دوسرے مناسب مقام پر قائم ہونی چاہیے۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی حضرت الاستاذؒ کے نام پر کوئی ٹھوس یادگار قائم ہونی ضروری ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی عہد آفریں شخصیت

از: حضرت العلام مولانا سعید احمد اکبر آبادی
سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حضرت الاستاذ العلام مولانا محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس صدی میں آیۃ من آیات اللہ اور حجۃ من حجج الٰہیہ تھے۔ اپنے علم و فضل، وسعت مطالعہ، دقت نظر، غیر معمولی قوت حافظہ اور حفظ و اتقان علم کے باعث عبقری یا (GENIUS) تھے۔ آپ کے اوصاف و کمالات پر ارباب وعلم نظر نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن حق یہ ہے کہ حق اب بھی ادا نہ ہوا ایک بڑے سے بڑے انسان کی عظمت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نے کسی عہد جدید کی تخلیق کی یا نہیں اور اگر کی تو کس حد تک؟ انگریزی میں اس کو HISTORY یا EPOCH MAKING کہتے ہیں، آیئے ہم اسی حیثیت سے شاہ صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیں۔

شاہ صاحبؒ کا زمانہ وہ تھا جب کہ غیر منقسم ہندوستان میں بڑے بڑے علماء اور مدارس عربیہ موجود تھے لیکن ان مدارس میں حدیث کی تعلیم اس طرح پر ہوتی تھی گویا حدیث فقہ کے تابع تھی، مدرس کی تقریر زیادہ تر احادیث سے اپنے فقہی مسلک کی تائید اور دوسرے فقہی مسالک کی تردید پر مشتمل ہوتی تھی نہ اسانید و طرق کا اہتمام ہوتا تھا اور نہ اسماء الرجال کا، علماء کا حال عموماً یہ تھا کہ یک فنی ہوتے تھے اگر کسی کو حدیث و تفسیر سے اشتغال ہے تو شعر وادب میں زیادہ درخور نہیں، اگر شعر وادب میں کمال حاصل ہے تو منطق سے بے بہرہ ہیں۔ اگر یہ سب کچھ بھی ہے تو فقہ سے مناسبت نہیں اور اگر ہے بھی تو معلومات صرف اپنے فقہی مسلک کے احکام اور ان کے دلائل و براہین تک محدود ہیں۔ دوسرے فقہی مسالک اور ان کے مآخذ پر نگاہ نہ ہوتی تھی، مطالعہ درسیات اور ان کے شروح وحواشی تک محدود ہوتا تھا۔ مخطوطات کی دنیا ان کی دسترس سے باہر تھی، ان کے مطالعہ اور تحقیق وتفحص کا کوئی ذوق نہ تھا۔

اس عالم میں حضرت الاستاذ العلام مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوئے۔ درس حدیث میں

حسب ذیل چند در چند نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔

(۱) آپ اسانید وطرق، متون کی صحت اور راویوں کے حالات کی تحقیق وتلاش پر بہت زور دیتے تھے، اور اس کا اتنا اہتمام تھا کہ ناموں کے صحیح تلفظ کا بھی خیال رکھتے تھے مثلاً کثیر زبیر ایسے نام ہیں جن کا تلفظ کئی طریقوں سے ہوسکتا ہے حضرت کو پورے ذخیرۂ اسماء الرجال میں یہ معلوم تھا کہ اس نام کا تلفظ کہاں کیا ہے؟ اور کہاں کیا؟ اپنی تحقیق پر اتنا اعتماد تھا کہ جو کچھ فرماتے تھے، پورے حزم ویقین کے ساتھ فرماتے تھے، چنانچہ زبیر نام کے سینکڑوں راوی ہیں لیکن آپ نے ایک مرتبہ درس بخاری میں فرمایا۔ صرف حدیث ام رفاعہ میں عبدالرحمٰن بن زَبیر ہے۔ اس کے علاوہ اور جہاں کہیں یہ نام آیا ہے، وہاں زُبیر ہے نہ کہ زَبیر۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے فرمایا فلاں فلاں جگہ کثیر پڑھنا چاہئے اور فلاں فلاں جگہ کُثیر۔ ظاہر ہے اس درجہ نازک معاملات میں پوری قطعیت اور حزم ویقین کے ساتھ وہی شخص ایک فیصلہ کن بات کہہ سکتا ہے جس نے کمال ژرف نگاہی سے احادیث اور اسماء الرجال کے پورے ذخیرہ کو کھنگال ڈالا ہو۔

(۲) اسماء کے صحیح تلفظ کے بعد راویوں کے جرح وتعدیل کا معاملہ آتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ کا معمول یہ تھا کہ کتب اسماء الرجال میں کسی راوی کی جرح وتعدیل میں جو کچھ لکھا ہوتا تھا صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ خود اس کے حالات کا سراغ لگا کر اور اس کے محامد ومثالب اور اس کے وجوہ واسباب کا تجزیہ وتحلیل کر کے اس کے متعلق اپنی آزاد رائے قائم کرتے تھے چنانچہ اربابِ نظر کو معلوم ہے کہ واقدی اور ابن اسحاق دونوں محدثین میں کتنے بدنام ہیں، امام شافعیؒ تو اوّل الذکر کو جھوٹ کی پوٹ ''مطیة الکذب'' کہتے ہیں، لیکن شاہ صاحبؒ فرماتے تھے واقدی کی عمر زیادہ ہوگئی تھی حافظہ کمزور ہوگیا تھا اور اس پر ستم یہ ہوا کہ ان کی بیاض جس میں احادیث درج تھی، ضائع ہوگئی اس بناء پر اب وہ محض اپنی یادداشت سے جو روایت کرتے تھے اس میں اختلاط اور تلبیس پیدا ہوجاتی تھی۔ پھر فرمایا کہ حدیث میں وہ ثقہ اور متقن نہ ہوں لیکن مغازی میں ان کی امامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ابن اسحاق کی نسبت آپ کی رائے تھی کہ وہ محدثین کے نزدیک مقبول نہیں ہیں

لیکن بحیثیت مورخ کے ان کا مرتبہ ومقام مسلم ہے، اگر کسی کتاب میں نام غلط چھپا ہوتا تھا تو اس کی تصحیح کرتے اور اس سے متنبہ فرماتے تھے، چنانچہ تخریج زیلعی میں ایک جگہ راوی کا نام زحمویہ بالزاء المعجمہ چھپ گیا ہے۔تو آپ نے فرمایا یہ کاتب کا سہو ہے۔ورنہ اصل نام راء مہملہ کے ساتھ رحمویہ ہے۔(العرف الشذی:ص:۱۱۵)

(۳) راویوں کے ناموں کی تصحیح اور ان کے اسباب جرح وتعدیل کی تحقیق کی طرح ایک حدیث جتنے اسانید وطرق سے مروی ہوتی تھی، حضرت شاہ صاحب ان سب پر بالاستیعاب الگ الگ کلام کرتے اور ان کا مرتبہ ومقام متعین فرماتے تھے۔یہی حال متون حدیث کا تھا۔ایک متن کے جتنے ٹکڑے ہوتے آپ ان کو جمع کرتے اور ایک ہی متن میں الفاظ میں جوردوبدل ہوتا۔اس کی مکمل نشاندہی کرتے تھے۔اس طرح ایک حدیث چھن چھنا کر سامنے آجاتی تھی اور اب وہ اس قابل ہوجاتی تھی کہ اس سے متعلقہ فقہی مسئلہ کے استنباط واستخراج کے وقت اس کی صحیح پوزیشن متعین، کی جاسکے۔اس سلسلہ میں محدثین وفقہاء سے اگر بھول چوک ہوجاتی تھی تو آپ اس کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے تھے، چنانچہ آپ کی ترمذی اور بخاری کی درسی تقریریں جن کو آپکے لائق وفائق تلامذہ نے مرتب اور مدوّن کرکے شائع کردیا ہے، اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔

(۴) چوں کہ احادیث اس پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرمودات کا مجموعہ ہیں۔جس نے خود اپنے متعلق فرمایا تھا، اوتیت جوامع الکلم وانا افصح العرب والعجم۔ اس بناء پر کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو کما حقہ سمجھنے کے لئے عربی لغت، اس کے محاورات وضروب الامثال، مختلف اسالیب بیان اور فن معانی وبیان وبلاغت میں درک وادراک ونبوغ ومہارت کی ضرورت ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ کو ان تمام چیزوں کا فطری اور بہت اعلیٰ ذوق تھا۔چنانچہ درس میں آپ ان مسائل پر بھی کثرت سے کلام کرتے تھے اور اس دیدہ وری اور فنی بصیرت کے ساتھ کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سعدالدین تفتازانی یا عبدالقاہر جرجانی زینتِ مسند درس ہیں۔

(۵) قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے ائمۂ قدیمہ اور مختلف تاریخی واقعات

وحوادث کا ذکر آیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ ان پر سے سرسری نہیں گذرتے تھے، بلکہ اپنی عادت کے مطابق کتب قدیمہ اور قدیم مآخذ کی روشنی میں ان میں سے ایک ایک چیز کی تاریخی وجغرافیائی تحقیق کرتے اور اسے بیان فرماتے تھے۔ اسی طرح بخاری میں فلسفہ اور علم کلام کے سینکڑوں مسائل پھیلے ہوئے ہیں۔ جب وہ آتے تو اس وقت حضرت الاستاذ کی روانیٔ طبع دیدنی ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اشعری اور ابن رُشد کی روح قلب انوری میں بول رہی ہے۔ حضرت الاستاذؒ مروّجہ اصطلاح میں خطیب یا مقرر نہیں تھے، جو بات بھی کہتے نپی تلی کہتے اور جو مضمون بھی بیان فرماتے اسے ناپ تول کر بیان فرماتے تھے اس میں حشو وزوائد نہیں ہوتا تھا۔ وہ اعادہ وتکرار کے نقص سے پاک اور سرتاسر مواد اور معلومات سے پُر ہوتا تھا، پھر کوئی بات بھی بغیر سند اور تحقیق کے نہیں ہوتی تھی۔ زیر بحث وگفتگو موضوع کا ہر جز مدلل اور مبرہن ہوتا تھا یہاں تک کہ درمیان میں موضوع کی خشکی دور کرنے کے لئے آپ کبھی ظرافت یا بذلہ سنجی کا مظاہرہ بھی فرماتے تو اس میں شعر وادب یا کسی اور کہانی کی چاشنی ہوتی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا کلام صحیح معنی میں اطناب ممل اور ایجاز مخل سے دور قلَّ وَدَلَّ کا نمونہ ہوتا تھا، جو عین بلاغت ہے۔ بعض اوقات سوچتا ہوں تو خیال گذرتا ہے کہ حضرت الاستاذ کا یہ مخصوص طرز کلام اس لئے تھا کہ آپ سیرت وصورت، فضائل وشمائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیکر تھے، یہاں تک کہ شمائل ترمذی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار کے متعلق مذکور ہے، کانما ینحد رمن صبب یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ اونچائی پر سے اتر رہے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ جب اپنے کمرہ سے مسجد یا درس گاہ تشریف لاتے تھے تو میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا تھا۔ یوں کہ مجھے اس رفتار میں طرز خرام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس نظر آتا تھا۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طبعی مماثلت کا یہ اثر حضرت الاستاذ کے طرزِ کلام میں نظر آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر مختصر مگر (TO THE POINT) ہوتی تھی اور کثرت کلام آپ کو سخت ناپسند تھی۔ ارشاد ہوا۔

اِنَّ اَبْغَضَکُمْ اِلَیَّ الثرثارون المتفیھقون المتشدقون حضرت شاہ صاحبؒ کا بھی طبعاً اسی پر عمل تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی طبیعت بے حد متجسس متفحص اور تحقیق پسند تھی، ہر چیز جس سے واسطہ پڑتا اس کی حقیقت و ماہیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے، ایک مرتبہ کشمیر کے خصی مرغ کا ذکر آ گیا تو اس کی دسیوں قسمیں اور ان کے خواص بیان کر دیئے۔ کسی پھل یا کسی حیوان کا ذکر آیا اور اس پر فوراً ایک لکچر دے دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ علم النباتات (BOTANY) اور علم الحیوانات (ZOOLOGY) جن پر متقدمین عرب کی کافی تصنیفات ہیں وہ بھی مطالعہ سے گذر چکی تھیں۔ ذہانت و فطانت خداداد کے ساتھ حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو کچھ پڑھ لیا یا معلوم کر لیا حافظہ میں جم گیا اور نسیان و ذہول سے محفوظ ہو گیا، اسی بناء پر جتنا بھی علم تھا ہر وقت مستحضر تھا۔ طبیعت ذرا ادھر متوجہ ہوئی اور معلومات کا چشمہ اُبلنے لگا۔ سائنس ہمارے زمانہ میں فطرت کی نیرنگی کا عجیب و غریب مظہر ہے اس نے کائنات کا رخ بدل دیا اور انسان کی فکر و نظر میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے، اس بناء پر کیوں کر ممکن تھا کہ حضرت الاستاذ کی طبع وقاد و متجسس کو اس طرف توجہ نہ ہوتی، آپ انگریزی یا کوئی اور مغربی زبان نہیں جانتے تھے، لیکن عربی میں کس چیز کی کمی ہے سائنس کے باوا آدم آئزک نیوٹن (IZAC NEWTON) کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور سائنس پر کچھ اور کتابیں بھی عربی میں چھپی ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سب کتابوں کو منگوایا انہیں بکمال توجہ پڑھا اور ان کتابوں کے مضامین پر اس درجہ حاوی ہو گئے کہ عصر کے بعد سائنس کا باقاعدہ درس دینا شروع کر دیا جس میں مولانا بدر عالم، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی شریک ہوتے تھے۔ ساتھ ہی علامہ جوہر طنطاوی کی دس بارہ جلدوں میں تفسیر جواہر القرآن جو سائنس کے مختلف علوم و فنون سے بھری پڑی ہیں، اس کو از اوّل تا آخر حرفاً حرفاً پڑھا اور جیسا کہ فرمایا کرتے تھے اس سے متاثر ہوئے تو اب سائنس کی معلومات اور اس کے دقیق مباحث و مطالب کے علم میں اور وسعت پیدا ہو گئی، فرق صرف یہ رہ گیا کہ حضرت الاستاذ کا سائنس کا علم جو کچھ بھی تھا نظری (THEORITICAL) تھا، کسی تجربہ گاہ یا لیبارٹری کے میسر نہ ہونے کے باعث اس کا عملی تجربہ (PRACTICAL EXPERIENCE) نہ کر سکے تھے۔ لیکن اس نظری علم میں ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ سائنس کے اساتذہ اور

طلباء اس کا اعتراف کرتے تھے، چنانچہ مولانا بدرعالم صاحبؒ کے بھانجہ سید محمد عقیل صاحب جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس اور نہایت قابل بی ایس سی (.B.Sc) تھے انہوں نے خود مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ دیوبند آئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر ایتھر جس کو عربی میں اثیر کہتے ہیں اس کے متعلق چند سوالات کئے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سوالات کے جواب میں جو تقریر کی سید محمد عقیل کہتے تھے کہ وہ ایسی جامع اور مدلل تھی کہ ہماری یونیورسٹی کا ایک سائنس کا پروفیسر اتنا ہی کچھ کہہ سکتا تھا۔

ایک اور واقعہ سنئے غالباً ۱۹۲۷ء میں حضرت شاہ صاحبؒ جمعیۃ علمائے ہند کی ایک سالانہ کانفرنس کی صدارت کے لئے پشاور تشریف لے جارہے تھے لاہور راستہ میں تھا، ٹرین کافی دیر یہاں ٹھہرتی تھی، اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ سے ملاقات کے لئے لاہور کے جو حضرات اسٹیشن پر تشریف لائے ان میں ایک صاحب مولانا سید محمد طلحہ ٹونکی بھی تھے۔ موصوف اورینٹیل کالج لاہور میں عربی کے استاذ تھے، جو حضرات ان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ موصوف نہایت ذہین وطباع اور علوم جدیدہ کے بڑے رسیا تھے، لاہور میں ہر مضمون کے استاد اور پروفیسر موجود تھے وہ ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے، میں ان دنوں میں لاہور میں ہی تھا۔ مولانا سید محمد طلحہ صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، اتفاق ایسا ہوا کہ اسٹیشن نہ جاسکا تھا دوسرے دن مولانا سے ملاقات ہوئی تو اپنے خاص انداز میں کچھ مٹک کر کہنے لگے ارے بھئی! مولوی انور شاہ تو عالم یا علامہ نہیں وہ تو علم کے پہاڑ ہیں پہاڑ، میں نے ان سے (Gravity) کشش کے متعلق سوال کیا۔ تو انہوں نے وہی کہا جس کو میں سائنس کے پروفیسروں سے یہاں سنتا رہا ہوں۔

ابن خلدون کا نظریہ ہے کہ جو شخص جتنا بڑا عالم ہوگا اسی تناسب سے شاعر کم درجہ کا ہوگا۔ اس کے برخلاف حضرت شاہ صاحبؒ کا حال یہ تھا کہ بایں ہمہ استغراق وانہماک فی العلم کے وہ عربی اور فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے، عربی میں آپ کو ابوالعلاء معری اور فارسی میں خاقانی کا ہمرنگ کہا جاسکتا ہے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا سخت حیرت واستعجاب سے سنا جائے گا اور واقعہ یہ ہے کہ جس

شخص کو حضرت الاستاذ سے کسب فیض کی سعادت حاصل نہیں ہوئی وہ اندازہ کر ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے وجودِ مسعود کی شکل میں اپنی کتنی بڑی نشانی اور حجت اہل علم پر ظاہر کی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے تصنیف و تالیف کو کبھی اپنا مستقل مشغلہ نہیں بنایا کیوں کہ خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو کے باعث مطالعہ میں اس درجہ استغراق وانہماک تھا کہ کسی اور طرف طبیعت متوجہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں طبعاً اس درجہ فروتن اور منکسر المزاج تھے کہ کبھی اپنی ہستی کو کچھ جانا ہی نہیں، وہ تو اللہ نے خیر کی اور ارباب علم کی خوش قسمتی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ترمذی و بخاری کی درسی تقریروں کو بعض فاضل اساتذہ نے قلم بند کرلیا اور انہیں شائع کر کے وقف افادۂ عام و خاص کر دیا۔ ان کے علاوہ خود حضرت شاہ صاحبؒ نے بعض وقتی اور ہنگامی حالات سے چند رسالے اور کتابیں زیور تصنیف سے آراستہ کیں، ان کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کی بعض قیمتی اور بلند پایہ تحقیق پر مشتمل چند یادداشتیں تھیں ان کو بھی آپکے بعض ارشد تلامذہ نے بعینہٖ یا اپنی شروح اور حواشی کے ساتھ طبع کر کے عام کر دیا۔ پھر بعض رسالے ایسے بھی ہیں جنہیں حضرت نے خود اپنے ذاتی شوق اور جذبہ سے تصنیف کئے۔ بس لے دے کے یہ ہے کہ حضرت الاستاذ کا تصنیفی سرمایہ! آپ کی وجاہت علمی کے پیش نظر یہ اگر چہ کوئی بڑا سرمایہ نہیں ہے، لیکن اس میں علوم وفنون نقلیہ وعقلیہ کے وہ انمول خزانے دفن ہیں جو ارباب علم و تحقیق کے لئے ہمیشہ سرمہ نورِ نظر اور حرزِ جان بنے رہیں گے چنانچہ عالم اسلام کے وہ اکابر علم و تحقیق جن کو براہِ راست حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت حاصل نہیں ہوئی وہ آپ کی چند تصنیفات اور علمی افادات کو پڑھ کر ہی اسیر دام گیسوئے انوری ہو گئے۔ علامہ زاہد کوثری عہد حاضر کے نہایت بلند پایہ اور محقق مصر کے ہیں انہوں نے حضرت الاستاذ کے دو رسالے دیکھے تو اپنی تصنیف ''تانیب الخطیب'' میں لکھا ''رفع یدین کے موضوع پر جانبین سے خاص خاص کتابیں لکھی گئیں ہیں لیکن اس موضوع پر علامۂ بحر و بر مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے جو دو کتابیں نیل الفرقدین وبسط الیدین کے نام سے لکھی ہیں۔ ان میں سب کا لب لباب آ گیا ہے۔ اور یہ موضوعِ بحث پر شافی وکافی ہیں''۔ (الانور: ص:۳۳۹)

حدوثِ عالم، فلسفہ وعلم الکلام کا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر دو رسالے تالیف کئے ہیں، ایک ضرب الخاتم علی حدوث العالم اور دوسرا مرقاۃ الطارم لحدوث العالم، پہلا رسالہ چار سو اشعار پر مشتمل ہے۔ ان چار سو اشعار میں کتنے حوالے ہیں؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذ رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ ان حوالوں کو جمع کرنے بیٹھے تو ایک سو صفحات میں آئے، دوسرے رسالہ کی نسبت مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

''ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری جو رد مادیین و دہریین میں نہایت متخصص عالم تھے، میں نے ۱۹۳۸ء میں قاہرہ میں ان کو یہ رسالہ دیا تو اسے پڑھ کر فرمایا: میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی دنیا میں کوئی زندہ ہے۔ پھر فرمایا: ''جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جاچکا ہے، اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اسفارِ اربعہ پر بھی اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں'' (الانور: بحوالہ: حیاتِ انور: ص:۳۴۶)

علامہ سید رشید رضا صاحب المنار قاہرہ جو عالم اسلام کے نامور عالم اور محقق ہیں، دیوبند آئے وہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی فی البدیہہ عربی میں مسلک دیوبند پر تقریر سن کر انہوں نے کیا اثر لیا اور حضرت الاستاذ کے متعلق کیا لکھا؟ وہ اس قدر مشہور واقعہ ہے اور اتنے لوگوں نے اس کو لکھا ہے کہ اسے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شیخ عبد الفتاح ابوغدہ نامور عالم اور مصنف ہیں، وہ حضرت شاہ صاحبؒ کی کتابوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ حضرت شاہ صاحب کی دو کتابیں اپنے مقدمہ کے ساتھ بڑے اہتمام سے دمشق سے شائع کرچکے ہیں۔ اور غالباً ابھی اور کتابیں چھاپنے کا بھی پروگرام ہے۔

یہ بیرونی افاضل تو وہ ہیں جنہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک دو رسالے دیکھے یا ایک تقریر سنی اور ایک رائے قائم کرلی، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جو علماء اور فضلاء خود برصغیر ہندو پاک کے باشندے تھے اور اس بناء پر ان کو حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات سے براہِ راست استفادہ کا موقع تھا ان کی کیا رائے ہوگی؟ اگرچہ علامہ ذہبی کے بقول علماء کے لئے معاصرت فتنۂ عظیم ہے، تاہم حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ

اپنے اور پرائے سب ہی آپ کی عظمت وجلالت علم کے کھلے دل سے معترف ہیں، چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے فتح الملہم فی شرح مسلم اور فوائد القرآن میں جگہ جگہ حضرت شاہ صاحبؒ سے استفادہ کیا اور مسئلہ متعلقہ میں آپ کی رائے کو متقدمین علماء کی رائے پر ترجیح دی ہے۔ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ حضرت شاہ صاحب کو امام غزالی ورازی کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کے نزدیک حضرت شاہ صاحب علم کے ایسے سمندر ہیں کہ جس کی تھاہ ہی نہیں ہے، مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک مرتبہ فرمایا جو شخص یہ قسم کھائے کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ اس زمانہ کے بے نظیر عالم ہیں تو وہ اپنی قسم میں حانث نہیں ہوگا، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے فرمایا: ''میں ایسے حضرات کو جانتا ہوں جنہیں بخاری اور مسلم از بر تھیں لیکن حضرت مولانا انور شاہ کے علاوہ کسی ایسے عالم دین سے واقف نہیں ہوں جس کے سینہ میں پورا کتب خانہ ہی محفوظ ہو'' مولانا ابراہیم میر صاحب سیالکوٹی جماعت اہل حدیث کے امام اور بلند پایہ عالم تھے، آپ نے فرمایا: ''اگر مجسم علم دیکھنا ہو تو مولانا انور شاہ کو دیکھو'' یہ حال تو علماء کا تھا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں علامہ اقبالؒ سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے، علامہ کو حضرت شاہ صاحبؒ سے جو غایت درجہ کی عقیدت وارادت تھی، اسے دنیا جانتی ہے، بیان کرنے کی ضرورت نہیں، خود حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے، مجھ سے جو استفادہ ڈاکٹر اقبالؒ نے کیا ہے کسی عالم نے نہیں کیا۔ (یہ سب اقوال حیات انور اور الانور سے ماخوذ ہیں)

ایک شخصیت کی تعمیر میں غزارتِ علم وفن کے باوصف اس کے اخلاق، سیرت اور کردار کا بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے، آیئے اب اس حیثیت سے بھی اس شخصیت کا جائزہ لیں۔

حضرت شاہ صاحب طبعاً نہایت غیور وخوددار مگر بے انتہا حلیم وبردبار، جلالتِ شان کے ساتھ ابھرتے اور حافظ ابن حجر، علامہ ابن تیمیہ، ابن قیم، اور امام نووی، وغیرہم پر جب موقع ہوتا تھا، تنقید کرتے تھے۔ لیکن لب ولہجہ ہمیشہ نہایت شستہ اور مہذب رکھتے تھے۔ کبھی کوئی بات غیر سنجیدہ اور غیر مہذب زبان سے نہیں نکلتی تھی۔ مخالف سے مخالف کا بھی ادب واحترام ملحوظ رکھتے اور اس کے علمی مرتبہ ومقام کا اعتراف برملا کرتے تھے، وسعت علم نے

وسعتِ نظر اور عالی حوصلگی پیدا کی تھی مولویانہ کٹ حجتی، خوردہ گیری، سخن پروری، اور سخن سازی کا دور تک کہیں نام ونشان نہ تھا۔ جو بات فرماتے کھلے دل ودماغ سے ایمانداری اور دیانت داری سے فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت الاستاذ نے اگر چہ فقہ حنفی کی نہایت عظیم الشان اور ٹھوس خدمت انجام دی ہے لیکن اس میں کبھی دھاندلی اور سخن پروری کو راہ نہیں دی بلکہ اگر کہیں کمزوری نظر آئی ہے تو بے تکلف اس کی نشاندہی بھی فرمائی ہے۔ اختلافی معاملات ومسائل میں آپ کا مسلک نہایت معتدل اور متوازن تھا، اتباع سنت کا بڑا خیال اور لحاظ رکھتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ہم لوگوں سے فرمایا کہ کبھی کبھی رفع یدین بھی کرلیا کروتا کہ سنت پر عمل ہوجائے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ نفل نماز کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے لیکن کبھی کبھی بیٹھ کر بھی پڑھ لیا کرو، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طرح نفل نماز پڑھی ہے۔ تراویح کی نسبت فرمایا کہ کبھی کبھی اسے ناغہ کردینا اور کبھی آٹھ کبھی بارہ رکعات بھی پڑھنا چاہیے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا، فیاض اور دریادل اس درجہ تھے کہ قلیل آمدنی کے باوجود کبھی کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں لوٹا اور جہاں تک میں نے دیکھا ہے کبھی انہوں نے کسی سائل کو ایک روپیہ سے کم نہیں دیا۔

رہی خاکساری، فروتنی اور انکساری، اس کے متعلق میں کیا عرض کروں، صرف ایک واقعہ سناتا ہوں، اس پر قیاس کرلیجئے۔ ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے وہاں محمد صادق صاحب کشمیریؒ نام کے ایک مشہور بیرسٹر بھی رہتے تھے، ان کو حضرت شاہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی اس لئے وہ خدمت میں حاضر تو ہوگئے لیکن حضرت شاہ صاحب کے سامنے بیٹھے ہوئے ان کو اپنی مغربی وضع قطع اور ہیئت پر شرمندگی ہورہی تھی اور جھینپے جھینپے بیٹھے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے اسے تاڑلیا اور فرمایا: بیرسٹر صاحب! آپ کیوں اس بات پر شرمندہ ہورہے ہیں کہ میری ڈاڑھی اتنی بڑی ہے اور وضع پارسایانہ ہے اور آپ کی داڑھی مونچھ صاف ہے اور ہیئت فرنگیانہ ہے؟ کیوں کہ فعل اگر چہ ہمارا مختلف ہے مگر غرض ایک ہے اور وہ ہے روٹی، اگر آپ بیرسٹر ہوکر میری وضع اختیار کرلیں تو آپ کو بیرسٹری کی روٹی نہ دے، اسی طرح اگر میں آپ کی وضع قطع اختیار کرلوں تو مجھے مولویت کے نام سے روٹی نہیں ملے، پس جب ہم دونوں

کی غرض ایک ہی ہے تو آپ کیوں شرمندہ ہوں، غور کیجئے کمال انکساری کے ساتھ حضرت شاہ صاحب نے امت اسلامیہ پر کس درجہ بھرپور مگر حسرت ناک طنز کیا ہے۔ ؎

قابل رحم ہے اس شخص کی رسوائی بھی ❁ پردہ پردہ ہی میں کم بخت جو رسوا ہو جائے

ایک عہد آفریں شخصیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ملک وقوم میں ایسے افراد پیدا کرے جو اس کے مشن اور اس کے کام کو دنیا میں فروغ دیں اور علم وفن کے کارواں کو آگے بڑھنے میں مدد دیں۔ جب اس پہلو سے ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت لائق وفاضل تلامذہ جس کثرت سے اور جس نوعیت کے پیدا کئے۔ اس زمانہ میں کسی نے پیدا نہیں کئے میں نام لینے کا عادی نہیں ہوں اور اگر نام گناؤں بھی تو کس کس کے، دو چار، دس بیس ہوں تو انہیں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں قطار اندر قطار ہوں، ان کی گنتی کون کرے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ آج ہندوستان اور پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی دیوبند سے تعلق رکھنے والے پرانی نسل کے جو حضرات درس، افتاء تصنیف وتالیف، ارشاد وہدایت، وعظ وتبلیغ، صحافت، قومی وملی خدمات کے میدانوں میں نمایاں کام کر رہے ہیں اور ان میں کتنے ہیں جو خدا کے پیارے ہو گئے، یہ سب گلشن انوری کے خوشہ چیں اور حضرت شاہ صاحب کے صحبت یافتہ ہیں، ان حضرات نے علم وفن کے لالہ زار اگائے اور اسلامی ثقافت کے ہر شعبہ میں گل وگلزار پیدا کئے ہیں۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس سے صاف طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کی طرح حضرت الاستاذ العلام مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی شخصیت بے شبہ ایک عہد آفریں شخصیت تھی۔ آپ نے علوم اسلامیہ اور خصوصاً فن حدیث کے درس وتعلیم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا، علماء میں ذوق تحقیق وتدقیق پیدا کیا، ان کو استنباط واستخراج مسائل میں ایک وسیع نقطۂ نظر عطا فرمایا، اپنے علم وفضل اور ہر فن میں اپنی مجتہدانہ آراء سے اپنے زمانہ کے علماء وفضلاء اور دوسرے ارباب علم ودانش کو متاثر کیا اور ایک نسل ایسی پیدا کی جس نے زمانہ کے معیار علمی وخدمت ملی کا رنگ بدل دیا۔ ایک عہد آفریں شخصیت کی یہی خصوصیات ہوتی ہیں اور بے شک وشبہ حضرت شاہ صاحبؒ کی عظیم شخصیت ان تمام

خصوصیات اور اوصاف وکمالات کی جامع اتم تھی۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام☆بسیار خوبان دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علم وفضل کا ابرِ کرم عالم اسلام کے ہر گوشہ اور ہر خطہ پر برسا اس بناء پر آپ کی شخصیت بین الاقوامی ہے لیکن کشمیر جنت نظیر کی سرزمین کو آپ کے مولد ومنشاء ہونے کا فخر حاصل ہے، وہ کسی مقام کو نہیں۔ علامہ اقبال اور حضرت شاہ صاحب دونوں معدن کشمیر کے وہ کوہِ نور ہیرے ہیں، جنہوں نے اس سرزمین کو لالہ وگل کی کلاہِ افتخار میں چار چاند لگائے ہیں، انگریزوں کا زمانہ غلامی کا زمانہ تھا اس لئے کشمیر کا ورثۂ علمی وثقافتی نذرِ تغافل رہا لیکن اب جب کہ ہم آزاد ہیں، ہمیں اپنے اس ورثہ کا جائزہ لے کر اس کی خاطر خواہ قدر دانی کا ثبوت دینا چاہئے جیسا کہ دنیا کے سب ملک اور ہندوستان کی مختلف ریاستیں کر رہی ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال پروفیسر کی چیئر'' پیدا کر کے اس راہ میں نہایت مستحسن اور ضروری اقدام کیا گیا ہے، تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اسی طرح کا اقدام کشمیر یونیورسٹی میں عربی یا اسلامیات کی ایک چیئر حضرت شاہ صاحبؒ کے نام پر یا ''مولانا انور شاہ اکاڈمی'' کے نام سے ایک اکاڈمی قائم کی جائے۔

حضرت محدثِ کشمیریؒ کا ذوقِ تفسیری

از: جناب مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی
مدیر ''الحرم'' (سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

کتاب اللہ العظیم قرآن کریم کی جلالت وعظمت کے پیش نظر اس کے فہم وتفہیم اور تاویل وتفسیر کے آداب وشروط پر علمائے محققین نے مفصل گفتگو کی ہے۔ (حافظ عماد الدین بن کثیر دمشقی، علامہ جلال الدین سیوطی، حافظ ابن تیمیہ، حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، علامہ عبدہ المصری وغیرہم نے اپنے اپنے انداز میں دادِ تحقیق دی ہے) ماحصل یہ ہے کہ قرآن کریم، جہاں تک ایمان کی تازگی، نصیحت پذیری، اقوام سابقہ کے واقعات سے عبرت اندوزی اور دینی ودنیوی فلاح وصلاح کے بنیادی اصول سے واقفیت کا تعلق ہے وہ ایک آسان کتاب ہے اس کے صفحات ہر طالب حق کے لئے آئینۂ رُشد وہدایت ہیں۔ یہی منشاء ہے اس ارشاد کا:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ.

اور ہم نے قرآن کو نصیحت پذیری کے لئے آسان بنایا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟

لیکن جہاں تک قرآن کریم کے مقاصد عالیہ کو سمجھنے، ان کے اسرار وحکم سے واقفیت حاصل کرنے، اس سے احکام شرعیہ کو مستنبط کرنے اور زندگی کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی رہنمائی حاصل کرنے کا تعلق ہے۔ علامہ سیوطی صاحب الاتقان نے پندرہ علوم میں مہارت شرط قرار دی ہے تاہم چند شرائط ضروری ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ عربی زبان کا صحیح ذوق ہو۔ علوم ادبیہ پر گہری نظر ہو۔ محاسن زبان واسالیب بیان کا اداشناس ہو۔ کسی بھی زبان کے اُدباء وبلغاء کے کلام سے استفادہ کے لئے یہ بنیادی شرط ہے۔ اقبال وغالب کے کلام کا مطالعہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کلام کا کیا ذکر ہے جس کے معانی کی طرح اس کے الفاظ بھی معجزانہ ہوں۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ صاحب کتاب، مہبطِ وحی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سنیہ پر گہری نظر ہو، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی مقدس بندہ کو رسالت کے لئے انتخاب فرماتا ہے تو اسے اپنے بھیجے ہوئے پیغام کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت بھی عطا فرماتا ہے۔

وَمَآ اَنزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَھُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْہِ.

اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ پر یہ کتاب اسی لئے اتاری ہے تاکہ جن باتوں میں لوگوں میں اختلاف ہے، آپ ان کی وضاحت کردیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص فہم عطا ہوتی ہے جس سے وہ کتاب اللہ کی تبیین وتوضیح کرتا ہے۔ وہ بھی وحی ہی ہوتی ہے مگر غیر متلو۔ حافظ ابن کثیرؒ امام شافعیؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں۔

وَالسُّنَّةُ اَیْضًا تُنَزَّلُ عَلَیْہِ بِالْوَحْیِ کَمَا یُنَزَّلُ الْقُرْآنُ اِلَّآ اَنَّھَا لَا یُتْلٰی کَمَا یُتْلٰی الْقُرْآنُ. (تفسیر ابن کثیر۔ مقدمہ مطبوعہ مصر)

یہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کو حق شناسی اور خدا پرستی کے سانچہ میں ڈال کرامت کے لئے اسوۂ اور نمونہ بنایا جاتا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

تمہارے لئے اللہ کے پیغمبر کی ذات میں بہتر نمونۂ زندگی ہے۔

پھر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال سے قطع نظر کر کے وحیٔ الٰہی اور پیغامِ خداوندی سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ دنیوی حکومتوں میں بھی کسی ملک کے سربراہ کے فرمان اور گورنمنٹ کی پالیسی کی وضاحت کے سلسلہ میں اس ملک کے سفیر کا بیان ہی ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے اور اسی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال قرآن کی تفسیر وتشریح کے لئے صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سنیہ پر گہری نظر ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ اس مقدس گروہ کے اقوال وآثار پر بھی نظر ہونی چاہیے، جس نے دبستانِ نبوت میں براہِ راست پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کی اور

جنہوں نے اس معاشرہ کی تشکیل کی جو قرآنی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔علامہ ابن خلدون مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

وكان النبی صلی اللّٰه عليه وسلم يبين المجمل ويميز الناسخ والمنسوخ ويعرّفه اصحابه فعرفوه وعرفوا سبب نزول الآيات ومقتضى الحال منها منقولاً عنه (مقدمۃ ابن خلدون:ص:۴۸۳مطبوعہ مصر)

(۳) تیسری شرط: ''تقویٰ'' ہے۔ تقویٰ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کے نتیجہ میں ان باتوں سے احتراز کرنا جو اس کی ناراضی کا سبب ہوسکتی ہیں۔تقویٰ کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ بندہ کے دل میں خدا کا ڈر ہو اور درجۂ کمال یہ ہے کہ خوفِ خدا کے سبب نہ صرف ممنوعاتِ شرعیہ کو چھوڑ دے بلکہ بعض ان مباحات سے بھی دستبردار ہو جائے جن کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ موصل الی المعاصی ہوسکتی ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

ويتم ذٰلک بترک بعض المباحات لما رُوِیَ الحلالُ بينٌ والحرامُ بينٌ وبينهما مشتبهاتٌ وَمَنْ وَقَعَ حَوْلَ الحِمٰى فحقيقٌ ان يقعَ فِيهِ. (مفردات امام الرغب)

اس کی تکمیل بعض مباحات کے ترک سے ہوتی ہے کیوں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں۔(لہٰذا بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ) جو شخص محفوظ چراگاہ کے آس پاس اپنے جانور چرائے گا وہ اس میں داخل ہوسکتا ہے۔

پھر جس طرح تقویٰ کے مدارج ہیں اسی طرح ہدایت کے بھی درجات ہیں۔قرآنی ہدایات کا ابتدائی درجہ حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کا ابتدائی درجہ ضروری ہے چنانچہ فرمایا گیا هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو)

حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے مذکورہ بالا ترجمہ فرما کر بہت سے شبہات کو ختم فرما دیا۔ظاہر ہے کہ جس کے دل میں خوفِ خدا ہی نہ ہوگا وہ خدا کی کتاب سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

البتہ ہدایت کے اعلیٰ درجہ تک وصول تقویٰ کے اعلیٰ درجہ کے حصول پر منحصر ہے اس لئے

معارفِ قرآنی سے کما حقہ، وہی بہرہ اندوز ہوسکتا ہے جسے تقویٰ کا اعلیٰ درجہ حاصل ہو، لہٰذا مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ متقی بھی ہو۔اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تفسیر قرآنی میں وہ خواہش نفسانی کا پیرو نہ ہوسکے گا اور اس کی تفسیر، تفسیر بالرائے نہ ہوگی۔

(۴) یہ تینوں صفات جن کا ذکر کیا گیا ہے اکتسابی ہیں۔ان کے علاوہ ایک صفت اور بھی ہے جس کا تعلق محض اللہ تعالیٰ کی موہبت وکرم سے ہے۔جس طرح پیغمبر خدا کو خدا کی طرف سے ایک خاص فہم اور ایک مخصوص بصیرت نبوت عطا ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بعض نیک نہاد اور پاک باز بندوں کو بھی اس نورِ بصیرت کا کچھ حصہ ملتا ہے اگر چہ اس کے لئے تقویٰ شرط ہے مگر علت نہیں۔یعنی ضروری نہیں کہ جو متقی ہو اسے یہ نورِ بصیرت بھی عطا ہو۔علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

علم الموهبة وهو علمٌ يورثه الله تعالىٰ لمن عمل بما علم واليه الا عادة بحديث من عمل بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ. (الاتقان: ج:۱، ص:۱۸۱، مطبوعہ مطبع ازہریہ مصر)

(۵) یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں بعض صغیر السن صحابہ کو اس عطیۂ خداوندی کا حصہ ان حضرات سے زیادہ مل گیا جو مقابلۃً صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مستفید ہوئے تھے۔چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس جو اصاغر صحابہ میں تھے قرآن فہمی میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔حضرت عمر جیسے جلیل القدر صحابی تفسیر قرآن میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور عبداللہ بن مسعود جیسے فاضل صحابی کا قول تھا کہ:

"نِعْمَ تَرْجُمَانُ القرٰان عبداللّٰه بن عباس"

اس کا سبب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی تھی۔

اسی طرح ہندوستان میں حضرت الامام الحجت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا خانوادہ یوں تو سب کا سب "ایں خانہ ہمہ آفتابست" کا مصداق تھا، مگر یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے باب میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ کو جو بصیرتِ خصوصی عطا فرمائی تھی اس میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہ تھا۔

اس تفصیل کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ حضرت الامام علامہ انور شاہ کشمیریؒ میں یہ تمام صفات بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں۔ عربی تقریر وتحریر اور نظم ونثر پر قدرت میں وہ مصر وشام کے اُدباء کے ہم پلہ تھے۔ ان کی عربی زبان میں برجستہ تقریریں، ان کی عربی تصنیفات، ان کے بلند پایہ عربی قصائد، ادب عربی میں ان کے کمال اور ان کے اعلیٰ لسانی ذوق کے شاہدِ عادل ہیں۔

۱۳۲۰ھ میں علامہ رشید رضا مصری مدیر ''المنار'' کی دیوبند تشریف آوری پر حضرت شاہ صاحبؒ نے علمائے دیوبند کی درسِ حدیث کی خصوصیات پر جو محد ثانہ ومحققانہ برجستہ عربی تقریر ارشاد فرمائی اس کو سن کر سننے والے حیران رہ گئے اور خود علامہ رشید رضا کا تو حال یہ تھا کہ بار بار کرسی سے اٹھتے تھے اور فرماتے تھے۔

''ما رأیت مثل ھذا الرجل قط'' (نظام تعلیم وتربیت از مولانا مناظر احسن گیلانی)

حضرت شاہ صاحب کے ارتجالاً شعر کہنے کا خود راقم الحروف کو ذاتی تجربہ ہے۔ ۱۹۲۹ء کا ہنگامہ خیز دور تھا۔ حضرت والا دولت کدہ پر بیرونی ومقامی اصحاب کے ایک مجمع میں گھرے بیٹھے تھے۔ کچھ اخبار نویس ہنگامۂ دیوبند سے متعلق آپ کا بیان لے رہے تھے، کشمیر کے ایک مہمان بھی مصروفِ گفتگو تھے عین اس وقت یہ ظلوم جہول بڑھا اور حضرت کے سامنے اپنا ایک تازہ قصیدہ جسے اخبار میں چھپوانا تھا پیش کر دیا۔ حضرت نے اس بیبا کی اور بے ادبی پر تنبیہ کے بجائے قلم ہاتھ میں لیکر فوراً مصرعے کے مصرعے تبدیل فرمادیئے۔ یہ اصلاح شدہ قصیدہ میرے پاس محفوظ ہے۔

جہاں تک سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے اس سلسلہ میں کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ کم از کم آپ کے زمانے میں اور اس کے بعد پورے عالم اسلام میں اس شان کا محدث پیدا نہیں ہوا اور علمائے ہند ہوں یا فضلائے مصر وشام وحجاز یہ سب ہی کا متفقہ فیصلہ ہے۔ علامہ رشید رضا کے فضل وکمال سے وہ لوگ واقف ہیں جنہوں نے آپ کی مرتّبہ تفسیر ''المنار'' کا مطالعہ کیا ہے ان کا اعتراف اوپر گذر چکا ہے۔ ایک دوسرے عالم اسلام کے عہد حاضر کے فاضل علامہ زاہد الکوثری نے حضرت شاہ صاحب کی بعض تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد فرمایا:

''احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث وعالم امت میں نہیں گذرا''۔

تیسری شرط تقویٰ تھی۔اس سلسلہ میں اس ماضی قریب کے ایک جلیل القدر بزرگ و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کا ایک ارشاد نقل کرنا کافی ہے۔آپ نے فرمایا۔

''کچھ دن میں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھا ہے ایک دفعہ سنہری مسجد امینیہ میں گیا تو دیکھا کہ حضرت حجرہ میں دروازہ بند کئے ذکر جہری میں مصروف ہیں، آپ اس زمانہ میں جوان العمر ہی تھے۔آپ کا دستور یہ تھا کہ باہر تشریف لے جاتے تو سر پر رومال ڈال کر آنکھوں کے سامنے پردہ کر لیتے کہ مبادا کسی غیر محرم پر نظر نہ پڑ جائے''۔

چوتھی شرط موہبتِ خداوندی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اللہ تعالیٰ کے اس انعامِ خصوصی سے بھی بہرہ اندوز تھے۔یہی وجہ ہے کہ تفسیر قرآن کریم اگر چہ آپ کا موضوع نہ تھا مگر احادیث پر گفتگو فرماتے ہوئے ضمناً یا بخاری شریف کی کتاب التفسیر سے گزرتے ہوئے جہاں کہیں جو کچھ آپ نے تفسیر قرآن کریم کے سلسلہ میں فرمادیا ہے وہ اپنی جگہ قول فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب میں اس سے قبل کہ حضرت علامہ کے تفسیری افادات میں سے چند دُرَرِ غُرَرْ آپ کے سامنے پیش کروں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بات امرِ واقعہ ہے کہ علوم قرآنیہ پر وسیع نظر کے باوجود حضرت شاہ صاحب حافظ قرآن نہ تھے۔مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ میں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے عرض کیا: ''حضرت! آپ کا حافظہ تو قرآن کریم کو چند دنوں میں حفظ کر سکتا تھا پھر کیا بات ہے (کہ آپ نے قرآن حفظ نہ کیا) حضرت شاہ صاحب نے جواب دیا ''قسمت، بخت، واللہ اعلم'' مولانا گیلانی کے اس بیان کو ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی اپنے مقالہ میں نقل کیا ہے۔مولانا گیلانی کو حضرت شاہ صاحبؒ نے یہی جواب دیا ہوگا۔مگر میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں اپنے دوست مولوی جمیل الدین صاحب میرٹھی (حال ریٹائرڈ رجسٹرار جامعہ عالیہ بھاولپور) سے سنا کہ کسی نے حضرت شاہ صاحبؒ سے یہی

سوال کیا تو آپ نے فرمایا ''بچپن میں تو والدین نے اس طرف متوجہ نہ کیا اب یہ ممکن نہ رہا۔اس لئے کہ قرآن کریم کی جو آیت پڑھتا ہوں معارف قرآن کا ایک طوفان سا امنڈ آتا ہے۔الفاظ ذہن سے نکل جاتے ہیں اور معانی ومطالب کی وادیوں میں گم ہو جاتا ہوں'' مجھے یقین ہے کہ اصل بات یہی تھی، تاہم جہاں تک اپنی معلومات ہیں حضرت شاہ صاحبؒ کو قرآن کریم پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ قادیانیوں نے میرٹھ کنٹونمنٹ کی ایک مسجد پر قبضہ کرنا چاہا مسلمانوں نے مزاحمت کی حکومت نے تصفیہ کے لئے نواب اسماعیل خاں مرحوم کو ثالث مقرر کر دیا۔

صورت مناظرہ کی سی پیدا ہوگئی۔قادیانی مولوی نے کہا ہم غیر آباد مسجد کو آباد کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ ہمیں روکتے ہیں۔پھر قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَااسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا.

(اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا ذکر کرنے سے روکا اوران کو اجاڑنے کی کوشش کی)

حضرت شاہ صاحبؒ نے برجستہ جواب دیا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْقَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْئٌ.

(اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی اتری ہے حالانکہ اس پر قطعاً وحی نہیں اتری۔)

اب میں اپنے موضوع پر آتا ہوں اور حضرت شاہ صاحب کے تفسیری ذوق کے چند نمونے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

قرآن کریم میں سورۂ حج میں فرمایا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَانَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰى اَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَايُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ٥

یہ آیت مہمات آیات میں سے ہے۔مفسرین قدیم وجدید نے اس کی تفسیر میں اپنے

اپنے ذوق کے مطابق نکتہ سنجیاں کی ہیں۔ مدارِ بحث یہ امور ہیں کہ تَمَنّٰی کے معنی آرزو کرنا ہے یا پڑھنا، امنیۃ سے آرزو اور خواہش مراد ہے یا کلام اِلْقَاءُ الشَّیْطَان سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد ہے یا دخل اندازی یا مزاحمت، اور آیات کے احکام سے کیا مقصود ہے؟

قاضی بیضاویؒ نے تین اقوال اس کی تفسیر میں نقل کیے ہیں جن میں سے دو میں واقعۂ غرانیق مراد لیا ہے۔ اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی مجلس میں بیٹھے اور آپ نے ان کو سورۃ النجم سنائی تو اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی. کے بعد آپ کی زبان مبارک سے سبقت لسانی سے یہ الفاظ نکل گئے تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی یا شیطان نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر کہہ دیئے۔

یہ قصہ روایت کے اعتبار سے ساقط الاعتبار اور مفہوم کے لحاظ سے مردود ہے۔ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو صاحب وحی کی عظمت اور وحی الٰہی کی حجیت مجروح و مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالاں کہ سارے دین کی بنیاد انہی پر ہے۔ علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں مختلف ائمہ نے طعن کیا ہے یہاں تک ابن اسحاق امام سیرت نے کہہ دیا ہے کہ یہ زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے اور خود قاضی صاحب نے بھی لکھ دیا ہے کہ کسی صاحب صحیح محدث نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ قاضی صاحب کے تیسرے قول کا جسے انہوں نے مرجح قرار دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ہر رسول اور نبی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ جب اس نے کوئی آرزو کی تو شیطان اس کی آرزو میں وہ باتیں ڈال دیتا تھا جن سے وہ دنیا میں الجھ جائے (اذازوّر فی نفسہ مایھواہ القی الشیطان فی تشھیہ مایوجب اشتغالہ بالدنیا) پھر اللہ تعالیٰ اس القائے شیطان کو نابود کر دیتا تھا۔ اس تفسیر میں انہوں نے تمنی سے آرزو کرنا امنیۃ سے آرزو اور القاء الشیطان سے شیطان کا اس میں آمیزش کرنا مراد لیا ہے۔

یہ تفسیر اگرچہ عصمت نبوت کی قادح نہیں مگر عظمت نبوت کے منافی ہے۔ علامہ جلال الدین المحلیؒ اور حافظ عماد الدین بن کثیرؒ نے بھی ان ہزلیات کا اپنی تفسیروں میں ذکر کر دیا ہے۔ اگرچہ حافظ صاحب نے بعد میں فرما دیا وَلٰکِنَّھَا مِنْ طَرِیْقٍ کُلِّھَا مُرْسَلَۃٌ وَلَمْ اَرَھَا مسندۃً مِن وجہٍ صحیح. (تفسیر ابن کثیر: ج:۳، ص:۲۲۹)

مشہور مفسرین و مترجمین ہند میں سے کسی نے اپنے ترجمہ و تفسیر کی بنیاد اِن لغویات پر نہیں رکھی۔

اب میں اختصار کے ساتھ پہلے چند بزرگوں کے ترجمے اور مختصر طور پر تشریحی جملے پیش کروں گا۔ پھر حضرت علامہ کشمیریؒ کی پسندیدہ تفسیر بیان کروں گا۔

(۱) حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس آیۃ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''و نہ فرستادیم پیش از تو ہیچ فرستادہ و نہ ہیچ صاحب وحی الا چوں آرزوئے بخاطر بست بیفگند شیطان چیزے در آرزوے وے۔ پس دور می کند خدا آنچہ شیطان انداختہ است باز حکم می کند خدا آیات خود را و خدا دانا و با حکمت است''۔

اس پر حاشیہ ہے: مثلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخواب دیدند کہ ہجرت کردہ اند بزمینے کہ نخل بسیار دارد۔ پس وہم بجانب یمامہ و ہجر رفت و در نفس الامر مدینہ بود الخ۔

مذکورہ بالا تفسیر میں القائے الشیطان سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھتے تھے تو کبھی کبھی اپنی طبیعت کے میلان کی بناء پر اس کی تعبیر میں مقام یا وقت کے تعین میں مسامحت ہو جاتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ یا اس واقعہ کے ظہور کے ذریعہ اس مسامحت کو دور فرما دیا جاتا تھا۔

(۲) آپ کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ فرماتے ہیں:

''اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی، سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں۔ پھر اللہ مٹاتا ہے شیطان کا ملایا، پھر پکی کرتا ہے اپنی باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا''۔

حضرت شاہ صاحبؒ فوائد میں رقمطراز ہیں:

نبی کو ایک حکم اللہ سے آتا ہے اس میں ہرگز تفاوت نہیں، اور ایک اپنے دل کا خیال اس میں جیسے اور آدمی کبھی خیال ٹھیک پڑا کبھی نہ پڑا۔ جیسے حضرت نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ سے مکہ گئے عمرہ کیا۔ خیال آیا کہ شاید اب کے برس وہ ٹھیک پڑا اگلے برس۔ یا وعدہ ہوا کافروں پر غلبہ ہوگا۔ خیال آیا اب کے لڑائی میں، اس میں نہ ہوا۔ پھر اللہ بتا دیتا ہے کہ جتنا

حکم تھا اس میں تفاوت نہیں۔

مقصد دونوں بزرگوں کا ایک ہی ہے۔ مگر الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ کیا نبی کی وحی میں (اگرچہ وہ خواب ہی کی صورت میں ہو) غلط خیال کی آمیزش ہو سکتی ہے اور نبی اس خیال کی بنیاد پر کوئی ایسا اہم اقدام کر سکتا ہے جیسا کہ واقعہ حدیبیہ میں کیا گیا۔

(۳) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ترجمہ میں فرماتے ہیں:

''ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے کچھ پڑھا شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہ ڈالا۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب علم والا ہے''۔

حضرت تھانوی نے تمنی کو بمعنی قراءۃ کیا ہے جو اس کے مجازی معنی ہیں اور امنیۃ کو بمعنی متلو لے کر اس سے آیات متشابہات مراد لی ہیں اور القاء الشیطان سے شیطان کی وسوسہ اندازی اور احکامِ آیات سے آیاتِ محکمات کی تنزیل۔

(۴) مفسر عصر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی اپنے فوائد القرآن میں اسی موقف کو اختیار فرما کر اس کی مزید وضاحت فرمائی ہے، آپ لکھتے ہیں:

احقر کے نزدیک بہترین اور سہل ترین تفسیر وہ ہے جس کی مختصر اصل سلف سے منقول ہے۔ یعنی تمنی کو بمعنی قراءۃ و تلاوت یا تحدیث کے اور امنیہ کو بمعنی متلو یا حدیث کے لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ قدیم سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول کوئی بات بیان کرتا یا اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ شیطان اس کی بیان کی ہوئی بات یا آیۃ میں طرح طرح کے شبہات ڈالتا ہے۔ یعنی بعض باتوں کے متعلق بہت لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اور شکوک و شبہات پیدا کر دیتا ہے مثلاً نبی نے آیۃ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ پڑھ کر سنائی، شیطان نے شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا تو حلال اور اللہ کا مارا ہوا حرام کہتے ہیں۔ اس القائے شیطانی کے ابطال ورد میں پیغمبر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی وہ آیات سناتے ہیں جو بالکل صاف اور محکم ہوں اور ایسی پکی باتیں بتاتے ہیں جن کو سنکر شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہے۔ گویا

متشابہات کی ظاہری سطح کو دیکھ کر شیطان جو اغوا کرتا ہے، آیات محکمات اس کی جڑ کاٹ دیتی ہیں، جنہیں سن کر تمام شکوک وشبہات کافور ہو جاتے ہیں۔

یہ تفسیر وتوضیح سادہ اور واضح ہے مگر اس میں بھی خلجان یہ پیدا ہوتا ہے کہ اندازِ کلام سے متبادر ہوتا ہے کہ ہر نبی اور رسول کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ جب اس نے آیات متشابہات اپنی قوم کو سنائیں تو شیطان نے ان میں شکوک وشبہات پیدا کئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیات محکمات نازل فرما کر ان شبہات کو دور فرما دیا۔ حالاں کہ ہر نبی کے لئے صاحب کتاب ہونا بھی ضروری نہیں۔

نیز یہ بھی واقعہ ہے کہ تمنی کے حقیقی معنی آرزو کرنا ہی ہیں، قراءۃ کے معنی میں اس کا استعمال مجازی ہے۔ جیسا کہ امام راغب کی تشریح سے مستفاد ہوتا ہے۔

ان التمنی کما یکون عن ظن وتخمین فقد یکون عن رویة وبناء علی اصل. ولما کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کثیراً ما کان یبادرُ الی ما نزل به الروح الامین علی قلبه حتی قیل له لا تعجل بالقرآن الآیة ولاتحرک به لسانک لتعجل به سمی تلاوته علی ذلک تمنیاً. (مفردات)

(۵) اب میں اس تفصیل کو مختصر کر کے حضرت الامام الکشمیریؒ کی اختیار فرمودہ تفسیر پیش کرتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں:

انبیائے کرام کی تمنی سے مراد وہ آرزو ہے جو ان کے دلوں میں اپنی امتوں کے ایمان کے بارے میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش سب ہی ایمان لے آتے اور القاء الشیطان سے مراد شیطان کا ان کی امت کے لوگوں کو اغوا کرنا اور ایمان کے راستہ سے ان کو روکنا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ ان کی آرزو کے مطابق ایمان قبول نہیں کرتے اور یہ ایک بلیغ محاورہ ہے۔ کہا جاتا ہے فلان القی فی امنیتی یعنی فلاں میرے اور میری آرزو کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ جو اسے منظور ہوتا ہے، کرتا ہے، جن کی تقدیر میں ایمان لانا ہوتا ہے ایمان لاتے ہیں اور شیطان ان کے معاملہ میں کامیاب نہیں ہوتا، لیکن جن کے

لئے بدبختی مقدر ہوچکی ہوتی ہے وہ اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور کافر بن جاتے ہیں۔یہی معنی ہیں فَیَنْسَخُ اللّٰہ ما یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحکِمُ اللّٰہ ایاتہ کے۔

اما وجہُ الآیۃ فاقول ان تمنی الانبیاء علیھم السلام عبارۃٌ عَمَّا تتحدثُ بہ انفسھم فی حق ایمان اُممھم. انَّھمْ لَوْ آمَنُوْا کُلِّھِمْ والقاءُ الشیطٰن فیھا عبارۃ عن اِغوائہ ایاھم وصدِّھم عن سبیل الایمان فلا یومنون حسب امنیتھم وھٰذہ محاورۃ بلیغۃٌ یقالُ فلانٌ القی فی امنیتی. ای حال بینی وبینھا. ثم اللّٰہ یفعل فیھم ما ھو فاعل. فیومن من قُدِّرلھم الایمان ولا ینجح فیھم اللّعین واما من قدّرت لہ الشقاوۃ فیتبعونہ فیکفرون وھو معنی قولہ فینسخ اللّٰہ مایلقی الشیطان ثم یحکم اللّٰہ آیاتہ. (فیض الباری: ج:۴،ص:۲۰۹)

اس تفسیر کا ماخذ صاحب تبریز کی تشریح ہے جیسا کہ حضرت مولانا بدرعالم نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔اس صورت میں حضرت علامہ کشمیریؒ کی تفسیر کی توضیح یہ ہوگی۔

ہر پیغمبر غایت شفقت امت کی بناء پر یہ تمنا لے کر اٹھتا ہے کہ میری ساری قوم میری دعوتِ اصلاح وہدایت کو قبول کرے، مگر شیطان اس کی اس تمنا کو ناکام بنانے کے لئے قوم کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتا ہے اور ان کو راہِ ہدایت سے روکنے کے لئے ہر کوشش عمل میں لاتا ہے۔یہ وسوسے یوں تو سب ہی کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں مگر جن کے دل روگی ہوتے ہیں، سنت الٰہی کے مطابق ان کے دلوں میں یہ وسوسے پھولتے پھلتے ہیں اور آخر میں انہیں کافر بنا کر چھوڑتے ہیں۔اور جن کے دلوں میں قبول حق کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے ان فتنہ کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور اپنی آیات کی صداقت اور دین کی حقانیت کو ان پر آشکارا کر کے ایمان ویقین کی دولت سے ان کو مالامال کر دیتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تفسیر کی بناء پر تمنی کے حقیقی معنی ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی، نہ آیۃ کے عموم میں خلل پڑتا ہے اور نہ کوئی ایسی بات

مفہوم ہوتی ہے جو عصمت نبی یا عظمت نبوت کے خلاف ہو۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور قریب قریب وہی بات کہی ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمائی۔ان کا ترجمہ یہ ہے۔

''اور اے پیغمبر! ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور جتنے نبی بھیجے سب کے ساتھ یہ معاملہ ضرور پیش آیا کہ جوں ہی انہوں نے اصلاح وسعادت کی آرزو کی، شیطان نے ان کی آرزو میں کوئی نہ کوئی فتنہ کی بات ڈال دی اور پھر اللہ نے اس کی وسوسہ اندازیوں کا اثر مٹایا اور اپنی نشانیوں کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔وہ سب کچھ جاننے والا (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے''۔

واضح رہے کہ ترجمان القرآن حصہ دوم کے مقدمہ میں اس کی تاریخ تکمیل ترتیب، ۱۲/اپریل ۱۹۳۶ء مندرج اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تاریخ وفات اس سے تین سال قبل ۲۹/مئی ۱۹۳۳ء ہے۔

اب حضرت علامہ کشمیری کی دوسری نکتہ سنجی ملاحظہ ہو۔

سورۂ بقرہ میں روزہ کے احکام میں سلسلہ فرمایا گیا ہے:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ٥ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ٥

حضرت شیخ الہندؒ نے یہ ترجمہ فرمایا ہے: اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ، چند روز ہیں گنتی کے۔ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے، اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا''۔

اس آیۃ کا آخری ٹکڑا مفسرین کرام میں زیر بحث رہا ہے۔عام طور پر یہی کہا گیا ہے کہ ابتدائے اسلام میں چوں کہ روزہ رکھنے کی لوگوں کو عادت نہ تھی اور یہ امر ان پر بہت شاق گذرتا تھا۔اس لئے اس وقت ان کو اجازت دی گئی تھی کہ چاہیں روزہ رکھیں جو بہتر ہے

اور چاہیں ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلا کر اس کا فدیہ دیدیں۔ پھر یہ حکم جب لوگ روزہ کے عادی ہو گئے، دوسری آیت: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ. الخ. سے منسوخ فرمادیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اسی قول کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے۔ اگر چہ آپ نے فوائد میں دوسرے قول کا بھی ذکر کیا ہے مگر اکثر محققین جو نسخ کے دائرہ کو وسیع نہیں کرتے، اس آیت کو منسوخ نہیں مانتے انہوں نے اسے محکم قرار دینے کے لئے مختلف توجیہات فرمائی ہیں۔

(۱) مفسر جلال الدین اور بعض دوسرے مفسرین نے یطیقون سے پہلے حرف نفی لا مقدر مانا ہے۔ یعنی جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے، ان کے ذمہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ اور اس کا محمل شیخ فانی وغیرہ کو قرار دیا ہے۔

مگر جیسا کہ حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا ''یہ بڑی خطرناک توجیہ ہے۔ اس سے کلام خداوندی سے امان اٹھ جاتا ہے۔ مثبت اور منفی کے درمیان فرق باقی نہیں رہتا۔ ہر باطل کوش کسی بھی حکم میں لا محذوف مان کر حکم کو ختم کر سکتا ہے۔

(۲) بعض دوسرے جلیل القدر مفسرین نے اطاقہ میں باب افعال کی خاصیت سلب ماخذ مانی ہے۔ اس صورت میں لا مقدر ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ التفسیرات الاحمدیہ میں شمس الائمہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے۔ انّ قوله تعالیٰ: يُطيقونه من الاطاقة والماضى اطاق والهمزة فيه للسلب مگر اس قول میں یہ ضعف ہے کہ خاصیت ابواب سماعی ہیں قیاسی نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی مختصر تفسیر فتح الرحمٰن میں یطیقونه کی ضمیر کو فدیہ کی طرف راجع کرتے ہیں اور ''فدیہ'' سے صدقۃ الفطر مراد لیتے ہیں۔ یعنی جو لوگ صدقۃ الفطر ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں ان پر اس کی ادائیگی واجب ہے۔ مگر اس صورت میں اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے۔ اگر چہ توجیہ لطیف ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دوسری توجیہہ میں يُطيقونهٗ کی ضمیر آیۃ سابقہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا الخ کے مفہوم کی طرف راجع فرماتے ہیں اور مراد یہ لیتے ہیں کہ جو لوگ حالتِ مرض و سفر کے روزوں کی قضا کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے

اس کی قضا نہ کی یہاں تک کہ دوسرا رمضان آگیا۔ان کے ذمہ واجب ہے کہ وہ فدیہ ادا کریں، یہ مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔اس صورت میں ایک جملہ مقدر ماننا پڑے گا۔

صاحب ''المنار'' علامہ رشید رضا اپنے استاذ علامہ عبدہٗ مصری سے ایک اور توجیہ نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:

اطاقۃ کے معنی ہیں کسی کام کو بمشکل کرسکنا۔اطاقۃ قوت وقدرت کے ادنیٰ درجہ پر استعمال ہوتا ہے۔عرب اَطَاقَ الشَّیْئَ کا استعمال اس صورت میں کرتے ہیں جبکہ اس پر قدرت نہایت ضعیف ہو کہ اس میں مشقت شدیدہ اٹھانی پڑے۔تو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ''جو لوگ روزہ رکھتے ہوئے سخت تکلیف محسوس کرتے ہوں مثلاً شیخ کبیر یا وہ مریض جس کی صحت یابی کی امید باقی نہ رہے تو انہیں اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور اس کے بدلہ میں فدیہ دے دیں۔(علامہ مصری اس ذیل میں کان کے مزدوروں کو جنہیں کوئلہ وغیرہ کھودنا پڑتا ہے اور اسی نوعیت کے دوسرے سخت جسمانی مشقت کے کام کرنے والوں کو شامل کرلیتے ہیں) (تفسیر المنار: ج:۲،ص:۱۵۶)

یہ قول دراصل صاحب کشاف کے کلام سے ماخوذ ہے جیسا کہ حضرت علامہ کشمیریؒ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔اور صحیح بخاری میں مجاہد کی جو روایت حضرت ابن عباس کے متعلق ہے کہ کان یقرأ وعلی الذین یطوّقونه فدیة طعامُ مسکین اور اس کی تشریح یُحَمَّلُوْنَهٗ سے کی گئی ہے وہ اس کی مؤید ہے۔

حضرت العلامہ الاستاذ الامام الکشمیریؒ کی رائے اس سلسلہ میں منفرد ہے۔آپ فرماتے ہیں:

ذهب عامة المفسرين الى ان تلک الآيات نزلت فی شهر رمضان وعندی لامِسَاسَ لهابرمضان وانماهی فی الايام البيض وعاشوراء. فريضةً قبل رمضانَ ولذا قال اياماً معدودات فتعبيره بالايام ادَلُّ واَصْدَقُ عَلٰی تِلْکَ الْاَيَّام من رمضان. لما يشهدبه الذوق الصائب (فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِيْضًا اَوْعَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَر) ای من لم

يَصُم تلکَ الْاَيَّام لِمَرَضٍ اوسفرٍ فَعَلَيْهِ اَن يقبضها فی غير تلک الايام (وَعَلَى الَّذِيْنَ يطيقونه فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْن) وَ فی قراءة يُطَوِّقُوْنَهٗ وهٰذا الحكم ايضاً يتعلق بالايام البيض ولا تعلق له برمضان. يَدُلُّ عليه ما اخرجه ابوداؤد فی حديث احوال الصلوٰة والصِّيَام عنْ مَعَاذ.

پھر فرماتے ہیں:

فهٰذا نصٌّ فی اَنَّ تِلْکَ الآيَاتِ فِیْ حَقِّ اَيَّامِ البِيْضِ وَاِنَّمَا افْتَرَضَ صِيَامُ رَمَضَانَ مِنْ قَوْلِهٖ (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ. الآية) وَمن هٰهنا ظَهَرَ وجه قوله "كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" فَاَنَّ تِلْکَ الصِّيَامُ كَانَتْ فِیْ الْاُمَمِ السَّابِقَةِ اَيْضًا. بخلاف رمضان. وحينئذٍ لاحاجةَ الى التَّاوِيْل فی آية الفِدَاء. الخ. (فیض الباری: کتاب الصوم: ج:۳،ص:۱۴۵)

حضرت العلامہ الامام الکشمیریؒ کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ان آیات (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ الخ) کا تعلق ماہِ رمضان کے روزوں سے نہیں بلکہ ایام بیض اور عاشوراء کے روزوں سے ہے جو ابتدائے اسلام میں فرض تھے۔ ان ہی کے متعلق یہ حکم تھا کہ جو شخص مریض ہو یا مسافر وہ دوسرے دنوں میں ان کی قضا کرے اور یہ بھی اجازت تھی کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ بھی روزہ نہ رکھیں اور اس کے بدلہ میں فدیہ ادا کریں۔ بعد میں آیات شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ اتریں۔ ان سے رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم ثابت ہوا۔ ایام بیض اور عاشوراء کی فرضیت ختم ہوگئی البتہ اس کا استحباب باقی رہا۔ مریض اور مسافر کا حکم ان آیات میں بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ ان روزوں کی قضا دوسرے دنوں میں کرلیا کریں، ان ہی پر شیخ کبیر کو قیاس کیا جائے گا کیوں کہ عذر مشقت دونوں میں مشترک ہے۔ اس لئے اجازت افطار ان کو بھی دی جائے گی۔ مگر چوں کہ ان کا عذر مستقل ہے، اس لئے بجائے قضاء کے فدیہ ادا کرنا کافی

ہوگا۔حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی اس رائے پر حدیث معاذ سے جو ابوداوٗد کے احوال الصلوٰۃ والصیام میں مذکور ہے، استدلال فرمایا ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ کی اس رائے پر ایاماً معدودات کا اطلاق بھی برمحل ہوجاتا ہے۔کیوں کہ گنے چنے دن ایام بیض اور عاشوراء ہی کے تھے۔ کَمَا کُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کی تشبیہ بھی صحیح ہوجاتی ہے،اس لئے کہ امم سابقہ پر ان ہی دنوں کے روزے فرض تھے۔مریض اور مسافر کے حکم میں تکرار بھی باقی نہیں رہتی۔کیوں کہ دونوں کے محل مختلف ہیں۔اور یطیقونہ کی تاویل کی زحمت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔کہ اس کا تعلق ہی صیام رمضان سے نہیں۔فَلِلّٰهِ دَرُّهٗ.

حضرت علامہ کشمیریؒ کا علمی مقام

حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوریؒ، مؤلف: انوار الباری

(۱) مشہور اہل حدیث عالم علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ حضرت شاہ صاحب کے مداحین میں سے تھے، آپ کی خدمت میں دیوبند جاتے اور استفادہ کرتے تھے۔

(۲) علامہ ابراہیم میر سیالکوٹیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو مجسم علم دیکھنا ہو تو حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھ لے۔

(۳) علامہ اقبال مرحوم نے اصولِ اسلام کی ارواح سمجھنے میں حضرت شاہ صاحبؒ سے بالمشافہ اور بذریعہ مکاتبت بھی بہت استفادہ کیا تھا اور دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد آپ کو لاہور لانے کی بھی بہت کوشش کی تھی۔

آپ نے حضرتؒ کی وفات کے بعد لاہور کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ حضرت شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے" ڈاکٹر اقبالؒ نے ایک موقع پر محترم مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی سے فرمایا تھا کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا (حضرت شاہ صاحبؒ کے ترک تعلق دارالعلوم کے بارے میں) جو بھی تاثر ہو، مگر ان کے استعفیٰ کی خبر سن کر میں بہت خوش ہوا، کیوں کہ دارالعلوم کو صدر مدرس اور بھی مل جائیں گے مگر اسلام کے لئے اب جو کام میں شاہ صاحبؒ سے لینا چاہتا ہوں، وہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

حضرت کی وفات کے بعد علامہ اقبالؒ کی مکاتبت راقم الحروف سے بھی رہی اور علامہ چاہتے تھے کہ کسی جید عالم کو اپنے پاس رکھ کر اس دور کے پیچیدہ فقہی مسائل پر کوئی کتاب لکھوائیں، غالباً وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات کی ہی روشنی میں اتنا بڑا کام کرنا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ علامہ کو اس مہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔

(۴) ایک دفعہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب علی گڑھ سے دیوبند آئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درس مسلم شریف میں بیٹھے تو کہا کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر سامنے آگیا تھا، یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جس طرح پوری تحقیق وریسرچ کے ذریعہ پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا تھا، آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے وہی نقشہ دیکھا ہے۔

(۵) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ اپنی مشہور حدیثی تالیف بذل المجہود شرح ابوداؤد کی مشکلات میں حضرت شاہ صاحبؒ سے رجوع کرتے تھے، حالاں کہ وہ آپ کے ساتذہ کے درجہ میں تھے۔

(٦) علامہ محدث نیمویؒ نے اپنی پوری تصنیف آثار السنن طبع واشاعت سے قبل حضرت شاہ صاحب کے ملاحظہ سے گذاری اور آپ کے علمی مشوروں سے استفادہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے علامہ نے اس تالیف کے مسودات حضرت شیخ الہند کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے بھیجے تھے، مگر آپ نے مشورہ دیا کہ ان کو حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس بھیجا جائے۔

(۷) حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے اپنی شرح مسلم شریف اور فوائد قرآن مجید میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیقات عالیہ سے پورا استفادہ فرمایا تھا، سورۂ نجم کے ایک تفسیری استفادہ کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فتح الملہم، ج:۱، ص:۳۳۵۔ میں حضرت شاہ صاحبؒ کو القاب عالیہ کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ بھی لکھا کہ ”لوگوں کی نظروں نے ان کا مثل نہیں دیکھا اور نہ خود انہوں نے اپنا مثل دیکھا تھا“۔

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے نفحة العنبر: ص:۲۲۷۔ میں یہ جملہ نقل کرکے یہ بھی بتلایا کہ یہ جملہ کتب تراجم وطبقات میں صرف ٦، ۷، اکابر امت کے حق میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا حضرت شاہ صاحبؒ ان اعلیٰ وارفع شان کے اکابر واساطین امت میں سے ایک تھے وکفی به منقبة۔

اب تک میں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے اعلیٰ وارفع ”علمی مقام“ کے لئے اکابر معاصرین کے اجمالی ارشادات سے استدلال کیا ہے، اس کے بعد کچھ علوم وفنون میں حضرت شاہ

صاحبؒ کی تحقیقاتِ عالیہ کی مثالیں اور نمونے بھی بطورِ استشہاد پیش کرتا ہوں۔ وبہ نستعین۔

علمِ تفسیر میں حضرتؒ کا مقام رفیع

حضرت کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ ہر علم وفن کے مشکلات ومختارات دونوں پر پوری نظر رکھتے تھے اور مشکلات کے حل کی فکر میں رہتے تھے، مختارات کی نشان دہی فرمادیتے تھے، آپ کی تالیفات میں سے ''مشکلات القرآن'' اسی کا ایک نمونہ ہے۔ اس کتاب کو راقم الحروف نے ہی حضرتؒ کی یادداشتوں سے مرتب کیا تھا اور حوالوں کی تخریج حاشیۂ کتاب میں کی تھی اور اس پر نہایت مفید علمی وتفسیری مقدمہ رفیق محترم مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ مرحوم نے لکھا تھا۔ یہ کتاب مجلس علمی ڈابھیل سے شائع شدہ ہے اگرچہ اب نایاب ہے، یہاں اسی سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) سماعِ موتیٰ کا مسئلہ

حضرت نے آیات وآثار سے ثابت کیا کہ ارواح موتیٰ سب سنتی ہیں جہاں نفی آ گئی ہے وہ اجساد سے متعلق ہے یا اس امر کی نفی ہے کہ مرنے کے بعد ان کے لئے سننا نفع بخش نہیں ہے۔ یہ بھی حضرت نے فرمایا کہ جو کچھ اس بارے میں اختلاف بھی ہوا ہے وہ عام ارواح کے بارے میں ہوا ہے، باقی ارواحِ انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے بھی تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ ارواحِ انبیاء علیہم السلام کے سماع پر سب کا اتفاق ہے۔ (مشکلات القرآن: ص:۲۲۲)

(۲) سورج کی حرکت

حضرت نے سورۂ یٰسین کی آیت والشمس تجری لمستقر لھا کے بارے میں افادہ کیا کہ اس کو جدید ہیئت کے مخالف نہ سمجھنا چاہیے کیوں کہ قرآن مجید کا مطمحِ نظر طبعی وسائنسی معلومات فراہم کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف اپنی قدرتِ عظیمہ کاملہ کا بیان ہے۔ اور ایسے مواقع

پر جو بات عام طور سے عوام جانتے پہچانتے ہیں اسی کے مطابق کلام کیا گیا ہے۔ اگر عوام کے اذہان کو کونی حقائق اور سائنسی تحقیقات میں الجھا دیا جاتا تو وہ ہدایت و نصیحت کی طرف کما حقہ متوجہ نہ ہو سکتے۔ قرآن مجید کے وقت نزول سے ہزار بارہ سو برس تک لوگ یہی سمجھتے رہے کہ سورج حرکت کرتا ہے، تو اس کے خلاف کی طرف ذہنوں کو موڑنے کی سعی لا حاصل اور بے فائدہ تھی۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آیت میں مستقر سے مراد قیامت ہو کہ سورج کی خدمت وکارفرمائی کا دور قیامت تک باقی رہے گا (پھر اور مخلوقات کی طرح وہ بھی فنا ہو جائے گا) اور احادیث میں جو سجدہ کا ذکر ہے وہ معمورۂ ارضی کے لحاظ سے ہے۔ (یعنی دریافت امریکہ کے بعد وہ سجدہ ان کے معمورۂ ارضی کے لحاظ سے ہوگا)۔ (مشکلات القرآن:۲۲۹)

نیز حضرت نے فرمایا کہ سورج کے لئے بالکلیہ سکون وعدم جریان ہیئت جدید میں بھی مسلم نہیں ہے، کیوں کہ وہ بھی اگر چہ سورج کی حرکت زمین کے گرد تو نہیں مانتے مگر سورج کے لئے بھی ایک حرکت و جریان فضائے بسیط کے اندر مانتے ہیں۔ جو مستقر یا قیامت تک کے لیے ہوگی۔ احقر نے انوار الباری میں اس کی پوری تحقیق درج کی ہے۔ ہمارے حضرت شاہ صاحب یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جدید ہیئت و سائنس چوں کہ مشاہدہ پر مبنی ہے اس لئے وہ قدیم سے زیادہ قابل وثوق ہے۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اسلامی تعلیمات سے جدید سائنس کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ وہ ان سے زیادہ قریب ہے۔

واضح ہو کہ ہمارے اکابر میں سب سے پہلے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے شق قمر کی بحث میں جدید ہیئت کی برتری و صحت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

(۴) آیت: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا (بقرہ)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن تیمیہ اور ان کے بعد بھی بعض حضرات کو اشکالات پیش آئے ہیں۔ ان حضرات نے آیت میں ذکر شدہ اہل مذاہب کا حکم ماضی سے متعلق سمجھا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کو زمانۂ نبوت سے متعلق ثابت فرمایا اور تفصیل کی جس کو

بسبب طوالت مضمون ترک کر رہا ہوں۔ (مشکلات: ص:۱۶)

(۵) آیت: وَاِنْ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ (انفال)

بظاہر ارشاد ربانی یہ ہے کہ اگر کسی دار الحرب کے مسلمان باشندے دار الاسلام کے مسلمان باشندوں یا اس کی حکومت سے کسی دینی معاملہ میں نصرت و مدد طلب کریں تو ان کا فرض ہے کہ دار الحرب کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بشرطیکہ ان دونوں ملکوں میں کوئی باہمی معاہدہ نہ ہو (کیوں کہ معاہدہ کے خلاف کرنا اسلام میں جائز نہیں)

حضرت شاہ صاحبؒ نے تفسیر ابن کثیر وغیرہ کے حوالوں سے یہ تحقیق فرمائی کہ یہ معاہدہ والی شرط ظلم کی صورتوں پر عائد نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ظلم کی صورت میں ہر مظلوم کی مدد کرنا شرعاً ضروری ہے۔ خواہ دار الاسلام ہی کے اندر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم کرے۔ لہٰذا آیت مذکورہ کے استثناء میں ظلمِ کفار والی صورت داخل نہ ہوگی اور معاہدہ مظلوم مسلمانوں کی نصرت سے مانع نہ ہوگا۔ (مشکلات: ص:۱۹۰)

(۶) آیت: اَلنَّارُ مَثْوٰكُمْ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ. (انعام، ہود)

حضرت شاہ صاحبؒ نے تفسیر بحر محیط کے حوالوں سے تحقیق فرمائی کہ آیت میں استثنائے مذکور سے عدم خالدین عذاب کفار ثابت کرنا صحیح نہیں اور علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کی غلطی کو دلائل کے ساتھ واضح فرمایا۔ حوالوں کی تخریج راقم الحروف نے کر دی ہے۔

(مشکلات القرآن: ص:۱۷۷ تا ۱۸۰)

(۷) آیت: فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ (آل عمران)

حضرت نے تفاسیر کے حوالوں سے شہادت امت مرحومہ کی مکمل وضاحت فرما کر ضمناً یہ بھی تحقیق فرمائی کہ صوفیہ جو وساطت فی النبوۃ کا ذکر کرتے ہیں اس سے مراد فتح باب نبوت ہے اس سے اصطلاح اہل معقول کے مطابق بالذات و بالعرض کی بات سمجھنا درست

نہیں۔ (مشکلات: ص:۷۴)

حضرت نے کئی جگہ درس بخاری شریف میں یہ بھی فرمایا تھا کہ مذکورہ بالا تعبیر خلافِ احتیاط معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ اہل معقول کی اصطلاح کے مطابق سلف سے ثابت نہیں ہوگی۔

طوالت کے خیال سے ان ہی چند نمونوں پر اکتفاء کرتا ہوں ورنہ پوری کتاب حضرت کے حل مشکلاتِ تفسیر حوالوں کے ۲۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

واضح ہو کہ تفسیر قرآن مجید ایک محفوظ طریقہ تو تفسیر القرآن بالقرآن کا ہے اس کے بعد تفسیر القرآن بالحدیث الصحیح کا درجہ ہے مگر کسی بھی تفسیر بالماثور پر پورا بھروسہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ اس ماثور کا صحیح درجہ معلوم نہ ہو۔ تفسیر بیضاوی، تفسیر درِ منثور سیوطیؒ، تفسیر روح المعانی، تفسیر ابن جریر طبریؒ، تفسیر ابن کثیر وغیرہ مستند تفاسیر ہیں مگر ان میں بھی حذف والحاق اور اندراجِ ضعاف وموضوعات کا سقم موجود ہے۔ ان اکابر مفسرین کا مطمح نظر یہ تھا کہ کسی آیت کی تفسیر میں جتنا بھی مواد مل سکے وہ سب اسانید کے ساتھ جمع کر دیں اور چوں کہ پہلے دور کے علماء رجال سے واقف ہوتے تھے وہ سندِ حدیث سے ہی معلوم کر لیتے تھے کہ حدیث کس درجہ میں قابل استناد ہے، اور قابل استناد بھی ہے تو صرف فضائل اعمال کے لئے ہے یا اس سے بڑھ کر احکام حلال وحرام یا واجبات وفرائض کے لئے بھی اور اس سے بھی آگے درجہ اصول وعقائد کے لئے ہے، جن کے اثبات کے لئے اور بھی زیادہ قوی احادیث درکار ہیں۔

علامہ ابن کثیر نے یہ بہت بڑا کام کیا کہ تفسیر ابن جریر کی روایات کو سند کے ساتھ بیان کیا اور ان کی علل بھی بیان کیں۔ احادیث ضعاف وموضوعات کی نشاندہی کردی۔ یہ ان کی نہایت عظیم الشان خدمت ہے مگر اس کے باوجود ان سے بھی بعض احادیث کے اندر کوتاہی ہوگئی کہ ان کی علت ونکارت پر تنبیہ نہیں کی۔ ملاحظہ ہو، ص:۱۰۷، الاجوبۃ الفاصلہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ۔ شاید علامہ نے ان کی بیّن نکارت کی وجہ سے تنبیہ ضروری نہ سمجھی ہو۔ جس طرح امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں کئی احادیث منکر وشاذ رواۃ سے درج فرما دیں اور تنبیہ نہیں فرمائی۔ حالاں کہ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں صرف صحیح احادیث ذکر کرنے کا ارادہ

کیا تھا اور فرمایا تھا کہ جس حدیث کی سند پر سکوت کروں اس کو بھی صحیح سمجھا جائے۔ مگر حدیث ثمانیہ اوعال اور اطیط عرش وغیرہ بلا تنبیہ ذکر فرمادیں۔ جن سے بڑے بڑوں کو مغالطہ لگ گیا۔ تاہم علامہ ذہبیؒ نے سیر اعلام النبلاء میں تصریح کی کہ امام ابوداؤدؒ نے اکثر جگہ بین الضعف راویوں پر سکوت نہیں کیا بلکہ ان کا ضعف بتلا دیا ہے۔ پھر بھی بعض جگہ انہوں نے کسی راوی کے نہایت ضعیف ومنکر ہونے کی شہرت کی وجہ سے بھی سکوت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو،ص: ۶۸ وص: ۷۳، وص: ۱۴۴/الاجوبہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ مطبوعہ حلب۔

یہاں صرف اتنا عرض کرنا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے کتب تفاسیر میں سے جتنا حصہ مشکلات قرآنیہ کے حل کے لئے اہم وضروری تھا نیز جس قدر مختارات مفسرین حضرتؒ کی نظر میں معتمد وپسندیدہ تھے وہ ایک جگہ جمع فرمادیئے تھے۔ احقر نے اپنے ابتدائی دور میں کچھ کام اس کی ترتیب وتخریج حوالہ جات کا انجام دے کر مجلس علمی سے اس کو شائع کر دیا تھا۔ اب کتاب مذکور مکمل تشریحات اور مزید تائیدی حوالہ جات کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کام کی توفیق عطا فرمائے۔

علم حدیث میں حضرت شاہ صاحبؒ کا اعلیٰ مقام

حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری شریف باب الاذان قبل الفجر میں امام طحاوی کی تحقیق کو سراہا اور اسکو بیان کر کے فرمایا کہ امام طحاویؒ کی قدر وہ کر سکتا ہے جس کو معلوم ہو کہ پہلے کیا کچھ اعتراضات وابحاث ہو چکی ہیں، اور فرمایا کہ حنفیہ کے مذہب پر جس قدر احسانات امام طحاویؒ کے ہیں اور کسی کے نہیں۔ میں نے اکثر دیکھا کہ امام طحاویؒ کی تحقیق کی بنیاد امام محمدؒ کے کلام پر ہوتی ہے اور بعض اوقات ان کے ایک ہی لفظ پر بنیاد رکھ کر امام طحاویؒ اس کو پھیلا کر پوری تحقیق قائم کر دیتے ہیں، اور اعلیٰ درجہ کی تحقیقات کی نشاندہی جتنی امام طحاوی نے کی ہے اور کسی نے نہیں۔ کی پھر ان کی تقریرات وتائیدات جس قدر میں نے جمع کر دی ہیں اور کسی نے نہیں کیں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام محمدؒ اکابر سلف اور امام اعظم رضی اللہ عنہم کے علوم

وکمالات کے جامع تھے، اور امت محمدیہ کے نہایت جلیل القدر محقق ومدقق تھے، بقول حضرت شاہ صاحبؒ آپ کے علوم کی تشریحات امام طحاوی نے کیں اور امام محمد کے تلمیذ خاص امام شافعیؒ کی وساطت سے وہ علوم دوسرے ائمۂ مجتہدین ومحدثین کو بھی حاصل ہوئے، پھر ایک مدت مدید کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے جن کا سلسلۂ نسب بھی امام اعظمؒ کے خاندان سے ملتا ہے، ان علوم وتحقیقاتِ عالیہ محمدیہ وطحاویہ کو سامنے رکھ کر تیس چالیس سال تک ان کے لئے تائیدی دلائل وبراہین جمع کئے، اور ان کی شان علم وفضل وجامعیت بھی بقول حضرت تھانویؒ ایسی تھی کہ ان کے ایک ایک جملہ پر ایک ایک رسالہ مدوّن ہوسکتا تھا اور بقول حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ آپ کی گراں قدر علمی تالیفات کی قدر بھی وہی کرسکتا ہے جس کے سامنے سابقہ اعتراضات وابحاث ہوں اور خود علامہ موصوف نے ہی حضرت شاہ صاحبؒ کا رسالہ "کشف الستر" پڑھ کر یہ بھی فرمایا تھا کہ اس رسالہ کا مطالعہ سترہ بار کرنے کے بعد میں سمجھ سکا ہوں کہ حضرت نے کن کن مشکلات واشکالات کا حل فرمادیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام محمدؒ، امام طحاویؒ اور علامہ کشمیریؒ تینوں حضرات کی محدثانہ شانِ تحقیق وتدقیق علمائے امت میں سے ایک نرالی شان کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے رسالہ مذکورہ اور نیل الفرقدین، بسط الیدین، مرقاۃ الطارم وغیرہ کی یادداشتیں احقر کے سپرد فرما کر نقل وترتیب کا کام کرایا تھا۔ جن کی "مجلس علمی" ڈابھیل سے اشاعت ہوئی تھی، اور یہ ادارہ اولاً حضرت کے علوم کی اشاعت ہی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

حضرت کی اسی طرح کی یادداشتوں کے تین صندوق بھرے ہوئے گھر پر تھے، جن کا اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے، ان سے سینکڑوں مسائل میں مدد مل سکتی تھی، اور آج وہ سب موجود ہوتیں تو صحاحِ ستہ، معانی الآثار طحاوی وغیرہ کی بے نظیر شروح تالیف کی جاسکتی تھیں، مگر صد افسوس کہ حضرت کی وفات کے بعد اس بے مثال خزینہ میں سے ہمیں کچھ بھی نہ مل سکا، بلکہ حضرتؒ کی وہ کتابیں بھی جن پر حضرت نے اپنے قلم سے حواشی لکھے تھے وہ بھی حاصل نہ ہوسکیں۔

ان حالات میں حضرتؒ کی وفات کے بعد سوچا گیا کہ کم سے کم حضرت کے درس حدیث کے امالی ہی کو مرتب کرا کر شائع کردیا جائے، چنانچہ فیض الباری مرتب کرائی گئی جس

کو مصر میں طبع کرا کے شائع کیا گیا مگر افسوس ہے کہ اس سے جتنی امیدیں قائم کی تھیں، وہ پوری نہ ہوسکیں، کیوں کہ اس میں نہ صرف ضبط و کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں بلکہ کتابوں کے حوالوں میں بھی مراجعت نہ کرنے کی وجہ سے فاحش غلطیاں ہوگئیں ہیں۔اسی لئے ''انوارالباری'' میں ایسی فروگذاشتوں کی اصلاح بھی پیش نظر ہے تاکہ حضرتؒ کے علوم وافادات کو حتی الوسع صحیح صورت میں پیش کیا جائے۔واللہ الموفق۔

اس تمہید کے بعد حضرت کی محدثانہ شان تحقیق کے بھی چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

(۱) حدیث سُدُّوْا عَنِّی کُلُّ خَوْخَةٍ فِیْ هٰذا المسجد غیر خوخة ابی بکر (بخاری: ص:۶۷)

اس حدیث پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم در بارۂ سد الابواب غیر باب علی بھی قوی سند سے ثابت ہے۔(اگر چہ بخاری میں نہیں ہے) لیکن محدث ابن الجوزیؒ نے اس کو موضوع قرار دے دیا ہے، جس کا حافظ ابن حجر نے ردِ وافر کیا ہے، اور امام طحاویؒ کی مشکل الآثار سے بھی اپنے مدعا کو قوت پہنچائی ہے کیوں کہ امام طحاوی نے توفیق بین الحدیثین کا راستہ اختیار کیا ہے۔

حافظ نے لکھا ہے کہ محدث ابن الجوزی نے اس حدیث کو بوجہ اعلال بعض رواۃ کے گرایا ہے اور اس لئے بھی کہ اس کو بخاری وغیرہ کی صحیح روایت کے مخالف خیال کیا کہ اس حدیث کو روافض نے حضرت علیؓ کی منقبت کے لئے گھڑ لیا ہے، حالاں کہ یہ ابن جوزی کی خطاء شنیع ہے، کیوں کہ اس طرح انہوں نے احادیث صحیحہ کو رد کرنے والوں کا طریقہ اختیار کیا۔(فتح الباری: ج:۷،ص:۱۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید افادہ کیا کہ ایسی غلطیاں دوسرے اکابر امت سے بھی ہوئی ہیں کہ کسی ایک مجروح راوی کی وجہ سے حدیث صحیح یا حسن کو گرا دیا۔ جبکہ وہ حدیث دوسرے ثقہ راویوں سے بھی مروی ہوتی ہے، خود بخاری میں بھی بعض ضعیف راوی ہیں مگر ان کی حدیث اس لئے نہیں گرے گی کہ وہ دوسرے ثقہ راویوں سے بھی مروی ہے، اسی لئے صحیح

بخاری کی تمام احادیث صحیح وقوی قرار دی جائیں گی۔ بعض حضرات کسی حدیث کو اضطراب کی وجہ سے گرا دیتے ہیں جب کہ وہ معنی کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے، یا کبھی تعصب مسلکی کے سبب سے بھی کسی مخالف کی حدیث کو گرا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے مسلک پر اس سے استدلال نہ کر سکے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ہی نے علامہ ابن تیمیہ پر بھی نقد کیا ہے کہ انہوں نے منہاج السنۃ میں روافض کے مقابلہ میں اتنا زور دکھایا کہ ان کی نقل کردہ صحیح احادیث کو بھی گرا دیا، یہ بات انصاف سے بعید ہے۔

(۲) قولہ وقال الشعبی لایشترط المعلم الاان یعطی شیئًا فیقبلہ (بخاری ص:۳۰۴)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام محمدؒ نے جو یہ تفصیل کردی ہے کہ اجرتِ ممنوعہ اگر مشروط ہو تو ناجائز ہے ورنہ درست ہے تو اس پر علامہ ابن تیمیہ نے بڑے غیظ وغضب کا اظہار کیا ہے اور امام محمدؒ کے رد کے لئے اپنے فتاویٰ میں مستقل جز ولکھا ہے کہ ہم نہیں سمجھ سکے اس قید کا خارج میں ثمرہ کیا ہے جبکہ وہ اجرت قبول کر لے۔ حالاں کہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے۔ اور اس نے حدیث کی کھلی مخالفت کی ہے، میں نے کہا کہ وہ اپنے غصہ کو اپنے پاس ہی رکھیں ہمیں ان کا علم بھی معلوم ہے۔ یہاں امام بخاریؒ نے علامہ شعبی کا قول نقل کیا کہ معلم اگر شرط نہ کرے اور اس کو کچھ دیدیا جائے تو لینا جائز ہے، اور ترمذی شریف میں صحیح حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے عسب الفحل کی ممانعت فرمائی ہے اور اس کی اجرت حنفیہ کے نزدیک بھی حرام ہے، تاہم حدیث ہی میں یہ بھی حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا ہمیں اکراماً وہدیۃً کچھ دیا جاتا ہے، اس کی آپ نے اجازت دی۔

پس جبکہ ایک اصل اور جنس حضور علیہ السلام کے ارشادات سے ثابت ہوگئی تو اس کے تحت آنے والی جزئیات پر نکیر کیوں کر درست ہوسکتی ہے، غرض فقہ حنفی میں بہت سے جزئیات تعامل وتوارث کی وجہ سے جائز قرار دیئے گئے ہیں جن پر دوسرے لوگ نکتہ چینی کیا کرتے ہیں، اور یہ بات شان علم وتحقیق اور انصاف سے بعید ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے

مزید فرمایا کہ علامہ ابن تیمیہ جب اکابر امت کی شان میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں تو بڑا دکھ ہوتا ہے، انہوں نے ائمہ حنفیہ پر بھی بہت کچھ لے دے کی ہے اور خاص کر امام محمدؒ سے تو بہت ہی ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ (شاید اسی لئے انہوں نے امام شافعیؒ کے امام محمدؒ سے تلمذ کا بھی انکار کیا ہوگا۔ واللہ اعلم)۔

(۳) مرض وفات میں نبی اکرم ﷺ کی نمازیں مسجد نبوی میں

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بخاری کی حدیث الباب (۶۵۱) میں حضور علیہ السلام کا مرض وفات میں ٹب میں بیٹھ کر غسل کرنے کا ذکر ہے اور نمازِ عشاء مسجد نبوی میں پڑھنے کی بھی صراحت ہے اور بخاری کے الفاظ سے بھی ۵-۶- جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضور علیہ السلام عشاء کے وقت حجرۂ شریفہ سے مسجد کی طرف نکلے ہیں اور خطبہ پڑھا ہے، مگر حافظ نے کہیں بول کر نہیں دیا۔ اور وہ صرف ایک ظہر کے نکلنے کو مانتے ہیں باقی کا انکار کرتے ہیں حالاں کہ حضور علیہ السلام نے اپنے مرضِ وفات میں چار پانچ دن کے اندر چار بار مسجد نبوی کی نماز میں شرکت فرمائی ہے۔ اور تین نمازوں کی شرکت کو تو امام ترمذیؒ نے بھی مانا ہے، میں چار مانتا ہوں، جبکہ امام شافعیؒ اور حافظؒ صرف ایک نماز کی شرکت مانتے ہیں، پھر ان دونوں میں بھی اختلاف ہے کہ امام شافعی صبح کی نماز میں کہتے ہیں اور حافظ ظہر میں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بخاری کی حدیث ص:۳۲، کے تحت بھی ضروری تفصیل انوار الباری، ج:۵، ص:۷۰ا میں آچکی ہے، وہ بھی اس کے ساتھ دیکھ لی جائے۔

اب حضرت نے سابق باب اہل العلم والفضل احق بالامامۃ کی حدیث انسؓ میں قولہ فنکص ابوبکر الخ پر بھی فرمایا کہ اس کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام اس نماز میں داخل نہیں ہوئے کہ ایسا ہوتا تو راوی اس کو ضرور ذکر کرتا، تاہم امام بیہقی نے شرکت پر اصرار کیا ہے اور دو روایتوں سے استدلال کیا ہے میرے پاس بھی دس وجوہ یا زیادہ ایسی ہیں جو شرکت نماز فجر (یوم الاثنین یوم وفات نبوی) پر دلالت کرتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ نے اقتداء حجرۂ شریفہ سے کی ہے، مسجد میں تشریف نہیں لے جاسکے، جس کی عورتیں

جمعہ کے دن حجروں سے اقتداء کرتی تھیں، (کمافی المدونہ لیکن میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے) اور نسائی سے معلوم ہوتا ہے کہ صف تک پہنچ گئے تھے۔

امام شافعیؒ بھی نماز صبح کی شرکت کے قائل ہیں اور غالباً وہ پیر کے دن کی ہے، حافظ نے صبح کی نماز کی شرکت سے انکار کیا ہے اور شرکت صرف ظہر میں مانی ہے۔ پہلے یہ بات بھی آچکی ہے کہ ایک نمازِ ظہر کی شرکت کو سب ہی مانتے ہیں، علاوہ امام شافعیؒ کے خواہ وہ سنیچر کی ہو یا اتوار کی جمعہ کی تو ہو نہیں سکتی، اور جمعرات کی شام سے علالت شروع ہوئی تھی، جمعہ، سنیچر، اتوار تین روز پورے علالت میں گذرے، پیر کے دن ظہر سے قبل وفات ہوئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حافظ نے نماز عشاء کی شرکت سے بھی انکار کیا ہے جبکہ امام بخاریؒ کی ۵-۶، روایات سے بھی حضور علیہ السلام کے حجرۂ شریفہ سے نکلنے اور نماز کے علاوہ خطبہ دینے کا بھی ثبوت موجود ہے، مگر بڑا مغالطہ حدیث ابن انسؓ: ۶۵۱، سے ہی لگا ہے جو اس وقت سامنے ہے کیوں کہ اس کے شروع میں اگرچہ نماز عشاء کا ذکر صراحتاً موجود ہے مگر آگے راوی نے نمازِ ظہر کا بھی ذکر کر دیا ہے، اس سے حافظ نے عشاء کی شرکت ہٹا کر ظہر کی شرکت ثابت کر دی ہے اور علامہ عینی بھی یہاں چوک گئے کہ انہوں نے بھی غسل کے واقعہ میں ظہر کی نماز تسلیم کر لی، حالاں کہ اس واقعہ کا کوئی تعلق نماز ظہر سے نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جس عمدگی کے ساتھ اوپر کی محدثانہ بحث فرمائی ہے وہ بھی آپ کے طرزِ تحقیق اور ریسرچ کا ایک نمونہ ہے اور عجیب بات یہاں یہ بھی ہے کہ ہمارے اکابر میں حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے بھی لامع الدراری اور اس کے حاشیہ میں اشکالِ مذکور اور اس کے حل کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ حضرتؒ کی عادت مبارکہ تھی کہ کسی اشکال کے موقع سے خاموشی سے گذرنے کو گوارہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ گویا حضرت حل مشکلات ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔

(۴) قولہ فَیُصَلِّیْ عِنْدَ الاُسطوانَۃ التی عِنْدَ المُصْحَفِ (بخاری ص: ۷۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں علامہ عینیؒ اور حافظ الدنیا ابن حجرؒ دونوں سے غلطی ہوگئی کہ اس اسطوانہ کو جو مصحف کے پاس تھا، اسطوانہ مہاجرین سمجھے شاید مخلقہ ہونے کی

وجہ سے مغالطہ لگا ہو، علامہ سمہودیؒ نے اس بارے میں اپنے استاذ حافظ ابن حجر کا رد کیا ہے اور کہا کہ وہ دوسرا تھا، اسطوانہ مہاجرین نہیں تھا۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ میرے نزدیک علامہ سمہودی کا قول اس بارے میں زیادہ معتبر ہے، علامہ نے اپنی کتاب وفاء الوفا میں، ج:۱،ص:۲۶۲، سے ج:۱،ص:۳۲۱ تک متعدد جگہ پوری تحقیق کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ مصحف شریف کے قریب والے جس اسطوانہ کا ذکر یہاں بخاری شریف میں ہوا ہے وہ اسطوانہ علم المصلی الشریف تھا اور درمیان میں ج:۱،ص:۲۶۴ میں اپنے استاذ محترم حافظ ابن حجرؒ کی غلطی مع وجوہِ اشتباہ بیان کر کے تصحیح کا حق ادا کر دیا ہے۔ پوری بحث اور اسطوانات کی تحقیق نقشہ کے ساتھ انوار الباری، ج:۱۲ میں درج ہوئی ہے۔

(۵) امام بخاریؒ کے رفع یدین پر اتفاقِ صحابہؓ کے دعوے کی حقیقت

حضرت شاہ صاحبؒ نے نیل الفرقدین، ص:۸۷، میں لکھا کہ امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ رفع الیدین میں دعویٰ کیا ہے کہ تمام صحابہؓ رفع یدین پر متفق تھے اور کسی سے ترک کا ثبوت نہیں ہوا۔ یہ امام بخاریؒ کا حسب عادت مبالغہ ہے کیوں کہ خود ان کے خلیفہ اور تلمیذ رشید امام ترمذیؒ نے ہی اس دعوے کے خلاف فیصلہ دیا ہے، انہوں نے لکھا کہ ترکِ رفع کے قائل بھی بہت سے اہل علم صحابہ وتابعینؒ تھے۔ اور وہی سفیان اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے رسالہ میں ثابت کیا کہ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ اور تابعین میں سے اصحاب علی وابن مسعود، جماہیر اہل کوفہ، بہت سے اہل مدینہ اور دوسرے اہل بلاد سے بھی ترکِ رفع ثابت ہے۔

اس کے ساتھ اس مسئلہ میں ابن حزم اور ابن قیم کی غلطیوں کی طرف بھی اشارات کئے ہیں، اور حضرت کے رسائل فصل الخطاب، نیل الفرقدین وکشف الستر کا مطالعہ کر کے ہر مشتغل بالحدیث حضرت کی نہایت بلند پایہ محدثانہ تحقیقی شان سے واقف ہو سکتا ہے۔

حضرتؒ نے اس موقع پر بھی یہ فرمایا کہ عجیب شان ہے کہ بخاری میں تو زیادہ نہیں کھلے،

مگر اپنے رسائل قراءت ورفع یدین میں حنفیہ کے خلاف خوب تیز کلام سے کام لیا ہے۔

(۶)باب اذا اُقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الاّ المکتوبۃ (بخاری:۹۱)

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہاں امام بخاریؒ سے دو غلطیاں ہوگئیں ایک تو یہ کہ حدیث الباب کی روایت مالک بن بحینہ سے کی، حالاں کہ وہ مسلمان بھی نہ ہوا تھا اور صحیح یہ ہے کہ یہ روایت مالک کے بیٹے عبداللہ نے کی ہے، جو صحابی تھے، اور ابن ماجہ میں روایت ان ہی سے کی ہے جو صحیح ہے، دوسری غلطی یہ کہ بحینہ کو مالک کی ماں کا ذکر کیا گیا ہے حالاں کہ وہ مالک کی بیوی اور عبداللہ کی ماں ہے۔

پھر فرمایا کہ میرے نزدیک شارع علیہ السلام کا منشا اقامت صلوٰۃ کے بعد دوسری نماز کی ممانعت مسجد کے اندر ہے اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کا مذہب جواز فی الخارج کا ہے اور نظر شارع میں داخل مسجد وخارج مسجد کے احکام الگ الگ ہیں۔ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ اقامت صلوٰۃ کے بعد کوئی دوسری نماز مسجد کے اندر پڑھ سکتا ہے نہ باہر۔ حالاں کہ راوئ حدیث حضرت ابن عمرؓ کا فتویٰ موطا امام مالک میں اور دوسرے راوی حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ معانی الآثار میں موجود ہے کہ صبح کی دو رکعت خارج مسجد پڑھی جائیں اگرچہ امام نے نماز فرض شروع کردی ہو۔ پھر یہاں ایک حدیث صحیح ابن خزیمہ کی بھی ہے جو عمدۃ القاری، ج:۲، ص:۱۷۱ میں نقل ہوئی ہے کہ حضور علیہ السلام اقامت نماز کے وقت نکلے تو لوگوں کو دیکھا کہ جلدی جلدی دو رکعت پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ دو نمازیں ایک ساتھ؟ پھر آپ نے ممانعت فرمائی کہ اقامت ہوجائے تو مسجد میں دوسری نماز نہ پڑھی جائے۔

حافظ کے سامنے صحیح ابن خزیمہ کا قلمی نسخہ تھا، جس کے حوالے وہ دوسری جگہ دیتے ہیں، مگر یہاں اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ تاریخ بخاری ومسندِ بزار وغیرہ کا حوالہ دیا ہے، جس میں مسجد کا ذکر نہیں ہے۔

(۷)بابُ دخُول المشرک فی المسجد (بخاری:ص:۶۷)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مشرک کے دخول مسجد کے مسئلہ میں اکابر امت کا

اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک مطلقاً جواز ہے، مالکیہ کے یہاں مطلقاً عدم جواز، شافعیہ تفصیل کرتے ہیں کہ مسجد حرام میں ممنوع اور دوسری مساجد میں جائز (عمدۃ القاری) امام محمدؒ کے نزدیک بھی شافعیہ کی طرح مسجد حرام میں دخول مشرک ناجائز ہے، جیسا کہ سیر کبیر اور شامی میں ہے۔ امام احمدؒ سے دو روایت ہیں ایک یہ کہ مطلقاً ہر مسجد میں ناجائز ہے، دوسری یہ کہ امام وقت کی اجازت سے جائز ہے، لیکن حرم میں داخلہ کسی حالت میں درست نہیں جیسا کہ مغنی میں ہے۔

لہٰذا حدودِ حرم کی تمام مساجد میں بھی داخلہ جائز نہ ہوگا اور اسی پر اس وقت حکومت سعودیہ کا عمل بھی ہے۔ پھر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام محمد کا مذہب ہی اختیار کرنا چاہیے جو نص قرآن مجید کے ساتھ زیادہ موافق اور دوسرے ائمہ سے زیادہ اقرب ہے، اور حضرت نے اصول و قواعد کے تحت بھی اس مسلک کی مفصل دلائل سے تائید کی۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت کی ایک خاص شان تحقیق یہ بھی تھی کہ ائمۂ حنفیہ میں سے اگر وہ کسی کی رائے کو اپنی نظر میں کتاب و سنت سے زیادہ قریب اور دوسرے مذاہب ائمۂ مجتہدین سے اوفق دیکھتے تھے تو اسی کو ترجیح دیا کرتے تھے، خواہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے خلاف ہی ہو، جس طرح مسئلۂ زیر بحث میں کیا، جبکہ عام طور سے دوسری شان اختلافی مسائل میں یہ بھی تھی کہ امام صاحب کی رائے کو ہی ترجیح دیا کرتے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کا بھی مقولہ نقل ہوا ہے کہ میرے نزدیک جس مسئلہ میں امام صاحب دوسروں سے الگ اور منفرد ہوتے ہیں وہاں امام صاحبؒ کی رائے سب سے زیادہ قیمتی اور وزنی ہوتی ہے۔

(۸) حدیث صحاح، بخاری وغیرہ انّی لاراکم من وراء ظہری

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ حضور علیہ السلام کا اپنے پیچھے بھی آگے کی طرح دیکھنا جو اس حدیث سے ثابت ہے، بطورِ معجزہ تھا، اور فلسفۂ جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ قوت باصرہ تمام اعضائے جسم میں موجود ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دنیا میں سائنس و طبعیات میں جو حیرت

انگیز ترقیات ہوئی ہیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں ان کی نظیریں موجود ہیں اوران کے معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لئے ظاہر کرائیں کہ یہ آئندہ امت کی ترقیات کے لئے تمہید ہوں، اور فرمایا کہ "ضرب الخاتم" میں ہے

وقد قيل ان المعجزات تقدم☆ بما يرتقى فيه الخليفة فى المُدىٰ

اسی کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے حضرت شاہ صاحبؒ سے ایسے امور میں کافی استفادہ کیا تھا وہ خود بھی فلسفۂ یونانی واسلامی کے ساتھ عہدِ حاضر کے فلسفۂ مغرب سے خوب واقف تھے، اس کے علاوہ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا، انہوں نے اپنے مشہور چھ انگریزی لکچروں کی تیاری میں بھی حضرتؒ سے کافی مدد لی تھی۔

ایک دفعہ حضرتؒ نے خود فرمایا تھا کہ جتنا استفادہ جدید معلومات کے سلسلہ میں مجھ سے ڈاکٹر اقبالؒ نے کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا، نیز فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب علوم قرآن وحدیث پر کافی دسترس رکھتے تھے، اور انہوں نے مولانا میر حسن صاحب سیالکوٹی مرحوم سے باقاعدہ پڑھا تھا"۔

علم اصول وعقائد میں حضرتؒ کا علمی وتحقیقی مقام

حضرت شاہ صاحبؒ نے دربارۂ مسائل اعتقادیہ اپنے رسائل اکفار الملحدین عقیدۃ الاسلام اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح میں جمہور سلف وخلف کے عقائد کی تائید میں مفصل دلائل تحریر فرمائے ہیں۔ صحیح بخاری کتاب التوحید اور ابوداؤد کی کتاب السنۃ کے ذیل میں ذات وصفات باری عزاسمہٗ پر کافی وشافی بحثیں فرمائی ہیں۔

آپ نے مشکلات القرآن، ص:۱۴۹ میں محدث ابن خزیمہ کی کلامی خامیوں اور غلطیوں کی طرف بھی اشارات کئے ہیں، جن کے اتباع میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ نے باب عقائد میں متعدد فاحش غلطیاں کی ہیں۔

اشاعرہ شیخ اکبر اور دوسرے اکابر صوفیہ کے بارے میں علامہ ذہبی اور ابن تیمیہ وغیرہ

سے جوافراط وتفریط عمل میں آئی اس پر بھی حضرتؒ نکیر فرمایا کرتے تھے اس فن کی غایت اہمیت کے پیش نظر ضروری تھا کہ مثال کے طور پر کچھ ارشاداتِ انوری نقل کئے جاتے مگر مضمون کی طوالت کے خیال سے ترک کئے گئے۔ انوار الباری کے متعدد مواقع میں تفصیلات ملاحظہ کی جاسکیں گی۔ انشاء اللہ۔

علم فقہ میں حضرتؒ کا علمی مقام

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر علم میں اپنی رائے رکھتا ہوں مگر فقہ میں نہیں اور حضرت چوں کہ تمام فقہائے امت کے مدارج واقدار سے پوری طرح واقف تھے اس لئے ترجیح کا طریقہ جلالتِ قدر ہی کی بناء پر فرمایا کرتے تھے۔ کسی فقیہ کا کوئی فیصلہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تو فوراً فرماتے کہ ان سے زیادہ درجہ کے فلاں فقیہ کی رائے دوسری ہے وہ اختیار کی جائے گی۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء نے صرف نزاع وجدال کی صورتوں کے لئے احکام لکھے ہیں، باہمی مسامحت والے معاملات کے لئے نہیں۔ اس لئے ان میں شدت نہ کی جائے۔

مثلاً فقہاء نے لکھا ہے کہ قربانی کے حصوں کا گوشت تول کر تقسیم کیا جائے۔ اس پر فرماتے تھے کہ اگر کمی بیشی کی وجہ سے باہم دلوں کے اندر خیال وملال پیدا نہ ہو تو وزن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۱۹۲۷ء میں حضرت نے جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کے خطبۂ صدارت میں دارالحرب، دارالاسلام ودارالامان کی فقہی تشریحات کیں۔ حب وطن کی شرعی حیثیت واضح کی۔ آیات سورۂ بقرہ "اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّم من المشركين ثم لم ينقصوكم شيئًا ولم يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُم" اور "فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ" سے۔ نیز حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ذمة المسلمين واحدة يسعى بها ادناهم وغیرہ سے استشہاد کر کے ثابت فرمایا کہ اگر ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ برابری حقوق اور شرع اسلامی کے تحفظ کی بنیاد پر کوئی معاہدہ ہو اور وہ اس پر صدق

دلی کے ساتھ پابند بھی ہوں تو باہر سے کسی اسلامی حکومت کے حملہ کا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ نہ اسکو ایسے اقدام کا حق ہے۔ نہ مسلمانانِ ہند اس کا ساتھ دیں گے، مسلمانوں کا اسلامی فرض ہے کہ وہ معاہدہ کے تحت ملک کے ساتھ پوری وفاداری برتیں۔

مقالہ ضرورت سے زیادہ طویل ہوگیا اس لئے معافی چاہتا ہوں میرا مقصد یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نہایت ہی رفیع وبلند علمی مقام کی کچھ نشاندہی کروں، کیوں کہ میں حضرتؒ کو بحیثیت مذکورہ نوادرامت میں سے ایک نادرہ خیال کرتا ہوں اور جتنا بھی حضرت کے علوم وفادات میں غور وفکر کرنے کا موقع میسر ہوا اور ہو رہا ہے میرے دل ودماغ پر آپ کی عبقریت، آپ کی انفرادیت ولامثالی شان کا یقین واذعان بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر چہ میں اس کے اظہار وبیان پر کما حقہ قادر نہیں ہوں۔

حضرت کے علوم کمالات پر نفحۃ العنبر حضرت مولانا بنوری مرحوم، حیات انور (مرتبہ مولانا ازہر شاہ قیصر) ''مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی حیات اور علمی کارنامے'' (دکتور قاری محمد رضوان اللہ) اور ''الانور'' (فاضل نو جوان عبدالرحمٰن کوندو کشمیری) میں کافی اور وافی ذخیرہ آچکا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ کی ضرورت ہے اور سب سے بڑی ضرورت حضرتؒ کی شایانِ شان علمی یادگار کی ہے۔ اگر آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ اس طرف توجہ کرے تو یہ اس کا عظیم کارنامہ ہوگا۔

میں محترم المقام شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر وچیئرمین آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ کے اس سیمینار کو منعقد کرنے کے اقدام کو مستحق صد تحسین وتبریک سمجھتا ہوں اور سب ہی کارپردازان سیمینار کے شکریہ پر اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

حضرت علامہ کے درسِ حدیث کی خصوصیات

از: جناب مولانا انظر شاہ کشمیری

استاذ تفسیر وحدیث دارالعلوم دیو بند

حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری المغفور پر دانشوروں کے اس اجتماع میں میرے مقالہ کا عنوان ''علامہ کے درسِ حدیث کی خصوصیات'' ہے۔

یہ موضوع بجائے خود نہایت وسیع اور مرحوم کی پوری زندگی پر حاوی ہے، چوں کہ علامہ کی زندگی علمی زندگی اور آپ کا تعارف علم ودانش کی وادیوں میں مسلسل سفر سے تعبیر ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ کے منفرد اجتہادی درس کا حقیقی رنگ درسِ حدیث ہی میں نمایاں ہوا۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دینی درسگاہوں کا منتہائے کمال حدیث کا درس ہے۔ غالباً یہ اس وجہ سے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا معاملہ قرآن کریم سے جدا اور ممتاز ہے، حالاں کہ قرآن کریم دین کا سرچشمہ، علوم کا بحرِ ذخار، معارف کا حسین آبشار ہے، ان خصوصیات کا تقاضا تھا کہ ہر قسم کی رفعتیں اور علم وتحقیق کے امتیازات قرآن ہی کے لئے خاص ہوں۔ لیکن قرآن مجید کا ثبوت اس قدر متواتر، غیر مشتبہ اور یقینی ہے کہ خاص وہ مباحث جو حدیث کے باب میں رد وقبول کے لئے چل پڑے ان سے ''القرآن'' کو سابقہ نہیں رہا، لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ قرآن سے اعتناء نہیں کیا گیا، اہل علم خوب جانتے ہیں کہ قرآنی علوم ومعارف میں بھی انکشافات، نکتہ سنجی، نکتہ آفرینی کا ایک چمن ہمارے کتب خانۂ علم کی دلفریب بہار ہے۔ لیکن حدیث کا فن جیسا کہ عرض کیا گیا وسیع تر ہوتا گیا حدیث ثابت ہے یا نہیں، ثبوت کے بعد پھر کس درجہ کی ہے، تعامل سلف مؤید ہے یا نہیں، شواہد موجود ہیں یا نہیں، اس کے رواۃ کس درجہ کے ہیں، کیا ان احادیث سے احکام کا استنباط واستخراج ہوتا ہے؟ پھر مختلف متضاد احادیث میں تطبیق، ترجیح وتاویل، رواۃ کی سوانح، ان کے تذکرے ایک ہی نام یا القاب میں شرکت ایسے اور اس طرح

کے دوسرے مباحث نے فن حدیث کو اہم حیثیت دینے کے ساتھ دشوار تر بنا دیا۔ نتیجتاً کسی دانشور کا کمال فن حدیث ہی میں نمایاں اور سند کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مزید برآں حدیث مذکورہ بالا حیثیتوں سے ہٹ کر کچھ اور رخوں سے بھی زیر بحث آگئی۔ مثلاً حدیث کی فصاحت وبلاغت، حدیث میں بدیع ومعانی کے فیصلے، صرفی ونحوی مباحث، مذاہب فقہیہ کا بیان۔ کسی ایک فقہی مکتبِ فکر کی ترجیح، وجوہِ ترجیح، احکام ومسائل کا استخراج، کلام مباحث، ضلالت پسند فرقوں کی تردید اور ان کے زلیغ وضلال پر حدیث کے سرمایہ سے بھرپور تردید، بلکہ حدیث کے رخ زیبا سے نقاب کشائی کرتے ہوئے ان انوار وتجلیات کی تشخیص وتعیین جن کی اس امت کو تا قیامت قدم قدم پر ضرورت پیش آتی رہے گی۔

ظاہر ہے کہ جب امت کے اساسی علوم وفنون میں حدیث کو قرآن کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے تو حدیث ہی سے کام لے کر دین ودنیا کے حوادث میں کوئی جچا تلا فیصلہ کرنا ہوگا، اس لئے ایک محدث درسِ حدیث میں صرف حدیث کی شرح، لغوی مباحث یا اسی طرح کے سامنے کے مسائل پر گفتگو نہیں کرتا بلکہ اس کی واقفیت وشناسائی دین کی تمام روایات وجوانب پر اتنی دبیز ہوتی ہے کہ اس کے فیصلے مبصرانہ اور اس کی آراء متوازن حیثیت اختیار کرتی ہیں اور درحقیقت مولانا انور شاہ ان ہی منتخب محدثین میں سے ہیں جن کی عبقریت وجامعیت ان کے لئے اسی اجتہادی مرتبہ کی سفارش کرتی ہے۔ ہندوستان میں درسِ حدیث کا جو رنگ حضرت شاہ ولی اللہ؁ سے قائم ہوا اس میں حدیث کے اصل وطن کی گہری چھاپ کے باوجود خود ہندوستان کے ماحول نے مختلف اضافے اور رنگ آمیزیاں کی ہیں، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں تقلید وعدم تقلید کے مسئلے کھڑے ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت شاہ صاحب کے قلم نے ''عقد الجید''۔ ''الانصاف'' جیسی وقیع کتابیں تصنیف کیں، مگر جو فتنہ اٹھ چکا تھا تدریس وتالیف کے حدود میں اس کا بھرپور مقابلہ ایسا نفع بخش نہ ہوا کہ فضا کا یہ غبار ہمیشہ کے لئے بیٹھ جاتا بلکہ دھواں پھیلتا رہا اور اس نے بڑھ کر بڑے حصہ کو اپنی تاریکی کے زد میں لے لیا۔ پھر ''شیعیت'' کا ہنگامہ قیامت خیز انداز میں نمودار ہوا ازالۃ الخفاء، تحفہ الاثنا عشری کی باوقعت جدوجہد بھی اس

بلائے بے درماں کو روکنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی۔ مزید برآں بدعت وسنت کی کشمکش میں ایک خاص جماعت کی اٹھائی ہوئی آندھی میلوں کی رفتار سے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی، اس ہنگامہ کے خلاف ہزاروں علماء کی مخلصانہ جدوجہد سنت اور اس کی اشاعتی مہم کا قیمتی سرمایہ ہے۔ تاہم آئندہ سطور سے معلوم ہوگا کہ اس گمراہی کی بیخ کنی واستحصال کی سعادت اس مکتبۂ فکر کے حصہ میں آئی جس سے علامہ کشمیریؒ کا دین و دانش ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے اور پھر جب ہندوستان میں خانہ ساز نبوت کا بلاخیز سیلاب امنڈ آیا تو اسکی سرکوبی کے لئے بھی اسی درسگاہ کی قوتِ علم وعمل کو حرکت میں آنا پڑا۔ ان تمام ہنگاموں بلکہ اس قبیل کے تمام فتنوں میں ''القرآن'' اور ''الحدیث'' کے مجموعہ سے تردیدی مسالہ بہم پہنچایا گیا، گویا کہ حدیث کی لگی بندھی بحثوں پر یہ وہ نئے اضافے تھے جنہیں دارالعلوم کے اجتہادی طریق درس نے نمایاں کیا۔

دارالعلوم دیوبند کا یہ تعارف کہ وہ ہند بشمول پاکستان میں ایک عظیم دینی ادارہ ہے، دارالعلوم کی وسعت، ہمہ گیری، اور اس کے ٹھوس و لگے بندھے فکر سے ناواقفیت ہے، یہ درسگاہ درحقیقت مکتبہء فکر ہے اس کے تاسیسی پس منظر میں کچھ اہم حقائق جلوہ افروز ہیں۔ جماعت دیوبند کے ایک عظیم مفکر مولانا عبیداللہ سندھی کا مقولہ ان حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ:

> ''دیوبند نام ہے اتباعِ سنت، اسکی اشاعت کی مجاہدانہ کوشش، حنفیت کی ترجیح و تفوق کا تقین اور اعلاء کلمۃ الحق کا جذبۂ بے قرار''

مفکر سندھی کا یہ ارشاد دارالعلوم کے عمومی جذبہ کا آئینہ دار ہے اور اس کا اثر اس کے اجتہادی طرزِ تعلیم میں بھرپور نمایاں ہے۔ درس میں کچھ تو وہ اضافے ہوئے جس کا سطور بالا میں مختصر ذکر آیا۔ اس کے علاوہ توسط واعتدال، تطبیق بین الاحادیث ترجیح فقہ حنفی، حدیث کے متعلق اس یقین کی آبیاری کہ وہ تعلیمات اسلامی کا سرچشمہ ہے یا حدیث کی اس نقطۂ نظر سے تعلیم کہ وہ متن قرآنی کی جامع شرح ہے اور ان سب کے ساتھ اسلام کی حقیقی روح کی نقاب کشائی اور اس کو اپنے واقعی پس منظر میں جلوہ طراز کرنے کی کاوش۔ دارالعلوم کی ان فکر

ی وعلمی خصوصیات کا اظہار یوں تو دارالعلوم کے روزِ تاسیس ہی سے شروع ہو گیا لیکن ان ممیّزات وخصوصیات کا بدرجۂ اتم ظہور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کے درس میں ہے۔اس دعوے کا صحیح ثبوت اس مرقع سے بہم پہنچے گا جو قلم انکے با اختصاص تلامذہ کے بیانات سے تیار کر کے پیش کرتا ہے۔راقم السطور نے اسکی کوشش کی ہے کہ اس منفرد تدریس کی اہم خصوصیات آپ کے سامنے آجائیں۔سب سے پہلے درس کی انفرادیت پر ان کے معروف ومشہور تلمیذ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی شہادت پیش ہے۔موصوف نے اپنے مقالہ برائے ''حیات انور'' میں تحریر کیا ہے:۔

''حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ حدیث میں کچھ ایسی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہ تھیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپکا اندازِ درس دنیائے درس وتدریس میں ایک عظیم انقلاب کا باعث ثابت ہوا''۔

اس کی مزید توثیق مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے پیش ہے، وہ شاہ صاحب مرحوم کی خصوصیات درس پر اپنے البیلے انداز رقمطراز ہیں:۔

''خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے، طلباء کتاب کی عبارت پڑھیں گے اور حضرت شاہ صاحبؒ اس عبارت کا ترجمہ ومطلب طلباء کو بتائیں گے لیکن پہلی مرتبہ درس کا نئے طریقہ کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ کا علم کا ایک بحر بیکراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں میرے دل ودماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا''

ہندوستان کی درس گاہوں میں درس کا جو روایتی طریقہ چلا آرہا ہے فاضل گیلانی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

''ایسے اساتذہ سے بھی پڑھنے کا موقع ملا تھا جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی؟ اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کی عادی تھے، صلوٰۃ کی شرح اور مختلف

امور کی طرف اس کا انتساب اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے۔ الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچے کے عمومی اجزاء کے متعلق سوال و جواب، ردو قدح کا موروثی سرمایہ جو حواشی و شروح میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اسی کو غریب طالب علموں پر پیش کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے۔"

صدیوں سے متوارث اس طریق تعلیم کی نشاندہی کے بعد یکایک فاضل گیلانی کو طرزِ تعلیم کا جو ایک نیا مشاہدہ و تجربہ ہوا اس کی کچھ تفصیل مولانا ہی کے قلم سے سنئے لکھا ہے کہ:

"لیکن الامام کشمیری نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو ایک خاص قسم کی دلچسپ، ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی، کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا تقریباً چالیس سال بعد اس کا دہرانا آسان نہیں لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظہ پر جہاں تک خیال کرتا ہوں اب بھی باقی ہے"۔

صحاحِ ستہ میں مسلم شریف کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس پر ایک مختصر تبصرہ کرنے کے بعد فاضل گیلانی لکھتے ہیں کہ:

"پہلے دن کے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکایک میرے سامنے آگئے"

گویا کہ علامہ کے درس کی پہلی اور بنیادی خصوصیت یہی جامعیت اور ایک ہی وقت میں علمی نوادر سے طلباء کے دامن دماغ کو لبریز کرنا تھا، پھر معلومات کا یہ وسیع افادہ کسی ایک ہی دائرہ میں بند نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق مختلف علوم و فنون سے تھا۔ متعلقہ موضوع کی مناسبت سے جب آپ ضمنی مسائل و مباحث کی طرف متوجہ ہوئے تو اسکا نام خود آپکی زبان پر "دفاع" تھا مولانا گیلانی ہی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

"یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم پذیر رہتا، کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے اسی کی مناسبت سے انکا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا تو فرماتے کہ دفاع ہو گیا، ان دفاعی مسائل میں صرف و نحو، معانی، بیان، بدیع وغیرہ فنون تک کے مسائل شامل تھے"۔

درس کی اس اہم خصوصیت میں محقق گیلانیؒ کے ساتھ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی یہ ہمنوائی بھی قابل غور ہے:

''حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحر ذخار ہونے کی وجہ سے درسِ حدیث صرف علوم حدیث تک ہی محدود نہ رہتا بلکہ ضمناً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی، اگر معانی و بلاغت کی بحث آتی تو محسوس ہوتا کہ علم معانی کا یہ مسئلہ واضع نے اسی حدیث کے لئے وضع کیا تھا، معقولات کی بحث چل نکلتی اور آپ معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث معقولات کے مسئلہ پر ہی تردید کے لئے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی، غرض اس نقلی و روایتی فن میں نقل و عقل دونوں کی بحثیں آتی اور ہر فن کے متعلق مقصد پر سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی، پھر علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہٖ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آجاتا تھا''۔

فاضل مقالہ نگار کے قلم نے اس داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی سنایا کہ:

''حضرت شاہ صاحب کا درسِ حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ منطق، ہیئت، ریاضی، سائنس الغرض تمام علومِ جدیدہ وقدیمہ پر مشتمل ہوتا''

گویا کہ معلومات کا بیش بہا خزانہ مختصر مدت میں طالبعلم اپنے لئے فراہم پاتا، ضمناً حدیث وقرآن سے متعلق شک وریب کے وہ کانٹے بھی دل و دماغ سے نکل جاتے جن کی خلش ایک مومن کے لئے انقباض ووحشت کا موجب ہے وہی پہلے دن کا درس جس کا قلمی خاکہ مولانا گیلانی کے قلم نے تیار کیا، اسکی تفصیلات میں موصوف نے اپنی بعض خلشوں کا ذکر کرتے ہوئے الامام کشمیری کی شفاء بخش تقریروں کی چارہ سازی اس عنوان سے بیان کی ہے:

اس وقت تک میرا تاثر یہ تھا کہ قرآن کے سوا بجز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی اور کا انتساب نہیں کیا جاسکتا، گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی اور یقین کی قوت سے محروم ہے۔

ایک مولانا گیلانی ہی کیا خیر القرون کے اختتام کے ساتھ ہی دین کے اسی انتساب کے بارے میں نہ جانے کیسے کیسے ہولناک مغالطوں میں عوام مبتلا کر دیئے گئے اور عصر حاضر کے مہیب فتنوں میں تو حدیث کو عجمی سازش قرار دیکر دیدہ و دانستہ دین کے اہم و بنیادی ستون ہی پر حملہ کر دیا گیا، عجمی سازش کا شوشہ چھوڑنے والوں نے اپنی چابک دستیوں سے لیکر ہیچ پوچ دلائل اس مقصد کے لئے تلاش کئے ہیں انہیں سے مرعوب ہو کر بلا مبالغہ لاکھوں تک تعداد ان سادہ لوح مسلمانوں کی پہنچتی ہے جو صاحب شریعت کی جانب حدیث کا انتساب مشتبہ گردان رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کے خدام درس کے حلقوں میں بھی اس زہر کا تریاق بہم پہنچاتے رہیں۔ یقین ہے کہ اگر طلباء کے ذہنوں میں دلائل کے ساتھ یہ بات ڈال دی گئی کہ حدیث کوئی عجمی سازش نہیں بلکہ ایک بنیادی عنصر ہے اور مناسب ہتھیاروں سے انہیں مسلح کر دیا گیا تو منکرین حدیث کی زہر چکانیوں کا شافی علاج ہو سکے گا۔ الامام کشمیری کو خدا تعالیٰ نے فتنوں کو بھانپ لینے اور انکا ضروری مقابلہ کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ بالکل ابتدائی مرحلوں میں طلباء کے روبرو حجیت حدیث کے موضوع پر ایسی فاضلانہ تقریر فرماتے جس سے حدیث کی حجیت ایک حقیقت نظر آتی، ممدوح گیلانی نے تفصیل سناتے ہوئے بتایا ہے کہ:

"پہلا دن تھا جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا تواتر طبقہ، تواتر عمل، تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سنا، سمجھا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعوی عام کتابوں میں کیا جاتا ہے یہ دعوی صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے، ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ، تواتر عمل اور تواتر مشترک کی راہ سے منتقل ہو کر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہنچا ہے اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے (۱)"

(۱) تواتر کی ان اقسام چہارگانہ کو مرحوم گیلانی ہی کی الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً ان ہی باتوں میں ہوئی ہے جو روایت کی راہ سے منتقل ہوئی ہوں لیکن ایسی بات کہ شاہ جہاں ہندوستان کا

دین کے اس اہم اور ضروری عنصر پر جو فاضلانہ دلائل بہم پہنچائے گئے ان کو سن کر مرحوم گیلانیؒ نے اپنے متعلق یہ شہادت دی ہے۔

''یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا نظام میرے لیے یقینی وقطعی ہوگیا اور جیسے جیسے تمیز وشعور میں عمر کے لحاظ سے اضافہ ہوا بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا''۔

خاکسار نے ابھی عرض کیا تھا کہ درسی افادات میں معلم واستاذ اس نہج پر اگر دماغوں کی آبیاری کرتے رہے تو دین کی جانب سے دفاع کرنے والوں کا جو مضبوط حلقہ قائم ہوگا وہ درس گاہوں سے لی ہوئی روشنی سے ہمیشہ کام لیتا رہے گا، چنانچہ فاضل گیلانی نے اپنے متعلق خود لکھا ہے کہ:

''خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا''۔

بلکہ ـــــ ''مسلمانوں کے دینی اختلاف کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا''۔

بہر حال درس میں جامعیت اور وسیع ترین افادی معلومات جو شاہ صاحب کی دُربار زبان سے ظاہر ہوئے اس سے جہاں ایک فائدہ وہ تھا جسے مولانا محمد طیب صاحب نے لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ:

حکمراں تھا یا سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنیوالے انکے کون ہیں جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر مثلاً پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے، سال میں جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ مسلمانوں کو رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جسے مسلمان ہی نہیں، بلکہ جو مسلمان نہیں ہیں ان کے نزدیک بھی اسلام کے یقینی عناصر ہیں۔ یہی تواترِ عمل کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت، اگرچہ گزرے ہوئے واقعات ہیں لیکن انکی تفصیلات مثلاً حاتم کی طرف سخاوت پر یا رستم کی بہادری کے جو قصے مشہور ہیں ان قصوں کا یقین ہونا تو ضروری نہیں لیکن ان قصوں کا قدر مشترک یعنی حاتم سخی تھا، رستم بہادر آدمی تھا اس قدر مشترک کے یقینی ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ الاستاذ العثمانی مولانا شبیر احمد مرحوم نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کی ان قسموں کا ذکر کر کے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ حضرت علامہ کشمیری ہی سے یہ بات سننے میں آئی ہے:

''اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لیکر اٹھتا اور اس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی کہ وہ بضمن کلام خدا اور سول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے۔ یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیری نے اختیار فرمایا''۔

مولانا طیب صاحبؒ ہی کے قلم نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک ملفوظ سے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا کہ درس کا آپ کا یہ اجتہادی طرز دورِ حاضر کے فتنوں کے مقابلہ کی سوچی سمجھی تیاری تھی۔ چنانچہ آپ خود درس میں طلباء کو مخاطب کر کے فرماتے:

''بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے''

موصوف کے اس ارشاد سے یہ واضح ہوا کہ درس میں مختلف عنوانات سے متعلق تقریر اپنے علم کا اظہار یا اپنے تبحر کا مظاہرہ نہیں تھا، بلکہ آپ طلباء کو نت نئے فتنوں کے مقابلہ میں اس طرح مسلح کر دینا چاہتے تھے کہ وہ دین کی جانب سے دفاع کر سکیں۔ آج دارالعلوم کی ممتاز پچاس سالہ تاریخ جس کی ابتداء آپ کی تدریس و تعلیم سے ہوتی ہے، شاہد ہے کہ آپکی درسگاہ سے نکلے ہوئے فضلاء اپنی اپنی جگہ دین کی حمایت و نصرت میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ بہرحال مرحوم کی درسی خصوصیات میں سے اب تک دو بنیادی خصوصیات کا ذکر آیا۔ آپ کے درس کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے جس کے ناقل ملک کے مشہور عالم و فاضل مولانا محمد ادریس کاندھلوی شارح مشکوۃ و شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ہیں۔ حسب معمول مولانا کاندھلوی نے اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس تفصیل کے بغیر مولانا کا مقصد واضح نہیں ہوتا۔ اس لئے خاکسار بھی مفصل پیش کرتا ہے، لکھا ہے کہ:

''دنیا کے علم میں خیر و شر، محمود و مذموم کی تقسیم ہے مگر آخرت اور دین کے علم میں یہ تقسیم نہیں، آخرت اور دین خداوندی کا علم خیر ہی خیر اور محمود ہی محمود ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اول مرتبہ ایمان و اسلام کا ہے اور اس کے بعد علم دین کا ہے''

اس کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ علم کے لئے دو قوتیں درکار ہیں ایک قوت فہم دوسری قوت حافظہ۔ تحریر فرمایا کہ:

''حضرت شاہ صاحب مرحوم کو خدا تعالیٰ نے ان تمام قوتوں سے اس طرح سرفراز فرمایا تھا کہ عالم میں اس وقت اس کی نظیر نہیں''۔

بلکہ طبقہ علماء میں آپ کی خصوصیت وامتیاز یہ تھا کہ:

''جب کوئی عالم کسی مسئلہ میں شاہ صاحب کی طرف مراجعت کرتا تو مسئلہ کا مادہ اس کے سامنے کر دیتے اور اس کے بعد اپنا فیصلہ بھی بتا دیتے کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں میری رائے یہ ہے''

جس کا حاصل یہی نکلا کہ خام علم اور ناپختہ آگہی کے جو مظاہر آئے دن ہمارے سامنے رہتے ہیں کہ اگر کسی سے کوئی بات پوچھی جائے تو اول تو بیچارہ شاید اس علم کے بارے میں ظنی وتخمینی رائے بھی نہ رکھتا ہو اور اگر مختلف اقوال نقل بھی کر دے تو راجح اور مرجوح کی تعیین سے بہر حال محروم ہی ہوگا، لیکن علامہ کا یہ حال تھا کہ:

''ہر مسئلہ آپ کے نزدیک طے شدہ تھا، اختلافِ اقوال کی وجہ سے تذبذب اور تردد نہیں بلکہ راجح اور مرجوح متعین رہتا''۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا کاندھلوی اپنے جلیل القدر استاذ کی جس خصوصیت کا ذکر کر رہے ہیں وہ فنی مہارت اور علمی حذاقت کی دوسری تعبیر ہے، نقول کے انبار سے کار آمد چیز اٹھا لینا اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ علم ملکہ راسخہ نہ بن جائے۔ اس خصوصیت کے بعد فاضل مضمون نگار نے شاہ صاحب کے خداداد فہم کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''فہم کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کی اصل اور اس کا سرا معلوم تھا، اصل کلی کے بتلا دینے کے بعد یہ بتلا دیتے تھے کہ فلاں فلاں مسئلہ اس اصل پر متفرع ہے اور ان مسائل مختلف فیہ میں ما بہ الاشتراک اور ما بہ الاختلاف یہ ہے''

ظاہر ہے کہ اختلاف اور قدر مشترک کی بنیادوں کو متعین کرتے ہوئے مسئلہ کی روح پر اطلاع خود مولانا کے الفاظ میں کہ ''یہ طریق نہایت دقیق اور عمیق ہے''

تاوقتیکہ اختلافِ علماء کے پس منظر پر پوری اطلاع نہ ہو تمیز و امتیاز کی یہ قوت و صلاحیت ممکن نہیں۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

''جب تک روایاتِ مختلفہ میں فقہائے کرام کا منشاء خلاف اور سبب اختلاف معلوم نہ ہو مسئلہ کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی''۔

اس کے بعد فاضل کاندھلوی نے علامہ کے درس حدیث کی بنیادی خصوصیات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے یہ بھی سنایا کہ:

درسِ حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے، کوشش اسکی فرماتے کہ حدیث کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے۔

یہ اس لئے کہ ''اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً و رتبۃً مقدم ہیں''۔

اور یہ ساری کوشش اس لئے ہوتی کہ ''حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلافِ ادب ہے''

جو شخص مسائل و مباحث میں ان بنیادی اصول پر پوری بصیرت رکھتا ہو جس اصل پر یہ مسائل پھیلے ہوئے ہیں، اسکی تعلیم و تدریس افادی نقطۂ نظر سے بڑی جامع ہوگی، قوت حافظہ نقول کی حد تک طلباء کے سامنے اقوال کا انبار لگا سکتی ہے لیکن فہم ثاقب کی جلوہ طرازیاں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ علامہ مرحوم کے درس کی یہی بڑی خصوصیت تھی کہ آپ اقوال میں اپنے خداداد فہم سے کام لیکر ترجیح بھی جاری فرما سکتے تھے۔ مولانا کاندھلوی نصف صدی سے درس گاہی ضرورتوں پر تام اطلاع رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کی نظر درس کے اس امتیازی پہلو پر جا پہنچی جو طلباء کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے۔ حدیث، قرآنی بیانات و مضامین کی ایک واقعاتی تشریح ہے۔ غالباً اسی لئے الشافعی الامام کو کہنا پڑا کہ قرآن جس قدر حدیث کا محتاج ہے، حدیث اتنی قرآن کی نہیں، او کما قال۔ مطلب اس کا یہی ہوا کہ قرآن کے مجملات کو حدیث ہی سے سمجھنا ممکن ہے جبکہ حدیث بجائے خود اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اس کی مراد کی تعیین کے لئے کوئی تشریح درکار نہیں۔ اس اہم حقیقت کے پیش نظر علامہ نے درس میں اس کا بھی اہتمام فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی ان آیات کی تعیین فرمادیں جو حدیث

کا ماخذ یا حدیث جن اجمال کی شرح ہے، مولانا کاندھلوی لکھتے ہیں کہ:

''حدیث نبوی کا مآخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے''۔

اس التزام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ:

''بہت سی مشکلات قرآنیہ کو حل فرمادیتے''۔

گویا کہ آپ کا درس حدیث ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ دین کی اولین اور اہم بنیاد قرآن مجید کو بھی حل فرما کر طلباء کی واقفیت کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا۔ مولانا گیلانی نے اپنے فاضلانہ مقالہ میں شاہ صاحب کی اس درسی خصوصیت کا خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم سے متعلق آپ کے مخصوص نظریات کا ذکر کیا ہے۔

معلوم ہے کہ حدیث کی صحت وعدم صحت تمام تر راویوں کے احوال پر قائم ہے اور اسی ضرورت سے اسماء الرجال نامی فن کو محدثین نے ایجاد بھی کیا اور اختیار بھی، حدیث کی یہی وہ ضرورت ہے جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر ارشاد کے ساتھ سند کا طویل اضافہ کردیا گیا، افسوس کہ آج ہماری درس گاہوں میں جن بنیادی علوم وفنون سے صرفِ نظر کی جارہی ہے، ان میں اسماء الرجال بھی ہے۔ اسماء الرجال ہی کی طرح اس کا دوسرا ضروری شعبہ جرح وتعدیل بھی اکثر چھوڑ دیا گیا۔ مذہبی وفقہی تعصب کی بناء پر بہت سی وہ روایتیں قبول کرلی جاتی ہیں جو کسی خاص مکتبۂ فکر کی تائید کرتی ہوں، حالانکہ اگر فنی نقطۂ نظر سے جانچ پڑتال کی جائے تو سلسلۂ سند میں وہ شخصیتیں نظر آئیں گی جنکی حیثیت مجروح ہے، یا ان روایات پر ناروا جرح کا دفتر ہی ملے گا جس کی روایت کسی ناپسندیدہ فقہی اصول کی تائید کرتی ہو اس لئے کوئی بالغ النظر عالم ہی ردوقبول کے ان ناملائم فیصلوں پر انصاف کی بات کہہ سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے فنون کو ان درسگاہی علوم میں داخل کیا جاتا جن کی باقاعدہ تعلیم دی جارہی ہے، مگر اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے فن سے اس غفلت کا کیا شکوہ، درسگاہوں میں تو اصولِ حدیث کے فن کو بھی بڑی حد تک ترک کردیا گیا۔

بقول شاعر ؎ دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

حافظ ابن حجر عسقلانی کی ''نخبۃ الفکر'' اصولِ حدیث میں ہماری درس گاہوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اس کی بھی تعلیم جس لئے دیئے انداز میں ہوتی ہے اس سے کچھ ہمارے طلباء ہی واقف ہیں۔ بہر حال شاہ صاحب مرحوم نے حدیث کی اس بڑی ضرورت کا خیال فرما کر راویوں سے متعلق مناسب تفصیل کا بھی التزام اپنے درس میں فرمایا۔ اسی سلسلہ میں مولانا کاندھلوی کا بیان ہے:

''اسماء الرجال پر کلام فرماتے خصوصاً جن رواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے، جرح و تعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنا قول فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول ہے اور یہ کہ اس کی روایت حسن کے درجہ میں رہے گی یا صحیح کے درجہ میں یا قابل رد ہوگی یا قابل اغماض، زیادہ تر فیصلہ کا یہ طریقہ ہوتا کہ جب کسی راوی کے جرح و تعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ فرماتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے''

اسماء الرجال کا یہی فن جو قوت حافظہ کا مطالبہ کرتا ہے اور ساتھ ہی وسعت مطالعہ کا بھی، حدیث کے طول و طویل دفتر میں ناقدین نے جہاں کہیں کسی راوی کی تعدیل کی ہے اور پھر کسی مذہبی عصبیت کی بنا پر اسی راوی کو مجروح قرار دیا ہے اس کی تعدیل سے فائدہ اٹھانے کے لئے حدیث کے پورے ذخیرہ پر واقفیت کی ضرورت ہے۔ خدا تعالی نے آپ کو یادداشت کی غیر معمولی قوت کے ساتھ جو وسعت نظر عطا فرمائی تھی اس سے کام لیکر احناف کے لئے مفید روایتوں اور راویوں سے آپ کام لیتے اور سلسلہ میں شافعی المسلک علماء کی زیادتی پر خصوصی توجہ دلاتے جس کا مقصد احناف کے لئے مفید روایت اور رواۃ کی بیخ کنی ہوتا حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری سے آپ کی غیر معمولی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جبل العلم، حافظ الدنیا سے آپ کا اشارہ ابن حجر کی جانب ہوتا، لیکن جب محسوس فرماتے کہ ابن حجر دانستہ کف لسانی سے کام لے رہے ہیں اور حنفیہ کے لئے کسی مفید روایت سے سرد مہری کا معاملے کر رہے ہیں تو ابن حجر کے اس طرز کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے جو آنکھوں کو گردش دیکر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اختلافی حدیثوں کے بارے میں شوافع کے یہاں اصح مافی الباب (یعنی اس

باب میں سب سے زیادہ صحیح حدیث یہ ہے) کا جو ترجیحی طریقہ جاری ہے اس کا جب کبھی ذکر آتا تو فرماتے کہ لیجئے علماء شافعی نے پٹھے ٹٹولنے کا کام شروع کر دیا۔ اس علمی لطیفہ کی دلچسپ تفصیل فاضل گیلانی سے سنئے، لکھتے ہیں کہ:

''اسماء الرجال کی کتابوں کو اٹھا کر راوی پر جرح کر کے مخالف کی حدیث کو نا قابل لحاظ بنا دینا اور صرف رجالی رجسٹروں کی مدد سے کسی روایت کو ترجیح دینا اور آثارِ صحابہ، قرآنی آیات کے اقتضاء اور اسلام کے کلی قوانین و اصول سے چشم پوشی حضرت شاہ صاحب شافعیوں کے اس طرز کو روایتوں کی ترجیح میں پسند نہیں فرماتے تھے، جرح کے لئے رجالی رجسٹروں میں راوی کی کمزوریوں کو ٹٹولنا اسی کا نام انہوں نے پٹھا ٹٹولنا رکھ لیا تھا، فرماتے کہ یہ قصابوں کا کام ہوا کہ جو جانور کمزور نظر آیا اسی کو پٹخ کر ذبح کر ڈالا''۔

عرض کر چکا ہوں کہ فن حدیث کا یہ اہم ترین شعبہ یعنی اسماء الرجال غیر معمولی اہمیت کا مقتضی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ حجاج بن ارطات کی ایک روایت جو کسی مسئلہ میں احناف کے لئے مفید ہے، شوافع نے روایت کو نا قابل قبول ٹھہرانے کے لئے حجاج کی شخصیت پر جو تابڑ توڑ حملے کئے ہیں، ان میں ایک بڑا اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ وہ با جماعت نماز کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ علامہ نے فرمایا کہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ حجاج کو اس جرم کی وجہ سے متروک قرار دیا جائے درآنحالیکہ امام دار الہجرت مالک ابن انس ایک مدت تک مسجد میں تشریف نہیں لائے اور اس کے باوجود الامام کی روایتیں بدستور قابل قبول ہیں۔ حجاج کی مدافعت میں جو دقیقہ شاہ صاحب نے دریافت فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کس دقت نظری سے اس فن کا مطالعہ فرمایا تھا، غرضیکہ اسماء الرجال جو فن حدیث کا ایک نہایت ہی ضروری اور اہم عنصر ہے شاہ صاحب اس فن کی اہمیت کے پیش نظر درس میں اس کا باقاعدہ اہتمام فرماتے۔ اسماء الرجال ہی نہیں بلکہ درس میں جن تصانیف اور تالیفات کے حوالے پیش کرتے ان کے مصنّفین و مؤلفین کے حالات، مصنف کا علمی پایہ اور خود اس کتاب کی ثقاہت پر ایک جامع تبصرہ بھی ہوتا جس سے طلباء کو مختصر وقت میں سیر و سوانح کے ساتھ کتاب

کی علمی حیثیت بھی معلوم ہوتی اور اس طرز سے نئی کتابوں کے مطالعہ کا شوق و ذوق بھی پیدا ہوتا، فاضل گیلانی ہی لکھتے ہیں:۔

''وہ اپنے عہد کے طلباء کی علمی بے بضاعتوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوعِ درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے تھے مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے انکی ولادت و وفات سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات اور انکی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے۔ ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔ یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلباء انکے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز و سامان سے مسلح ہو جاتے یا کم از کم مسلح بننے کا ڈھنگ ان کو آجاتا تھا''۔

لیکن اسماء الرجال کی طرح یہ کام بھی انتہائی دشوار ہے، غیر معمولی حافظہ کے ساتھ وسیع مطالعہ اس سنگلاخ وادی کو طے کرنے کے لئے ضروری ہے اور اسی لئے عام مدرسین و اساتذہ اگر اس کا اہتمام نہیں کر پاتے تو انہیں معذور سمجھنا چاہیے، فاضل گیلانی نے بھی لکھا ہے:

''لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس و استاذ کے بس کی یہ بات بھی نہیں کہ مطالعہ کئے بغیر جس عالم کا ذکر آجائے اس کے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے طلباء کو آگاہ کرنے پر قادر ہو، یہ تو ان کے خصوصی حافظہ کا کمال تھا''۔

مشفقانہ افادہ کے وہ جذبات جو موصوف میں بقوت موجود تھے جس کے تقاضوں کی بناء پر آپ نے اپنے حلقۂ درس میں شریک طلباء کی مناسب تربیت کے لیے جن ذیلی اضافوں کا اہتمام فرمایا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دوسرے فن کے اہم مسائل خصوصاً اختلافی مباحث پر واقف کارانہ کلام فرما کر اختلاف کی ابتداء و انتہاء اور محاکمہ کرتے ہوئے قولِ فیصل سے بھی طلباء کو اطلاع کر دیتے، جیسا کہ مولانا گیلانیؒ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

''عموماً وہ اس کا بھی موقعہ تلاش کرتے کہ علاوہ حدیث کے اسلامی علوم کے طلباء و علماء کے لیے دوسرے متعلقہ علوم و فنون کے جن اصول و کلیات کا جاننا ضروری ہے ان کا بادنیٰ مناسبت ذکر فرماتے اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان کرتے جس کے سننے کے

بعد معلوم ہو جاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتداء کس شکل میں ہوئی اور کن کن نقاطِ نظر سے گزرتے ہوئے موجودہ حال تک پہنچا"۔

اس ساری کدو کاوش سے مقصود طلباء کے ساتھ ان کی وہ غیر معمولی شفقت تھی جس سے ان کا قلب معمور تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طلباء کو اس طرح تیار کر دیں کہ آئندہ علمی مرحلوں میں ان کے لیے کوئی دشواری باقی نہ رہے اس لیے نہ وہ صرف مطالعہ کا طلبہ میں ذوق پیدا کرنا چاہتے بلکہ ان کے پیش نظر مطالعہ کے طریقے سے بھی طلباء کو آگاہ کرنا تھا۔ خاص اس مقصد کے لیے ان کے سامنے درس میں کتابوں کا انبار رہتا جس سے ضرورت کے وقت بطور حوالہ اصل مآخذ پر نشاندہی فرماتے تاکہ طلباء زبانی حوالوں پر ہی اکتفا نہ کریں، بلکہ مسائل میں مدلل گفتگو کی انہیں عادت پڑ جائے، مولانا منظور نعمانیؒ نے اپنے مقالہ میں ان کی اسی خصوصیت پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

"درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ حدیث کی اور کتابیں حضرت کے سامنے رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تو صرف زبانی حوالے پر اکتفاء نہیں فرماتے تھے (۱)"

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اور آپ کے تلامذہ کے متعدد حوالوں سے واضح کیا گیا کہ علامہ کشمیری کا درس صرف حدیث ہی کی شرح و تفسیر تک محدود نہ تھا بلکہ حدیث کے عنوان پر ہمہ جہت افادات جن میں تنوع کے ساتھ جامعیت و گہرائی ہوتی آپ کے درس کا امتیاز تھا، اس کے باوجود جب آپ کسی مسئلہ پر کلام کرتے تو اگرچہ یہ کلام کسی ادنیٰ مناسبت کی بناء پر ہوتا۔ مگر جس جانب بھی طبیعت متوجہ ہوتی اس پر مکمل اور سیر حاصل بحث فرماتے۔ درس

(۱) غیر معمولی قوت حافظ اور یادداشت جو ایک موہبتِ الٰہی کی طرح مرحوم کو حاصل تھی اس کا ایک حیرت انگیز منظر روزانہ طلباء کے سامنے آتا جس کی تفصیل مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے اسی محولہ بالا مضمون میں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ دورانِ تقریر ہاتھ بے تکلف اس کتاب پر جاتا جس کا حوالہ دینا چاہتے اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل ایک خاص انداز میں کہتے ہوئے اس طرح کتاب کھولتے کہ بعض اوقات تو وہی صفحہ کھلتا جس پر وہ حدیث ہوتی ورنہ دو چار ورق ادھر ادھر سے الٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے ہوتی تھی۔ جن حضرات نے یہ منظر نہیں دیکھا انہیں آج یہ سن کر غالباً حیرت ہوگی اور شاید بہت سوں کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا لیکن جن لوگوں کو حضرت کے درس میں چند روز بھی بیٹھنے کا موقعہ ملا ہوگا انہوں نے قریباً روزانہ سبق میں یہ تجربہ دیکھا ہوگا، ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ.

میں خصوصی اضافوں میں اضافۂ اسرار وحکم کا تھا۔اسرار وحکم کا مطلب یہ ہے کہ شریعت پر احکام کی علت اور حکمت کو دریافت کیا جائے۔قرآن کریم کے احکام جیسا کہ معلوم ہے حاکمانہ وحکیمانہ دونوں لب ولہجوں میں انسانوں تک منتقل کئے گئے ہیں، حاکمانہ لب ولہجہ کسی حکم کے جاری کرنے کے بعد اس کی حکمت وعلت بیان نہیں کرتا جب کہ حکیمانہ اندازِ بیان میں مصلحت وحکمت کی مختصر تفصیل آجاتی ہے۔اسے یوں سمجھئے کہ قبلہ کی تبدیلی پر ایک ان محروم عقل لوگوں کا گروہ تھا جو اس تبدیلی پر سب سے زیادہ چراغ پا ہو گیا ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے حکمت آمیز کلام کے مقابل میں حکومتی لب ولہجہ درکار تھا۔اس لئے خدا تعالی نے ان کی جانب روئے سخن فرمایا تو صرف اتنا ارشاد ہوا: قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔

ان معترضین سے کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب کے ہم مالک ہیں، اس لئے جو چاہیں حکم دیں پس جس طرح ایک مکان کے مالک کو اپنے مکان میں اور ایک خسروِ سلطنت کو اپنے ملک میں تمام تصرفات کا پورا اور قانونی حق حاصل ہوتا ہے ایسے ہی احکم الحاکمین کو اپنی وسیع حکمرانی میں ہر طرح کا اختیار حاصل ہے پھر اس کے کسی حکم پر اعتراض بے معنی ہے، دوسری جانب مخاطبین کا وہ گروہ تھا جنہوں نے تبدیلیٔ قبلہ کے حکم کو دل وجان سے قبول کیا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ انہیں حکم کی مصلحت سمجھا دی جائے تاکہ وہ مومنانہ طمانیت سے بھی سرفراز ہوں، اسی لئے انکے لئے ارشاد ہوا:

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ.

(اور یہ قبلہ ہم نے صرف اس لئے تبدیل کیا تاکہ رسول کی اتباع کرنے والے اور حکم کی مخالفت کر کے کفر کی جانب جانے والے کھل کر سامنے آجائیں)

گویا کہ قبلہ کی تحویل سے متعلق چند در چند حکمتوں میں سے یہاں ایک حکمت زیر گفتگو رہی، حاکمانہ وحکیمانہ فرق کو قرآن مجید نے اس جگہ جیسے ملحوظ رکھا وہ اس کی معروف بلاغت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے، بہر حال عرض تو یہ کیا جا رہا تھا کہ قرآن حکیم التزاماً تو نہیں لیکن کہیں کہیں مصلحتِ حکم کو کھولتا بھی ہے جیسا کہ روزہ والی آیت میں ارشاد ہوا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (تم پر فرض کر دیئے گئے روزے

جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض تھے، توقع ہے کہ اس سے تم میں تقوی پیدا ہوگا)

اس ارشاد میں روزے کی فرضیت کی مصلحت تقوی کو قرار دیتے ہوئے اسے بیان بھی کردیا گیا اسی طرح نماز کے متعلق ارشاد فرما کہ:

تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ.

(کہ وہ تم کو برائیوں اور بدکاریوں سے روکنے والی ہے)

بہر حال اسلام کا سب سے پہلا مطالبہ مسلمان سے احکام کی اطاعت ہے۔ ایمانی تقاضے حکم کو بلاچوں و چرا تسلیم کرنے سے ہی پورے ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآن وحدیث دونوں نے اسرار و حکم کے موضوع پر زیادہ توجہ نہیں کی مگر یہ بھی عجیب بات ہے کہ اسلامی تعلیمات کا متن یا اجمال ایک دوسری تفصیل و شرح کی جانب منتقل ہوتا رہا۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے اجمال کی سب سے کامل اور کامیاب تفصیل حدیث ہے۔ اور حدیث میں جو کچھ باقی رہ گیا اس کے ایک حصہ کا بیان فقہاء نے کیا اور دوسرے جزء کی تشریح و تفصیل صوفیاء علیہم الرحمۃ نے کی، پس جس طرح فقہ اسلام میں نہ فقہاء سے بے نیازی برتی جاسکتی ہے اور نہ صوفیا ہی سے، اس لئے علامہ کا خاص دستور تھا کہ وہ حدیث کے اسرار و حکم بلکہ مجموعۂ شریعت کے مصالح پر طویل کلام فرماتے۔ یوں بھی آپ کو صوفیاء سے ایک غیر معمولی عقیدت تھی یہی تاثر کبھی کبھی ان الفاظ میں آپ کی درسگاہ میں سنا جاتا کہ...

''صوفیاء کی دلپذیر باتوں سے قلب و دماغ مطمئن ہوتے ہیں جبکہ مناطقہ وفلاسفہ کہ ہفوات سے ایک نہ ختم ہونے والی تشویش پیدا ہوتی ہے''۔

بلکہ قرآن کریم اور بعض اختلافی احادیث میں جہاں مختلف اقوال کے ایک صحرا کی رہ نوردی کے باوجود تشفی نہیں ہوتی وہ اس قیل و قال میں صوفیاء ہی کی تحقیق کو اطمینان بخش قرار دیتے۔ سورۂ والنجم میں وہی معرکۃ الآرا اختلاف کہ آپکی زبان مبارک پر العیاذ باللہ بتوں کی تعریف میں تلک الغرانیق العلیٰ ان شفاعتھن لترجی (یہ لمبی لمبی گردن والے بت ان کی شفاعت کی توقع کی جاتی ہے) جاری ہوگیا اور بتوں کی یہ تعریف سن کر کفار مسرت سے جھوم اٹھے۔ روایت کے اعتبار سے ابن حجر جیسے بلند پایہ محقق کو اصرار ہے کہ کثرتِ طرق

کی بناء پر روایت کچھ نہ کچھ حیثیت رکھتی ہے۔ ابن حجر اور دوسرے محدثین کے اس اصرار پر جاننے والے جانتے ہیں کہ علمی حدود میں یہ مسئلہ اپنے دوررس نتائج کے اعتبار سے کیسی خوف ناک کشاکش کا باعث بن گیا، عرض یہ کرنا ہے کہ شاہ صاحب نے اس بحث میں عبدالعزیز دباغ صاحب ابریز کی صوفیانہ تحقیق کو مکمل قرار دیتے ہوئے فیصلہ کی اہم بنیاد قرار دیا ہے۔ خاکسار نے تو نمونہ کے طور پر یہ ایک مثال ذکر کر دی۔ آپ کی املائی تقریر فیض الباری میں اس طرح کے بہت سے نمونے مل سکتے ہیں، غرضیکہ آپ اسرار و حکم کو ایک اہم ضروری علم قرار دیکر اپنے درس میں اس کا ذکر فرماتے، مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ تواضع وانکساری جس کا آپ پر غلبہ تھا، اس کے نتیجہ میں ''ہمہ دانی'' کا دعویٰ تو درکنار ''ہیچ ندانم'' کا نعرہ آپ کی زبان پر تھا، لیکن اس کے باوجود فرماتے کہ جن دو چار علوم سے مجھے مناسبت ہے ان میں معانی و بلاغت، اعجازِ قرآن اور اسرار و حکم کا خاص طور پر ذکر ہوتا یہ بھی فرماتے کہ:

''اسرار و حکم کو بجز شیخ محی الدین ابن عربی کے سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ بلاشبہ شیخ اکبر اس فن میں مجھ پر فائق ہیں''۔

شیخ اکبر سے اسی غیر معمولی عقیدت کی بناء پر اسرار و حکم کے موضوع پر ان کے اقوال یا پھر عبدالوہاب شعرانی کی تحقیقات درس میں زیر گفتگو آتیں۔ الکاندھلوی نے بھی اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اسرارِ شریعت میں شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ شعرانی کا کلام ہمیشہ نقل فرماتے''

معلوم ہوا کہ اسرار و حکم کے بیان سے شرعی احکام کو معقول سمجھنے کے ساتھ ان کی قبولیت کے لئے بھی دل و دماغ کے دریچے کھل جاتے ہیں، اس لیے درس کا یہ رخ بھی بڑی افادیت کا حامل تھا مگر افسوس کہ جہاں ہماری درسگاہوں میں اور بہت سے ضروری علوم چھوٹ گئے ان کے ساتھ اسرار و حکم کا فن بھی رخصت ہوا۔

علماء و طلباء تو اس حقیقت سے خوب واقف ہیں لیکن جو نہیں جانتے انہیں کو سمجھانے کے لئے اس کلپترہ گوئی سے کام لینا پڑا ہے کہ اہل علم پر اٹھائے ہوئے بہتان و افتراء جس سے دو چار امت کے عام ہی ممتاز و منفرد اشخاص ہوتے رہے انہیں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ

علیہ کی بھی ستودہ صفات ذاتِ گرامی ہے۔ حسب ونسب سے لے کر ان کی شخصیت، علم، تفقہ، دیانت وتقوی، رائے اور حذاقت کون سا وہ گوشہ ہے جو مخالفین کی نکتہ چینیوں سے محفوظ رہا ہو۔ ایک اور عام اعتراض اس جلیل امام پر مسلسل یہ بھی کیا جارہا ہے کہ حدیث سے وہ سراسر ناواقف تھے یا ان کے فقہ کی تمام تر بنیاد ذاتی رائے وقیاس پر ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ کہنے والوں اور سننے والوں نے آخر یہ کیوں نہ سوچا کہ بھلا اسلامی فقہ کا استخراج واستنباط کرنے والا حدیث سے کس طرح بے نیاز ہوسکتا ہے، عوام سے تو نہیں، پوچھنا ان خواص سے ہے جو اس امام الائمہ پر اس اعتراض کو جڑنے کے لئے پھیپھڑوں کی تمام ہی قوت استعمال کررہے ہیں۔ آخر بتائیں کہ فقہ کی چار اہم بنیادیں (یعنی قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس) قرار دیکر پھر امام ابوحنیفہ کے فقہ کو مستقل فقہ مانتے ہوئے حدیث جیسے اہم جز سے بے اعتنائی کا الزام آخر کس معقول بنیاد پر ہے۔ مگر جہاں نبی کو کاہن، ساحر اور شاعر کہنے والے اور قرآن حکیم کو اساطیر الاولین بتانے والے موجود رہے اور ان کی سب کہی ہوئی سننا پڑی تو غریب امام ابوحنیفہ کے متعلق اگر کچھ کہا جارہا ہے تو خواہی نخواہی اس کو سننا ہی پڑے گا۔ بہر حال شاہ صاحب جنہیں فقہ حنفی کے مطابق للحدیث ہونے کا پورا یقین تھا اور جنہوں نے تیرہویں صدی میں حنفیت کی خدمت اور اس استحکام میں تاریخی رول ادا کیا، اپنے درس میں احناف کے ماخذ کی خصوصی نشاندہی فرماتے۔ عادت یہ تھی کہ چاروں فقہاء کے مسلک کو نقل فرماکر امام الائمہ کے قول کے ترجیحی دلائل بیان فرماتے کبھی کبھی مختلف اقوال میں جب کسی قول کو ایک دوسرے کے مقابل میں راجح یا قوی وضعیف کے دائروں میں سمیٹنا مشکل ہوتا تو اپنی تحقیقی رائے پیش فرماتے جیسا کہ مولانا کاندھلوی نے لکھا ہے کہ:

> ''فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر انکے وہ دلائل بیان فرماتے جو اس مذہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہیں۔ پھر ان کا شافی جواب، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے''۔

حنفیت، شافعیت بلکہ چاروں ہی فقہ متقدمین اور متاخرین کی جس تاریخی تقسیم میں

بٹ گئے ان دونوں جماعتوں میں ان کا اعتماد اور بھروسہ متقدمین پر زیادہ تر تھا۔ جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے بھی لکھا ہے:

"نقل مذاہب میں قدماء کی نقول پیش فرماتے بلکہ معمولاً متاخرین کی نقول پر متقدمین کی نقول کو مقدم رکھتے۔"

بلکہ ان کی کوشش زیادہ تر یہ رہتی کہ اگر کسی اختلافی مسئلہ میں مجتہد اور خود صاحب مذہب کی کوئی تحقیق اور قول ہاتھ لگ جائے تو اسی کو بنیاد بنایا جائے محولہ بالا مقالہ ہی میں ہے:

"ائمہ اجتہاد کے اصل قول پہلے نقل فرماتے اور مشائخ کے اقوال بعد میں"۔

یہ تو عرض ہی کر چکا ہوں کہ خلافیات کے معرکۃ الآرا مباحث و مسائل میں خود انکی محققانہ رائے ہوتی جسے سننے والا سن کر مطمئن ہوتا۔ اس ذیل میں مولانا کاندھلوی رقم طراز ہیں:

"مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے"۔ گویا کہ وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلباء کے لئے موجب طمانیت ہوتا"

بہرحال موصوف نے اپنے چالیس سالہ درسِ حدیث میں غیر متزلزل بنیادوں پر یہ حقیقت روشن کردی کہ نعمان ابن ثابت الکوفی ابی حنیفہؒ طاب ثراہ پر یہ الزام کہ انہوں نے حدیث سے ہٹ کر رائے وقیاس سے فقہ کی تعمیر کی ہے، ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔ والقصة بطولها.

الخطوط البارزة فى شخصية

امام العصر الشيخ محمد انور شاه الكشميرى

مولانا بدر الحسن القاسمی
از: رئیس التحریر الجریدۃ ''الداعی'' والمدرس بدار العلوم دیوبند

فى نهاية القرن التاسع عشر الميلادى و بداية القرن العشرين ظهر على سماء الهند العلمى كوكب مضئ متلألأ، بهرعيون الناس بسنا علمه و عبقريته، وملأ ارجاء الارض باضوائه.

طلع هذاالكوكب العلمى المنير على افق زهرة الربيع الدائم وجنة الدنيا "كشمير" وامتلك ناصية العلم بمواهبه الفطرية، فاصبحت شخصيتهٔ فذة انيقة، وبارزة، لامعة، و عرف بين الناس بذكائه النادر وقوة ذاكرته الخارقة و علمه الغزير، و استحضاره المدهش، ومقدرته العلمية العجيبة وهو امام العصر الشيخ محمد أنور شاه الكشميرى الذى يعد فى الرعيل الاول من الائمة والاعلام، و يسجل اسمه فى رأس قائمة المحدثين.

ولد امام العصرؒ صبيحة يوم السبت السابع والعشرين من شهر شوال سنة ۱۲۹۲ هـ فى اسرة علمية و دينية عريقة، ونشأ على حب الاطلاع والعكوف على العلم والدراسة، فكان منذ نعومة اظفاره ومن مستهل طفولته على د أب نادر فى اكتساب العلوم والمعارف وكانت تلوح على جبينه علائم الرشد و تتحلى فيه بوارق الذكاء حتى تفوس بعض ذوى البصيرة انه سيكون غزالى

عصره ورازی دهره.

قوة ذاكرته وموهباته الفطرية:

كان اللّه قد اودع فی امام العصر موهبات عجيبة من خصوبة العقل وقوة الذاكرة والقريحة الوقادة المندلعة، والذكاء المتوقد فما كان يسمع كلمةً الا ويحفظها ويعيها ويقيّدها فی ذهنه ولم تخفه ذاكرته مدة حياته، يقول متحدثاً عن نفسه:.

"سمعت ببلدتی فی كشمير، ولی اذ ذاک اربع سنين، رجلين يتكلمان فی ان العذاب هل يكون للجسد او للروح؟ فاستقرر أيهما على ان العذاب لهما، ثم ضربَا له مثلاً فقالا، ان مثل الجسد مع الروح لمثل الاعمى والاعرج، ذهبا الى حديقة ليجنيا ثمارها، فعجز الاعمى عن ان يراها و عجز الاعرج عن جنيها، فتشاوروا فی امرهما، فركب الاعرج على الاعمى واخذ الاعمى يذهب به الى الاشجار، والاعرج يرى الثمار ويجنيها فهذا هو حال البدن مع الروح، فالبدن بدون الروح جماد لا حراک به والروح بدون البدن معطلة عن الافعال فاحتاج احدهما الى الاخر فلما اشتركا فی الكسب اشتركا فی الاجر والوِزر ايضاً.

وبعد مرور خمس و ثلاثين سنة رايت فی القرطبی عن ابن عباس عين ما قالاه من رأيهما. (فيض الباری، ج: ص:۱۱۵)

و يقول والده: كان يسئالنی فی درس مختصر القدوری اسئلة احتاج فی الاجابة عنها الى مطالعة الهداية، ثم فوضت دراسته الى عالم آخر، فيجعل يشكو من كثرة سئوالاته رغم انه كان خارج درسه ساكتاً صامتاً لايرغب فی الملاعب، وكان يكتب على كتبه الدراسية وهو فی فاتحة قراءته تعليقات يتحير منها العلماء الافاضل.

المناهل العلمية:

ارتوى هذا الطفل المرهوب من علوم اهل بلدته وتلقى العلوم من حضرة والده وعلماء كشمير وهزاره، الى ان برع فى العلوم العقلية والنقلية وفاق الاقران والامثال، واصبح عالماً لا يدرك شأوهٔ وهو ابن اثنتى عشرة سنة.

وبعد ذالك ارتحل الى ديوبند، والتحق باكبر الجامعات الاسلامية "دارالعلوم" وكان ساحتها اذذاک مزدانة ومستنيرة بالعلم، تتلألأ من حبها بذة العلماء الربانيين، كامثال الشيخ محمود حسن والشيخ محمد اسحق امر تسرى والشيخ خليل احمد السهارنفورى، فاخذ ينهل من علومهم، ويرتوى من معارفهم حتى اكتملت ثقافته، وكسته صحبتهم علماً غزيراً وبهارًا فى الاخلاق والاداب.

نبوغه وعبقريته

طار صيته فى الافاق وهو لم يتجاوز العقد الثانى من خمره، وظهرت براعتُه فى الحديث والفقه والاصول والعلوم الاخرى الاسلامية، واقبل عليه العلماء والباحثون والمتخصصون فى العلوم الدينية للاستفادة منه، والارتواء من منهله العذب الفياض، وهو فى ريعان شبابه ومقتبل عمره.

فهذا الامام النابغة المحدث ظهير احسن شرق النيموى، مئولف "آثارالسنن" مع تقدمه فى السن وبراعته فى علم الحديث يرسل كتابه قطعة الى الشيخ الكشميرى ليلقى عليها نظرة انتقادية، فسجل الشيخ آرائه وتعليقاته من فقه الحديث ومعارفه والكلام على رجال الحديث وعلله حتى اصبحت تعليقاته زاداً قيماً وتحفةً

نادرةً للاحناف.

وظيفته فى الحيٰوة

اشتغل بوظيفة التدريس هذالمحدث الموهوب فى دهلى و كشمير بدون راتب احياناً، وبرواتب زهيدة احياناً اخرى، وبعد ماتشرف بالحج والزيارة، واستفاد من مكتبات الحجاز العامرة،عين فى سنة ۱۳۲۲ هـ مدرسا فى دارالعلوم ديوبند، وتولى فيها منصب شيخ الحديث بعد معادرة شيخه وطنه واعتقاله فى "مالطه" وبقى على منصبه عشرين سنة حتى الجأته بعض الاوضاع الى ان يستقيل فذهب الى الجامعة بدابهيل، ومكث هناك خمس سنوات، ثم رجع الى ديوبند، وعاش قليلاً مبلتى بداء عضال حتى اختلسه الموت ولفظ انفاسه الاخيرة فى شهر صفر سنة ۱۳۵۲ هـ.

مزاياه ومقومات شخصيته

قرأت فى كتاب "حكمة الاشراق" للشيخ المقتول شهاب الدين السهروردى كلمة وهى "ان العلم ليس وقفاً على قوم" بل يمكن ان يفرق شخص فى زمن متاخر، ممن سبقه من العلماء.

وهكذا كتب الامام الكبير الشيخ محمد قاسم النانوتوى المتوفى ۱۲۹۷ ھ فى احدى رسائله: انه لا دخل للتقدم والتاخر الزمانى فى النبوغ العلمى، ان الشيخ عبدالعزيز الدهلوى مثلا نشأ فى زمن متاخرلكنه فاق كثيرا من المتقدمين فى سعة الاطلاع ودقه النظر ومكانتة العلمية العظيمة، وهذا الذى عناه النبي ﷺ بقوله:.

مثل امتى كالمطر لايدرى اوله خير ام آخره او كماقال.

ولله دَرُّابى العلاء المعرى حيث يقول ـ

"انی وان کنت الاخیرَزمانة ☆لاٰت عالم تستطعه الاوائل"

ولا شک ان امام العصر الشیخ محمد انور شاه کان خیر مثال للتفوق والبراعة، علی کثیر ممن سبقه فی بعد نظره وسعة افته فی العلوم.

یقول حکیم الامة الشیخ اشرف علی التهانوی:

"ان الشیخ محمد انور شاه قد فاق علی کثیر من اساتذتہٖ"

الافاضات الیومیة ج ٦ص ۱۱۱.

وکان یقول: ان وجود مثله فی الامة دلیل علی حقانیة الاسلام

ویقول الشیخ المحقق شبیر احمد العثمانی: فقید المثیل عدیم العدیل بقیة السلف حجة الخلف البحر المواج، لم تر العیون مثله ولم یرَهو مثلَ نفسہٖ"

ویقول الامام الجهبذ النقاد الشیخ زاهد بن الحسن الکوثری "لم یأت بعد الشیخ الهمام مثله فی استشارة الابحاث النادرة من ثنایا الاحادیث وهذه برهةطویلة من الدهر"

مقدمة التصریح بماتواتر فی نزول المسیح. ص: ۲٦.

ویصفه احد اصحابه وهو قد لازمه عشر سنوات: "انْ رأیته رأیت رجلاً یضاهی الذهبی فی حفظه، ویماثل ابن حجر ضبطه واتقانه ویساجل ابن دقیق العید فی عدله ودقةرأیه، ویشابه البحتری فی شعره ویحاکی سحبان فی بیانہٖ وسحره:

ولیس علی اللّٰه بمستنکر ☆ ان یجمع العالم فی واحد

الخطوط البارزة فی شخصیتہٖ:

کان امام العصر الشیخ انور شاه عالماً موسوعیاً بکل ماللکلمة معنی، یحمل فی صدره مکتبة واسعة للعلوم العقلیة والنقلیة والقدیمة والحدیثة، وکانت ذاکرته تذخر بانواع من الدُّرَرِ

والـلآلى، التى اجتمعت لديه من مطالعة كتب المتقدمين فى جميع الـفـنـون مـن العلوم الطبيعية والالهية، وكتب الحقائق والتصوف، والهـنـدسة والتـاريـخ والـعـلوم الغريبة من النجوم والرمل والجفر والـمـوسيـقـى والـريـاضـى بـفنونهٖ الى جانب العلوم الاسلامية من الحديث والتفسير والفقه والاصولين.

وكـان مـن عـادته مطالعة كل كتاب فى اى علم كان، يتحدث عن نفسه ويقول:

"ربّـمـا طـالـعـتُ مـجـلدات ضخمة من كتاب، ولم افز منه بشيئٌ جـديـد وربـمـا ظـفـرت بشى يسير اوفائدة يسيرة، وكان يقيد فى بـرنامجه ماتنحل به عقدة من مشكلات القرآن اوالحديث اوالفقه اوعلم آخر.

كـذالـک اذا سـنـح لـه دليل للمذهب الحنفى اوكان له فى مسئلة تحقيق خلاف ما ذهب اليه عامة العلماء فكان يقيده فى مذكرته.

امـا الـعلم الذى عاش فيه وعاش له وعاش عليه، فهو علم الحديث الـنـبـوى، كـان راسـخ الـقـدم فى متونه حاذقاً فى الجرح والتعديل وطبـقـات الرجال الى جانب كونه حافظاً للفقه والخلافيات مطلعاً على مناقشات العلماء وأراء الائمة، كان يقول:.

"انـى لا احتـاج فـى اى فـن الـى تـقـليد احد سوى الفقه فان الفقه ليـس لـى فيـه رأيـى سوى الرواية، لذا قد يصعب على الافتاء، فان الـنـاس لا يـكون عندهم الاقول واحد، وقد تكون فيه عندى اقوال كثيرة، عن الامام اوعن المشائخ، والتصحيح قد يختلف، وحينئذ افتـى بـمـا يـقـرب مـن مذاهب الائمة وآثار السلف والسنة. (فيض البارى، ص: ۱۹۷)

آراء ه عن الشخصيات البارزة

وكانت له آراء خاصة عن كل من الشيخ تقى الدين بن دقيق العيد المتوفى سنة ۷۰۲ ھ وابن عبدالبر المتوفى سنة ۴۶۳ھ وهو الشيخ جمال الدين الزيلعى المتوفى سنة ۷۴۳ھ وابن تيمية المتوفى سنة ۷۲۸ ھ وابن عربى المتوفى سنة ۶۳۰ ھ،وابن حجر المتوفى سنة ۸۵۲ھ واخرين فكان يقول: ان الشيخ الأكبر من كبراء الامة وسباق غايات علم الحقائق، اما الحافظ ابن تيمية فلا ريب انه بحر مواج لا ساحل له، ولكنه شذ فى مسائل الفروع والاصول من جمهور الامة، وهذه طبقات من الناس خلقهم اللّٰه على مراتبهم، فمنهم من يطبع على الاعتدال والنصفة كابن دقيق العيد وابن عبدالبر و الزيلعى ومنهم من يطبع على الشدة كالشوكانى وابن تيمية ومنهم من يطبع علىٰ غاية التيقظ، مع شدة التعصب كابن حجر. (فيض البارى ملخصاً:۲/۱۶۳)

وكان يقول عن الامام ابى جعفر الطحاوى المتوفى سنة ۳۲۱ھ انه امام مجتهد ومجدد، كماقال ابن الاثير، والمراد بكونه مجدداً من حيث شرح الحديث وغوامضه، فهو امام طريقته المبتكرة وكان يثنى كثيراً على كتاب "البدائع للكاسانى المتوفى سنة ۵۸۷ ھ. يقول: انّ مؤلفات العراقيين من فقهاء الحنفيّة اثبت واتقن من تصانيف الخراسانيين لكنّ"البدائع" مع انّ مؤلف هٰذا الكتاب من الخراسانيين قد فاق حسنًا على مؤلفاتِ العراقيين، بل على كتب سائر فقهاء نا فهو كتاب بديع ان طالعه عالم بالامعان لصار فقيه النفس. (نفحة العنبر:ص:۸۵)

وكان يفضل ابن نجيم على ابن عابدين الشامى، كما كان يفضل

عـليـه الشيخ عبدالعزيز الدهلوى والشيخ رشيد احمد الكنكوهى في التفقه.

مزايادرسه:

قـضـى ثـلـث عـمـره فى ديوبند وجرت من قلبه ينابيع الحكمة والمعرفة واستـفـادمنه كثير من العلماء وتضلع عنده عدد لا يحصى وكان وجوده الـعـلـمـى سببـا لاصلاح طرق التدريس، فانتج للعلماء مناهج التحقيق وطرق التفصى من معضلات السائل.

كـانـت دروسهٔ شبـه مـحـاضـرات جـامـعة تستوعب جميع نواحى الـقضية وتنحل بها عقد سائر العلوم، كان يتدفق بحره المتلاطم من علومه فيفيض من كل ناحية يسقى الاجادب ويروى عطش العلم.

كـان يـجـوده بثـروتـه الـعـلـمية ونفائس الابحاث على الطلاب والســائـلـيـن بـكـل سـمـاحة واخـلاص، وحـرص متزايد عـلـى الافـادةيـكثـر الاحالة الى كتب المتقدمين، فكان يشعر من يتلمذ عـليـه بـانـه فـى عـصـر ذهبى من عصور العلم، وقد ارتبطت صلته بـالائـمة الـذين مضوا قبل خمس مائة سنة على الاقل . وفى شرح الـحـديـث النبوى كان يثير ابحاثاً علمية فادر ة، يتسع نطاقها الى الـبـلاغة والـنـحـو والـصرف فاذا جاء على الاستشهاد بقول شاعر فربما يتمثل بقصائد طويلة لكثرة محفوظاته.

وقـد كـان يـحفظ من قصائد شعراء العرب مايتجاوز خمسين الف بيـت وكـان يـلقى ضوءَ ا حافلاً على حياة كل من يذكره فى درسه من الائمة ويذكر مكانته العلمية، وكان من دأبه فى الدرس انه كان يـضـع كـتـب الـمـراجـع امامهٔ اثنا درسه فاذا احال شيئًا الى كتاب فياخذه ويريه الطلاب.

قد حضر درسه يومًا احدٌ من العلماء المبرزين وهو الشيخ على المصرى الحنبلى، وكان من حفاظِ الصحيحين فناقشه اثناء درسه، فلما فرغ الشيخ من درسهٖ صاح الشيخ على المصرى قائلاً. "لَوْحلفتُ انه اعلمُ من ابى حنيفة لما حنثتُ".

غير ان الشيخ لما سمع هٰذه الكلمة فقال: ان مدارك اجتهاد الامام الاعظم ابى حنيفة عالية لا اكاد اصلها.

هكذا كان دأبهٗ فى الدرس فانجب امثال العلامة الباحث الشيخ مناظر احسن الكيلانى والمحدث الشيخ بدرعالم الميرتهى. والعلامة الشيخ حبيبُ الرحمن الاعظمى والشيخ المحدث محمديوسف البنورى وفضيلة الشيخ محمد طيب رئيس جامعة ديوبند والشيخ محمد ادريس الكاندهلوى والمفتى الكبير الشيخ محمد شفيع، والمحدث الكبير الامام الشيخ فخرالدين احمد والشيخ محمدمنظور احمد النعمانى، والكاتب الاسلامى الكبير الشيخ سعيد احمد الاكبر آبادى وسماحة المفتى الشيخ عتيق الرحمن العثمانى والصحفى البارز حامدالانصارى غازى.

زياداته القيمة على مصطلحات الفنون:

قد اضاف -رحمه اللّٰه- الى مصطلحات بعض الفنون زيادات قيمة تخلوعنها كتب المتقدمين فاقسام التواتر الاربعة التى بسطها الشيخ فى "نيل الفرقدين" و"اكفار الملحدين" لا توجد فى كتاب التعريفات للسيد شريف الجرجانى. ولا فى كليات ابى البقاء ولافى كشاف اصطلاحات الفنون للشيخ محمدعلى التهانوى، ولا فى دستور العلماء للقاضى عبدالنبى احمدنكرى بل انها من

زيادات امام العصر القيمة.

كـذلك شـرحـه لوجوه اعجاز القرآن على اسلوبٍ بديع مبتكر بـان الـقـرآن مـعجز في مفرداته، وكلماتهٖ ومقاصدهٖ، وحقائقه من بـدائـع تـحـقيقات الشيخ محمدانور الكشميريؒ، لم يتنبه له احد قبله وقد قام تلميذه النابغة الشيخ محمديوسف البنوريؒ. بتوضيح تحقيق شيخهٖ في "يتيمه البيان" في اسلوب عصرى بارع.

ولـلشيـخ آراء خـاصة وتـحـقيـقـات نـادرة انيقة فـي كثيـر من الـمعضلات العلمية ومسائل علم الحقائق كحقيقة العماء ومسئلة الـروح والـنفس وحقيقتها التجلى ومسألة المعية الدهرية وحقيقة عالم المثال.

وكتبه واماليه تـذخـر بـامثال هذه الابحاث النادرة اخمص منها بالذكر "فيض الباري" و "مشكلات القرآن"

مؤلفاتهٗ واماليه:

مع ان الشيخ –رحمه اللّٰه–لم يعزم قط يؤلف رسالة اوكتابا توجد امالى اخـذت عـنـه ونـصـوص وتقييدات، افردها بالعنوان يدافع الـضــرورة الدينية او الخدمة الاسلامية ولو انه عكف على التاليف لانارت اضواء ه الّلامعة ارجاء دنىا العلم على سعتها،وازدانت بها المكتبة الاسلامية الذاخرة.

ويعـجبنـى قـول الشيخ محمد يوسف البنورى ان الشيخ جلال الـدين السيوطى قد الف اكثر من خمس مائة كتاب والشيخ الامام ابن دقيق العيد لا تتجاوز مؤلفاته على كام الأحكام. والامام بشرح الالـمـام، مـع ذلك لا تـرجح كثرة تأليف السيوطیؒ على دقة نظر ابـن دقيـق الـعيـد الذى استنبط من حديث واحدٍ اربع مائة مسئلة،

كما ذكره الشيخ عبدالعزيز الدهلوى. فى "بستان المحدثين".

ويشابه ذٰلك ان الشيخ مصطفى صبرى اعظم متكلم عصره حينما رأى "مرقاة الطارم" لامام العصر فقال، انى افضلها على هٰذا "مثيراً الى كتاب "الاسفار الاربعة" لصدر الدين الشيرازى، مع ان مرقاه الطارم رسالة وجيزة تحتوى على ستين صفحة و الاصفار الاربعة للشيرازى كتاب ضخم فى مجلدات كبيرة يبلغ اكثر من الف صفحة.

ومن اهم مؤلفات الشيخ اماليه على صحيح البخارى و الترمذى و"مشكلات القرآن" و"اكفار الملحدين" و"مرقاة الطارم" و"والتصريح بما تواترفى نزول المسيح" و"خاتم النبيين" و "عقيدة الاسلام" و "فصلُ الخطاب" و"نيل الفرقدين" و"ضرب الخاتم" و هو يشتمل على اربع مائة شعر فى مسئلة حدوث العالم.

وكان الفيلسوف محمداقبال الشاعر الاسلامى الكبير معجباً بهٰذه الرسالة. ضرب الخاتم. وبشخصية امام العصر كثير الثناء عليه، قد استفادمنه فى عديد من القضايا العلمية و الدينية وكان يقول، لم تنجب الامة خلال خمس مائة سنة مثل الشيخ محمدانور الكشميرى. وكانت بينهما صلاة ودية وثيقة.

ويجدر بالذكر ان امام العصر كان شاعراً مغلقا، له اشعار كثيرة، تفيض رقة وعذوبة.

ولامام العصر مؤلفاتٌ اخرىٰ مطبوعة وخطيةٌ تتسم بالدقة ورصانة الاسلوب، وتشهد على تغلغله فى العلوم، وبعدنظره فى جميع اصناف المعارف، وانه قدبث فى كل مؤلف حكما وحقائق مايطرب المسامع والآذان وينعش القلوب والاذهان.

وذكر الشيخ محمد منظور احمد النعمانی فی مقال ان علماً عربياً حاملاً للشهادات العديدة ومثقفاً بالثقافة العصرية حينما طالع "عقيدة الاسلام" فاشتاق الى زيارة مؤلفه الامام،وسافر من المانيا الى ديوبند.

وقام رحمه اللّٰه بدور بارزفی دحض فتنة القاديانية وألف كتبا عديدة،وخطب وناظر، واستنهض هِمَمَ اَصْحَابِهٖ لمقاومة هٰذه الفتنة. وكان يضطرم غيظًا على تحريفات القاديانيين لنصوص الشريعة فاثمرت مساعيه.

يقول الشيخ المحدث زاهدبن الحسن الكوثری فی مقالاته اعلى اللّٰه سبحانه منزلة العلامة فقيه الاسلام

المحدث المحجاج الشيخ محمدانور الكشميری فی غرف الجنان، وكافاه مكافاة الذابين عن حريم دين الاسلام فانه قمع القاديانية بحججه الدامغة وحال دون استفحال شر هٰذه الفتنة.(المقالات للكوثری:ص: ٣٥٩)

ومن اهم ميزاته فی التأليف انه يتوسع فی كل ماله صلة بالموضوع من نفائس الابحاث فكلما اخذ احد يطالع كتابه فی موضوع زاداعجابه وحيرته، بانه كيف حوى كل مال صلة بالبحث، وكيف اتی بابحاث رائقة من مظان بعيدة ومصادر لا تخطر ببال احد.

وانا اختم كلمتی المتواضعة بقول الشيخ العلامة سليمان الندوی ان مثال الشيخ محمدانور شاه الكشميری كالبحر المحيط الذی يكون ظاهره هادئًا وباطنة تذخربانواع من الدررِ الفاخرة وَ اللُّالِی الثمينة.

قرآن کریم اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ

(از: حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی، دہلی

حضرت علامہ کشمیریؒ کو خداوند عالم کی طرف سے نقلی اور عقلی علوم میں جو گہری بصیرت اور کمال تبحر عطا کیا گیا تھا اس میں وہ اپنے دور کے رازی غزالی اور ابن حجر سے کم نہیں تھے۔

خصوصیت کے ساتھ حضرت علامہؒ کو تفسیر قرآن میں فہم و بصیرت کا جو وافر حصہ ملا تھا اس میں بھی وہ اپنے دور کی ممتاز علمی شخصیت تھے۔

حضرتؒ کو خدا کے مقدس کلام سے گہرا عشق تھا، اور اگر وہ کسی کتاب کے جلال و جمال کی عظمت سے حد درجہ مرعوب نظر آتے تھے تو وہ کتاب العزیز ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسا محدث کشمیری کا صاحب علم و فضل شاگرد اپنے استاد کے بارے میں یہ تاثر رکھتا تھا کہ قرآن عزیز کی غیر معمولی عظمت وجلالت حضرت علامہ کے لئے حجاب بن گئی تھی جسکی وجہ سے مرحوم قرآن پر بے تکلف ہوکر غور وفکر نہیں کر سکتے تھے بلکہ ادب اواحترام کے ساتھ حد درجہ محتاط ہوکر توجہ فرماتے تھے۔

قرآن حکیم کے ساتھ آپ کو اس درجہ والہانہ عشق تھا کہ جس وقت آپ قرآن کی تلاوت فرماتے تو اس کے حسن تعبیر پر وجد و شوق میں جھومنے لگتے۔ (حیات انور ص: ۹۳)

عمر کے آخر حصہ میں حضرت محدث کشمیریؒ کی توجہ قرآن حکیم کی طرف زیادہ ہوگئی تھی، آپ فرمایا کرتے تھے کہ مشکلاتِ حدیث سے زیادہ مشکلاتِ قرآن توجہ کے طالب ہیں۔

ماہ رمضان المبارک میں آپ کی عادت یہ تھی کہ صبح سے شام تک نہایت غور و فکر کے ساتھ قرآن حکیم کا صرف ایک پارہ تلاوت فرماتے تھے اور اس طرح پورے رمضان میں صرف ایک قرآن پاک ختم ہوتا تھا۔

تفسیری علوم میں اعجاز القرآن کے علم کو بہت مشکل مانا گیا ہے اس سلسلہ میں یہ مقولہ مشہور ہے:۔ لم یدر اعجاز القرآن الا عرجان احدھما بزمخشر و آخرھما

بجرجان. اس پر شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے "وثالثھما انا" یعنی اعجاز قرآن کے دو بڑے ماہر زمخشری اور جرجانی گذرے ہیں مگر ان میں تیسرا میں ہوں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ یہ علم آپ کا وہبی اور لدنی تھا (مقدمہ مشکلات القرآن: ص:۸۰)۔

اسی مناسبت سے حضرت علامہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کے اردو ترجمہ کے ساتھ خاص شغف رکھتے تھے کیونکہ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ کے قول کے مطابق شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ الہامی ہے جو کسی دوسرے انسان کے بس کا نہیں۔ (تفسیر معارف القرآن مولانا مفتی شفیع صاحبؒ)

چنانچہ حضرت محدثؒ نے ایک سال پورے رمضان شاہ عبدالقادر صاحب کے موضح قرآن پر غور وفکر کرنے میں گزارا۔

قرآن پاک کے بعض غالی عقید تمندوں نے قرآن کریم کے بارے میں یہ عقیدہ پھیلا رکھا ہے کہ قرآن میں سب کچھ ہے عربی کا مشہور مقولہ ہے۔

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِیْ الْقُرْآنِ لٰکِنْ ۞ تَقَاصَرَ عَنْہُ اَفْھَامُ الرِّجَالِ

یعنی قرآن پاک میں تمام علوم موجود ہیں لیکن لوگ اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خوش عقیدگی سے قرآن پاک کی عظمت زیادہ ہوتی ہے حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ اس طرح کی سطحی باتوں سے قرآن کریم کے بارے میں غلط فہمیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ پہلے علماء میں ملا جیون استاد عالمگیر اورنگ زیب جیسے صاحب فضل عالم نے تفسیراتِ احمدیہ میں یہ لکھ دیا:

فما من شیئ الا یمکن استخراجه من القرآن یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جس کا قرآن پاک سے استنباط ممکن نہیں۔ ہر چیز کو قرآن میں سے نکالا جا سکتا ہے۔

اس تفسیر کے محشی نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ جبر و مقابلہ، مساحت، سوت کاتنے، لوہا کوٹنے، کپڑا بننے اور کھیتی کرنے کے مسائل بھی قرآن پاک سے نکالے گئے ہیں۔

موجودہ صدی کو سائنس کی صدی کہا جاتا ہے۔ اس صدی میں سائنس کی ترقی سے متاثر ہوکر بعض ایسی تفسیریں بھی لکھی گئیں جن میں سائنس کے نظریات واکتشافات کو قرآن پاک سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا ثبوت بعض مسلمانوں نے قرآن پاک سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس طرح بعض عیسائی علماء نے انجیل سے اس نظریہ کی تائید تلاش کی تھی۔

ابھی حال میں پاکستان کے ایک سائنسداں نے جوش عقیدت کے اندر سورہ یوسف کی آیت "قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاباً فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْبُلِهٖ سے غلہ واناج کو محفوظ رکھنے کا کامیاب طریقہ مستنبط کرنے کا دعوی کیا۔

امریکی سائنس داں جب چاند پر اترے تو بعض لوگوں نے قرآن پاک سے چاند پر انسان کے اترنے کا ثبوت پیش کرنا شروع کردیا۔

حضرت محدث کشمیری تفسیر، حدیث اور فقہ وکلام میں ایک ماہر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم وجدید فلسفہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے لکھا ہے کہ ملک کے مشہور فلسفی شاعر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے حضرت محدث کشمیریؒ کے متعلق ایک موقعہ پر فرمایا تھا:

> "حدوثِ عالم پر مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر میں دنگ رہ گیا کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک وبصیرت ہے" (حیات انور:ص:۱۹۱)

اس کے باوجود حضرت شاہ صاحب اس غالیانہ عقیدت کی پرزور تردید فرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں سب کچھ ہے اور اوپر والے شعر کو کسی غبی اور بے وقوف آدمی کا شعر قرار دیا کرتے تھے۔

سنجیدہ علمی حلقوں کی طرف سے اگرچہ اس غلوّ عقیدت کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی لیکن پرزور طریقہ سے اس تصور کی اصلاح شاہ صاحبؒ کے حلقۂ درس میں کی جاتی تھی۔

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ بلاشبہ قرآن میں سب کچھ ہے مگر وہ سب کچھ اس کے موضوع ومقصد کے دائرہ میں ہے۔

قرآن کریم کا مقصد اصلی انسان کو فوز وفلاح کی راہ پر چلانا ہے اور بے شک ایک

کامیاب نظام زندگی کے تمام اصول وکلیات مکمل طور پر قرآن پاک میں موجود ہیں۔ اور یہی اس کا مقصد نزول ہے۔ یہ خوش فہم لوگ جس قسم کی آیات سے استدلال کرتے ہیں ان میں سے دو آیتیں حسب ذیل ہیں:۔

الانعام میں کہا گیا ہے:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَايَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ (۵۹)

اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ کوئی سوکھی چیز مگر وہ سب کتاب مبین میں موجود ہے۔

النحل میں فرمایا گیا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِكُلِّ شَيْئٍ.

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب، کھلا بیان ہر چیز کا۔

محققین علماء نے لکھا ہے کہ کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ ہے اور لکل شیء سے مراد قرآن کریم کے مقصد نزول سے متعلق وہ تمام کلیات واصول ہیں جو ایک کامیاب نظام زندگی کی بنیاد ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ بعض منکرین حدیث کی طرف سے پھیلائی جانے والی اس غلط فہمی کا بھی پوری طرح سے رد فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے اور اس کا مطلب وہ لوگ یہ لیتے ہیں کہ قرآن پاک کے مطالب کو سمجھنے کے لئے ہادیٔ قرآن ﷺ کی سنت وسیرت کی کوئی ضرورت نہیں اس سلسلہ کی مشہور آیت ہے:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر)

اور ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لئے آسان کر دیا ہے پس ہے کوئی جو اس سے یاددہانی حاصل کرے۔

شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت میں قرآن کریم کے آسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مالک حقیقی کی مرضیات کے مطابق زندگی گذارنے کا جو طریقہ قرآن پاک کے اندر بیان کیا گیا ہے وہ بالکل صاف، روشن اور واضح ہے۔

ایک عربی اپنی عربی دانی سے اور ایک عجمی ترجمہ کی مدد سے عقاید واعمال کی وہ تمام بنیادی باتیں بآسانی سمجھ سکتا ہے جو فلاح دارین کے لئے ضروری ہیں، البتہ اگر کوئی شخص

قرآن پاک کے حقائق ورموز تک رسائی حاصل کرنا چاہے تو اسے عربی لغت ومحاورات اور ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال کا صحیح علم حاصل کرنا پڑے گا۔

تفسیر کے بارے میں ایک طبقہ اس قدر روایت پسند واقع ہوا ہے کہ کسی مفہوم ومطلب کی تائید میں جب تک انہیں کوئی تفسیری روایت نہیں ملتی وہ اسے تفسیر بالرائے قرار دیتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ اس خیال کی بھی تردید فرمایا کرتے تھے۔ فیض الباری میں شاہ صاحبؒ نے علمائے علوم کو براہ راست قرآن کریم پر غور وفکر کرنے کی ترغیب دی ہے کہ تاکہ لا تنقضی عجائبہ کی صداقت قیامت تک ظاہر ہوتی رہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرائے وہ تفسیر ہے جو دین کے اساسی تصورات اور متواتر عقائد واعمال کے خلاف ہو۔ پھر فرماتے ہیں:۔

ومن حجر علی العلماء ان لا یبرزوا معانی الکتاب بعد الامعان فی السباق والسیاق والنظر الی حقائق الالفاظ المراعیة لعقائد السلف بل ذالک حظهم من الکتاب فانهم هم الذین ینظرون فی عجائب ویکشفون الاستار عن وجوه دقائقه ویرفعون الحجب عن خبئات حقائقه. فهذالنوع من التفسیر بالرّای حظ اولی العلم ونصیب العلماء المستنبطین

اہل علم کو کس نے روکا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے معانی ومطلب کو سیاق وسباق الفاظ قرآن کے اقتضاء اور سلف صالحین کے عقیدہ کی رعایت رکھ کر بیان نہ کریں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کتاب اللہ میں اہل علم کا حصہ یہی ہے وہ کتاب اللہ کے نئے نئے پہلوؤں پر غور کر کے اس کے پوشیدہ اسرار ورموز سے پردہ اٹھائیں۔ اور جو لطائف پوشیدہ ہیں انہیں نمایاں کریں۔

حضرت محدث کشمیریؒ کو آخر عمر میں اس کا احساس تھا کہ وہ دوسرے علم سے زیادہ علم تفسیر پر غور وفکر کے لئے وقت نکالتے۔

یقیناً اگر علامہ مرحوم کو کتاب اللہ کے اسرار ورموز کے کشف وبیان کا پورا پورا موقع مل جاتا تو قرآنی علوم کا وہ نادر ذخیرہ وجود میں آتا جس سے اربابِ نقل وروایت، اصحابِ عقل ودانش اور فقہاء ومحدثین سب کے سب مستفیض ہوتے اور موجودہ سائنسی دور میں تفسیری علوم کا نہایت کارآمد علمی سرمایہ ثابت ہوتا۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کا مسلک طریقت

از: جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ڈاکٹر ذاکر حسین کالج دہلی

حضرت الامام المحدث انور شاہ کشمیریؒ جامع کمالات اور یگانۂ روزگار بزرگ تھے۔ ان میں فقہِ حدیث کا وہ غیر معمولی ملکہ ودیعت ہوا تھا جو کچھ منتخبان روزگار ہی کے حصے میں آتا ہے اس لئے انہیں فقیہ محدث کہا جاتا ہے لیکن ان کی ایک انفرادی حیثیت یہ بھی ہے کہ وہ فقیہ صوفی تھے اور حضرت گیسودرازؒ (ف ۸۲۵ھ) نے اپنے ملفوظات میں فرمایا ہے کہ ''جوان صالح اور فقیہ صوفی الشاذ کالمعدوم'' کا حکم رکھتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں کئی طویل دور ایسے بھی آئے ہیں کہ حکومت وقت کے زیر اثر شریعت اسلامیہ اپنے خالص دینوی اور تعزیری رنگ میں محدود ہوگئی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی فقہاء اور متصوفین کی راہیں الگ الگ نظر آتی ہیں حتی کہ شریعت کو علم ظاہر اور سلوک وطریقت کو ''علم باطن'' کا نام دیا گیا گویا شریعت کو lether of the law اور طریقت کو Spirit of the law سمجھا جانے لگا۔ ہر چند یہ اختلاف فرضی تھا اصلی نہیں پھر بھی تاریخ کے اوراق میں ایسے علماء خال خال ہی ملیں گے جنہوں نے ظاہر شریعت کے مکمل احترام کے ساتھ میدان سلوک میں بھی یکہ تازی کی ہو۔ اور اسی طرح برعکس۔

ہندوستان میں تصوف کی تخم ریزی کرنے والے صوفیائے چشت نے ''مقام شریعت'' کو خوب پہچانا تھا۔ ان میں اکثر صوفیاء مثلاً حضرت بابا فرید، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت چراغ دہلی، حضرت گیسودراز، حضرت مخدوم جہانیاں، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کے فرزندان گرامی، حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی، حضرت شاہ عضد الدین امروہوی اور حضرت شاہ عبدالباری وغیرہ نے علوم ظاہری یعنی معقول ومنقول کی تکمیل اپنے اپنے زمانے کے رواجی نصاب کے مطابق کی تھی۔ اجازت وخلافت کے لئے بھی یہ حضرات علم شریعت کو ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے والد ماجد حضرت شیخ

عبدالاحدؒ نے جب حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے ان کے آستانے پر رہنے کی اجازت طلب کی تو شیخ نے فرمایا کہ پہلے علوم دین وشریعت کے حصول میں ہمت صرف کرو پھر یہاں آنا۔ کیونکہ ''درویشی بے علم راچنداں نکے نیست'' (زبدۃ المقامات ص ۹۲)

انہوں نے شیخ کے کبرسن اور ضعیفی کے پیش نظر عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ جب میں تحصیل علوم سے فارغ ہو کر آؤں تو مبادا کہ یہ گرامی صحبت نہ ملے۔ ارشاد ہوا کہ اگر میں نہ رہوں تو میرے بیٹے شیخ رکن الدین سے رجوع کرنا۔ اور آخر یہی ہوا۔

حضرت چراغ دہلیؒ نے اپنے ملفوظات خیر المجالس میں فرمایا ہے کہ پہلی سیڑھی شریعت ہے، دوسری طریقت، تیسری حقیقت۔ اور یہ اس لئے کہ اگر کوئی مقام حقیقت سے گرے گا طریقت میں رہے گا، طریقت سے نیچے آئے گا تو بارے مقام شریعت میں رہے گا لیکن شریعت سے ساقط ہوا تو سوائے جہنم کے اس کا ٹھکانا کہاں ہے؟

غرض کہ یہ چشتی سلسلہ کے اکابر صوفیہ نے ہمیشہ ظاہر شریعت کی بالادستی اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا ہے۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ پیر کا عالم صحو میں اور عالم شرع ہونا ضروری ہے تاکہ وہ نامشروع باتوں کا حکم نہ دے۔ حضرت چراغ دہلی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ''مسلک پیر حجت نمی شود دلیل از کتاب وسنت می باید'' صوفیاء کی مبارک سیرت کو غور سے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ''ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است'' کے مصداق ان میں سے ہر ایک کی اپنی شان ہے اور ہر ایک پر نیا حال غالب ہوتا ہے۔ ''در محفل او مستی ہر یک زشرابے ست''

حضرت کشمیریؒ کی سیرت اور سوانح کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ بظاہر وہ عالم یا فقیہ، متکلم، محدث یا مفسر، معلم اور مبلغ تھے لیکن ان کا قلب اسرار الٰہی کا گنجینہ، انوارِ حقائق کا ایسا منبع تھا جس پر انہوں نے علم ظاہر کے پردے ڈال رکھے تھے کہ اہل محفل کی نگاہیں خیرہ نہ ہوں۔ شاید العلم حجاب الاکبر کا ایک مفہوم یہ بھی ہو۔ وہ یقیناً ایک صوفی صافی، صاحب عرفان اور نسبت عالیہ رکھنے والے سالکین طریقت میں سے تھے۔ عالم اور معلم دنیا میں لاکھوں ہوتے ہیں لیکن امام غزالیؒ کی مانند ان کے علم میں جو خیر و برکت تھی، جو انوار تھے، جو افادہ اور اخلاص اور تاثیر تھی یہ صرف ان کی نسبت عالیہ کا اعجاز ہے۔ غالب کے

ایک قطعے کو ذرا سے تصرف کے ساتھ پڑھتا ہوں :۔

گرچہ عالمانِ فیض آثار ❁ زیک جام اندر بزم سخن مست
ولے بابادۂ بعضے حریفاں ❁ خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ دراطوار ایں قوم ❁ ورائے علم ہم چیزے دگر ہست

یہ ''خمار چشم ساقی'' اور ''چیز دگر'' انہیں شریعت، طریقت اور حقیقت کے اعلیٰ ترین سرچشموں سے ملی تھی۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا خاندانی سلسلہ حضرت شیخ مسعود نروریؒ سے ملتا ہے۔ یہ گویا سہروردی کرمانی نسبت ہے جو ان کے خمیر میں شامل تھی پھر انہیں ابتدائے حال میں میاں نظام الدین نقشبندی مجددی کی مختصر صحبت نصیب ہوئی۔ مگر غالباً ان سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔

انہوں نے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ۱۳۱۴ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھ پر سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں بیعت کی۔ (الانور، ص:۱۰۱)

اور خلافت سے بھی یقیناً سرفراز ہوئے ہونگے۔ اگرچہ تذکرہ الرشید میں جہاں مولانا گنگوہی کے خلفاء و مجازین کا ذکر ہے ان میں مولانا کشمیریؒ کا نام نہیں ملتا لیکن اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ آپ نے اس کا اخفاء فرمایا اور مؤلف تذکرہ کو کسی دوسرے ذریعے سے علم نہ ہوسکا۔ خلیفۂ مجاز ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ اگر اجازت نہ ہوتی تو خود حضرت مولانا کشمیریؒ کسی سے دست ارادت قبول نہ کرتے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ ''شیخ الہند کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سابق مفتی اعظم پاکستان نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کی طرف رجوع کیا۔ ہمیں طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اس میں کھلی تاثیر اور تصرف محسوس کرتے تھے'' (الانور، ص:۲۸۱)

مولانا کشمیریؒ نے اپنے روحانی احوال کا بہت شدت کے ساتھ اخفاء کیا ہے صرف صاحبانِ حال ہی ان کے مقامات سنیہ کی رفعتوں کا کچھ ادراک کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت میں انوار و برکات کا ایسا وفور ہے کہ ہم جیسے عامی اور اعمیٰ بھی بہت کچھ دیکھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی اپنی شان تھی۔ وہ بھی تصوف میں سرتاسر رنگے ہوئے

تھے اوران پر چشتی نسبت پوری طرح مستولی تھی۔ مگرانہیں ظاہر شریعت کے حفظ وحمایت کا اتنا خیال تھا کہ بعض امور میں انہوں نے اپنے پیرو مرشد شیخ العرب والعجم قطب العالم حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بھی اختلاف کیا اوران کے فیصلہ ہفت مسئلہ کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ طریقت میں ارادت ''متابعتِ کاملہ'' کا نام ہے اوراس رمز کو مولانا گنگوہیؒ یقیناً ہم سب سے زیادہ جانتے تھے مگر حاجی صاحبؒ نے ان جزوی اختلافات کے بارے میں فرمایا کہ:

''فقیر تو آپ کے سب اقوال کو موافق شرع جانتا ہے اگر چہ بعض مسائل میں موافق نہ سہی اوراس اختلاف کو صحابہ کا اختلاف سمجھتا ہے'' (تذکرۃ الرشید)

حضرت حاجی صاحبؒ نے ابتداء میں شاہ نصیرالدین آفاقی نقشبندی دہلوی سے بیعت کی تھی مگر مجھے اس کا کہیں حوالہ نہیں ملا کہ انہیں نقشبندی سلسلے میں خلافت بھی ملی تھی۔ حضرت حاجی صاحب نے ہزروں لاکھوں تشنگان معرفت کو اپنے حلقہء ارادت میں داخل کیا انہیں سلسلہ ءچشتیہ صابریہ، قدوسیہ ہادویہ ہی میں بیعت کیا اور جن حضرات کو خلافت عطا فرمائی یا کچھ اوراذکار تلقین کیے وہ بھی سب چشتی سلسلے ہی کے تھے۔

حضرت کشمیریؒ نے ابتداء میں کچھ اورادووظائف سہروردی کرمانی سلسلے کے بھی پڑھے تھے جوانہیں اپنے والد ماجدؒ سے پہنچے تھے۔ لیکن مولانا گنگوہیؒ نے جواوراد انہیں تعلیم کیے تھے وہ طریق سلف سے ملنے والے خالص چشتی اذکار ہی تھے۔

اختلافی مسائل

ہندستان کے علمائے احناف میں بعض فروعی مسائل پر جن اختلاف کوافتراق کا سبب بنایا گیا ہے ان میں حضرت شاہ صاحب کا رویہ ایسا تھا جوان کے رتبے کے عالم دین کے شایانِ شان کہا جاسکتا ہے۔ مقدمہ بہاولپور کی شہادت میں قادیانی وکیل نے جرح کرتے ہوئے کہا تھا کہ:''علمائے بریلی علمائے دیوبند پر کفر کا فتوے دے رہے ہیں اور علمائے دیوبند علمائے بریلی پر ''۔ حضرت شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ''جج صاحب احقر بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی جانب سے گذارش کرتا ہے کہ حضرات دیوبند ان کی تکفیر نہیں کرتے۔ اہل سنت والجماعت

اور مرزائی مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے۔ علمائے دیوبند اور علمائے بریلی میں واقعات کا اختلاف ہے قانون کا نہیں۔ چناں چہ فقہائے حنفیہ نے تصریحات فرمائی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کلمۂ کفر کسی شبہ کی بنا پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہ کی جائے۔ (انور، ص:۴۸۵)

ان فروعی اختلافی مسائل میں ''قیام میلاد'' کا سوال بھی تھا کہ کچھ لوگ کھڑے ہو کر یا دعا کے طور پر ہاتھ اٹھا کر حضور رسالت مآب ابی وامی فداہ کی خدمت میں صلوٰۃ وسلام عرض کرتے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اس مدح میں یہ فرمایا: ''بھائی مجھے تو اس میں لطف آتا ہے'' یعنی نہ جواز کا فتویٰ دیا نہ عدم جواز کو قبول کیا، یہیں کشمیر میں کسی نے حضرت شاہ صاحبؒ سے سوال کیا کہ صلوٰۃ وسلام کے وقت ہم اپنے ہاتھوں کو نماز کی طرح ادب سے باندھیں گے یا بصورت دعا دونوں ہاتھ پھیلائیں گے؟ حضرت نے جواباً فرمایا کہ ادب سے ہاتھ باندھو تو عین ادب ہے۔ پھر مولانا عارف رومیؒ کا یہ شعر زبان پر لائے۔ ؎

کردم از عقل سوالے کہ بگو ایمان چیست

عقل در گوشِ دلم گفت کہ ایمان ادب است

خاص کر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ادب کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب ☆ ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی است

اور فرمایا کہ اگر کوئی دعا کی نیت سے ہاتھ اٹھائے تو اَلصَّلٰوۃُ عَلَی النَّبِیِّ دُعَآءٌ یعنی سرور کائنات ﷺ پر درود پڑھنا دعاء ہے۔ (الانور، ص:۶۳۷، ۶۳۸)

سید مبارک شاہ گیلانی صاحبؒ کہتے ہیں کہ ارواحِ اولیاء کے استمداد کے بارے میں میرا عقیدہ کچھ مشتبہ تھا۔ شاہ صاحبؒ سے سوال کیا تو فرمایا: ''بچہ ہر عمل کا دارومدار نیت پر ہے، انما الاعمال بالنیات اگر عقیدۃً اور حقیقتاً انبیاء اور اولیاء سے استمداد کیا جائے تو کفر ہے'' (الانور، ص:۶۳۷)

اب میں مولانا کشمیریؒ کے چند احوال واشغال بیان کرتا ہوں جن کا تعلق سلسلۂ چشتیہ صابریہ کی نسبت سے تھا۔

۱:اسم ذات اور پاس انفاس

حضرات چشتیہ کا خاص وظیفہ ''اسم ذات'' ہے۔ اس کا دور ایک کروڑ بار وِرد کرنے سے پورا ہوتا ہے اور اس کی خاصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اسم اللہ قلب پر منقوش ہو جاتا ہے، اسرار توحید منکشف ہو جاتے ہیں اور ماسویٰ سے قلب کو کسی طرح کی رغبت نہیں رہتی۔ اس کے اثر سے سالک صرف لقائے حق کا خواستگار ہو جاتا ہے اور وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ایسے ہی مجاہدوں اور مشتاقوں کی شان ہے۔ یہ ذکر بھی حدیث سے مقتبس ہے لاتقوم الساعة حتى يقال في الارض الله الله۔ حضرت کشمیریؒ نے ایک بار لدھیانہ میں وعظ کرتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ عالم کی روح ذکر اللہ ہے، جب تک اللہ کی یاد قائم رہے گی عالم باقی رہے گا، جب دنیا اللہ کی یاد چھوڑ دے گی تو سمجھ لو کہ کوچ کا وقت آ گیا۔ (الانور، ص: ۴۳۰)

اس کے بعد پاس انفاس کا ورد ہوتا ہے۔ اس میں کلمہ طیبہ کے نفی و اثبات کو سانس کی آمد و شد میں بسا لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ایسی عادت ثانیہ بن جاتی ہے کہ زندگی بھر ہر سانس کے ساتھ ذکر ہوتا رہتا ہے۔ حبس دم اور پاس انفاس کا طریقہ جوگیوں میں بھی ہے اور اسے ہندوستان کے اکابر صوفیہ نے مفید جان کر اختیار کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کشمیریؒ سلوک کے ابتدائی دور ہی میں اس مرحلے سے گزر گئے تھے۔ کبھی حضرت وقفے تک خاموشی اختیار کئے رہتے تو آپ کے تنفس کی منضبط کیفیت سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ پاس انفاس کے شغل میں برابر مشغول ہیں۔ (الانور، ص: ۳۲۷)

مولانا محمد منظور نعمانی کی روایت ہے کہ ایک بار آپ نے فرمایا ''اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت و سنت پر استقامت ہے۔ (الانور، ص: ۳۲۵)

یہ آخری جملہ خاص طور پر حضرت کشمیریؒ کے ذوق اور مشن کا آئینہ دار ہے۔

احسانی کیفیت کیا ہے؟ ایک حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے:

"ان تعبدالله کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" یعنی اگر دونوں طرف سے رابطہ قائم ہو جائے تو سبحان اللہ ورنہ یک طرفہ رابطہ سے ہی عبادت باخلاص جاری رکھے، جو خدا کو نہ دیکھ کر بھی اس کی عبادت اس طرح کرے گا گویا خدا اسے دیکھ رہا ہے وہ اس حدیث کی رو سے "محسن" ہے۔ اور قرآن کہتا ہے ان اللہ لایضیع اجر المحسنین جس نے بے دیکھے اور بے لاگ عبادت کی گویا احسان کیا، یہ توقع نہ رکھی کہ اس کا صلہ واقعی کچھ ملے گا یا نہیں۔ اللہ اس کا صلہ ضائع نہیں کریگا۔ وعدۂ الٰہی یہ ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ یعنی جس بندے نے صلہ کو جانچے پرکھے بغیر ہماری عبادت کی ہوگی اس کی جزاء بھی یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی عبادت کو انکے تولے بغیر اجر دیا جائے۔

میری ناقص رائے میں احسان کی کیفیت میں عوض معاوضہ والی بات نہیں ہے بلکہ یک طرفہ اور بے طمع نیکی ہے "طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبین کی لاگ الخ" اسی لئے وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا فرمایا ہے۔ والدین کے ساتھ احسان کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان کی طرف سے اگر اچھا سلوک نہ بھی ہو تو بھی اولاد ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔

احسان کے ساتھ دوسری کیفیت حضرت کشمیریؒ نے "استقامت" فرمائی ہے یہ بھی احسان ہی کا دوسرا نام ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک خلیفہ نے عرض کیا کہ خلق خدا کرامت کی طلب گار ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا:

الکرامۃ ھی الاستقامۃ علی باب الغیب یہ "استقامت علی باب الغیب" "احسان" نہیں تو کیا ہے؟ اس سے منطقی نتیجہ یہی نکلا کہ احسانی کیفیت بجائے خود کرامت ہے۔

مراقبہ اسم ذات

حضرت کشمیریؒ کی زبان مبارک دن بھر درس حدیث میں قال اللہ اور قال الرسول کا ورد کرتی تھی۔ یہ بھی ایک ذکر ہی تھا علی الدوام ذکر۔ لیکن مراقبہ کو صوفیہ نے مشاہدہ و معائینہ کی پہلی سیڑھی بتایا ہے۔ ذکر سے سامعہ اور ناطقہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر مشاہدہ و فکر کا

ذوق مراقبہ میں ہے۔ حضرت کشمیریؒ جب اپنے حجرے میں تنہا ہوتے تو وہ مشغولیت کا دوسرا ہی عالم ہوتا تھا۔

ملنے والو پھر ملے گا وہ ہے عالم دیگر میں ☆ میر فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

آپ تہجد کے لئے رات کو دو بجے بیدار ہو جاتے اور فجر کے وقت تک مراقبہ اور پاس انفاس میں مشغول رہتے تھے۔ (الانور، ص:۲۷۹)

نماز فجر کے بعد سورج کے ایک نیزہ بلند ہونے تک وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہوتے اور یہ سب معمولات اسی طرح سلسلۂ چشتیہ صابریہ ہادویہ کے بزرگوں کے بھی رہے ہیں۔

حالت مراقبہ اور مشغولی کا بیان آپ کے شاگرد نے اس طرح کیا ہے:۔

''احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی قمقمے روشن ہوں حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی'' (الانور، ص:۲۷۹)

تعویذ اور ادعیہ

بزرگان طریقت کی طرح حضرت کشمیری عندالضرورت کسی طالب کو کوئی وظیفہ یا دعا بھی پڑھنے کے لئے تجویز کرتے تھے۔ یہ اکثر ماثور دعائیں ہوتی تھیں۔

ایک بار حافظ ابوزرعہ کی روایت نقل کی کہ جرجان میں ہزارہا گھر آگ لگنے سے جل گئے اور قرآن بھی جلے مگر ان میں بعض آیات نہیں جلیں اور ان آیتوں کے لئے فرمایا کہ اگر انہیں لکھ کر کسی برتن میں بند کر کے دکان یا گھر یا سامان میں رکھیں تو حفاظت کے لئے مجرب ہے۔ (الانور، ص:۴۳۲)

اسی طرح کسی لاعلاج مرض کے لئے فرمایا کہ ہر سورت کی آخری آیت پڑھ کر پانی پر دم کریں تو مفید ہے۔ (الانور، ص:۴۳۲)

شمائم امدادیہ میں حضرت شاہ عبدالباریؒ کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ آپ نے کسی کو یہ الفاظ بطور تعویذ لکھ کر دیئے تھے۔ ''چل اڑ جاری بھنبھیری ساون آیا''

حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں ایسا ہی چٹکلہ ان کے صاحبزادے مولانا انظر شاہ

نے بیان کیا کہ چیچک کے بخار میں مریض کے کان میں یہ الفاظ کہنے کو فرمایا:۔

اوراد: اوراد میں حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل ہمہ وقت زبان مبارک پر جاری رہتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے زبان سے حسبنا اللّٰہ ہی نکلتا تھا۔ یہ خود آپ کے مقام فردانیت پر پہنچ جانے کی دلیل ہے۔ ایسی روایات کثرت سے ملتی ہیں اور بحمد اللہ ابھی اس کے شاہدین بھی زندہ ہیں کہ آپ ضخیم کتاب سے ایک یا آدھی سطر کا حوالہ بھی حسبنا اللّٰہ کہہ کر فوراً نکال لیتے تھے۔

اسی سلسلۂ عالیہ کے بزرگ حضرت شاہ عضد الدین امروہوی (متوفی ۱۱۷۲ھ کی ایک تصنیف مقاصد العارفین (۱) فن سلوک میں بے مثل کتاب ہے اور شیخ اکبر کے افکار اور اسلوب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس میں حضرت شاہ عضد الدین نے اسمائے صفات کی تجلیات سے بھی بحث کی ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ سالک پر مختلف اسماء کس طرح متجلی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ حضرت کشمیریؒ حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل کے باقاعدہ عامل تھے اور یہ اسم یا وکیل کی تجلی تھی یا باصطلاح دیگر اسی اسم کے مؤکل آپ کے تابع تھے۔ کیونکہ بعض مواقع پر تو اسی حسبنا اللہ نے بدیہی کرامت دکھادی ہے۔ (روایات کی نقل سے بخوف بطوالت پرہیز کرتا ہوں)

قوت مکاشفہ

خطرات پر آگاہ ہونے کی قوت یا کشفی صلاحیت بہت ہی ادنیٰ درجہ ولایت و کرامت کا ہے اور اکابر صوفیہ نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ جیسے دُردی کش میخانہ شریعت وطریقت کے احوال میں مکاشفات کی مثالیں تلاش کرنا کوئی خاص قابل اعتناء بات نہیں ہے۔ ذاکر و شاغل اور حق آگاہ درویش پر تو کبھی ایسے لمحات بھی گزرتے ہیں کہ اسے یہ سارا عالم کف دست پر رکھے ہوئے انڈے کی طرح نظر آتا ہے۔

(۱) مقاصد العارفین کے صرف ۴، ۵ ہی قلمی نسخے ملتے ہیں۔ میں نے اس کے چار مخطوطات فراہم کر کے اسے ایڈٹ کیا ہے اور آج کل یہ کتابت کے مرحلے سے گذر رہی ہے۔ آپ نے اپنے اوراد وادعیہ کی ایک بیاض بھی مرتب کی تھی جسے بعد میں مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کر دیا تھا۔

کرامات امدادیہ میں لکھا ہے کہ ایک صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت کی۔ ان کے ایک ملنے والے نقشبندی مجددی سلسلے کے مجاز تھے اور وہ چاہتے تھے کہ یہ میرے ذریعے سے داخل سلسلہ ہوں اس لئے ان کے دل میں سلسلہ چشتیہ کی طرف سستی اعتقاد پیدا کرنا شروع کر دیا اور یہ کہا کہ اس سلسلہ میں سلوک ختم ہی نہیں ہوتا، عمر بھر کشف نہیں حاصل ہوتا کچھ نظر نہیں آتا۔ مولوی صاحب چونکہ مشائخ کی صحبت میں کم بیٹھے تھے کسی قدر اعتقاد اُسست ہو گئے۔ مولانا تھانویؒ نے ان کا حال بیان کیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کشف کوئی چیز نہیں لڑکوں کو ہو جاتا ہے۔ کشف حقائق اہل حقیقت کے نزدیک معتبر ہے۔ (کرامات امدادیہ، ص:۱۳)

جو لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت کیمیا خاصیت سے بہرہ اندوز ہونے کی سعادت رکھتے ہیں انہوں نے اس قوت مکاشفہ کے ہزاروں کرشمے دیکھے ہونگے، ایک واقعہ مولانا محمد انوری لائلپوری نے لکھا ہے کہ:

> ''حضرت شاہ صاحبؒ نے آسٹریلین بلڈنگ (لاہور) کی جامع مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء، عوام وخواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور انکے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوئے تھے۔ بیان تھا: اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو۔ غرض حضرتؒ نے خطبہ شروع فرمایا: **الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ** وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے۔ احقر کے دل میں وسوسہ سا گذرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوئے ادب ہو۔ حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا، فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک سائل کے جواب دینے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے، غالباً لوہے کے تھے۔ مصلّٰی کے قریب رکھی گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بیٹھ کر جوابات دیئے''

یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرت نے وعظ کہا۔ احقر ندامت سے پسینے پسینے

ہو گیا'' (الانور، ص: ۲۱۳-۲۱۴-۲۸۰)

یہ تو ''کشف قلوب'' کا عالم تھا۔ دوسری نوعیت یعنی ''کشف قبور'' کی مثال بھی سن لیجئے۔ جناب سید نبیہ احمد اندرابی کی روایت ہے:

''خانقاہ اندرابیہ (واقع سری نگر) میں پہلی مرتبہ غالباً عصر کی نماز پڑھائی۔ نماز پڑھا کر دعاء کے لئے قوم کی طرف منھ کیا مگر پیٹھ ذرا جنوب کی طرف مائل تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد پوری طرح قوم کی طرف منہ کر کے پشت بقبلہ ہو کر بیٹھ گئے۔ دعاء سے فارغ ہوئے تو حاضرین سے دریافت فرمایا کہ ادھر جنوب کی طرف کون بزرگ مدفون ہیں؟ حاضرین نے عرض کیا کہ یہ سید السادات شیخ سید میر محمد میرک اندارابیؒ کا مزار پرانوار ہے۔ اس کے بعد کبھی اس کی طرف پیٹھ کر کے نہیں بیٹھے''۔

کشف حقائق

مجاہداتِ سلوک کیا ہیں، دقائقِ حقائق کی راہوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا. شاہ صاحبؒ کی پوری زندگی ریاضت اور مجاہدہ تھی انہوں نے زیادہ تر اپنے مجاہدات کو مخفی رکھا۔ لیکن فتنۂ قادیانیت کی تردید اور استیصال کے لئے تو وہ ایک مزمن بیماری اور عالمِ ضعیفی کے باوجود باہمت نوجوانوں کی طرح میدان میں کود پڑے تھے۔ خدا کے فضل سے جہاد ظاہری کی فضیلت سے بھی محروم نہ رہے۔

اسرارِ شریعت کچھ بھی ہوا کریں لیکن بحیثیت ایک محدث، مفتی اور فقیہ کے ان کا فرض یہ تھا کہ ظاہر شریعت کی حمایت وحفاظت کریں۔ مگر انہوں نے کبھی اہل تصوف کے خلاف کوئی ادنیٰ سا کلمہ بھی استخفاف کا اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ شریعت وطریقت کی ایک بحث مقدمہ بہاولپور کی گواہی میں سخن گسترانہ طور پر آن پڑی تھی تو آپ نے فرمایا:

''ہم سمجھتے ہیں کہ ظہر قرآن کی مراد وہ ہے جو قواعد لغت اور عربیت اور ادلہ شریعت سے علمائے شریعت سمجھ لیں اور اس کے تحت میں قسمیں ہیں اور باطنی سے یہ مراد ہے کہ حق تعالیٰ اپنے ممتاز بندوں کو ان حقائق سے سرفراز کردے اور بہتوں سے وہ

خفی رہ جائیں لیکن ایسا کوئی باطن جو مخالف ظاہر کے ہو اور قواعد شریعت اس کو رد کرتے ہوں مقبول نہ ہوگا اور رد کیا جائے گا اور بعض اوقات باطنیت الحاد تک پہنچادیگی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہم مکلّف فرمانبردار بندے اپنے مقدر کے موافق ظاہر کی خدمت کریں، اور باطن کو خدا کے سپرد کردیں"۔ (الانور، ص:۴۶۴)

اسی شہادت میں حضرت کشمیریؒ نے یہ چیلنج بھی کردیا تھا کہ صوفیائے کرام جسے فن حقائق کہتے ہیں (مرزا غلام احمد قادیانی) اس میں سے کسی حقیقت کو صحیح نہیں سمجھ سکا۔ (الانور، ص:۴۵۶)

کاش کسی نے "فن حقائق" کے موضوع پر شاہ صاحب کو چھیڑ دیا ہوتا تو آج کشف المحجوب، رسائل قشیریہ یا عوارف المعارف جیسی کوئی اور کتاب بھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتی۔

توحید وجودی

چشتی صوفیہ کے سلوک میں "کشف حقائق" کا مرتبہ حاصل ہوجائے تو عقیدۂ وحدت وجود پر کامل شرح صدر ہوجاتا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو مولوی قلندر جلال آبادی نے ابتداء میں ہی بشارت دی تھی کہ تم پر توحید خوب منکشف ہوگی۔ اسی لئے خدا نے ان کا پیوند بھی حضرت شاہ عبدالباری کی خانقاہ سے کردیا جو اپنے مسلک وحدت وجود میں بے مثل تھی اور جہاں عبدالرحمٰن موحد لکھنوی جیسے بزرگ بھی کچھ سیکھنے کے لئے آکر رہتے تھے۔

ہندوستان میں توحید وجودی کا مذاق حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصانیف کے ساتھ آیا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری میں فصوص الحکم کی پہلی شرح اسی سرزمین کشمیر میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ (ف ۷۸۶ھ) نے لکھی تھی۔ (خلیق احمد نظامی، تاریخی مقالات:۲۵)

فارسی شرح کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے، عربی شرح ناپید ہوگئی۔ اس کے بعد ہندوستان میں عربی فارسی دونوں زبانوں میں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کی متعدد شرحیں اور ترجمے ہوئے جن کی تفصیل حضرت مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی کی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ کے بزرگوں میں گلزار ابرار کی روایت کے مطابق سب سے

پہلے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے شرح فصوص الحکم لکھی تھی لیکن حضرت شیخ محبّ اللہ الہ آبادی (ف ۱۰۵۸ھ) نے تو ہندوستان میں ابن عربی کے افکار کو عام کرنے میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے مسئلہ وحدت الوجود کے دقائق واسرار کو عارفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ داراشکوہ بھی ان کی خدمت میں استفادہ کے لئے حاضر ہوتا تھا۔

شاہ صاحبؒ کے سلسلہ کی مختصر تاریخ:

ثانی ابن عربی حضرت محبّ اللہ الہ آبادی کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ خلیفہ حضرت شیخ محمدی فیاض اکبرآبادی مولانا رفیع الدین فاروقی شاگرد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے تذکرۃ المشائخ میں لکھا تھا کہ شاہ محمدی فیاض علوم ظاہری کے بھی اتنے ہی بڑے عالم تھے ورع وتقوی میں ان کے مرتبے کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ شیخ محبّ اللہ نے فرمایا: ''اگر یہ میرے مرید نہ ہوتے تو میں خود ان کا مرید ہوتا''۔

شاہ محمدی فیاض کا قیام آگرہ میں رہتا تھا اور داراشکوہ انکی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے مرشد شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کی کتاب تسویہ کی شرح بھی لکھی تھی۔ اسی کی آڑ لیکر اورنگ زیب نے انہیں پہلے گوالیار پھر اورنگ آباد کے قلعے میں اسیر کر دیا تھا۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو بھی شیخ محی الدین ابن عربی کی تصانیف سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے رموز ودقائق کو خوب سمجھتے تھے اور ظاہر شریعت پر ان کا انطباق خوب کرتے تھے، عوام سے تو ان مسائل کو بچا کر رکھتے تھے۔ لیکن اگر علماء اور صاحبان دل کی محفل ہوتی اور مسئلہ وحدت الوجود کا ذکر چھڑ جاتا تو ایسے حقائق ومعارف بیان فرماتے تھے جن سے کچھ اندازہ ہوسکتا تھا کہ خود شاہ صاحبؒ کس مقام پر فائز ہیں۔ بقول شاعر ؎

خم کے خم پی گئے مئے منصور ☆ لیک اس کا سا شور وشر نہ کیا ط

ایک بار مسئلہ وحدت وجود ووحدت شہود کی بات چھڑ گئی بس پھر کیا تھا تین دن تک نماز عصر سے وقت عشاء تک برابر اسی موضوع پر کلام کرتے رہے۔ (الانور ص:۲۷۸)

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بحر مواج ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے اپنی بعض نظموں میں مسائل توحید وجودی نظم کئے ہیں۔ یہ نظمیں بھی شاہ صاحبؒ کو از بر تھیں۔

حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے چار مسئلوں میں شرح صدر ہے: (اشرف التنبیہ ص:۲۵) مسئلہ قدر، مشاجرات صحابہ، مسئلہ روح اور وحدت الوجود۔ حضرت کے متوسلین کو بھی اس کا کچھ نہ کچھ فیضان ضرور پہنچا ہے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (ف ۶۳۰ھ) کے بارے میں شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ وہ اس امت کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ہیں۔ وہ حقائق کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور اس فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے (۱)۔

درس حدیث میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے سامنے جب کبھی اسرار شریعت پر بیان کرنے کا موقع آتا تھا تو شیخ اکبر اور شیخ عبدالوہاب شعرانی کے حوالے بکثرت دیتے تھے (۲) مشہور مقدمہ بہاولپور میں آپ کی شہادت پر جرح کرتے ہوئے قادیانی وکیل نے شیخ ابن عربی کے بعض اقوال سے معارضہ کیا تو آپ نے شیخ اکبر کی پوری مدافعت فرمائی تھی۔ حتی کہ ایک موقع پر فرمایا:

''صوفیاء کے یہاں ایک باب ہے جس کو شطحیات کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ان پر حالات گزرتے ہیں اور ان حالات میں کچھ کلمات ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں جو ظاہری قواعد پر چسپاں نہیں ہوتے اور بسا اوقات غلط راستہ لینے کا سبب بن جاتے ہیں۔ صوفیاء کی تصریح ہے کہ ان پر کوئی عمل پیرا نہ ہو، اور تصریح کرتے ہیں کہ جن پر یہ احوال نہ گزرے ہوں یا جو ان کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں وہ ہماری کتابوں کا مطالعہ نہ کریں (۳)''

حضرت کشمیریؒ کا بنیادی طور پر صوفی منش ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ امام ابن تیمیہؒ کے تبحر علمی اور خلاقانہ فکر کے قائل تھے مگر انہیں تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے

---

(۱) فیض الباری، ص:۲/۱۶۴، بحوالہ: الانور: ص:۳۸۰۔

(۲) الانور، ص:۴۵۰۔ (۳) الانور، ص:۴۷۳۔

بارے میں اعتدال پسندانہ اور منصفانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ فرماتے تھے کہ ابن تیمیہ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا دین یا پیغمبر کی حدیث کو ان کی عقل کے موافق اترنا چاہئے تھا''۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ حافظ ابن تیمیہ صرف اپنی کہتے ہیں دوسروں کی نہیں سنتے۔ (الانور، ص:۳۶۸)

شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ علماء دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں ابن تیمیہ کی تصانیف ہیں اور دوسرے میں شیخ اکبر کی۔ ابن تیمیہ کے افکار سے جلال و جبروت الٰہی کا اظہار ہوتا ہے اور شیخ اکبر کی کتب سے رجا و انبساط و محبت حق اور انس ملتا ہے''۔ طریقت اور شریعت کے تعارض کی بحثوں میں اس سے زیادہ معتدل اور منصفانہ رائے ہم عصر علماء میں اور کسی کے ہاں مشکل ہی سے ملے گی۔

حضرت شاہ محمدی فیاض اکبرآبادی (ف ۱۱۰۷ھ) ہی پہلی بار امروہہ میں آ کر بس گئے تھے۔ یہاں ان کے بھتیجے حضرت مولانا عضد الدین امروہوی نے ان سے سلوک کی تکمیل کر کے خلافت پائی۔ بعض شجروں میں حضرت عیسیٰ ہرگامی، شاہ محمد حامد، محمد روشن مدنی وغیرہ ناموں کا اضافہ صرف برکت کے لئے کر لیا گیا ہے حضرت شاہ عضد الدین (ف ۱۱۷۲ھ) نے معقول و منقول کی تحصیل زمانے کے رواج و منہاج کے مطابق کی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہندو فلسفہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے انہوں نے بھیس بدل کر کئی سال اجودھیا میں قیام کیا اور سنسکرت پڑھی۔ وہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ دیوان تو ضائع ہو گیا، کچھ متفرق اشعار مل جاتے ہیں۔ فارسی میں ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف ''مقاصد العارفین'' جس کا تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ ان کی ایک سنسکرت کتاب ''ست سرودر'' (جس کا ترجمہ بحر الحقیقت ہو سکتا ہے) بھی تھی۔ اس کی ایک جھلک میں نے دیکھی ہے اب یہ ناپید ہو گئی ہے۔

حضرت شاہ عضد الدین صاحبؒ کے ایک خلیفہ ان کے فرزند حضرت شاہ معز الدین عرف میاں موج (ف ۱۱۹۵ھ) تھے اور دوسری خلافت حضرت شاہ عبدالہادی چشتی امروہوی (ف:۱۱۹۰ھ) کو ملی تھی اس کے بعد کئی پشتوں تک یہی سلسلہ رہا کہ ایک خلافت فرزند صلبی کو ملتی رہی دوسری حضرت شاہ عبدالہادی کی اولاد کو۔

حضرت شاہ عبدالہادیؒ نسباً صدیقی تھے اور ان کا خاندان عہدِ سلطنت ہی سے امروہہ

میں آباد اور عہدۂ قضاء وغیرہ پر سرفراز تھا۔ ان کی رسمی تعلیم زیادہ نہیں ہوئی مگر طریق سلوک کو اپنے مرشد کی رہنمائی میں خوب طے کیا تھا۔ خود انہوں نے بھی ایک کتاب مقصود الطالبین لکھی تھی جس کا میرے علم میں اب صرف ایک نسخہ باقی ہے اور وہ میرے پاس ہے۔ ان کے حالات وملفوظات پر مشتمل ایک کتاب مفتاح الخزائن ان کے خلیفہ سید نثار علی بخاری بریلوی صاحب انشائے دلکشا نے لکھی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ میرے ذخیرے میں موجود ہے اور ان شاء اللہ اسے مع اردو ترجمہ وحواشی شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں (ف ۱۱۹۵ھ) جب سنبھل یا مراد آباد تشریف لے جاتے تو حضرت شاہ عبدالہادی کی خانقاہ میں ضرور قیام فرماتے تھے۔ چنانچہ دوبار موضع براہی (پرگنہ سنبل) میں ان سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے اور ایک یا دوبار امروہہ میں خانقاہ ہادویہ میں قیام فرمایا۔

حضرت شاہ عبدالہادی کے ایک ہی فرزند شیخ ظہور اللہ تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے والد سے تکمیل سلوک نہیں کی تھی بلکہ ان کے بیٹے حضرت شاہ عبدالہادیؒ نے تربیت روحانی حاصل کی تھی۔ اس لئے حضرت شاہ عبدالہادیؒ نے انہیں اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت شاہ عبدالہادیؒ کی رسمی تعلیم بھی خوب ہوئی تھی اور سلوک میں تو اپنے وقت کے امام ربانی تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحمٰن لکھنوی نے بھی چھ ماہ تک انکی خانقاہ میں قیام کر کے ان سے باطنی فیوض کا اکتساب کیا تھا (۱)۔

حضرت میرزا مظہر جان جاناں نے ان کے دادا سے اپنے روابط قلبی پر نظر کر کے انہیں سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں بھی اپنی خلافت دی تھی۔ چنانچہ امرویہ میں مرزا صاحبؒ کے دو خلفاء ہیں ایک حضرت شاہ ضیف اللہ نقشبندی دوسرے شاہ عبدالہادی چشتیؒ (۲)۔

حضرت شاہ عبدالرحیم علاقہ سرحد کے رہنے والے فاطمی سید تھے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر کئے گئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے پاس بیٹھے ہوئے کسی بزرگ کے سپرد کر دیا ہے۔ ان بزرگ کا نقشہ ذہن میں محفوظ رہا اور انہیں تلاش کرنے کی تڑپ دل میں شروع ہوئی۔ احباب سے تذکرہ کیا تو

(۱) انوار الرحمٰن لتنویر الجنان (طبع ۱۲۸۷ھ) ص: ۳۲۔ (۲) تذکرۃ الکرام۔

ایک نے کہا میں نے بھی ایسا خواب دیکھا ہے۔ چنانچہ دونوں اس مرشد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ روایت بہت سے مآخذ میں بیان ہوئی ہے مگر رسالہ درفرید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرے ساتھی اخوند جان محمد تھے(۱)۔

دونوں لاہور، ملتان، انبالہ، ساڈھورہ، انجلاسہ، سہارنپور، مظفرنگر وغیرہ کی خانقاہوں میں ٹھہرتے ہوئے امروہہ وارد ہوئے تو حضرت شاہ عبدالباری کی خانقاہ میں پہنچے وہ اس وقت مثنوی مولانا روم کے مطالعے میں تھے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی وہ خواب آنکھوں کے سامنے متمثل ہوگیا۔ حضرت شاہ عبدالباریؒ نے شاہ عبدالرحیم فاطمی کو مرید کرلیا اور تکمیل سلوک کرانے کے بعد انہیں خلافت بھی دیدی تھی مگر اخوند جان محمد سے اسی وقت فرمایا کہ تمہارا حصہ شاہ غلام علی صاحب کے ہاں ہے"۔ چنانچہ یہ وہاں چلے گئے اور ان سے بیعت ہوکر مجاز ہوئے پھر ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور جبل ابوقبیس پر معتکف رہتے تھے۔

اس واقعے کو راویوں نے خدا جانے کیا کیا گھٹا بڑھا کر بلکہ اکثر حالات میں مسخ کرکے پیش کیا ہے۔

یہاں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اسلاف طریقت کی مختصر تاریخ بیان کرنے سے اصل مقصود بعض شدید طور پھیلی ہوئی غلط بیانیوں کی تصحیح کرنا ہے جو ارواح ثلثہ جیسی کتابوں سے عام ہوئی ہیں۔ مثلاً روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ مولوی عاشق الٰہی مرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں مولانا گنگوہیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "دو چار روز کے بعد حاجی عبدالرحیم صاحب حضرت شاہ عبدالباری صاحب سے رخصت ہوکر ایک جگہ اللہ کی یاد میں مصروف ہوگئے۔ چھ ماہ کے بعد جب شاہ صاحب کی زیارت کو امروہہ حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کا وصال ہوگیا تھا یہ ابھی مجاز بھی نہ ہوئے تھے کہ شیخ کا انتقال ہوگیا(۲)۔

مولوی عاشق الٰہی کی روایت ہے کہ پھر حاجی عبدالرحیم صاحب منجلاسہ میں رحم علی شاہ قادری کے پاس آئے تو ان کے پہنچنے سے پہلے شاہ صاحب کا بھی انتقال ہوگیا تھا، ان سے

(۱) درفرید ص ۶۔۷ مطبع دار العلوم میرٹھ۔ یہ کتاب شاہ عبدالعلیم قادری کے حالات میں ہے اخوند جان محمد کے خلیفہ تھے۔ سرسید کے استاد نصر اللہ خان خویشگی مؤلف تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار وغیرہ انہیں شاہ عبدالعلیم کے فرزند ہیں:

(۲) تذکرۃ الرشید ۲/۲۶۲۔۲۶۳

بھی مجاز نہ ہوئے (ایضاً)''

آخر سید احمد صاحب بریلوی جب سہارنپور تشریف لائے تو حضرت حاجی صاحبؒ بھی حاضر ہوئے انکو مجاز فرمایا۔''

مولوی عاشق الٰہی مرحوم خود اس سلسلے میں بیعت ہیں۔ ایسی غیر ذمہ دارانہ روایات شاید ہی کسی نے کبھی اپنے بزرگانِ سلسلہ کے بارے میں لکھی ہوں۔ میں بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کا قول فیصل موجود ہے:۔

اِنَّ الَّذِینَ یُبَایِعُونَکَ. الخ.

گویا حضرت شاہ عبدالباری کی زندگی ہی میں حضرت شاہ عبدالرحیم نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ بعد میں کسی نے ان سے اس طرح کا سوال کیا کہ سید صاحب سے بیعت کرنے کے بعد آپ کو کیا ملا؟ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں نماز پڑھنی آ گئی اور روزہ رکھنا آ گیا۔'' گویا شاہ عبدالباری کی خانقاہ میں نماز روزہ تک درست نہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالباری کا انتقال ۱۲۲۶ھ میں ہوا۔ اس وقت حضرت شاہ عبدالرحیم فاطمی انکی خانقاہ میں موجود تھے اور دوسرے بزرگ ضلع ہزارہ کے میر حاتم علی صاحب (ف ۱۲۴۵ھ) تھے جنہیں چشتی نظامی سلسلے میں حضرت شاہ فخر الدین دہلوی سے بھی فیض پہنچا تھا اور حضرت شاہ عبدالباری کی خدمت میں آئے تو پھر زندگی بھر کہیں نہیں گئے۔ انتقال کے بعد بھی ان کے قدموں میں آسودہ ہیں۔ انتقال کے وقت ان کے فرزند اکبر حضرت شاہ رحمٰن بخش (ف ۱۲۸۰ھ) کی عمر صرف پچیس سال تھی اور انہوں نے سلوک کی تکمیل نہیں کی تھی۔ انتقال کے وقت حضرت شاہ عبدالباری نے انہیں اپنے خلیفہ میر حاتم علی صاحب کے سپرد کیا اور کہا کہ جب انکا سلوک مکمل ہو جائے تو انہیں اجازت دے دینا۔ چنانچہ خاندانی شجرۂ طریقت میں حضرت شاہ عبدالباری اور ان کے فرزند شاہ رحمٰن بخش کے درمیان میں میر حاتم علی صاحب کا اسم گرامی آتا ہے۔ حضرت شاہ بخش رحمٰن کو جہاد کی بڑی تمنا تھی۔ اسی نیت سے ایک گھوڑا لیکر پال رکھا تھا اور شہسواری اور شمشیر زنی بھی سیکھی تھی۔ بڑھاپے میں بھی بصارت زائل ہونے کے باوجود اس نیت سے تھوڑی سی ورزش کیا کرتے تھے کہ جہاد میں حصہ لوں گا۔

حضرت شاہ عبدالباریؒ کی وفات کے ۱۵، ۱۶ سال کے بعد ۱۲۴۴ھ میں حضرت سید احمد شہیدؒ نے سارے شمالی ہندوستان کی خانقاہوں اور مدرسوں کو ایک گشتی دعوت نامہ بھیجا اور تحریک جہاد میں حصہ لینے کی اپیل کی۔ اس وقت حضرت شاہ رحمٰن بخش خود جانے کے لئے آمادہ ہوگئے مگر مسترشدین اور دوسرے حضرات نے مشورہ دیا کہ آپ کے جانے سے خانقاہ بند ہو جائیگی اور رشد و ہدایت کا جو کام یہاں ہو رہا ہے یہ موقوف ہو جائے گا، شاہ عبدالرحیم فاطمی کو نمایندہ بنا کر بھیج دیجئے۔ حاجی عبدالرحیم صاحب افغانی تھے، جسم قوی تھا، فنون حرب سے واقف تھے، اور تمام عمر تجرد میں بسر کی تھی۔ اہل و عیال کا بکھیڑا بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ چنانچہ ۲۰، ۱۲۵ اصحاب نے جہاد میں شرکت کے لئے اپنے نام لکھوا دیئے خانقاہ کی طرف سے پانچ سو روپے کی ایک تھیلی اور بعض دوسرے ہدایا لے کر مجاہدوں کا یہ مختصر سا قافلہ امروہہ روانہ ہوا اور سہارن پور جا کر حضرت سید احمد صاحبؒ کے قافلے سے مل گیا۔ حضرت شاہ عبدالرحیم فاطمی نے حضرت سید احمد صاحب شہید سے بیعتِ ارادت نہیں کی تھی، بیعت جہاد کی تھی۔ اس لئے جو لوگ اس بیعت کی بنیاد پر سلسلۂ طریقت قائم کر لیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اس بیعت جہاد کو وہ ''طریق محمدیہ'' سے موسوم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس طریقے کی نسبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور ظاہر شریعت ہے(۱)۔

یہاں ضرورۃً اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت عبدالباری میرے جد امجد تھے اور ان کے پڑپوتے حضرت شاہ سلیمان احمدؒ جو علوم ظاہری میں حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہی کے شاگرد تھے، میرے مربی اور مرشد تھے۔ اس خاندان کے کتب خانے اور بیاضوں کا کچھ حصہ جو اصلی ذخیرے کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے اس نامہ سیاہ کے پاس محفوظ ہے۔ اس لئے یہ مختصر تاریخ جو میں نے بیان کی ہے، دوسری تمام روایات کے مقابلے میں اصح اور مستند ترین ہے۔

سید صاحب کے قافلے میں شامل ہونے کے بعد اگلے ہی سال ۲۷ رذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو حضرت سید احمد صاحبؒ کے ساتھ ہی بالاکوٹ کے معرکے میں پنجتار کے مقام پر

(۱) وصایا وزیری، ۲، ۴۲/۲، بحوالہ جماعت مجاہدین: ۲۲۱۔

شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شہید ہو گئے تھے۔ انا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ.

بنا کر دند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اپنے پیرومرشد کی وفات کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کا خانقاہ امروہہ میں قیام رہا، البتہ دہلی، مظفرنگر، ساڈھورہ وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ اوران علاقوں میں ان کے مریدین بھی تھے۔ حضرت میاں جی نور محمدؒ (ف ۱۲۵۸ھ) نے ان کی بیعت جہاد سے بہت پہلے ان سے خلافت واجازت حاصل کرلی تھی۔

حضرت میاں جی نور محمدؒ کو تمام تر تعلیم وتلقین حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ہی سے ملی اور وہی حضرت شیخ الکل حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ تک پہنچی۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ☆ ہرکجا می نگری انجمنے ساختہ اند

حاجی صاحبؒ کی ذات اللہ کی شان کبریائی کا ایک آئینہ تھی۔ "تفضیل بعض علی بعض" بڑا نازک معاملہ ہے اور ہم جیسے عامیوں کو زیب نہیں دیتا مگر دل یہ کہتا ہے کہ کم سے کم ان دوصدیوں میں حاجی صاحبؒ کی کوئی نظیر کہیں بھی نہیں ملے گی۔ یہ صرف حاجی صاحب ہی ہیں جن کی شخصیت کے مرکزی نقطے پر چشتی اور نقشبندی، قادری اور سہروردی، بریلوی اور دیوبندی، عالم اور اُمی سب جمع ہو گئے ہیں اور چشتی نسبت عالیہ کا رنگ اپنی بھرپور جلوہ سامانیوں کے ساتھ نکھر آیا ہے۔

جن اختلافی امور کو بنیاد بنا کر ہندستان کے علمائے احناف نے اپنے جداگانہ قبرستان کھول لئے ہیں۔ حاجی صاحب کی شخصیت اور افکار میں وہ فروعی اختلاف ایسے غائب ہو گئے ہیں جیسے میل کچیل کو دریا بہالے جاتا ہے۔

ابھی مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس صدی کے آغاز سے بعض حضرات جن میں ذمہ دار علماء اور اکابر شامل نہیں ہیں۔ البتہ ان کے اغماض کا شکوہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ اس

سلسلے کی نسبت کو ہی ''غت ربود'' کرنے کی کوشش کی ہے۔اب زیادہ زور اس بات پر ہے کہ سلسلۂ طریقت کو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی یا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ یا حضرت سید احمد شہیدؒ سے جوڑا جائے اور چشتی نسبت کے ساتھ وہ سلوک ہے جو ہمارے بعض ہم وطن قرون وسطیٰ کی تاریخ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

اکثر شجروں میں حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے نام کے بعد نام تک صحیح نہیں یا ان کی ترتیب غلط ہے۔حضرت شاہ عبدالرحیم فاطمی کے حالات سے تو اتنا تجاہل ہے کہ مولانا غلام رسول مہر نے پوری تحریک جہاد کی تاریخ دو ڈھائی ہزار صفحوں میں لکھی مگر شاہ عبدالرحیم صاحب کے حالات میں انہیں دو پیراگراف بھی نہیں مل سکے۔

جناب عبدالرحمٰن صاحب کوندو نے حال ہی میں ایک قابل ستائش کام کیا ہے کہ حضرت محدث کشمیریؒ کے حالات وکمالات پر ساڑھے سات سو صفحات کی کتاب اَلا نـــو رَ مرتب کردی ہے۔اس میں حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کی وہ اثر انگیز تقریر بھی شامل ہے جو انھوں نے حضرت کشمیریؒ کی وفات پر منعقد ہونے والے تعزیتی جلسے میں دہلی کی جامع مسجد میں کی تھی۔انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

''حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد جس خاندان کو خدمت حدیث کا شرف حاصل ہے وہ شاہ عبدالرحیم کا خاندان ہے۔اسی خاندان کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ اسحٰق صاحب رحمتہ اللہ علیہم اجمعین ہیں۔یہ تمام حضرات اسی مبارک خاندان کے افراد ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے لوگوں کو جس طرح علم ظاہر اور علم باطن میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے..وہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی اور میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔(الانور۔ص ۴۱۳۔۴۱۴)

اس تقریر کے آخری جملوں سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے:۔

''شاہ صاحب نے جو کچھ کا بـراعـن کـابر شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور میاں جی نور محمد صاحب سے حاصل کیا تھا اس کے بیان کو دفتر کے دفتر ناکافی ہیں'' (انور۔ص:۴۲۵)

اس سے ظاہر ہے کہ میاں جی نور محمد سے پہلے شجرے میں شاہ عبدالرحیمؒ کا جو نام آرہا ہے اسے حضرت مولانا احمد سعید بھی سمجھ رہے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی مراد ہیں۔

اسی طرح حال ہی میں ایک کتاب تسلسلات امدادیہ شائع ہوئی ہے جس کے سر ورق پر لکھا ہے ''سلاسل اربعہ کا ایک محققانہ جامع جائزہ'' اور اس کے مصنف ڈاکٹر ماجد علی خاں پی، ایچ، ڈی علیگ ہیں۔ اس کے ساتھ بعض اکابر ملت کی تقریظیں بھی ابتدا میں درج کی گئی ہیں لیکن اس محققانہ جائزہ کا بھی یہ حال ہے کہ لکھتے ہیں:

بیعت کے بعد جب آپ (یعنی شاہ عبدالرحیم شہید) سہارنپور واپس تشریف لائے تو آپ نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد و طریقت کی اور سلسلۂ نقشبندیہ میں اجازت حاصل کی''۔ (تسلسلاتِ امدادیہ، ص:۸۰)

یہ تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں ہے، مختصراً یہ عرض کردوں کہ شاہ عبدالہادی صاحب کے انتقال اور حضرت سید احمد شہید کی سہارنپور میں تشریف آوری کے درمیان صرف ۵۴ سال کا وقفہ ہے اور شہادت کے وقت حضرت شاہ عبدالرحیم کی کل عمر اتنی بھی نہیں تھی۔

خلاصۂ کلام

حضرت کشمیریؒ کی خصوصیات کو اگر ایجاز کے ساتھ بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے انہیں عجیب جامعیت عطا فرمائی تھی۔ ان کی شخصیت اور سیرت بوقلموں ہے جن میں صدہا رنگ ہیں اور ہر رنگ کی چھینٹ دوسرے پر اس طرح پڑ رہی ہے کہ وہ اس کے سہارے سے اور نکھر رہا ہے۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ جامع شریعت وطریقت یعنی فقیہ صوفی تھے۔ دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان کے صدق واخلاص کی وجہ سے اللہ نے ان کے علم میں بڑی خیر و برکت عطا فرمائی تھی۔ انہیں مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا بدر عالم، مولانا محمد انوری، مولانا محمد شفیع صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد میاں، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور

شاہ وصی اللہ ایسے ایسے تلامذہ ملے جو بجائے خود ایک ایک ادارہ ہیں اور جنہوں نے مجلس علمی اور ندوۃ المصنفین جیسے ادارے قائم کر کے اسلامی علوم و معارف میں مضامین نو کے انبار لگا دئے ہیں۔ یہ سب دراصل حضرت کشمیری کی للّٰہیت کا پرتو ہے۔ تیسرا امتیاز شاہ صاحب کا حسن قبول ہے کہ زندگی میں بھی وہ محبوب و محترم رہے۔ چنانچہ آج بھی اس شمع انور کے پروانے اسکے نام پر کھنچ کر چلے آئے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ شاہ صاحب نے قادیانی فتنہ کے خلاف بھرپور جہاد بالتعلیم کیا۔ پانچویں یہ کہ وہ خود بھی حامیٔ شریعت اور متبع سنت تھے اور تلامذہ کی اخلاقی اور روحانی تربیت اور تزکیۂ نفس پر ہر وقت نظر رکھتے تھے۔ چھٹی یہ کہ اعلیٰ درجے کے صوفیانہ اخلاق یعنی تعلیم توکل صبر و رضا، استقامت، تواضع، حلم، سادگی، انکسار وغیرہ ان کی سیرت کے بنیادی عناصر ہیں اور ان کی زندگی دوسروں کے لئے مثل اعلیٰ بن گئی ہے۔ آخری امتیاز یہ کہ وہ ہمارے دور کے علمائے شرع میں نہایت قوی روحانی نسبت کے مالک تھے اور یہ خالص چشتی نسبت تھی جس کا ایک اجمالی بیان مقالے کا اصلی موضوع ہے۔

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ

(از: جناب مولانا محمد عثمان صاحب (ایم۔ایل۔اے)
نواسہ حضرت شیخ الہندؒ، مدرس دارالعلوم دیوبند

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اس باغ پر بہار کے گلِ سر سبد تھے جو حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے دیوبند کی اس بستی میں لگایا تھا جو اس وقت علمی اعتبار سے غیر معروف و بے نشان تھی۔ اور علامہ اقبالؒ ایک ایسے لعلِ شب چراغ تھے جنہوں نے ایک ایسی ہی جگہ میں جنم لیکر پورے عالم اسلام کو اپنی خیرہ کن عظمت اور روشنی سے منور کر دیا، ان دونوں میں مشترکہ بات انکی وطنیت تھی۔ دونوں اس خطہء جنت نظیر سے وطنی اور نسبی تعلق رکھتے تھے جو کشمیر کہلاتا ہے اور روز اوّل سے خلاق عالم کی بے نظیر خلاقانہ قوتوں کا مظہر سمجھا جاتا رہا ہے، اپنے اپنے مید ان میں ایسے یگانہء روزگار اور بے مثال تھے جن کا ثانی ان کے عصر میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تھا، دونوں نے پیغمبر امّی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سیرابی میں اپنی ہستیوں کو فنا کیا اور اسلام کے پیغام اور اس کی روح کی عظمتوں کو دنیا پر ثابت کرنے کی مہم میں اپنی جانِ عزیز صرف کی، دونوں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت بے مثال کے شیدائی اور شمع ایمان کے پروانہ تھے۔ دونوں کے رجحانات و خیالات، پسند و ناپسند، فکر و اندیشہ ایک دوسرے سے اتنے مماثل اور اتنے قریب تھے کہ دونوں کی سیرت اور شخصیت کا مطالعہ ایک ساتھ کیا جائے تو حسن اتفاق پر حیرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ سامنے نہیں آتا۔

قادیانیت کا سوال ہو یا زوالِ اسلام کی دردمندی کا، غازیانِ اسلام سے قلبی وابستگی کا سوال ہو یا دینی سربلندی کی تڑپ کا، فروغ امت کی خاطر خوابوں اور کاوشوں کا مسئلہ ہو یا غلبۂ دین کے عالمی تصور کا۔ دونوں ایک ہی منزل کے راہی اور ایک ہی جذبہ کے اسیر نظر آتے ہیں۔ علامہ انور شاہ نے حدیث و فقہ کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں اور خدمتوں کے ایسے روشن مینار تعمیر کئے کہ عالم اسلام پر چھائے ہوئے اندھیرے ان چراغوں کی روشنی سے کپکپانے

لگے جوایک کے بعد ایک کر کے وہ جلاتے چلے گئے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے فکروجذبہ کے لئے شعروفلسفہ کواظہار کا ذریعہ بنایا اوراپنی حکیمانہ ژرف نگاہی سے قوت وحرارت کی ایسی بجلی مردہ رگوں میں دوڑادی کہ وہ فضاجو ٹوٹی ہوئی ہمتوں، گرے ہوئے حوصلوں اورمغرب کے اثرخواب آوری کی سرایت کے باعث مایوس کن اور حوصلہ شکن تھی یکا یک امیدوں، روشنیوں اورحوصلوں سے بھرگئی۔

دونوں کے ایمان اورقلبی گداز نے عالمی پیمانے پرمسلمانوں کے ذہنی انقلاب کی دعوت کوعام کیااور نئے دورِعروج کے دروازہ پردستک دی، دونوں کی بدولت اسلام کی نشأۃالثانیہ کے امکانات حقیقت اور واقعہ کے ملبوس سے مزین ہوئے، دونوں نے علمی اورفکری سطح پر دماغوں کی ماہیت تبدیل کردینے کی عظیم الشان خدمت سرانجام دی۔اوردونوں اپنی اپنی جگہ اسلام کی عظمتوں اوراس کے پیغام کی قوتوں کی مثال اورثبوت کے طورپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید ہوگئے۔ علامہ انورشاہ کی علمی اور دینی عبقریت کے نشانات اس وقت تک موجود ہیں اورمولانا احمدعلی لاہوری، (مولانا احمدعلی لاہوری باضابطہ حضرت شاہ صاحب کے شاگرد نہیں تھے) مولانا سید محمد یوسف بنوری مولا نا حفظ الرحمٰن سیوہاری، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مولاناسعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد منظورنعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، مولانا زین العابدین میرٹھی اور دوسرے ایسے ہی روزگارمشاہیر عالموں اور مفکروں کی شخصیتوں اورکارناموں کی صورت میں موجود ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے فکروفلسفہ کے چراغ بھی فقیر کی صورت میں، ڈاکٹر سیدعبداللہ کی صورت میں، مولانا غلام رسول مہر اورعبدالمجید سالک کی صورت میں، خلیفہ عبدالحکیم کی صورت میں، عاشق بٹالوی کی صورت میں، عبداللہ چغتائی، اکرام اورحفیظ کی صورت میں جل رہے ہیں اوراگر میں یہ کہوں کہ فکراقبالؒ کی عظمتوں اور پنہائیوں، گہرائیوں اور دارائیوں کا سب سے بڑاعملی نمونہ اس وقت خود شیخ محمدعبداللہ کی صورت میں اسی کشمیر کے اندرموجود ہے تو میراخیال ہے کہ آپ مجھ سے اختلاف کرنے کی ہمت نہیں کرسکتے۔

یہ اثرات تھے ان دونوں شخصیتوں کے، جنہوں نے مشترکہ طورپر سیاست میں، فلسفہ میں،

عملی اور علمی میدانوں میں، شعر و ادب میں اور سماج و اخلاق کی جولان گاہوں میں، نئے چاند سورج اُگائے اور نتائج و اثرات کی ایسی بار آور اور بہرہ اندوز فصل کاٹی کہ نہ صرف برصغیر ہندو پاکستان بلکہ پورا عالم اسلام فکری زرخیزی، قلبی خوش حالی اور ذہنی مرفہ حالی سے لبریز ہو گیا۔

جو لوگ ان دونوں عبقریوں کی ذہنی آہنگی، قلبی یگانگت اور مخلصانہ تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ گرویدگی کی حد تک پہنچے ہوئے جذبات و احساسات کی نوعیت سے واقف ہیں وہ وقت و مقدر کے سوئے اتفاق سے رنجیدہ ہونگے کہ عالم سلام کی ان دونوں بے مثال شخصیتوں کو مشترکہ طور پر کام کرنے اور اپنے مشترکہ خوابوں کو باہمی اشتراک عمل کے ذریعہ حقیقت میں بدلے کا موقع حاصل نہ ہو سکا۔ سیرت انور اور آثار اقبال کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی حد تک بہتر کوششیں اس مقصد کے لئے صرف کیں کہ لاہور میں ایک ایسا مرکز قائم ہو جس میں اسلام کی تعلیمات کو جدید ذہن کے تقاضوں کے مطابق دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک جدو جہد منظر عام پر آئے جو مغربی فکر و فلسفہ کا دفاع کر سکے، انہوں نے خود علامہ انور شاہ کو اس سلسلہ میں متوجہ کیا، اپنے احباب سے یاددہانیاں کرائیں اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں علامہ انور شاہؒ کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش کی۔ ۱۹۲۱ء کے اکتوبر کی اس تاریخ سے لے کر جبکہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے قول کے مطابق علامہ اقبالؒ اور علامہ انور شاہؒ کے تعارف و تعلق کی لاہور میں ابتداء ہوئی، ۱۹۳۳ء کے تاریخی دن تک جس دن علامہ انور شاہ اپنی دنیاوی زندگی کی مہلت پوری کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں علامہ انور شاہؒ کی معاونت کا حصول، علامہ اقبالؒ کی زندگی سب سے بڑا مقصد بنا رہا۔

علامہ اقبالؒ عالم اسلام کے ان بالغ نظر اور محرم اسرار شخصیتوں میں سے ایک شخصیت تھے جو وقت اور زمانہ کی گردشوں اور فرس دوراں کی اس گرد کی نوعیتوں اور اثرات سے بخوبی واقف تھے جو مدتوں سے روح اسلام کو دھندلا کرنے کا سبب بنتی رہی ہے، وہ روایتی مذہب اور اس کی خالی از روح مقاومت کی کمزوریوں کا بھی شدید احساس رکھتے تھے اور اس کے لئے درد مندی اور فکر مندی کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کے فکر و فلسفہ میں حقیقت کے خرافات میں گم

ہو جانے اور امت کے روایات میں کھو جانے کے شدید احساسات پیدا ہونے والے عناصر نمایاں اور موجود ملتے ہیں، ان کا ذہن اس سلسلے میں یہ تھا کہ اگر ان کے فکر اور مغرب سے ان کی واقفیت اور محرمانہ شعور کے ساتھ علامہ انور شاہؒ کا علم اور رہنمائی، معاونت اور دلربائی شامل ہو جائے تو اتحادِ ذہنی سے جو چیز پیدا ہوگی وہ مغربی فلسفہ اور تہذیب پر اسلامی فکر و فلسفہ کے تفوق کی ضامن بن سکے گی۔ اسی خیال نے انہیں زندگی بھر مضطرب رکھا۔ علامہ انور شاہ کی آخری زندگی میں جبکہ معلوم اسباب کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کے ساتھ ان کی وابستگی ختم ہوئی۔ انہیں ان ہی پرانی تمناؤں کے برآنے کی نئی توقعات بندھ گئیں، وہ اس سے پہلے بھی ۱۹۲۲ء میں جیسا کہ عبداللہ چغتائی نے شہادت دی ہے، شاہ صاحب کے مستقل قیام لاہور کی تجویز پیش کر چکے تھے اور ان ہی کے بقول انہوں نے لاہور کی "بعض انجمنوں سے طے کر لیا کہ اگر شاہ صاحبؒ لاہور میں قیام کے لئے آمادہ ہو جائیں تو انہیں بادشاہی مسجد کا خطیب اور اسلامیہ کالج میں شعبۂ اسلامیہ کا سربراہ بنا دیا جائے، مختلف انجمنیں اس تجویز کے لئے رضامند بھی ہو گئیں" شاہ صاحبؒ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے چشمۂ فیض کے ساقی اور شیخ الحدیث کی مسند کی زینت بنے ہوئے تھے، اس لئے یہ تجویز قدرتی طور پر اس وقت عملی جامہ نہیں پہن سکتی تھی لیکن ۱۹۲۸ء کے اس وقت بھی جبکہ شاہ صاحبؒ فارغ ہو چکے تھے، یہ تجویز سرے نہ چڑھ سکی۔ اسے سوئے بخت و اتفاق کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم علامہ اقبالؒ کے موقف و ذہن پر علامہ انور شاہ کے خیالات و نظریات کے فیصلے کن اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، اور ان اثرات کے مشاہدے کی بدولت علامہ اقبالؒ کے خیالات پر علامہ انور شاہ کے فن و کمال اور جلالت و شان کے اعتراف و احترام کی قدر و قیمت واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔

اس کی مثال کے طور پر خود کشمیر کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں علامہ اقبال کے موقف اور طرزِ عمل میں حضرت شاہ صاحبؒ کے اثرات کی کارفرمائی کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جن کے نتیجے میں علامہ اقبالؒ حنفیہ بقادیان مرزا بشیر الدین کی سرکردگی میں قائم شدہ کشمیر کمیٹی کی رکنیت سے مستعفی ہوئے اور اس کے بعد فتنۂ قادیانیت کے استیصال کی جدوجہد میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مؤید بن گئے۔ دوسری مثال زمان و مکان کے مسئلہ پر علامہ اقبال

کی اس مہماتی دلیل سے واقفیت کی ہے۔ جس کے سامنے فلسفی برگسان تک خود علامہ اقبالؒ کے بقول ''متحیر و ششدر رہ گیا تھا۔''

مسئلہ زمان و مکان جو پہلے نیوٹن اور اب ہمارے زمانہ میں آئین اسٹائین کی تحقیقات و مکاشفات کا عظیم الشان موضوع رہا ہے۔ سائنس اور فلسفہ کے مہتم بالشان مسائل اور بنیادی محرکات میں شمار ہوتا ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ہی پہلی بار علامہ اقبالؒ کو معلومات بہم پہنچائی تھیں، سلسلۂ کتابت جو علامہ انور شاہ اور علامہ اقبال کے درمیان ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک جاری رہا، ان دونوں عبقریوں کے تبادلۂ خیال اور جذب و انجذاب کی تاریخی دستاویز بن سکتا ہے اگر اس کا ریکارڈ امت کو مہیا ہو جائے۔

اسی سلسلہ خط و کتابت کے ذریعہ علامہ انور شاہ نے علامہ اقبالؒ پر نیوٹن کے فلسفے کی مستعار نوعیت واضح کی اور مدلل طور پر ثابت کیا کہ اس کے فلسفے اور مکاشفات کی بنیاد عراقی کے مکاشفات سے ماخوذ مستعار ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے نہ صرف عراقی کے خیالات و نظریات سے علامہ موصوف کو روشناس کرایا بلکہ اس موضوع پر اس کی تصنیف ''غـــایة الامـکـان فی درایة المکان'' کی نقل بھی انہیں مہیا کی جس کے وجود تک سے اس وقت کی علمی دنیا واقف نہیں تھی۔ خود علامہ اقبالؒ نے ۱۹۲۸ء کے اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ عربی و فارسی کے اجلاس کے صدارتی خطبہ میں جو حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعہ کے زیرِ عنوان پڑھا گیا تھا۔ علامہ انور شاہ کا حوالہ اس تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

یہ مختصر حوالۂ بالا میر از ابن عراقی کی تصنیف ''غـایة الامـکان فی درایة المکان'' کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لا تسبو الـدهـر لان الـدهـر هو اللّٰه میں دھر بمعنی وقت (TIME) جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولانا انور شاہ سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں، میری خط و کتابت ہوئی اس مراسلت کے دوران مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطہ کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی۔ اس علمی انکشاف کی نوعیت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مستند ترین اور مشہور اسلامی دانشور اور عالم مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی تک جو

اس جلسہ میں شریک تھے علامہ اقبال کے اس انکشاف پر حیران رہ گئے کہ نیوٹن نے زمان ومکان کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی اپنی تحقیق نہیں بلکہ عراقی کے اسی رسالہ کا چربہ اور سرقہ ہے۔"

ان دو مثالوں کے تصریحی تذکرہ کے علاوہ "ختم نبوت"، "قتل مرتد" اور دوسرے کتنے ہی مسائل پر علامہ انور شاہ اور علامہ اقبال کے باہمی تبادلۂ خیالات اور فکری تاثرات کے ثبوت بآسانی فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں تعریف وستائش سے بالاتر پہلو یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے کسی موضوع پر بھی علامہ انور شاہ کے علم وتبحر سے استفادہ کے اعتراف میں پہلو تہی سے کام نہیں لیا بلکہ ہر موقع پر وہ ان کے ذہنی فیض اور سمندر کی مانند بے کنارو وسیع علم کا ذکر واعتراف کرتے رہے۔ اس بات کی قوی شہادتیں موجود ہیں کہ علامہ اقبالؒ کی مشہور نظم "اے وادئ لولاب" حضرت شاہ صاحب کی شخصیت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

مجھ جیسے گوشہ نشین اور علم وتصنیف کی مشغولیتوں سے محروم شخص کے لئے ان اجمالی اشاروں کے سوا بالتفصیل کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ یہ سطریں بھی میں نے صرف اتنے تعلق کی بدولت قلم بند کر دی ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ اس باغ کے نخل ثمر دار تھے جس کے مالی فرائض اُن حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے انجام دئے تھے، جن کے نام لیوا اور وارث ہونے کی عزت مجھے حاصل ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ بحر تحقیق کے حقیقی شناور اور اس موضوع پر زبان کھولنے کے واقعی مستحق ہیں، وہ میرے اس خاکہ پر عظیم عمارت تعمیر کر سکیں گے۔ اور جو موضوع اس وقت صرف اشاروں تک محدود رہ گیا ہے اسے حقیقی طور پر تاریخ کا ایک درخشاں باب بنائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہ رب العلمین.

حضرت علامہ کشمیریؒ ایک مربی کی حیثیت سے

از: جناب مولانا عبداللہ جاوید۔ ایڈیٹر مرکز، دیوبند

اسلام میں تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جو والدین اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرتے ہیں ان کے لئے آخرت کے اجر و ثواب کی بشارتیں موجود ہیں۔ بچہ کی اولین تربیت گاہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہے جہاں بچہ ذہنی و فکری نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ گھر کا ماحول اگر صحیح دینی شعور سے محروم ہو تو بچہ کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ گھر کے باہر بچے کی تربیت کی ذمہ داری تعلیم گاہ پر ہوتی ہے۔ اس مرکز تربیت سے بچہ اخلاق و کردار کی توانائی، علم و فکر کی پختگی اور مستقبل کی روشنی لے کر نکلتا ہے۔ تعلیم گاہ یا مدرسہ کا یہ مفہوم انتہائی محدود ہے کہ اس کا مقصد طالب علم کو محض چند مقررہ کتابیں پڑھا کر رخصت کر دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک استاذ اس وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ وہ اپنے شاگرد کی بہتر علمی اور اخلاقی رہنمائی کا حق ادا نہ کرے۔ قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو وصف بیان کئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ آپ اپنے صحابہ کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں اور دوسرا وصف یہ ہے کہ آپ انہیں کتاب کا علم اور حکمت کی باتیں سکھلاتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم اور تزکیہ دونوں ایک دوسرے کے ردیف ہیں۔ بلکہ الہامی طریقۂ بیان میں تزکیہ کا ذکر پہلے ہے جس سے تعلیم پر اس کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ علم جسکے ساتھ عمل کی طاقت نہ ہو غیر مفید ہے اور وہ عمل جسے علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو بہت سے مفاسد کا سبب بن سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند ایک درسگاہ ضرور ہے، مگر اس کی شہرت اور بین الاقوامی سطح پر اس کی عظمت کا راز یہ ہے کہ یہ ادارہ اپنے قیام کے روزِ اوّل سے ایک ایسی تربیت گاہ بھی رہا ہے جہاں طالب علم نہ صرف علم کا رسوخ حاصل کرسکتا ہے بلکہ اسے کردار و عمل کی پختگی بھی نصیب ہوتی ہے۔

طلباء کے ساتھ شفقت ومحبت، ان کے مستقبل کی فکر، ان کی تربیت واصلاح کا خیال، یہ سب وہ عناصر ہیں جو دارالعلوم کے ماحول میں رچ بس گئے ہیں۔ یہاں سے نکلنے والا طالب علم آسمان علم کا روشن ستارہ ہوتا ہے۔ جہاں جاتا ہے، اپنی ضیاباریوں سے پورا ماحول روشن کرتا ہے۔

بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''آب حیات'' میں لکھا ہے کہ بعض شخصیتیں جامع الکمالات ہوتی ہیں لیکن ان میں کوئی ایک کمال اتنا غالب اور ایسا نمایاں ہوجاتا ہے کہ دوسرے سب کمالات نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ بھی ایسے ہی جامع الکمالات لوگوں میں سے تھے، بلاشبہ ایک محدث کی حیثیت سے انہیں بین الاقوامی اعتبار اور وقار ملا ہے مگر وہ صرف ایک محدث ہی نہیں تھے بلکہ دوسرے علوم میں بھی انہیں وہی رسوخ حاصل تھا، جو علم حدیث میں ملا تھا۔ منطق اور فلسفے کی بات جانے دیجئے، یہ فنون عربی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اور ان پر عبور حاصل کرنا کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن انہوں نے کچھ ایسے علوم میں بھی امتیاز حاصل کرلیا تھا۔ جن کی بساط الٹ چکی تھی اور جن کے ماہرین خال خال ہی ملا کرتے تھے۔ شاہ صاحبؒ کا ایک اور کمال یہ تھا کہ وہ بہترین مربی تھے، ماہرین تعلیم و تربیت نے جتنی خصوصیات اساتذہ کی متعین کی ہیں، وہ سب ان میں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے بیشتر تلامذہ کا اپنے وقت کے ممتاز علماء میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی تصنیف وتالیف کے میدان میں بے پناہ شہرت رکھتا ہے، کوئی میدان خطابت کا شہسوار ہے۔ کسی شخص کو تدریس کا خاص ملکہ ہے اور اپنی اس خصوصیت کی بناء پر مرجع علماء بنا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کے جتنے رنگ تھے ان کا پرتو انکے شاگردوں میں موجود ہے۔

استاذ یا مربی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے ساتھ حقیقی اولاد کا سلوک کرے اور ان کی تربیت یہ سمجھ کر کرے کہ وہ اپنے جگر پاروں کی تربیت کررہا ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے ارشاد فرمایا:۔

" انما انا لکم بمنزلة الوالد اُعَلِّمُکم " میں تمہارے والد کی طرح ہوں تمہیں سکھلاتا ہوں۔ حضرت علامہ کشمیریؒ اس قول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تصویر تھے۔ اپنے

تلامذہ کے ساتھ ان کا تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق سے کہیں زیادہ مضبوط و مستحکم تھا۔ انہیں اپنے تلامذہ اور متعلقین کی علمی تربیت اور ان کے اعمال و اخلاق کو شریعت و سنت کے سانچے میں ڈھالنے پر خاص توجہ تھی۔ چنانچہ دارالعلوم کی مدرسی کے ابتدائی دور میں اور پھر صدر مدرسی کے زمانہ میں آپ کے ممتاز تلامذہ مولانا میرک شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر، مولانا تاجور نجیب آبادیؒ، مولانا فخرالدین مرادآبادیؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور دوسرے سینکڑوں شاگرد آپ کی تربیت اور علمی رہنمائی سے مستفید ہوئے۔ ذہین اور ہونہار طلبہ پر نہ صرف درس کے دوران خاص طور پر متوجہ رہتے تھے، بلکہ درس کے علاوہ اوقات میں بھی ان کی خبر گیری اور ہمت افزائی فرماتے رہتے۔ فراغت تعلیم کے بعد کوشش ہوتی کہ ہونہار اور لائق طلبہ کو اپنے پاس روک لیں اور انہیں علم دین کی خدمت میں لگادیں۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی کو فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ماہانہ رسالوں الرشید اور القاسم کے ادارۂ تحریر سے منسلک کیا اور اس رشتہ سے تحریر و تصنیف کی راہ دکھلائی۔ اپنے اس قابل اور ہونہار شاگرد کی جولانیٔ طبع کو دیکھتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ نے انہیں دارالعلوم میں تدریس کا موقع بھی عنایت فرمایا۔ دارالعلوم میں تنخواہوں کا معیار معمولی تھا اور اکثر مدرسین و ملازمین فکر معاش میں مبتلا رہتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تنخواہ کی قلت کا عذر کیا اور اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کی اجازت چاہی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا دورِ اہتمام تھا۔ یہ درخواست جب ذمہ داروں کی نظر سے گذری تو حضرت شاہ صاحبؒ سے مشورہ ہوا۔ حضرت شاہ صاحب نے درخواست کی نہ صرف پرزور سفارش کی بلکہ اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کو سراہا بھی اور معقول تنخواہ پر انہیں دارالعلوم میں رکھنے کی کوشش کی، مولانا شائق عثمانی اور مولانا تاجور نجیب آبادی سے علمی موضوعات پر مضامین لکھوائے، خود ملاحظہ کئے، اصلاح و نظر ثانی کے بعد انہیں الرشید اور القاسم میں شائع کرایا۔ ان دونوں حضرات کی تحریر و تصنیف کی ابتداء حضرت شاہ

صاحبؒ کی نگرانی میں ہوئی۔ مولانا محمد یوسف صاحب میر واعظ کشمیرؒ نے کشمیری زبان میں قرآن پاک کا جو بے نظیر ترجمہ اپنے قیام پاکستان کے دوران کیا تھا وہ دراصل حضرت شاہ صاحب ہی کے حکم کی تعمیل ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی خواہش تھی کہ کشمیری زبان میں قرآن پاک کا کوئی عمدہ ترجمہ ہو، میر واعظ کشمیر مرحوم نے اپنے استاذ کی اس خواہش کو عملی شکل دی۔

حضرت شاہ صاحب کی تربیت کا خاص انداز یہ تھا کہ اپنے شاگردوں کو انکے ذوق کے مطابق کام تفویض فرماتے۔ کسی کو تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہوتی تو اسے اس میدان میں لگا دیتے، کسی کو تدریس کا ذوق ہوتا تو اسے تدریس کے مواقع مہیا فرماتے، کسی شاگرد میں خطابت سے مناسبت دیکھتے تو اس کی جولانی طبع کے لئے مہمیز ثابت ہوتے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب میں خطابت کا ذوق دیکھا تو انہیں اپنے ساتھ جلسوں اور تقریروں میں لے جانے لگے۔ بیس بائیس برس کی عمر میں قادیان کا سفر کرایا اور وہاں قادیانی نبوت کے خلاف اس نوعمر شاگرد کی تقریر بھی ہوئی مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کو تدریس سے دلچسپی تھی، بہار کے ایک مدرسہ میں ایک معیاری مدرس کی ضرورت پیش آئی تو انہیں وہاں بھیج دیا۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری کو مناظروں سے خاص شغف تھا، اگرچہ آپ شاہ صاحب کے باقاعدہ شاگرد نہ تھے مگر حلقہ مستفیدین میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ مولانا چاندپوری نے حضرت شاہ صاحبؒ کی رہنمائی میں متعدد معرکے سر کئے اور رئیس المناظرین کہلائے۔

دیوبند کے زمانہ قیام میں حضرت شاہ صاحبؒ کی خواہش پر مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے بڑے پیمانے پر مطبع قاسمی قائم کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی نگرانی میں متعدد کتابیں لکھوا کر طبع کرائیں۔ چنانچہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ سے حماسہ، نفحۃ الیمن، متنبی، کنز الدقائق وغیرہ درسی کتابوں پر عربی میں حواشی لکھوائے اور ان کا حرف بحرف مطالعہ کیا اور اصلاح و نظر ثانی کے بعد ان کتابوں کی اشاعت کا نظم فرمایا۔ مولانا میرک شاہ صاحب کشمیریؒ نے "محیط الدائرہ" کے نام سے فن عروض پر ایک قیمتی کتاب تصنیف فرمائی۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے کلامی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے فقہی مسائل پر رسالے لکھے، آپ کی معرکۃ الآراء کتاب "ختم النبوۃ" دراصل شاہ صاحب کی علمی رہنمائی اور خاص توجہات کا

نتیجہ ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری اور مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنی نے ختم نبوت، عقیدۂ حیات مسیح اور نزول مسیح کے مسئلہ پر ٹھوس علمی کتابیں لکھیں، اس زمانے میں خود آپ نے بھی کئی گرانقدر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے سیرت پر ایک ایسی کتاب لکھوائی جو مدارس کے نصاب میں داخل کی جاسکے اور نوخیز طالبعلموں کیلئے مفید ہو۔ عقیدۂ ختم نبوت پر ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں تقریباً تیس سے زیادہ بلند پایہ کتابیں حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے شاگردوں سے لکھوائیں اور خود ملاحظہ فرما کر شائع کیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی گرانقدر کتاب ''الدین القیم'' کا نقش اوّل حضرت شاہ صاحب کی رہنمائی میں لکھا گیا۔

۱۳۴۵ھ میں بعض انتظامی نوعیت کے اختلافات کے بعد جب آپ دارالعلوم سے علیحدہ ہوئے اور اپنے تلامذہ کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ گجرات کے شہر ڈابھیل میں فروکش ہوئے تو وہاں بھی آپ نے نشرواشاعت اور تصنیف وتالیف کے لئے مجلس علمی کے نام سے ایک عظیم ادارہ قائم کیا۔ افسوس ہے کہ یہ ادارہ اپنے پرانے معیار پر قائم نہیں رہ سکا ہے۔ حضرت کے ایماء پر ان کے خاص متعلقین نے ایک بڑی رقم اس ادارے کی تعمیر پر خرچ کی، خود آپ ہی کی زندگی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی ''التفهيمات الالٰهيه'' ''الخير الكثير'' اور ''البدور البازغة'' خوبصورت ٹائپ پر شائع ہوئیں۔ خود آپ کی بھی کئی کتابیں اس ادارے نے شائع کیں۔ حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد جو کتابیں مجلس علمی سے چھپیں ان میں فیض الباری، مشکلات القرآن، اور نصب الرایہ اہم ہیں۔ فیض الباری امام بخاری کی جامع صحیح پر آپ کے امالی کا مجموعہ ہے جو مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ نے عربی میں لکھے تھے۔

فیض الباری چار ضخیم جلدوں میں ہے اور اس پر لائق مولانا کے گرانقدر حواشی بھی ہیں، مشکلات القرآن آپ کے تفسیری افادات کا مجموعہ ہے۔ حضرت کے شاگرد اور داماد جناب مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری نے یہ مجموعہ ترتیب دیا اور مولانا محمد یوسف بنوری کے ایک طویل مقدمے کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ زیلعی کی نصب الرایہ نقد کی مشہور کتاب ہدایہ کی احادیث تخریج پر مشتمل ہے مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اسے مرتب کیا ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تقریباً معاصر تھے باقاعدہ شاگرد نہ تھے۔ مگر حضرت شاہ

صاحب سے جس قدر استفادہ آپ نے کیا ہے شاید ہی کسی دوسری شخصیت کو اس کا موقع ملا ہو۔ ”فتح الملھم“ کی تالیف کے دوران آپ نے بار بار استفادہ کیا۔ اس کے نمونے اس کتاب میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ جہاں وہ حضرت شاہ صاحبؒ کا بڑا احترام اور عقیدت کے ساتھ نام لے کر افادات درج کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مولانا عثمانیؒ حضرت شاہ صاحب سے تحریری استفسار فرماتے اور حضرت تحریر ہی میں جواب عنایت فرماتے، مولانا عثمانی نے فرط عقیدت میں وہ تحریریں من وعن اپنی کتابوں میں درج کردی ہیں۔ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں جب علامہ عثمانی حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے سے گذرے تو وہاں زبردست اشکال پیدا ہوا، عصمت انبیاء کا نازک مسئلہ تھا تمام متداول اور مستند تفاسیر میں واقعہ کی صحیح توجیہ تلاش کی مگر ناکام رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اشکال پیش کیا۔ شاہ صاحب نے حدیث کی کسی کتاب کا حوالہ دیکر فرمایا کہ فلاں روایت سے یہ اشکال رفع ہوسکتا ہے اور واقعی روایت مل گئی جس سے تمام اعتراضات کافور ہوگئے۔ یہ علمی تبحر تھا کہ نہ صرف تلامذہ اور معاصرین آپ کی رائے وقیع اور آخری سمجھتے تھے بلکہ اکابر علماء تک آپ پر اعتماد کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ ہمیشہ اپنے عزیز شاگرد کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ مشکل مسائل میں حضرت شاہ صاحبؒ کا نقطۂ نظر دریافت فرمایا کرتے تھے، مشہور محدث مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بذل المجہود کی تصنیف کے دوران بارہا آپ سے رجوع کیا۔ علامہ شوق احسن نیمویؒ کی آثار السنن پر آپ کے استدراکات اس کا ثبوت ہیں کہ نوعمری ہی میں آپ کی شہرت اور مقبولیت دار العلوم کی حدود سے تجاوز کرگئی تھی۔

علمی اعانت میں کبھی بخل نہ تھا۔ اکثر و بیشتر مدرسین آپ کے پاس حاضر ہوتے اور مشکل مقامات آپ سے پوچھ پوچھ کر حل کرتے، نئے مدرسین خاص طور سے آپ کی مدد کے محتاج رہتے۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اپنی معین المدرسی کے دور میں حاضر ہوجاتے کبھی ایسا ہوتا کہ رات کے آخری حصہ میں مطالعہ کے لئے بیٹھے اور الجھ گئے۔ اتنا صبر کہاں کہ صبح کا انتظار کریں، فوراً اٹھے اور شاہ صاحب کے کمرے کے دروازے پر دستک دی، شاہ صاحبؒ نے دروازہ کھولا۔ مسکراتے ہوئے استقبال کیا، سوال کا جواب دیا اور دروازہ بند

کرلیا۔ جو تلامذہ اور اہل علم تحریری، تصنیفی یا تدریسی کاموں میں لگے ہوئے تھے ان سے خوش رہتے، اور انہیں سالہا سال کا جمع کردہ اپنا گرانقدر تحقیقی سرمایہ بلا تکلف سپرد فرمادیتے۔

حضرت شیخ الادب ؒ کو جب دارالعلوم میں پہلی مرتبہ ابن ماجہ شریف کا درس سپرد کیا گیا تو انہوں نے حدیث کی اس اہم کتاب کے درس سے معذوری ظاہر کی اور اس ذمہ داری کی کما حقہ ادائیگی سے اظہار عجز کیا، اس صورت میں جبکہ ابن ماجہ کے حواشی برائے نام ہیں یہ کام واقعی مشکل تھا۔ شاہ صاحب ؒ نے فوراً ہی اپنا لکھا ہوا حاشیہ مولانا اعزاز علی صاحب ؒ کے سپرد کردیا کہ اس سے استفادہ کرو۔ یہ قیمتی حاشیہ دو چار سال ہوئے کراچی سے نور محمد اصح المطابع نے شائع کیا ہے۔ مولانا اعزاز علی صاحب حضرت شیخ الہند ؒ کے شاگرد تھے مگر آپ نے کئی کتابیں حضرت شاہ صاحب ؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی ہیں۔

دورانِ درس اور درس کے علاوہ اوقات میں آپ اپنے شاگردوں کو اسباق میں حاضری اور مطالعہ و تکرار کی ہدایت فرماتے تھے۔ کبھی ترغیب سے کام لیتے اور کبھی ترہیب سے۔ تعلیمی امور میں اصل ترغیب ہی ہے۔ بقول ابن خلدون طالب علم پر سختی اس کی تعلیم کے لئے مضر ہے۔ اس طرح وہ شرح صدر اور انبساط کے ساتھ تعلیم میں مشغول نہیں رہ سکتا۔ صوفیاء کا عام خیال بھی یہی ہے کہ تربیت کے دوران سختی متعلم کے اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کے سامنے تربیت کے یہ مسلمہ اصول تھے اور سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت کا ایک ایک حرف ان کے دل و دماغ پر نقش تھا۔ صحابہ کے ساتھ آپ کا رویہ انتہائی نرم اور مشفقانہ تھا تاہم سختی کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ بسا اوقات تربیت کے لئے مناسب سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ روایات میں ہے کہ کبھی کبھی سرکار دو عالم ﷺ اس قدر خفا ہوتے کہ آپ کے دونوں رخسار مبارک غصہ سے دہکنے لگتے بعض اوقات ناراض ہوکر بولنا چھوڑ دیتے۔ وہ بچہ جو دس سال کا ہوجائے اور نماز کی طرف مائل نہ ہو اس کے لئے شریعت نے ضرب کا حکم دیا ہے۔ شاہ صاحب ؒ بہت کم خفا ہوتے لیکن کبھی کبھی ان کی خفگی اتنی بڑھ جاتی کہ شاگرد کو درسگاہ سے اٹھا بھی دیتے تھے۔ عام طور پر یہ سزا پڑھنے کے معاملے میں دی جاتی۔ ایک مرتبہ کسی طالب علم نے کتاب کی عبارت پڑھی رواۃ کے ناموں میں وہ غلطی سے شَعبی کے بجائے شُعبی پڑھ گیا۔ آپ نے نام کی تصحیح فرمائی۔ طالب

علم نے دوبارہ غلطی کی پھر اصلاح فرمائی تیسری مرتبہ جب یہ نام سند میں گذرا تو وہ طالب علم پھر غلطی پر رہا۔ غلطی اور اس پر اصرار، معاملہ سنگین تھا خفا ہو کر اسے درس گاہ سے باہر نکال دیا اور فرمایا جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد، کج فہم اور غبی ہوں کہ روزمرہ آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بتلانے پر سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہوں انہیں دورۂ حدیث میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ دوران درس اگر کوئی طالب علم سوال کرتا تو اس سے بہت خوش ہوتے اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اس کے سوال کا جواب عنایت فرماتے، خواہش یہ رہتی کہ اپنے تلامذہ کو زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچادیں۔ درس میں اگر کسی مصنف کا نام آجاتا یا کسی عالم کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے حالات زندگی ضرور بیان فرماتے، اور اس شخصیت پر اپنا تبصرہ بھی فرمادیتے، فیض الباری میں جابجا اس کے نمونے ملتے ہیں۔ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن حجرؒ، ابن عابدین جیسے اساطین علم پر بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

اپنے شاگردوں کو جدید علوم کے مطالعہ کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ شروع شروع میں اردو زبان کی وسعت وہمہ گیری کے قائل نہ تھے، مگر حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ زبان بھی بڑے بڑے علوم کی متحمل ہوسکتی ہے۔ اس تبدیلی کے بعد اپنے تلامذہ کو مستقل یہ تلقین فرماتے رہے کہ اردو میں لکھنے پڑھنے کی عادت ڈالو۔ اکثر تلامذہ کو اردو میں لکھنے کے لئے عنوانات دئے، اور ان کے مضامین ضروری اصلاح کے بعد اخبارات ورسائل میں اشاعت کے لئے بھجواتے۔ قاضی طنطاوی کی تفسیر جواہر القرآن چھپ کر آئی، بہت شوق سے مطالعہ کیا۔ طنطاوی نے قرآن پاک کا سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ بہت سی چیزوں میں اختلاف کے باوجود آپ اس کے افادی پہلوؤں کے معترف اور قدر دان تھے۔ تلامذہ کو اس کا مطالعہ کرایا اور مشکل مقامات خود سمجھائے۔

شاگردوں سے استاذ کے تعلق اور شفیتگی کا یہ عالم ہو، اور تربیت ورہنمائی کا یہ انداز ہو تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ان میں لعل وجواہر پیدا نہ ہوں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی محنت اور تربیت کے لئے انکی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ انکے فیض تربیت کے اثر سے ایسے علماء تیار ہوئے جو آسمان علم کے آفتاب وماہتاب بنے اور جنہوں نے علم دین کی بے پناہ خدمات انجام دیں۔

دارالعلوم دیوبند کا علمی مسلک

علامہ کشمیریؒ کے نقطۂ نظر سے

از: جناب مولانا ندیم الواجدی
شعبۂ تصنیف دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند

نصاب تعلیم منزل بہ منزل

نظام تعلیم کی خوبی کا مدار اس پر ہے کہ وہ جمود سے پاک ہو اور تغیر پذیر حالات میں تغیر پذیر تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہو، یہی وجہ ہے کہ نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں حالات کے مطابق تبدیلیوں کا تسلسل رہا ہے۔ دورِ اول کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم، حدیث، فقہ اور اشعار عرب کے ضروری اسباق شامل تھے، دوسری صدی ہجری کے وسط میں علوم کا دائرہ وسیع ہوا۔ نصاب میں تفسیر، نحو، صرف، اصول فقہ، لغت اور تاریخ کا اضافہ کیا گیا۔ پانچویں صدی ہجری میں امام غزالی کے علم کلام کی بنیاد پڑی، فلسفۂ یونان کے رد کے لئے منطق اور فلسفہ وجود میں آئے، ابن خلدون (۸۰۸ھ) تک یہ نصاب زیر درس رہا۔ یہ دور علوم معقولہ کے شباب کا دور تھا، دینی علوم کا نفوذ ختم ہو رہا تھا اور لوگ منطق اور فلسفہ کی موشگافیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس خطرناک رجحان پر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں سخت تنقید کی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے نصاب تعلیم کو اسی دور میں باقاعدگی ملی، اگرچہ یہاں اسلامی علوم کی تدریس کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا اور سلاطین نے مدارس کے قیام کی طرف خاص توجہ کی تھی، لیکن ایک مدت تک یہ نظام اپنے تنگنائے سے باہر نہ آسکا، فیروز شاہ تغلق (۷۹۰ھ) پہلا شخص ہے جس نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دی، اس دور کے مدارس میں

صرف، نحو، بلاغت، ادب، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر کلام اور منطق کا درس ہوتا تھا۔ حدیث میں امام رضی الدین حسن ابن محمد صنعانی (۶۵۰ھ) کی مشاق الانوار پڑھائی جاتی تھی، فقہ اور اصول فقہ خاص مضامین تھے سکندر لودھی (۸۹۴ھ) کے دور حکومت میں اگرچہ کثرت سے مدارس قائم ہوئے، طلباء اور مدرسین کے وظائف مقرر کیے گئے، کتب خانوں کا رواج ہوا لیکن سب سے زیادہ نقصان دہ بات یہ ہوئی کہ نصاب تعلیم پر معقولات کا تسلط قائم ہوگیا۔ ملتان کے زوال کے بعد دو معقولی علماء ہندوستان تشریف لائے۔ شیخ عبداللہ طلبنی دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ طلبنی سنبھل میں فروکش ہوئے۔ حکومت کی سرپرستی حاصل رہی اپنے درباری اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں علماء نے نصاب میں معقولات کی متعدد کتابوں کا اضافہ کیا، مطالع اور مواقف اسی دور میں داخل نصاب ہوئی۔ میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف، علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول، مختصر، تلویح اور شرح عقائد نسفی کو رواج دیا، اس طرح نصاب میں عقلی علوم زیادہ راہ پاگئے۔ یہی رجحان فتنۂ اکبری کی بنیاد بنا، مغل حکمرانوں میں بابر اور ہمایوں تک نصاب تعلیم میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن اکبر نے دین الٰہی کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اور تمام مذاہب کی تحقیقات کے لئے مختلف الخیال علماء کو دربار میں جمع کیا۔ ان میں مناظرے کرائے، عقلی آزادی علماء سے عوام میں آگئی، ملا فتح اللہ شیرازی نے دربارِ اکبری میں اپنے نفوذ کا فائدہ اٹھایا اور نصاب میں محقق دوانی، میر صدرالدین، میر غیاث الدین، منصور اور مرزان کی کتابوں کو جگہ دلانے کی کوشش کی۔

یہی زمانہ تھا جب حرمین سے واپسی کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوٰۃ اور مشارق الانوار کا درس شروع کیا۔ یہ ایک روشنی تھی جو اندھیروں کے افق سے طلوع ہوئی۔ جہانگیر نے مذہبی تعلیم میں دلچسپی لی مگر معقولیت کا اثر کم نہ کرسکا۔ شاہ جہاں نے نومسلوں کے لئے تعلیم کا بندوبست کیا۔ اورنگ زیب نے فقہ کی تدوین میں علماء کو لگایا۔ اس دور میں تعلیم سرکاری پابندیوں سے آزاد ہوئی اور لوگوں نے اپنے ذاتی مدارس قائم کئے، ملا قطب الدین شہید (۱۱۰۳ھ) نے سہالی کو مرکز علم بنایا، آپ کے صاحبزادے ملا نظام الدین ایک نئے

نصاب تعلیم کے ساتھ یہ مرکز علم فرنگی محل لکھنؤ لے گئے۔ یہ نصاب تعلیم بھی معقولات کے اثر سے آزاد نہ رہ سکا، آپ نے منطق میں صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم، حکمت میں میبذی، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ کتابیں داخل کیں۔ بعد میں ملاحسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، رسالہ میر زاہد، ملا جلال، بحر العلوم اور ملا مبین بھی پڑھائی جانے لگیں، یہ نصاب اودھ کے مدارس میں پہنچا، فرنگی محل نے معقولات کے غلبہ سے نجات پائی مگر خیر آباد اسیر ہو کر رہ گیا۔ ملا نظام الدین کے ہم عصر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) نے اپنا نصاب الگ بنایا۔ اس نصاب میں تعلیم کے مروجہ اسلوب سے انحراف تھا۔

تیرہویں صدی ہجری میں تین مراکز علم معروف تھے۔ دہلی، لکھنؤ، خیر آباد۔ دہلی میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶ھ) کے نصاب کا اثر تھا اور وہاں حدیث اور تفسیر پر زیادہ توجہ دی جا رہی تھی، لکھنؤ میں فرنگی محل علماء کی دلچسپیاں فقہ اور اصول فقہ تک محدود تھیں، خیر آباد کا موضوع منطق اور فلسفہ تھا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد یہ تینوں مراکز منتشر ہو گئے اور انکی میراثِ علم دار العلوم کو پہنچی، چنانچہ دار العلوم نے اپنے نصاب تعلیم میں ان تینوں مکاتب فکر کی خصوصیات جمع کیں اور ایسا نصاب تیار کیا جسے پڑھ کر طالب علم میں تعمق، امعانِ نظر اور بصیرت پیدا ہو اور اسے فی الجملہ تمام مروجہ علوم پر دسترس حاصل ہو جائے۔

دار العلوم اور علم حدیث

دار العلوم دیوبند میں علم حدیث کے مطالعے کا اسلوب دوسری درسگاہوں سے مختلف ہے۔ یہاں محض حدیث کی تلاوت پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ حدیث کے تمام پہلو نمایاں ہو جائیں۔ متعارض روایات میں تطبیق، ترجیح، یا تنسیخ کا عمل ہوتا ہے اور اس عمل کے لئے دلائل فراہم کئے جاتے ہیں۔ دورانِ درس استدلال اور استنباط کے طریقوں پر گفتگو کی جاتی ہے، رجال حدیث زیر بحث آتے ہیں، روایت کا درجہ متعین کیا جاتا ہے، فقہی احکام بیان کئے جاتے ہیں، ائمہ کے مسالک کی تفصیل سامنے آتی ہے اور آخر میں

احناف کا مسلک، دلائل اور وجوہِ ترجیح کا ذکر ہوتا ہے۔

حدیث فہمی کا یہ اسلوب دار العلوم کے درس میں بھی نمایاں ہے اور ان کتابوں میں بھی جو حدیث کے موضوع پر علمائے دیوبند کے قلم سے نکلی ہیں، یہ ایک معقول اسلوب ہے، ہندوپاک کے بیشتر مدارس میں اس کا اتباع کیا جاتا ہے مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو صحیح معلومات کے فقدان کے باعث اس اسلوب کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں، یہی صورت حال تھی جس سے متاثر ہوکر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے دار العلوم دیوبند کے طریقۂ حدیث کی وضاحت فرمائی۔

حضرت کشمیری کی عربی تقریر

۱۳۳۰ ہجری میں مصر کے مشہور عالم تفسیر ''المنار'' کے مصنف اور رسالہ ''المنار'' کے سابق مدیر علامہ سید رشید رضا مرحوم ہندوستان تشریف لائے، اس موقع پر آپ دیوبند بھی پہنچے اور دار العلوم کی علمی سرگرمیوں کا قریب سے مطالعہ کیا، دار العلوم نے آپ کے اعزاز میں ایک عام جلسہ کا اہتمام بھی کیا، طے شدہ پروگرام کے مطابق حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری کو استقبالیہ تقریر کرنی تھی مگر بروقت یہ موضوع تبدیل کردیا گیا اور دار العلوم دیوبند کے علمی مسلک پر تقریر ہوئی۔ معزز مہمان نے کسی شخص سے دار العلوم کے طریقۂ درس کے سلسلہ میں استفسار کیا تھا، جو جواب انہیں ملا اس کی روشنی میں انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ گھر سے جلسہ گاہ تشریف لاتے ہوئے یہ بات حضرت کشمیریؒ کے علم میں آئی، وہیں سے تقریر کا موضوع بدلا، یہ تقریر فصیح و بلیغ عربی میں تھی، تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی، اپنے بلند مضامین کے لحاظ سے ایسی تھی کہ سننے والے حیرت زدہ تھے اور خود معزز مہمان بہت زیادہ متاثر دکھائی دے رہے تھے (۱)۔

ولی اللّٰہی فکر سے دار العلوم کا تعلق

ضروری تمہید کے بعد حضرت کشمیریؒ نے اپنی جماعت کا سلسلہ نسب فرمایا کہ ہماری یہ

(۱) ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، شمارہ ۲ جلد ۳، رمضان ۱۳۳۰ھ۔

جماعت قدیم طریقوں کی پابند ہے، کوئی نئی جماعت نہیں ہے، دینی امور میں ہمارا سلسلہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی پر جا کر منتہی ہوتا ہے جو اپنی بلند پایہ تصانیف کی بنا پر دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دینی علوم اپنے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے حاصل کئے، والد کی وفات کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں کے مشہور محدث شیخ ابوطاہر کُردی کی خدمت میں رہکر حدیث کا درس لیا۔اور اس شان سے لیا کہ خود استاد محترم یہ فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ الفاظ مجھ سے سیکھتے ہیں اور معانی میں ان سے سیکھتا ہوں۔ حرمین سے واپسی کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی اصلاحی جدوجہد کا آغاز کیا۔اللہ نے انہیں بصیرت اور آگہی کے نور سے نوازا تھا۔یہاں کے حالات کے مطالعہ کے بعد انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ بہت جلد حق و باطل کی کشمکش شروع ہوگی۔دین کے دفاع کے لیے جد جہد ضروری ہے۔سب سے پہلے آپ نے قرآن عزیز کا ترجمہ ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے فارسی زبان میں کیا، اس کے بعد موطاً امام مالکؒ کی شرح 'مسوّیٰ' تصنیف فرمائی۔

ولی اللّٰہی مکتب فکر اور دارالعلوم کے روابط پر یہ ایک اجمالی گفتگو ہے۔ہمارے لفظوں میں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس مکتب فکر کے بانی امام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے انتہائی نازک حالات میں دینی احیاء کے لیے جدوجہد کی۔اور علومِ شریعت کو عقل ونقل اور وجدان کا جامع قرار دیا۔حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اس مکتب فکر سے علماء کا ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے اس فکر کی امانت کو جو شاہ صاحبؒ نے انہیں سپرد کی تھی آگے بڑھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (۱۲۳۰ھ) اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ (۱۲۳۳ھ) اس فکر کے صحیح وارث اور امین قرار پائے۔حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ (۱۲۳۳ھ) نے بھی اپنے والد ماجد کے افکار کی اشاعت میں حصہ لیا، حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ (۱۲۶۲ھ) اور شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ (۱۲۶۴ھ) نے سنبھالی، ان میں اول الذکر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے اور ثانی الذکر بھتیجے ہیں۔ حضرت شاہ محمد اسحاق کے شاگردوں میں نامور علماء شامل ہیں، خاص طور پر مفتی عنایت احمد

کاکورویؒ (۱۲۷۹ھ) نواب قطب الدین دہلویؒ (۱۲۸۹ھ) مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (۱۲۹۷ھ) اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ (۱۲۹۶ھ) کے نام بڑے اہم ہیں۔ اول الذکر دونوں حضرات نے اردو زبان میں حدیث کا عام فہم لٹریچر تیار کیا۔ حضرت محدث سہارنپوریؒ نے درس وتدریس کے علاوہ فنِ حدیث کی معیاری کتابوں پر گراں قدر حواشی تحریر فرمائے اور ان کے صاف ستھرے ایڈیشن شائع کیے، حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ اپنے استاذ محترم حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی ہجرت کے بعد ان کے جانشین کہلائے۔ دیوبند کے بیشتر اکابر آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ) حضرت مولانا رشید احمد گنگوھیؒ (۱۳۲۳ھ)، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (۱۲۹۷ھ)، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، (۱۳۰۲ھ) حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ (پیدائش ۱۲۴۶ھ) حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (م ۱۳۲۲ھ) حضرت مولانا فضل الرحمن دیوبندی (م ۱۳۲۵ھ) ان حضرات اکابر کا سلسلۂ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی وساطت سے ہی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک پہنچتا ہے۔ یہ تمام حضرات تحریک دیوبند سے وابستہ تھے۔ بعض نام ان میں ایسے ہیں جو دارالعلوم کی تاسیس میں براہِ راست شریک رہے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز کے فیض یافتوں میں مفتی صدر الدین آزردہؒ (م ۱۲۸۵ھ) اور حضرت مولانا مملوک علیؒ (م ۱۲۶۷ھ) بھی ہیں، دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سرپرست ثانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، ان دونوں حضرات سے بھی سلسلۂ تلمذ رکھتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی شرح موطأ

امام مالک کی موطأ حدیث کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے جسے امت کا تعاون حاصل رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اس کتاب کو حدیث کی تمام کتابوں کی اساس اور دوسری کتابوں کو اس کی شروح قرار دیتے ہیں۔ اپنے وصیت نامے میں آپ نے اس کے مطالعہ کی تلقین بھی فرمائی ہے۔ یہ کتاب آپ نے اپنے تلامذہ کو پڑھائی اور ''مصفّٰی'' اور ''مُسوّٰی'' کے نام سے اس کی دو شرحیں بھی لکھیں، حضرت علامہ کشمیری کے خیال میں ''مسوّٰی'' کی سب سے بڑی

خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہاء کے مذاہب کی وضاحت کے لیے علمائے اصول کی اصطلاحات، تحقیق مناط، تنقیحِ مناط اور تخریجِ مناط سے مدد لی گئی ہے۔

تحقیق مناط یہ ہے کہ شارع کسی خاص امر کے سلسلہ میں کوئی حکم بیان فرمائیں، لیکن اس نوع کے دوسرے مسائل میں اس طرح کا کوئی حکم صراحۃً موجود نہ ہو، اس صورت میں وہ حکم ان مسائل میں بھی متحقق ہوگا اور یہ اس لیے کہ احکامِ شرعیہ عام ہوتے ہیں، علت جہاں پائی جاتی ہے وہاں حکم ضرور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حالتِ احرام میں شکار کرنا حرام ہے، اس جرم کے مرتکب کے لیے قرآن پاک نے ایک خاص سزا متعین کی ہے، وہ سزا یہ ہے کہ دو عادل مسلمان اس شکار کی قیمت لگائیں اور مجرم متعینہ قیمت کی ادائیگی کا پابند ہو۔ یہ حکم کسی خاص جانور کے شکار کے سلسلہ میں نازل ہوا لیکن دوسرے جانوروں کے شکار کا حکم بھی یہی ہے، فقہاء اس عمل کو تحقیق مناط سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ قیاس نہیں ہے کہ اجتہاد کی ضرورت پیش آئے بلکہ عام لوگ بھی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی ایسے حادثہ میں شارع علیہ السلام کوئی حکم بیان فرمائیں جس میں چند امور جمع ہوں، بعض امور اس حکم کی علت بن سکتے ہوں اور بعض میں اس کی صلاحیت نہ ہو، ان چند امور میں سے حکم شرعی کی صحیح علت دریافت کرنا ہی تحقیق مناط ہے، اس کی مثال حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ ایک شخص خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو مارا گیا! آپ نے دریافت فرمایا: کیا بات ہے؟ اُس نے عرض کیا کہ میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کر لیا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تم غلام آزاد کر سکتے ہو؟ اس نے عرض کیا: ''نہیں!'' آپ نے دریافت فرمایا کیا دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے عرض کیا ''نہیں!'' آپ نے دریافت فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ اس نے عرض کیا ''نہیں''۔

حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ مذکورہ صورت میں کفارہ واجب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے کفارہ کے وجوب کی علت فعل مفطر کو قرار دیا ہے۔ چاہے وہ جماع کی صورت میں ہو یا کھانے پینے کی صورت میں۔ امام شافعی اور امام احمد نے صرف جماع

بحالتِ صوم کو وجوبِ کفارہ کی علت قرار دیا ہے، کھانا پینا اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ ان دونوں حضرات نے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث سے استدلال کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو شخص رمضان المبارک میں بلا کسی شرعی عذر کے روزہ افطار کرلے تو ساری عمر کے روزے بھی اس کی مکافات نہیں کرسکتے۔ صورتِ استدلال یہ ہے کہ حدیث میں وجوبِ کفارہ کا ذکر نہیں ہے۔

تخریج مناط یہ ہے کہ کسی ایسے حادثہ میں شارع علیہ السلام کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو جس میں کئی امور جمع ہوں اور وہ سب اس حکم کی علت بن سکتے ہوں، مجتہد اُن میں سے کسی ایک کو مدارِ حکم قرار دیتا ہے۔ حدیث شریف میں گیہوں، جو، سونا، چاندی، نمک اور کھجور میں سود کی ممانعت ہے۔ ان چھ چیزوں میں قدر جنس، طعم، ثمنیت، اقتیات وادخار کا اجتماع ہے۔ یہ سب امور ممانعت ربا کی علت ہوسکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے قدر اور جنس کو، امام شافعی نے طعم اور ثمنیت کو، امام مالک نے اقتیات وادخار کو مدارِ حکم قرار دیا(۱)۔

اکابر دیوبند کا ذکر

مناط کی تفصیل کے بعد حضرت کشمیریؒ نے خاندان ولی اللّٰہی اور سلسلۂ دارالعلوم کے اکابر کی خدمات کا ذکر فرمایا: ''دیوبند میں ولی اللّٰہی فیوض وبرکات، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ذریعہ پہنچے۔ حضرت نانوتوی نے مادیت نواز اور دہریت پسند فرقوں کے خلاف کتابیں لکھیں، ایسی کتابوں میں آپ نے اسلامی عقائد اور تصورات کو معقولات، محسوسات اور مشہودات بنا کر پیش کیا۔ اس موقع پر حضرت کشمیریؒ نے اپنا وہ مشہور قصیدہ بھی سنایا جو آپ نے حضرت نانوتویؒ کے مناقب میں لکھا تھا۔ اس قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

قِفَایَا صَاحِبَیَّ عَلَی الدِّیَارِ ☆ فَمِنْ دَابِ الشَّجِیِّ هَرَی ازْدِیَارِ

(۱) ان اصولوں کی تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیے:۔ ''فیض الباری'' مؤلفہ مولانا سید بدر عالم مہاجر مدنی: ج:۱۔ ص: ۵۸-۵۹۔ ''فتح الملہم'' مصنفہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ: ج:۱،ص:۸۹-۹۱۔ ''العرف الشذی'' مؤلفہ مولانا چراغ محمد: ج:۱۔ ص:۱۵-۱۶۔ ''معارف السنن'' مصنفہ مولانا محمد یوسف بنوری: ج:۱،ص:۶۱-۶۲۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ بہت بڑے فقیہ اور مجتہد تھے(۱)۔اپنے دور میں مرجع علماء رہے۔مسائل میں آپ کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی، حضرت نانوتوی کو ہم اصول وکلیات میں اپنا امام سمجھتے ہیں، فروع وجزئیات میں ہمارے مقتدیٰ حضرت گنگوہیؒ ہیں، ان دونوں حضرات کے ذریعہ علم خوب واضح ہوکر سامنے آیا۔

دارالعلوم دیوبند کا طریقۂ حدیث

یہاں پہنچ کر حضرت کاشمیریؒ نے اپنے اکابر کے طریقۂ حدیث کی وضاحت فرمائی ''اکابر دیوبند کا طریقۂ حدیث افراط وتفریط سے پاک ہے، یہاں اندازوں کے بجائے علم اور تحقیق پر اعتماد کیا جاتا ہے، فقہ حدیث میں ہم ائمہ اربعہ کے اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، امام مالک نے اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دی ہے، امام شافعی اصح مافی الباب سے استدلال کرتے ہیں، امام احمد اصح، صحیح، حسن اور معمولی ضعف رکھنے والی روایات بھی قبول کر لیتے ہیں، امام ابوحنیفہ ہر درجہ کی روایت قابل استدلال سمجھتے ہیں اور تعارض کی صورت میں ہر روایت کا صحیح مفہوم متعین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احناف کے یہاں تاویلات کی کثرت ہےاور شوافع کے یہاں رواۃ پر جروح کی۔

امام بخاریؒ نے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے اصولوں کے امتزاج سے بخاری مرتب فرمائی۔ وہ اصح مافی الباب روایت کرتے ہیں اور سلف کے عمل کی رعایت بھی کرتے ہیں، اسی لیے ان کے یہاں متعارض روایات نہیں ہیں۔ کسوف شمس کے سلسلہ میں صرف وہ روایت بخاری میں ہے جس میں دو رکوع کا ذکر ہے جب کہ مسلم نے رُواۃ کی ثقاہت پر اعتماد کرتے ہوئے دو، تین، چار، پانچ رکوع کی روایات بھی درج کی ہیں۔ وہ روایت جس میں پانچ رکوع کا ذکر ہے وہ حضرت علیؓ پر موقوف ہے(۲)۔ ہمارے مشائخ نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے، نہ اُن کے یہاں تشدد ہےاور نہ تساہل، جو احادیث متعارض ہیں ان میں جمع

(۱) فیض الباری میں آپ نے حضرت گنگوہیؒ کو علامہ شامی سے بڑا فقیہ قرار دیا ہے۔ جلد۲، ص۲۴۔

(۲) ائمہ اربعہ کے اصولوں کی تشریح کے لیے دیکھیے:۔ الکوکب الدری ج۱ص۱۸۔ العرف الشذی ج۱ص۱۹۔ معارف السنن ج۱ص۱۰۲۔

کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور ایسی توجیہات بیان کی جاتی ہیں جو قابل قبول ہوں۔

استخراجِ مسائل کی کچھ مثالیں

حضرت کشمیریؒ نے اپنے اکابر کے طریقہ کی وضاحت کے بعد اعتدال کی مثالیں بھی پیش فرمائیں اور کچھ ایسے مسائل میں دیوبند کے موقف اور طریقۂ استدلال کا ذکر کیا جو اختلافی ہیں۔ پانی کی طہارت کے مسئلہ میں اصل روایت قلتین کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''اِذَا بَلَغَ الماءُ القلتین لم یحمل الخبث'' (اگر پانی دو قلوں کے بقدر ہو جائے تو وہ نجاست کا متحمل نہیں ہوتا) امام شافعی نے اپنے اصول کے مطابق اس حدیث پر عمل کیا اور اس مفہوم کی دوسری روایات ترک کر دیں، ہمارے مشائخ نے اس حدیث کے تمام طرق سامنے رکھ کر فیصلہ فرمایا، ایک روایت میں ''قلتین او ثلاثًا '' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس تنویع سے مفہوم ہوتا ہے کہ منشأ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تخمینہ ہے تحدید نہیں ہے، اس صورت میں حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر پانی کی مقدار اس قدر ہو تو اس میں ایک طرف کی نجاست کا اثر دوسری طرف نہیں پہنچتا۔ حدیثِ قلتین کے اس مفہوم کی تعیین کے بعد دوسری متعارض روایات بھی اپنے حال پر باقی رہیں۔ جیسے وہ حدیث جس میں سو کر اُٹھنے کے بعد پانی میں ہاتھ ڈالنے سے منع کیا گیا ہے، ولوغِ کلب کی روایت اور ماءِ راکد میں پیشاب کی ممانعت کے سلسلہ میں آنے والی روایات بھی تعارض سے بچ جاتی ہیں۔ قراءتِ فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین جیسے معرکۃ الآراء مسائل میں بھی ہمارے اکابر نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے(۱)۔

رفع یدین کے اختلاف کی نوعیت

رفع یدین کا اختلافی مسئلہ اسلامی فقہ کی تاریخ میں اہم ترین مسئلہ خیال کیا جاتا ہے، اس موضوع پر دونوں طرف کے علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے قاری کی رائے یہ بنتی ہے کہ امام شافعی ترکِ رفع کو بے اصل خیال کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک رفع

(۱) ان مسائل کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: معارف السنن: ج:۱، ص:۲۳۴۔ فیض الباری: ج:۲، ص:۲۵۵۔

بدعت ہے، ہمارے اکابر میں مبالغہ آمیزی نہیں ہے، وہ مسائل کا واقعیت پسندی کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔ حضرت کشمیریؒ کو اللہ نے جس بصیرت سے نوازا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس اختلاف کی نوعیت متعین فرمائیں، اپنی اس تقریر میں آپ نے اسے افضلیت اور استحباب کا اختلاف قرار دیا۔ ۱۳۵۱ھ میں آپ نے ''نیلُ الفرقدین فی مسئلة رفع الیدین'' کے عنوان سے جو عالمانہ کتاب تصنیف فرمائی اس کی بنیاد اسی جملہ پر اُٹھائی گئی ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جن مسائل میں توسع ممکن ہو اس سے گریز نہ کیا جائے آپؒ کے نقطۂ نظر کی وضاحت ''فیض الباری'' کی اس بحث سے ہوتی ہے، جس میں آپؒ نے امام و ماموم کے مسلک میں اختلاف کی بنیاد پر نماز کی صحت یا فساد کی وضاحت فرمائی ہے بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ اختلاف مسلک کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہے، جب کہ قاضی ابوبکر جصاص نماز کی صحت کے قائل ہیں، حضرت علامہ کشمیری کے نزدیک یہی مسلک راجح ہے(۱)۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ذکر

آخر میں آپ نے اپنے استاذ محترم شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کا ذکر کیا جو اس وقت بقید حیات تھے، اور جن کے دم سے علم و عمل کی محفلوں کو رونق تھی، آپ نے فرمایا ''ہمارے شیخ مولانا محمود الحسن اپنے اساتذہ کے طریقہ پر ہیں، توفیق الٰہی سے آپ کو متعارض روایات کی تطبیق اور مشکلات کے حل کا خاص سلیقہ ہے، چنانچہ صلوٰۃِ کسوف کے متعلق روایات کے اختلاف کے سلسلہ میں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعدادِ رکوع ثابت ہے۔ مگر یہ صرف آپ کے ساتھ خاص ہے امت کو آپ نے وحدتِ رکوع کی ہدایت فرمائی ''صَلّوا کاحدث صلوة صلّیتموها من المکتوبة'' (جو فرض نماز تم نے ابھی پڑھی ہے اس جیسی نماز پڑھو۔ اس حدیث میں صلوٰۃِ کسوف کو صبح کی نماز سے تشبیہ دی گئی ہے، شوافع اسے رکعتین کی تشبیہ پر محمول کرتے ہیں۔ ہمارے استاذ محترم کا خیال ہے کہ یہ بدیہی

(۱) بحوالہ فیض الباری۔ ج:۱:ص:۳۵۱۔

امر کو نظری بنانے کا عمل ہے۔ آں حضرت ﷺ نے مجمع عام میں کسوف کی نماز ادا فرمائی۔ صرف دو دو رکعتیں پڑھیں اس صورت میں صبح کی نماز سے تشبیہ دینے کی ضرورت نہ تھی۔

تشبیہ کسی خاص مقصد کے لیے دی گئی ہے اور قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تشبیہ کا مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جو تعددِ رکوع سے پیدا ہو سکتی ہے۔

حضرت کشمیریؒ اور حنفیت

حضرت کشمیری نے اپنے اکابر کے جس طریقہ کا ذکر کیا ہے وہ دراصل حنفیت کی تائید و ترجیح سے عبارت ہے، حنفیت کا ذکر کیے بغیر آپ نے یہ بتلایا کہ ہم امام ابوحنیفہ کے اصولوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کی فقہ کے پابند ہیں۔ یہ بات فاضل مقرر نے پوری بصیرت اور پورے اعتماد کے ساتھ کہی، آپ کو زندگی کے چالیس برس فقہ حنفی کی خدمت میں گذارنے کا موقع ملا۔ ابوداؤد، ترمذی اور بخاری جیسی مہمات کتب کا درس دیا، کئی کتابیں اختلافی مسائل پر سپرد قلم فرمائیں، اپنی طویل خدمات کے حوالے سے ارشاد فرماتے تھے کہ میں نے فقہ حنفی کی بنیاد اتنی مضبوط و مستحکم بنادی ہے کہ آئندہ سو سال تک متزلزل ہونے کی اُمید نہیں ہے۔ ایک اور موقع پر یہ ارشاد ہوا کہ مجھے فقہ حنفی میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ملا جس کے لیے مضبوط دلائل موجود نہ ہوں اور اگر ایسا کوئی مسئلہ ملا بھی تو وہاں دوسرے ائمہ بھی خاموش نظر آتے ہیں، البتہ مسئلہ خمر میں جمہور کے پاس دلائل زیادہ ہیں، مجھے امام ابوحنیفہ کے یہاں ایسی کوئی دلیل نہیں ملی جو جمہور کا جواب بن سکے (۱)۔

ایک غلط فہمی

دارالعلوم دیوبند ولی اللہی مکتب فکر کا وارث اور اس کی امانتوں کا امین ہے۔ دارالعلوم میں حنفیت کی تائید کا جو سلسلہ ہے وہ اس مکتب فکر سے انحراف نہیں ہے بلکہ اس کے بانی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نقطۂ نظر کا پرتو ہے۔

(۱) نفحۃ العنبر فی ہدی الشیخ الانور مؤلفہ مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم۔ ص ۹۰۔

حضرت الامام دہلویؒ کے تعلق سے یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ آپ تقلید کے خلاف تھے، حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ میں تقلید کے مخالف نہیں رہے، آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ''عقد الجید'' اور ''الانصاف'' میں کی ہے۔ ''عقد الجید'' کا خاص موضوع تقلید ہے، ضمناً اجتہاد کے متعلق بعض اہم مباحث بھی آگئے ہیں۔ ''الانصاف'' میں تقلید کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ نے عہد عالمگیر میں فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب وتدوین میں حصہ لیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے والد کے شاگرد ہیں۔ ۱۱۳۱ھ میں آپ کو حرمین شریفین میں قیام کا موقع ملا، وہاں شیخ ابو طاہر کردی شافعی اور شیخ تاج الدین حنفی کی صحبت میسر رہی۔ اس ملی جلی صحبت نے شاہ صاحب کے طرزِ فکر کو خاصا متاثر کیا اور وہ فقہ حنفی کے ساتھ ساتھ فقہ شافعی کی اہمیت بھی محسوس کرنے لگے، حجاز میں قیام کے دوران شاہ صاحبؒ کا خیال یہ رہا کہ صحاحِ ستہ کی اصل موطأ امام مالک ہے اور موطأ حدیث کا پہلا صحیح مجموعہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے قریب تر ہے، اس کتاب کی بنیاد پر جو عالم فتویٰ دے گا وہ قابل اعتماد ہوگا، چاہے وہ عالم حنفی ہو یا شافعی، اس بنیاد پر انہوں نے شافعی اور حنفی فقہوں میں مطابقت کی کوشش بھی کی، شاہ صاحب کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ ہر علاقہ ایک خاص فقہ سے مناسبت رکھتا ہے، فقہ حنفی کا مزاج حجاز میں نہیں ہے اور ہندوستان فقہ حنفی سے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ دہلی واپس تشریف لائے تو پھر فقہ حنفی اختیار فرمایا، آپ کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان میں ہمیشہ فقہ حنفی رائج رہا ہے، مسلمان اس سے مانوس ہیں، حضرت شاہ صاحب کو امت مرحومہ کی تنظیم اور شیرازہ بندی کے لیے جدوجہد کا اِلہام ہوا، اس میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں۔ ایک جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؒ سے ارشاد فرمایا کہ فقہ حنفی زیادہ عمدہ طریقہ ہے اور یہ طریقہ اس سنت کے زیادہ قریب ہے، جس کی تنقیح وتدوین امام بخاریؒ اور ان کے ساتھیوں کے زمانے میں ہوئی۔ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے اسکول میں حنفیت کو موضوع نہیں بنایا گیا تھا بلکہ وہ عملاً حنفی تھے اور درساً شافعی وحنفی۔ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں بخاری شریف کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ مخطوطہ

کے ٹائیٹل پر حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک عزیز شاگرد مولانا چراغ محمد کو اجازتِ حدیث دی ہے وہاں یہ الفاظ ہیں ''شافعی درساً و حنفی عَملاً وَتدرِیسًا'' کتاب پر آپ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کے دستخط ثبت ہیں اور شاہ عالم کی مہر تصدیق بھی۔ ''الفرقان'' کے ولی اللہ نمبر میں اس کا عکس شائع کیا گیا ہے۔

دارالعلوم میں حدیث کی تدریس

دارالعلوم نے اپنے قیام کے روزِ اوّل سے علم حدیث پر خاص توجہ دی ہے اور اس فن کی تدریس کا ایک ایسا اسلوب پیش کیا ہے جو تاریخِ تدریس میں جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ حضرت الامام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے اسکول میں حدیث کے درس کے لیے جس طریقہ کی بنیاد ڈالی تھی وہ اس دور کے لیے بڑا اہم تھا۔ عقلیت کے غلبہ کے نتیجہ میں دینی علوم سے انحراف بڑھتا جارہا تھا ضرورت اس کی تھی کہ لوگوں میں علمِ حدیث کا ذوق پیدا ہو اور سنت کی روشنی عام ہو۔ شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۰۷۳ھ) کے تراجم حدیث کا اثر موجود تھا مگر وہ زیادہ گہرا اور زیادہ واضح نہیں تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس مقصد کے لیے صحاحِ ستہ کی تدریس کا اہتمام کیا، درس کا اسلوب یہ تھا کہ طالب علم حدیث کی تلاوت کرتا، استاذ سماعت کرتا، اگر کوئی ضروری بات بیان کرنی ہوتی یا کسی غلطی پر ٹوکنا مقصود ہوتا تو درمیان میں روک کر تقریر کردی جاتی یا غلطی کی نشاندہی کے بعد آگے بڑھنے کا حکم دیا جاتا۔ حدیث کے اس طریقۂ درس کو سرد کا نام دیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں درس حدیث کے جو تین طریقے لکھے ہیں ان میں طریقۂ سرد کو پسندیدگی حاصل ہے۔

دارالعلوم میں تدریس کا جو طریقہ رائج ہے اُسے دورۂ حدیث کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ولی اللہی طریقۂ درس کی ارتقائی شکل ہے، حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے باکمال شاگردوں کی جدوجہد رنگ لائی اور لوگوں نے حدیث کے مطالعہ میں دلچسپی لی، اس صورت میں محض تلاوت کافی نہ تھی بلکہ ضرورت تھی کہ تسلسل کے ساتھ وہ علمی نسل تیار ہوتی رہے جو مرادِ نبوی ﷺ کا اِدراک کرسکے، حدیث اسلامی قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے، فقہی نقطۂ نظر سے اس

کا مطالعہ اس ربط کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، ولی اللہی مدرسہ رحیمیہ کی طرح یہاں صحاح ستہ کے درس پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ حدیث کی کچھ اور کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں تاکہ طالبعلم مختلف محدثوں کے ذوقِ تالیف سے واقف ہوجائے اور ہر درجہ کی روایات اس کے سامنے آجائیں۔ دارالعلوم کے اس اسلوب کی ابتدا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ہوئی۔ حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم میں اس طریقۂ درس کی بنیاد رکھی اور حضرت گنگوہیؒ نے اپنی خانقاہ میں اس کا آغاز فرمایا، حضرت گنگوہی کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کی خانقاہ سے جن بزرگوں نے حدیث شریف کی اجازت حاصل کی ہے ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے، ان میں حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ (۱۳۱۷ھ) مولانا محمد کاندھلویؒ (۱۳۳۴ھ) مولانا فتح محمد تھانویؒ، مولانا حسین علی نقشبندیؒ (۱۳۶۴ھ) کے نام اہم ہیں، مولانا فتح محمد کے علاوہ تینوں حضرات نے اپنے استاذ کی درسی تقریریں قلم بند کیں، اور انہیں شائع کیا۔ حضرت نانوتویؒ کے شاگردوں میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (۱۳۰۲ھ) حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ (۱۳۳۹ھ) حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ (۱۳۱۷ھ) حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ (۱۳۳۰ھ) جیسے علماء کے نام ہیں، دارالعلوم کی تعلیم سے انتظام تک ہر مرحلہ پر ان بزرگوں کے گہرے اثرات ہیں، قدرتی طور پر یہاں وہی اسلوب رائج ہوا جو ان حضرات نے اختیار کیا تھا، بعد میں آنے والوں نے اسے رنگ و نور عطا کیا اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

علامہ رشید رضا مصری کا اعتراف

دَورانِ تقریر آپ بار بار پہلو بدلتے رہے۔ ایک مرتبہ آپ نے پوچھا:

"یا شیخ! مسئلہ قلتین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے خیال کی وضاحت فرمائی، مہمان محترم نے دوبارہ سوال کیا:

"اور قراءت خلف الامام کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سوال کا جواب بھی دیا(۱) معزز مہمان پر تقریر کا اس قدر

(۱) نفحۃ العنبر، ص: ۷۳

تاثر تھا کہ بے ساختہ زبان سے نکلا:

"وَاللّٰہِ مَا رَأَیْتُ مِثْلَ ھٰذا الاُستاذ"(۱)

(بخدا میں نے (اس) استاذ جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا)

جوابی تقریر میں مہمان محترم نے طریقۂ دیوبند پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔

"لَو لم ار ھٰذہ الجامعة العلمیّة و مثل ھٰؤلاءِ الاعلام الاحبار لرجعتُ مِنَ الھِنْدِ حَزِیْنًا.(۲)

اگر میں اس دارالعلوم کو اور ان عظیم علماء کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین واپس جاتا۔

مصر واپسی کے بعد آپ نے اپنے جریدہ "المنار" کی اشاعت ماہِ شعبان ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ "مجھے سب سے زیادہ خوشی از ہرالہند دارالعلوم دیکھ کر ہوئی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ مصر کے مشہور مصنف جناب احمد الشرباصی نے علامہ رشید رضا کی سوانح عمری میں دیوبند کے سفر اور دارالعلوم میں ان کی بے مثال تقریر کا تذکرہ نہیں کیا جب کہ کتاب میں سفر ہند کا ایک مستقل عنوان ہے۔ اور اس میں مصنف نے ہندوستان میں علامہ کی متعدد علمی اور دینی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

---

(۱) مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی۔

(۲) مجلہ المعمر، ص: ۷۳

علم حدیث میں حضرت شاہ صاحبؒ کی نکتہ آفرینیاں

از: جناب مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم (مدرس دارالعلوم دیوبند)

امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۹۲-۱۳۵۲ھ) اُن نابغۂ روزگار شخصیتوں میں ہوئے ہیں جن کی مثال متقدمین میں تو ملتی ہے لیکن متاخرین میں ناپید ہے، اور اب تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ سوتے ہی خشک ہو گئے ہیں جہاں سے انسانیت کے شفاف چشمے نکل کر بہتے تھے۔

حسن ظاہری کا وہ کون سا باب اور جمالِ باطنی کا وہ کونسا عنوان ہے جس کے معنون حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نہ ہوں، بشرہ ایسا کہ پڑنے والی نظر ادھر سے ہٹنے کو تیار نہ ہو، رنگ میں خوبصورت کشمیریوں جیسا نکھار، چہرے کے متوازن نقش و نگار میں جمال باطنی کی رعنائی آشکار، اس پر علم و تحقیق کا جاہ و جلال مستزاد، صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندرونی خوبیاں چھلک کر چہرے پر نمودار ہو گئی ہیں، اور اطرافِ بدن احوالِ قلب کا تعارف کرا رہے ہیں۔ بالکل سچ ہے ''جو کچھ برتن میں ہوگا وہی اس سے چھلکے گا''۔

رہے اندرونی محاسن یعنی اخلاقِ جمیلہ و عاداتِ شریفہ کے علاوہ جن کا سب سے نمایاں پہلو علم و تحقیق میں انفرادیت اور اعلیٰ امتیاز اور فقید المثال مہارت ہے تو ان کو بتلانے کے لیے خود جس مہارت اور قابلیت کی ضرورت ہے افسوس ہے کہ راقم الحروف اور اس کا قلم اس سے عاری ہے۔

میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس کی بڑائی اور جلالتِ قدر کے خود اس کے بڑے اور ہم عصر معترف ہوں اور اجنبی و شناسا دور و نزدیک سب ہی اس کے گن گائیں تو اس کی عظمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس بات کی شہادت مطلوب ہو تو اس واقعہ کو دارالعلوم دیوبند کے پرانے ترجمان مجلّہ ''القاسم'' کے شمارۂ محرم ۱۳۳۲ھ میں دیکھ لیجئے کہ اس سال شیخ الاسلام

فلپائن کی دارالعلوم میں تشریف آوری کے موقعہ پر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جو خیر مقدمی تقریر فرمائی تھی اس کے بارے میں اس وقت کے منتظم اعلیٰ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی جو خود زبردست علمی پایہ کے مالک تھے، یہ لکھتے ہیں۔

''حضرت شاہ صاحبؒ جن کے علمی فضل وکمال اور فصاحت وبلاغت سے اکثر حضرات واقف ہیں، انھوں نے برجستہ عربی زبان میں ایسی تقریر فرمائی جو ان ہی کا حق تھا۔ یہ تقریر اگر ایک طرف زبان دانی اور فصاحت وروانی کے اعتبار سے بے مثل تھی تو دوسری طرف ایسے اصولِ دین، علم کلام وحدیث کے نکات اور حقائق ومعارف پر مشتمل تھی جو کم ہی کسی نے سنی ہوگی۔ مولانا نے جو مضامین بیان فرمائے وہ حقیقت میں ایسے تھے کہ دوسرا شخص گو کتنا ہی وسیع النظر اور قادر الکلام ہو متعدد مجالس میں ادا نہ کرسکتا تھا، مگر آپ کا دوسرا کمال یہ تھا کہ ان ہی مضامین دقیقہ کو نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں بہت تھوڑے سے وقت کے اندر اس طرح بیان کردیا کہ نہ فہم مضامین میں خلل واقع ہوا نہ کوئی ضروری بات فروگذاشت ہوئی اور نہ بے ضرورت اور زائد از حاجت کوئی جملہ زبان سے نکلا۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر ہفتوں سوچ کر اور عبارت کو مہذب اور منقح بنا کر کوئی شخص لکھتا اور یاد کرکے سناتا تو ایسی سلاست وروانی کے ساتھ نہ پڑھتا اور ایسی واضح وبرجستہ تقریر نہ کرسکتا تھا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ''۔

شیخ الاسلام فلپائن نے اپنی جوابی تقریر کے آخر میں قسم کھا کر فرمایا۔ آج استاذِ جلیل کے ذریعہ سے حقائق ومعارف اور علوم دینیہ کے ایسے بے بہا موتی میرے کان میں پڑے ہیں جو آج تک کبھی نہ سنے تھے۔ اور یہ مجلس ہمیشہ یادرہے گی۔ (ملخصا: از انوارِ انوری، مصنفہ: مولانا محمد انوری لائلپوری)

دوسرا واقعہ ملاحظہ ہو:

علامہ علی مصری حنبلی حافظِ حدیث دیوبند آئے اور درسِ بخاری میں شریک ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس دن ان کی رعایت سے عربی میں تقریر فرمائی۔ مہمان موصوف نے سوالات کیے اور شاہ صاحب نے جوابات دیے، بعد اختتامِ درس شیخ علی موصوف نے

طلبہ کے ہجوم میں کھڑے ہو کر فرمایا:

''میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماء و اکابر سے ملاقات کی، میں خود مصر میں سالہا سال درس حدیث دے آیا ہوں، میں نے شام سے لے کر ہند تک اس شان کا کوئی محدث اور عالم نہیں پایا۔ میں نے ان کو ساکت کرنے کی ہر طرح کی کوشش کی لیکن ان کے استحضار، تیقظ، حفظ و اتقان، ذکاوت و ذہانت اور وسعت نظر سے حیران رہ گیا اور آخر میں کہا لَو حَلَفْتُ اَنَّهٗ اَعْلَمُ بِاَبِیْ حَنِیْفَةَ لَمَا حَنِثْتُ یعنی اگر میں قسم کھا جاؤں کہ یہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں تو میں اس دعویٰ میں جھوٹا نہیں ہوں گا۔ (بیس بڑے مسلمان)

تیسری شہادت مزید بطورِ نمونہ ملاحظہ کر لیجئے:

علامہ زاہد الکوثری ترکی کے زبردست اور نامور عالم گذرے ہیں حدیث اور فقہ حنفی میں نادرہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ تصانیف آج بھی ان کی رفعتِ شان کے لیے شاہدِ عدل ہیں۔ جن دنوں قاہرہ میں جلاوطنی کے دن گذار رہے تھے، ان دنوں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بعض تصانیف کا انہوں نے مطالعہ کیا اور پھر جو فرمایا اس کے ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے فرمایا:

''احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب ''فتح القدیر'' کے بعد ایسا محدث و عالم امت میں نہیں گذرا'' (ایضا)

اور علامہ سید رشید رضا مصریؒ کی دارالعلوم میں آمد کا واقعہ تو بارہا سنا اور رسائل و مجلات میں دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب کی برجستہ عربی تقریر میں حدیث کے نادر نکات اور اختلافی مسائل فقہیہ میں حنفیہ کے دلائل کی محدثانہ ترجمانی، گویا علم و تحقیق کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اس سمندر کو جو اس وقت پیالہ میں بند کر کے پیش کیا جا رہا تھا دیکھ دیکھ کر مصر کی یہ نامور شخصیت اور شیخ محمد عبدہ کا جانشیں اپنی کرسی سے بار بار اٹھ کر یہ کہتا تھا۔

''مارأیتُ مِثْلَ هٰذَا الاستاذ الجلیل''

میں عرض کر چکا ہوں کہ اس شخص کے فضل و کمال میں شبہ نہیں کیا جا سکتا جس کے مداح اس کے بڑے اور معاصر رہے ہوں، معاصرین میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

دہلوی مفتی اعظم ہندوستان کی جلالتِ قدر اور ان کے اس انداز سے بہت سے لوگ اب بھی واقف ہیں کہ جو کہتے جچے تلے لفظوں میں کہتے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے انتقال پر تعزیتی مضمون میں ان کے تحریر فرمودہ الفاظ کو دیکھئے اور سوچئے کہ کیا ان لفظوں نے ہمارے جیسوں کے لیے کچھ گنجائش چھوڑی ہے کہ ہم شاہ صاحب کی تعریف و توصیف کرنے چلیں، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا تھا:

"آہ! قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت العلامہ الفاضل الکامل اکمل العلماء افضل الفضلاء النحریر المقدام، البحر الطمطام، رحلۃ العصر، قدوۃ الدہر، استاذ الاساتذہ، رئیس الجہابذہ محدث وحید، مفسر فرید، فقیہ یگانہ، ماہر العلوم العلوم النقلیۃ والعقلیہ مولانا سید انور شاہ قدس سرہ کو آغوشِ رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے جن کی نظیر مستقبل میں متوقع نہیں۔ طبقۂ علماء میں حضرت شاہ صاحبؒ کا تبحر، کمال فضل، ورع و تقویٰ، جامعیت و استغناء مسلم تھا، موافق و مخالف ان کے سامنے تسلیم و انقیاد سے سر جھکاتا تھا"۔ (ایضاً)

دیکھا آپ نے وہی مثال ہے کہ "قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری" یہ حضرات ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کو مبالغہ آمیز باتیں کہنے کی عادت ہو، "پیراں نہ می پرند، مریداں می پرانند" کے کاروبار میں ملوث ہوں، یہ حضرات تو خود سلطنتِ علم کے تخت نشیں تھے۔ حدیث و فقہ اور دیگر علومِ دینیہ میں خود اپنی منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کو کیا پڑی تھی کہ کسی کی خلافِ واقعہ قصیدہ خوانی کریں۔

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے علم و ورع، زہد و تقویٰ اور احتیاط و تقشف سے کون ناواقف ہے، کوردہ اور شپرہ چشم ہی ان کے نورِ علم سے چشم پوشی کر سکتا ہے، حضرت کی نظر میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا کیا رتبہ تھا اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہو جاتا ہے جو انہوں نے امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ سے کہے تھے کہ:

"اجی شاہ صاحب کے کیا کہنے، میں تو مولانا انور شاہ صاحب کے وجود کو اسلام کی

حقانیت کی دلیل سمجھتا ہوں جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ کے متعلق لکھا ہے"۔(انوار انوری، ص:۱۱۵)

سوچنے کی بات ہے کہ آخر کوئی تو وجہ تھی کہ خود حضرت شاہ صاحب کے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ ان کو علامہ جیسے وقیع لفظ سے یاد فرماتے تھے اور مسائل علمیہ میں جب کوئی دقیق مسئلہ سامنے آتا تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت فرماتے کہ کہو علامہ اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول یاد ہے۔ حضرت علامہ جواب دیتے اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ مسرت واطمینان کا اظہار فرماتے"۔(بیس بڑے مسلمان)

مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا تھا:

"میرا جیسا کم علم ان کے حالات کیا بیان کر سکتا ہے؟ البتہ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ صحابہؓ کا قافلہ جا رہا تھا یہ پیچھے رہ گئے تھے"۔ (بیس بڑے مسلمان، ص:۳۷۴)

اور بقول علامہ اقبال مرحوم:

"اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے"(ایضاً)

حاصل یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی مقبولیت اپنے دور کے عوام میں ہی نہیں بلکہ ان خواص کے دلوں میں بھی تھی جن کی خود عوام میں زبردست مقبولیت وشہرت تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی عالم کی علمی برتری اور شوکت وجلالت کی دو بنیادیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک کثرتِ مطالعہ اور دوسری قوتِ حافظہ۔ بزرگانِ سلف کے درجاتِ علمی کو ان ہی دو وصفوں کی کمی زیادتی سے ناپا اور تولا جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت کو دیکھا جائے تو ان میں یہ دو وصف نہایت نمایاں نظر آتے ہیں۔

میرا موضوع چوں کہ علم حدیث ہے اس لیے اس فن میں ہی حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مطالعہ کا اجمالی حال بیان کیے دیتا ہوں، حضرت کے شاگرد خاص حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نفحۃ العنبر میں جو کچھ لکھتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ علاوہ صحاح، سنن اور مسانید وغیرہ کتب حدیث کے تقریباً دو سو سے متجاوز شروح حدیث کا مطالعہ کیا جن میں کامل وناقص تیس شرحیں صحیح بخاری کی تھیں۔ عمدۃ القاری للعینی کا مطالعہ دورانِ تعلیم درسِ بخاری شروع

ہونے سے قبل ہی ماہِ رمضان المبارک میں کرلیا تھا۔ پھر دورانِ درس فتح الباری کا مطالعہ جاری رکھا۔ صرف صحیح بخاری کا بغیر حواشی و بین السطور کے تیرہ مرتبہ مطالعہ کیا جس میں ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ حقائق و معارف منکشف ہوئے، ہر دفعہ یہ خیال ہوتا کہ بس اب لطائف ونکات میں سے کچھ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوتا۔ اس قدر بیش بہا جواہر نمودار ہوتے چلے جاتے کہ جن کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، بالآخر یہ فرما کر سلسلہ کو موقوف کرنا پڑا کہ صحیح بخاری علوم و معارف کا ایک ایسا چشمہ ہے جو ہر دم ابلتا رہتا ہے۔

اس سے حضرت شاہ صاحب کے کثرتِ مطالعہ کا اندازہ بخوبی لگ سکتا ہے اور یہ یاد رہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ صرف کتبِ حدیث کا نہیں بلکہ ہر علم وفن کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اب لیجئے قوتِ حافظہ کی بات، تو محدثین کی اصطلاح کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ حافظ حدیث تھے۔ شہادت کے لیے واقعات تو بہت سے ہیں لیکن سردست ایک واقعہ پیش کرتا ہوں جس کا تعلق میرے موضوع سے براہِ راست ہے۔

دہلی میں ایک صاحب اپنے بارے میں حافظ حدیث ہونے کے مدعی تھے اور اسی زعم کو بنیاد بنا کر نہ صرف یہ کہ خود کسی امام مجتہد کی ائمہ اربعہ میں سے تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ تقلید کرنے والوں کی مذمت اور تضحیک کرتے رہتے تھے۔ اسی پر بس نہیں تھا بلکہ حضرات ائمہ بالخصوص حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر طعن وتشنیع کرتے تھے، یہ گستاخی یہاں تک رنگ لائی کہ مقلدین سے مناظرہ کی ٹھان لی اور چیلنج کردیا، اتفاق سے ان ہی دنوں حضرت شاہ صاحبؒ دہلی میں موجود تھے۔ آپ کو جب اس چیلنج کا علم ہوا تو جواب دہی کے لیے پہنچ گئے اور بھرے مجمع میں جا کر اس کو دعوت دی کہ فقہ وحدیث میں سے جو بات بھی دل میں آئے وہ تم پوچھ ڈالو، میں انشاء اللہ جواب دوں گا میں اس دور کا مجتہد ہوں۔ ہاں یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا ہر جواب اور اجتہاد امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کے مطابق ہوگا۔ وہ شخص چوں کہ کسی ایسے دعوے کا متوقع نہیں تھا اس لیے مبہوت اور پریشان ہوگیا۔ آپ نے مزید فرمایا: ہم نے سنا ہے کہ آپ کو اپنے حافظِ حدیث ہونے کا زعم ہے، میں پوچھتا ہوں کہ آپ کو حافظِ حدیث ہونے کا معنی بھی معلوم نہیں اور آپ نے کسی حافظِ حدیث کو دیکھا بھی نہیں، اور کتابوں کو تو

چھوڑ دو، یہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری ہے اس میں سے آپ کو کتنی حدیثیں حفظ ہیں اور اس کے کتنے علوم میں مہارت حاصل ہے۔ بولئے بخاری شریف کو آپ حفظ سناتے ہیں یا میں سناؤں؟ وہ بولے کہ آپ ہی سنایئے، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے سنانا شروع کیا اور کئی ورق سناتے چلے گئے اور پھر پوچھا کہ بس یا اور سناؤں۔ یہ منظر دیکھ کر پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا اور عالم حیرانی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت نے فرمایا سبحان اللہ لوگ حدیث وفقہ کے حافظ ہونے کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور ائمہ دین پر زبان درازیاں کرتے ہیں اور قابلیت کا یہ حال ہے جو سب کے سامنے ہے۔ وہ صاحب آخر کار وہاں سے خائب وخاسر ہو کر ایسے بھاگے کہ کسی کو نظر بھی نہ آئے۔ (نفحۃ العنبر ،ص:٦٩)

پھر ان دو وصفوں کثرتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ کا جو خاصہ ہے کہ علوم وفنون میں بصیرت ومہارت ہو یہ حضرت شاہ صاحبؒ میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ مسائل علم وفن میں تو یہ حال تھا کہ جن موقعوں پر زیادہ الجھاؤ ہے اور محققین اختلاف کے ان مواقع پر گویا آستین سونت کر اپنے اپنے دلائل سے مدِ مقابل کو پسپا کرنے میں منہمک نظر آتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ان ہی مسائل کو مختصر لفظوں میں نہایت سادگی کے ساتھ اس طرح حل فرما دیتے ہیں کہ اس کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر الجھاؤ کیا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کو اس قدر سرگردانی تھی۔

شاہ صاحبؒ کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ جن مسائل میں شارحین ومحشین خود دادِ تحقیق دے چکے ہیں ان میں اپنی یا سلف کی تحقیقات پیش کرنے کے بجائے ان ہی مسائل میں زیادہ بسیط کلام فرماتے تھے کہ جہاں عموماً شروح وحواشی میں کچھ نہیں ملتا، فیض الباری کا مطالعہ اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح رجالِ علم وفن کے بارے میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا نقد وتبصرہ اسی ڈھنگ کا ہوتا تھا جو علم وفن میں گہری نظر کا لازم ہوتا ہے۔ مثلاً شارحین بخاری میں فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے حفظ واتقانِ وسعت علمی اور روایت ودرایت میں دقتِ نظر کے بہت زیادہ مداح تھے۔ ان کو سب سے زیادہ فوقیت دیتے ہوئے ان کا ذکر حافظ الدنیا کے لفظ سے کرتے، لیکن اس کے باوجود نشاندہی بھی کرتے جاتے کہ فلاں مسئلہ میں ان سے غفلت

ہوئی، فلاں بات چھوڑ گئے۔ پھر اگر حافظ کو کسی اور کتاب میں تنبہ ہوتا اور وہاں بیان کر دیتے تو اس کی نشاندہی فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ حافظ الدنیا سے اس بات میں بھی شاکی تھے کہ حدیث میں اپنی جلالتِ قدر کے باوجود مسلک شافعی کی تائید وترجیح کی خاطر ہر صحیح وغیر صحیح سے استدلال کرتے ہیں۔ دوسری طرف علامہ عینی حنفی نے عمدۃ القاری میں حافظ کو جو جوابات دیے ہیں ان پر تبصرہ فرماتے ہوئے اور جہاں عینیؒ کی بات کمزور ہوتی اس کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی جگہ مرجح اور مضبوط جواب بتلایا کرتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس تعارف سے جہاں میرا منشاء یہ عرض کرنا ہے کہ ایسی زبردست علمی شخصیت پر کچھ لکھنے اور بولنے کے لیے اپنے اندر بھی علمی قابلیت ہونی چاہیے جس سے میں خود کو فروتر سمجھتا ہوں، وہیں دوسری غرض اس طرف متوجہ کرنا بھی ہے کہ علوم وفنون اور بالخصوص حدیث میں حضرت شاہ صاحبؒ کی بصیرت ومہارت کی صورت میں ان کی نکاتِ علمی کی کس قدر اہمیت وافادیت اور امتیاز وانفرادیت ہے۔ جس کا صحیح اندازہ اہل علم کو حضرت شاہ صاحبؒ کی کتب دیکھنے سے ہی ہوتا ہے۔ میں تو فی الحال وقت کے اختصار اور قابلیت کی کوتاہی کی وجہ سے چند چیزیں صرف بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

اہل علم اس بات سے باخبر ہیں کہ ظہر وعصر کے اوقات کے سلسلہ میں مالکیہ، شوافع اور حنفیہ کے درمیان اختلاف ہے، ایک اختلاف کی نوعیت تو یہ ہے کہ نمازِ اوّل وقت مستحب ہے یا استحباب تاخیر میں ہے۔ اس بارے میں واضح اختلاف شوافع اور حنفیہ کے ہی درمیان ہے۔

شوافع کا مسلک یہ ہے کہ دونوں نمازیں اوّل وقت مستحب ہیں جیسا کہ سوائے عشاء کے تمام نمازوں میں ان کے یہاں تعجیل ہی مستحب ہے۔

زیرِ تذکرہ دونوں نمازوں کے اوّل وقت مستحب ہونے کے لیے ان کے پاس سب سے زیادہ واضح اور قوی دلائل میں سے یہ حدیثیں ہیں:

عن عائشة قالت ما رأيتُ اَحَدًا كَانَ اَشَدَّ تعجيلاً لّلظهر من رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ولا من أبى بكر ولا من عمر (رواه الترمذى وحَسَّنَهٗ)

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے زیادہ اور ابوبکرؓ اور عمرؓ سے زیادہ ظہر کی جلدی میں سخت کسی کو نہیں دیکھا۔

نیز صرف ظہر کے سلسلہ میں یہ حدیث ہے:

وفی صحیح البخاری باب وقت الظھر عند الزوال وقال جابر کان النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصلی بالھاجرة (وھی نصفُ النھار عند اشتداد الحرّ)

عن الزھری قال انس بن مالک رحمه اللّٰہ اَنَّ رسُولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صلی الظھر حین زالت الشمس .

قال ابوعیسیٰ ھٰذا حدیثٌ صحیحٌ (وھو احسن حدیث فی ھٰذا الباب) (الترمذی)

بخاری میں باب ہے ظہر کا وقت بوقت زوال۔ حضرت جابر نے کہا کہ نبی ﷺ ہاجرہ میں یعنی سخت گرمی کے وقت نصف النہار میں نماز پڑھتے تھے۔

زہری سے مروی ہے کہ حضرت انسؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آفتاب کے زوال کے وقت ظہر کی نماز پڑھی۔

امام ابوعیسیٰ ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اور عصر کے سلسلہ میں یہ حدیث ہے:

عن عائشة قالت صلّٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم العصر والشمسُ فی حجرتھا لم یظھر الفیُٔ من حجرتھا. (ترمذی)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی جبکہ سورج (دھوپ) ان کے حجرے میں تھی، سایہ ان کے حجرہ میں نہیں آیا تھا۔

امام ابوعیسیٰ ترمذی نے تعجیل عصر کے سلسلہ میں اس حدیث عائشہ کی تعریف وتوصیف ان الفاظ میں کی ہے۔

حدیث عائشةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ وھو الذی اختارهٗ بعضُ اھل

العلم من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم منهم عمر وعبداللّٰہ بن مسعودؓ عائشةَ وانس وغیر واحدٍ من التابعین تعجیل صلوٰة العصر وکرهوا تاخیرها وبه یقول عبداللّٰہ بن المبارک والشافعی واحمد واسحاق.

حضرت عائشہؓ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اسی کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب نے اختیار کیا ہے۔ منجملہ ان کے حضرت عمر وعبداللہ بن مسعودؓ، عائشہ اور انس اور ایک سے زیادہ تابعین رضی اللہ عنہم ہیں انہوں نے عصر میں عجلت کو پسند کیا اور اس کی تاخیر کو مکروہ قرار دیا ہے اور یہی بات عبداللہ بن مبارک شافعی، احمد، واسحاق رحمہم اللہ نے فرمائی ہے۔

لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان بعض اہل العلم کے علاوہ بقیہ بعض کا تذکرہ نہیں کیا جو استحباب تاخیر کے قائل ہیں۔

بہر حال یہ شوافع کا مسلک اور اس کے دلائل ہیں، البتہ اگر مسجد میں جماعت کے لیے دور سے آنا پڑتا ہو تو پھر ان کے یہاں بھی تاخیر کی اجازت ہے، اس کے سوا ہر حالت میں تعجیل ہی کو ترجیح واوّلیت ہے۔ شوافع کے اس رجحان کا یہ اثر ہے کہ ان کے نزدیک ظہر کا وقت جلد ختم ہو کر فوراً اور جلد ہی عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے جس کی تعیین وتوقیت اس طرح ہے کہ کسی چیز کا سایۂ اصلی جو نصف النہار کے وقت ہوتا ہے اس سے زائد جب ایک مثل سایہ ہو جائے تو ظہر کا وقت ختم ہو کر عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے جب کہ مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ ایک مثل سایہ ہونے پر عصر کا وقت تو شروع ہو جاتا ہے لیکن وقتِ ظہر ختم نہیں ہوتا بلکہ بقدرِ چار رکعت نماز کے ظہر کا وقت باقی رہتا ہے اور یہ وقتِ ظہر وعصر دونوں کے درمیان مشترک ہوتا ہے۔

شوافع رحمہ اللہ کا استدلال مسلم شریف میں مذکور اس حدیث سے ہے:

عن عبداللّٰہ بن عمرو ان النّبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال اذا صلّیتم الفجر فانه وقت الی ان یطلع قرنُ الشمس الاوّل ثم اذا صلّیتم فانه وقت الی ان یحضر العصر (الی آخر الحدیث)

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم فجر کی

نماز پڑھو تو اسکا وقت سورج کی پہلی کرن نکلنے تک ہے پھر جب تم ظہر پڑھو تو اس کا وقت عصر کا وقت شروع ہونے تک ہے۔

تو اس حدیث کے الفاظ ثُمَّ اِذَا صَلَّیْتُمُ الظُّھْرَ فَاِنَّهٗ وَقْتٌ اِلٰی ان یَحضر العصر سے واضح ہے کہ ظہر کا وقت ختم ہو کر پھر متصلاً عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

اور مالکیہ کا استدلال امامتِ جبرئیلؑ والی حدیث سے ہے جس میں یہ تذکرہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے دوسرے دن ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ سایہ ایک مثل ہو گیا اور جبکہ پہلے دن ایک مثل سایہ ہونے پر عصر کی نماز پڑھائی تھی تو اس سے متبادر ہے کہ چار رکعت کے بقدر وقت دونوں نمازوں کے درمیان مشترک ہے۔ (کذا فی شرح المسلم للامام نووی رحمه الله .باب اوقات صلوٰة الخمس)

اس کے مقابلہ میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سوائے مغرب کے بقیہ نمازوں میں تاخیر مستحب ہے۔ چوں کہ یہ تاخیر تعجیل کے مقابلہ میں ہے اس لیے حاصل مسلک یہ ہے کہ اوّل وقت کو ترجیح نہیں ہے۔ اور یہ استحبابِ تاخیر بغیر کسی قید کے ہے ''جوہرہ'' اور ''السراج الوہاج'' میں اگر چہ کچھ قیدیں لگائی گئی ہیں لیکن علامہ علاء الدین الحصکفی صاحب الدرالمختار نے ان کو محل نظر قرار دیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار میں مذکورہ ہر دو کتابوں کی قیود کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تاخیر اس صورت میں مستحب ہے جب کہ نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ موجود ہو، دوسرے یہ کہ گرم علاقہ میں ہو تیسرے یہ کہ گرمی کے سخت موسم میں ہو۔ (ردالمحتار ص:۲۴۵، ج:۱)

بہر حال احناف کے یہاں تاخیر ظہر ہی مستحب ہے البتہ سردی کے دنوں میں وہ بھی تعجیل و تقدیم کو مستحب بتلاتے ہیں۔ (کما فی الدر المختار، والموطا للامام محمدؒ)

حنفیہ سب سے پہلے تو اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جس سے واضح ہے کہ ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت عصر اور مغرب کے درمیان کے وقت سے ممتد اور دراز ہے۔ حدیث یہ ہے:

عَن ابن عمرؓ عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال انما اجلکم فی اجل عن خلا من الامم مابین صلوٰة العصر الی مغرب الشمس

وانما مثلکم ومثل الیھود والنصاری کرجلٍ استعمل عُمّالا فقال من یعمل لی الی نصف اِلنھار علی قیراطٍ قیراط فعملت الیھود الی نصف النھار علی قیراط قیراطٍ ثم قال من یعمل لی من نصف النھار الی صلوٰۃ العصر علی قیراطٍ قیراطٍ. فَعَمِت النصاریٰ من نصف النھار الی صلوٰۃ العصر علی قیراطٍ قیراطٍ ثم قال من یعملُ لی من صلوٰۃ العصر الی مغرب الشمس علی قیراطین قیراطین. اَلا فانتم الذین یعملون من صلوٰۃ العصر اِلی مغربِ الشمس الالکم الا جرمرّتین فغضبتِ الیھود والنصاری فقالوا نحنُ اکثر عَمَلًا واقلُّ عَطَاءً ا. قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ فھل ظلمتکم من حقکم قالوا لا. قال اللّٰہ تعالیٰ فھل ظلمتکم من حقکم قالوا لا. قال اللّٰہ تعالیٰ فانہ اعطیہ من شئتُ .(رواہ البخاری فی باب ماذکر عن بنی اسرائیل من کتاب الانبیاء ونحوًا منہ من فضائل القرآن)

حضرت ابن عمرؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری مدت عمر (کی مثال) گذشتہ امتوں کی عمر کے مقابلہ میں عصر مغرب کے درمیان جیسی ہے اور تمہاری اور یہود ونصاری کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مزدوری پر کام لے اور یوں کہے کہ کون ہے جو آدھے دن تک میرا کام ایک ایک قیراط کی اجرت پر کرے۔ تو یہود نے آدھے دن تک کام کیا ایک ایک قیراط اُجرت پر تو پھر اس نے کہا کوئی ہے جو میرا کام کرے عصر سے لے کر غروبِ آفتاب تک دو دو قیراط اجرت پر۔ تو نصاریٰ نے نصف النہار سے نمازِ عصر تک ایک ایک قیراط کے عوض کام کیا۔ پھر اس نے کہا کوئی ہے جو میرا کام کرے عصر سے لے کر غروب آفتاب تک دو دو قیراط اجرت پر۔ تو یاد رکھو یہ تم ہی ہو جو عصر سے مغرب تک کام کرتے ہو۔ یاد رکھو تمہارے واسطے دوہرا اجر ہے۔ تو یہود اور نصاری کو غصہ آیا اور کہنے لگے کہ ہمارا کام زیادہ اور اجرت کم؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہارے (واجبی) حق میں کوئی کمی کی ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں (ایسا نہیں ہے) تو اللہ

تعالیٰ نے فرمایا (مجھے اختیار ہے کہ زیادہ اجرت) جسے چاہوں دوں۔

اس حدیث میں مذکور امت مسلمہ کی فضیلت کا حاصل یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے مقابلہ میں کم وقت اور کم مقدار عمل کے باوجود دوہرے اجر کی امت مسلمہ مستحق ہوگی، اس سے واضح ہے کہ بین العصر والمغرب کے مقابلہ میں ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت طویل اور دراز ہے اور یہ اسکے بغیر نہیں ہوسکتا جب تک کہ مسلک حنفی کے مطابق عصر کے وقت کو دومثل سایہ سے شروع نہ مانا جائے اور اس وقت تک ظہر کے وقت کو باقی قرار دیا جائے۔

اس کے علاوہ امامتِ جبرئیل والی حدیث ہے جو ترمذی میں موجود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت جبرئیل نے دو دن آکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پنج گانہ نمازیں پڑھائیں اور پہلے دن ظہر کی نماز بعد زوال اوّل وقت پڑھائی جس کے لیے لفظ یہ ہیں: حین كَانَ الفئ مثل الشراک یعنی جب سایہ تسمہ کے برابر تھا۔ مراد یہ ہے کہ سایہ دراز نہیں ہوا تھا اور عصر کی نماز ایک مثل سایہ ہونے پر اور پھر دوسرے دن ظہر کی نماز ایک مثل سایہ ہونے پر اور عصر کی نماز دومثل سایہ ہونے پر پڑھائی۔ (ترمذی باب ماجاء فی مواقیت الصلوٰۃ)

تیسری حدیث مسلم شریف کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازوں کے اوقات کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے اس کو اپنے ساتھ دو دن رہنے کی ہدایت فرمائی اور پھر پہلے دن ظہر کی نماز زوال ہونے پر پڑھائی اور دوسرے دن آپ نے تاخیر سے نمازِ ظہر کا حکم دیا اور اسی تاخیر کو پسندیدہ قرار دیا۔ الفاظ حدیث یہ ہیں: **فَـأَبـرَدَ بالظهر فابر دبها فانعم ان يُبردَ بِهَا (بـاب اوقات الصلوٰة الخمس رواية عن ابی بريدةؓ)**

چوتھی حدیث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک سفر کے دوران جب حضرت بلالؓ نے اذانِ ظہر کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا:

ابرد ثم اراد ان يؤذن فقال له اَبرِد حتّٰى رأينا فئ التلول فقال النبی صلى اللّٰه عليه وسلم ان شدة الحر من فيح جهنم فاذا اشتدّ الحرُّ فَاَبرِدُوا بالصلوٰة.

ٹھنڈا کرو پھر جب اذان دینے کا ارادہ کیا تو پھر آپ نے فرمایا کہ ٹھنڈا کرو یہاں تک کہ ہم نے ریت کی موجوں کے اندر سایہ دیکھ لیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گرمی کی سختی جہنم کے بھبکے سے ہے اس لیے جب گرمی سخت ہو جایا کرے تو نماز کو ٹھنڈا کر کے (تاخیر سے) پڑھا کرو۔

یہ حدیث قولی ہے اور اصول محدثین کے مطابق قولی حدیث کو بہر صورت ترجیح ہوتی ہے لہٰذا موسم گرما میں تاخیر ہی کو اوّلیت و استحباب حاصل ہے۔

باقی جو روایات ایسی ہیں جن سے اوّل وقت کا ثبوت ملتا ہے انکے بارے میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ یہ شروع زمانہ کی بات ہوگی بعد میں ابراد اور تاخیر ہی معمول بہا بن گئی۔

جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری، ج:۷، ص:۱۲۷ میں فرمایا ہے کہ ابراد کی مشروعیت تعجیل سے مؤخر ہے۔ اس کے علاوہ امام طحاوی کے حسبِ ارشاد حدیث مغیرہ سے اسی کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کُنَّا نُصَلّی بالھاجرۃ فقال لَنَا اَبرِدُوْا۔ (حضرت شاہ صاحبؒ حاشیہ آثار السنن)

بہر حال یہ ہے نوعیت اوقاتِ نماز کے سلسلہ میں ائمہ کے اختلاف کی، ہر مسلک کے پس پشت زبردست دلائل ہیں اور ہر ایک مکتبِ فکر کی یہی کوشش ہے کہ عمل بالحدیث کی سعادت میسر رہے، بات طویل ضرور ہوگئی لیکن اس کے بغیر ذہن اختلاف کی نوعیت اور اس کی تفصیل کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا کہ شافعی اور حنفی دونوں کی راہیں اس مسئلہ میں بالکل جداگانہ ہیں۔ اور حنفیہ کے اس مسئلہ نے بُعد میں اور بھی اضافہ کر دیا کہ وقت ظہر دو مثل ہیں۔ اور عام شہرت کے اعتبار سے اسی کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ظاہر روایت قرار دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری روایت غیر معروف اور غیر معمول بہا ایک مثل کی بھی ہے اور اس سے یہ بُعد بین المسالک کم بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ صدیوں سے مشہور چلی آنے والی بات کو معمولی انداز سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے مضبوط بنیادوں پر بات کہنے کے لیے مجتہدانہ منصب و صلاحیت درکار ہے۔ اب اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق کو ملاحظہ کیجئے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ فرمایا وہ ان ہی کا حق تھا۔

حضرت امام العصر کی یہ تحقیق جامع ترمذی پر انکی املائی شرح العرف الشذی میں ہے

جس کا اردو ترجمہ اور خُلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

جمہور اُمت نے ظہر کے اوقات کے سلسلہ میں اس بات کو لیا ہے کہ وقت ظہر کسی چیز کے بقدر اس کے ایک مثل سایہ ہونے تک ہے اور اس کے بعد سے عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے جو آفتاب اور دھوپ کے زرد ہونے سے قبل تک رہتا ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس سلسلہ میں کچھ روایات منقول ہیں ان میں جو زیادہ مشہور ہے جس کو اربابِ متون نے لیا ہے اور صاحبِ نہایہ شارحِ ھدایہ نے اسی کو ظاہر روایت بھی قرار دیا ہے وہ یہ کہ:

ا۔ وقت ظہر دو مثل سایہ ہونے تک ہے اور اس کے بعد سے عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ ابن عابدین شامی نے نہایہ کی ہی پیروی کی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ بدائع میں بصراحت کہا گیا ہے کہ آخر وقت ظہر کا ظاہر روایت میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ بدائع کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔

علاوہ ازیں میں نے بھی جامع کبیر، جامع صغیر، زیادات اور مبسوط میں آخر وقت ظہر کا ذکر نہیں دیکھا، چنانچہ علامہ سرخسی نے اپنی مبسوط میں اس کی تصریح بھی کی ہے کہ امام محمدؒ نے اپنی مبسوط میں آخر وقت ظہر سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس کے بعد امام سرخسی نے خود اس سے تعرض کیا اور دو روایتیں ذکر کیں۔

۲۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول دوسری روایت یہ ہے کہ وقت ظہر ایک مثل تک ہے اور اسکے بعد سے وقت عصر شروع ہو جاتا ہے ہماری عام کتابوں میں اس قول کے بارے میں یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ سے بذریعہ امام حسن بن زیاد مروی ہے اور مبسوط سرخسی میں ہے کہ بذریعہ محمد بن حسن مروی ہے۔

۳۔ تیسری روایت یہ کہ ظہر کا وقت ایک مثل تک ہے اور عصر کا وقت تیسرے مثل سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا مثل مہمل ہے۔ یہ روایت بطریق اسد بن عمرو منقول ہے۔

۴۔ چوتھی روایت عمدۃ القاری میں ہے اور امام کرخی نے اس کی امام ابوحنیفہ سے روایت کیے جانے کی تصریح کی ہے کہ ظہر کا وقت دو مثل سے پہلے پہلے تک ہے۔ لیکن عصر کا وقت تب تک شروع نہیں ہوگا جب تک دو مثل پورے نہ ہو جائیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان سب روایات کا حاصل یہ ہے کہ مثل اول ظہر کے ساتھ اور مثل ثالث عصر کے ساتھ مختص ہے اور دوسرا مثل دونوں میں مشترک ہے۔

اور یہ اشتراکِ وقت بعض سلف سے بھی ثابت ہے چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو عورت آخر وقت عصر میں پاک ہوئی اس کے لیے ظہر اور عصر کی قضا اور جو آخر وقت عشا میں پاک ہوئی اس پر مغرب وعشا کی قضا لازم ہے۔ تو اگر اشتراک وقت نہیں ہے تو دو نمازوں کی قضا کا کیا مطلب ہے۔ (العرف الشذی: ص:۸۹)

العرف الشذی میں مذکور محولہٗ بالا تقریر سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وقت ظہر کیلئے مثلین والی بات کو حضرت شاہ صاحبؒ قبول نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک مثل جس کو اکثر محدّثین اور ائمہ مجتہدین نے لیا ہے' اسی کو مرجح سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں تطبیق روایات اور پھر دیگر ائمہ اجتہاد سے مطابقت تو ہو جاتی ہے لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اکثر احناف اپنی کتب میں جس بات کو اپنا مسلک بتلاتے ہیں وہ ان سب سے جداگانہ بات ہے اور یہ ضرورت باقی رہتی ہے کہ اس کی تطبیق کی بھی کوشش کی جائے پھر جبکہ حنفیہ میں مشہور یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ بمعیت امام ابویوسفؒ دو مثل کے قائل ہیں اور امام محمد ایک مثل کے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خود حنفیہ میں اختلاف ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی مندرجہ بالا تحقیق سے شافعی اور حنفی بُعد تو کم ہو جاتا ہے اور مالکیہ جو صورۃً دوری تھی وہ بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے، لیکن روایات میں خود جو اختلاف ہے وہ بحالہ اس صورت میں بھی باقی رہتا ہے اور وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ کوئی متبحر فقیہ اس بُعد کو بھی دور کرے، تو حضرت شاہ صاحبؒ نے ان دو اقوال میں بھی تطبیق کی ہے اور بلاشبہ یہ بہت بڑی بات ہے۔

حضرت شاہ صاحب مولانا شوق نیمویؒ کی کتاب آثار السنن (۱) کے حواشی پر اپنے

(۱) ہمارے سامنے آثار السنن کا وہ نسخہ نہیں ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ مولانا نیموی مرحوم نے بعد تالیف وتصنیف اولاً شیخ الہندؒ کی خدمت میں اور پھر ان کے مشورے پر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں ان کے قیام کشمیر کے دوران بغرض ملاحظہ وتصحیح بھیجا تھا اور اس پر حضرت شاہ صاحب اپنے حواشی لکھ لکھ کر مصنف موصوف کو بھیجتے تھے۔ اس نسخہ کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ کاش کوئی صاحب پاکستان میں موجود مصنف مرحوم کے اہلِ خاندان سے رابطہ قائم کر کے اس نسخہ کا پتہ چلائیں اور اس سے استفادہ کی راہ نکالیں۔

قلم سے عربی میں تحریر فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ: امام ابوحنیفہؒ سے مثلین کی روایت کو امام محمدؒ نے موطأ میں بیان کیا ہے اور معلّٰی نے بواسطہ امام ابو یوسف امام ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ جب سایہ دو قامت (یعنی دو مثل) سے کم رہ جائے تو ظہر کا وقت ختم ہو جاتا ہے لیکن تاوقتیکہ سایہ دو مثل نہ ہو جائے عصر کا وقت شروع نہیں ہوتا۔ علامہ کرخی نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔ ان دونوں روایتوں کو سامنے رکھنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ ممکن ہے امام محمد کی روایت مذکورہ در موطأ کا مطلب بھی یہی ہو جو امام ابو یوسف کی روایت کا ہے کہ دوسرے مثل میں نماز ظہر کا وقت تو ہے مگر دو مثل مکمل ہونے سے پہلے پہلے تک ہے جب دو مثل مکمل ہو جائیں تو اب عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ باقی عام کتب میں جو امام حسن کی روایت ایک مثل کی ہے، جس کو مبسوط میں امام محمد کی ہی روایت قرار دیا ہے۔ اس کو اس بات پر محول کیا جائے گا کہ ایک مثل تک نماز کا وقت اختیار سے بغیر مجبوری کے پڑھنے کا ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ دوسرے مثل کا ہے تاوقتیکہ دو مثل سے کم ہی رہے لیکن اس کے بعد دو مثل پورے ہونے تک یہ وقتِ اضطرار ہے۔ جیسے مغرب میں شفق ابیض کا حکم ہے اور یہی بات حضرت ابن عمر کی روایت سے بھی متبادر ہوتی ہے۔ جس کو مسلم نے تفصیلاً اور نسائی نے اختصاراً روایت کیا ہے:

اَنَّ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال وقتُ الظھر اذازالت الشمس وکان ظلُّ الرجلِ کطولہٖ مالم تحضر العصر ووقت العصر مالم تصفر الشمس ووقتُ صلوٰۃ المغرب مالم یغیب الشمس ووقت صلوٰۃ العشآء الیٰ نصف اللیل الاوسط ووقت صلوٰۃ الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس فاذا طلعت

ہمارے سامنے تو وہ نسخہ ہے جو بعد طباعت شاہ صاحب کے پاس تھا اور اس کے حاشیہ پر یا درمیان میں شامل کردہ اوراق پر حضرت شاہ صاحبؒ کچھ نوٹ لکھتے رہتے تھے۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مجلس علمی کراچی نے تیار کی تھی۔ اس پر بہت کام کی ضرورت ہے جب کہ اس کے بہت سے حصوں کے فوٹو صاف نہیں ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے کام شروع کیا تھا۔ جو تقریباً دو سو صفحات کے اندر موجود ہے۔ کاش کوئی صاحبِ علم اس کی تکمیل کر کے شائع فرما دیں۔

الشمس فامسک عن الصلوٰۃ فَاِنَّهَا تَطَّلَعُ بَیْنَ قرنی الشَّیطن(آثار السنن، ج:۱،ص:۴۲، بحاشیه حضرت شاه صاحب مطبوعه المجلس العلمی کراچی پاکستان وسملک الهند)

عن ابی هریرة عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال من ادرک رکعةً قبلَ ان تطّلع الشَّمسُ فقد ادرک الصُّبح ومن ادرک من العصر رکعةًقبل ان تغرب الشمس فقد ادرک العصر.

اس حدیث کی روشنی میں ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعی اورامام احمد بن حنبل رحہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ جس کوعصر کی ایک رکعت قبل غروب شمس مل گئی پھراس نماز کے دوران ہی سورج غروب ہوگیااس نے نماز پوری کرلی تو وہ نماز صحیح ہوگئی۔اسی طرح صبح کی نماز میں بوقت طلوع شمس بھی یہی مسئلہ ہے،لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فجر میں یہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اگردوران نماز سورج طلوع ہوجائے تو نماز فاسد ہوجاتی ہے۔حضرات صاحبین یعنی امام ابویوسف اورامام محمد بھی اس قول میں امام صاحب کے ساتھ ہیں۔

البتہ شیخین یعنی امام ابوحنیفہ اورامام ابویوسف کے نزدیک یہ نماز نفل ہوجائے گی، بشرطیکہ بوقت طلوع درمیان نماز انتظار کرے اور بعداز طلوع دوسری رکعت پوری کردے، اگرچہ یہ روایت شاذ ہے۔امام محمد کے نزدیک کسی صورت سے نماز کومکمل نہیں ماناجائے گا بلکہ طلوع شروع ہوتے ہی اس کوخارج نماز قرار دیا جائے گا۔

حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ دوسری روایتوں سے عندالطلوع والغروب نمازوں سے ممانعت صراحۃً وارد ہے۔چنانچہ بخاری شریف کی حدیث ہے:

لاتحروا(ای لاتقصدوا) بصلوٰۃ تکم طلوعَ الشمس ولاغروبها وقال صلی اللّٰه علیه وسلم اذاطلع حاجبُ الشمس فاخروا الصلوٰۃ حتی ترتفع واذاغاب حاجب الشمس فاخروا الصلوٰۃ حتی تغیب (باب الصلوٰۃ بعدالفجر حتی ترتفع الشمس)

اور یہ ممانعت ایک علت پرمبنی ہے کہ سورج کے پجاریوں سے کسی طرح مشابہت نہ ہو

جو ڈوبتے اور نکلتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔اس لیے یہ ممانعت اصولی درجہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ برخلاف حدیث مندرجہ بالا سے مستفاد اجازت کے۔اس لیے اصولی طور پر اس مسئلہ میں ایک اور انداز سے غور کرنا ہوگا کہ کسی بھی فرض نماز کا نفس وجوب تو اس نماز کا وقت شروع ہونے سے ہوجاتا ہے۔مگر وجوبِ ادا اس نماز کو شروع کر دینے پر ہی ہوتا ہے۔یعنی جب شروع کردی تو اب اس کا پورے طور سے ادا کرنا واجب ہوگیا۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر وقت کامل میں نماز شروع کردی تو اس کی ادا بھی کامل ہی واجب ہوگی اور اگر کوئی چیز اس ادا کے کمال کو باطل کرنے والی پیش آجائے تو یہ نماز مکمل نہ مانی جائے گی۔اس کے برعکس اگر نماز کا آغاز کسی ناقص وقت میں ہوا تو ظاہر ہے کہ وجوبِ ادا بھی ناقص ہی ہوگا۔اب اگر وقت کے اندر کسی قسم کا مزید نقصان ہوجائے تو وجوب ادا پر پہلے ہی سے ناقص ہونے کی وجہ سے مزید کسی نقصان کا اثر نہ ہوگا۔لہٰذا نماز کو مکمل مانا جائے گا۔اس دو مقدماتی اصول کے مطابق اب دیکھئے نماز فجر کا کامل وقت بغیر کسی نقصان کے اس وقت تک ہے جب تک کہ سورج کا طلوع شروع نہ ہو،اب اگر قبل از طلوع نماز فجر شروع کی گئی تو ظاہر ہے کہ نماز کے لیے وقت کامل ملا۔اس لیے وجوب ادا بھی کامل نماز ہی کی ہوگی۔اب اگر درمیان نماز سورج طلوع کرنے لگے تو اس ادا کے لیے نقصان کا موجب ہوگا جو کامل واجب ہوئی تھی۔اس لیے نماز کو فاسد قرار دیا جائے گا۔اس کے برعکس نماز عصر کا وقت کامل اس وقت تک ہے جب تک کہ سورج کی روشنی متغیر نہ ہو، جب روشنی میں تغیر آجاتا ہے،تو وقت ناقص شروع ہوجاتا ہے اسی لیے اس وقت تک نماز عصر کو مؤخر کرنا مکروہ ہے اور یہ ناقص وقت بھی غروب آفتاب پر ختم ہوجاتا ہے اب اگر کسی شخص نے دھوپ کی زردی میں تغیر آجانے پر نماز عصر شروع کی تو چونکہ وقت ناقص میں نماز کا آغاز ہوا ہے اس لیے وجوبِ ادا بھی ناقص ہوگی اس صورت میں اگر وقت کے قبیل، مزید کوئی نقصان لاحق ہوجائے تو پہلے سے ہی جو وجوب ادا ناقص ہے وہ اس نقصان مزید سے بھی ناقص ہی رہے گی۔اس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ ناقص آغازِ ادا کی ناقص تکمیل ہورہی ہے،اور ظاہر ہے اس کا نام تغیر نہیں لہٰذا نماز کو ادا مان لیا جائے گا۔

باقی حدیث مذکور الصدر کے بارے میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ اس سے نماز کی

صحت ہی مستفاد ہے مگر قاعدۂ محدثین وفقہاء یہ ہے کہ اباحت وممانعت متصادم ہو تو ممانعت کو ترجیح دی جائے گی۔

اور ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ ممانعت کا حکم عام اور اصولی ہے لیکن اس حدیث میں اجازت صرف معذورین کے لیے ہے۔ جیسے کوئی سونے والا اسی وقت بیدار ہو۔ یا پھر حدیث ایسے لوگوں کے لیے ہے جن پر پہلے نماز فرض نہیں تھی، اور وہ ایسے وقت نماز کے مکلف ہوئے جب کہ صرف ایک رکعت نماز کا وقت ان دونوں اوقات میں رہ گیا، جیسے بچہ بالغ ہو یا مجنون کو افاقہ ہو یا حائضہ پاک ہو یا کوئی شخص اسلام قبول کرے تو اگر طلوع وغروب آفتاب سے قبل ایک رکعت کا بھی وقت مل گیا تو پوری نماز کا مکلف قرار دیا جائے گا۔

(کذاقال النووی فی شرح المسلم فی باب من ادرک رکعتہً الخ)

مگر بقول حضرت شاہ صاحبؒ حدیث کا محمل سب سے پہلے امام طحاوی اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں، پھر حیرت ہے کہ شوافع اس کو اپنے مسلک کی تائید میں بمقابلہ حنفیہ کیسے پیش کرتے ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے کیا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا جواب عجیب ہے اور اگرچہ یہ جواب بالکل منفرد اور نیا ہے لیکن بلاشبہ اس قبیل کی تمام روایات کو حاوی ہے۔ حضرت شاہؒ دیگر ائمہ فقہ وحدیث کی طرح اس حدیث کی تشریح صرف اسی کے الفاظ کے دائرے میں نہیں کرتے، بلکہ اس سلسلہ کی تمام روایات کے الفاظ کو ملا کر پھر تشریح کرتے ہیں تو مسئلہ بے غل وغش ہو جاتا ہے۔ حضرت کی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ یہ حدیث مسبوق کے بارے میں ہے جس کو امام کے ساتھ صرف ایک رکعت ملی ہو تو دوسری رکعت وہ ملا کر پڑھ لے۔ اس کی نماز جماعت کے ساتھ پوری ہو جائے گی۔ باقی اس حدیث میں قبل طلوع الشمس سے نماز فجر اور قبل الغروب سے نماز عصر مراد ہے نہ کہ یہ دونوں اوقات۔ مگر مقصود حکم صرف یہی دو نمازیں نہیں ہیں بلکہ ہر نماز کا یہی حکم ہے جس کی تائید درج ذیل روایات سے ہوتی ہے۔

اول بخاری ومسلم کی روایت ہے۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من ادرک رکعۃً من الصلوٰۃ فقد ادرک الصلوٰۃ.

اس حدیث کو بخاری باب من ادرک من الصلوٰۃ رکعۃً کے تحت اور مسلم باب من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ فقدادرک تلک الصلوٰۃ کے تحت لائے ہیں۔

دوم مسلم شریف کی حدیث ہے:

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من ادرک رکعۃً من الصلوٰۃ مع الامام فقد ادرک الصلوٰۃ.

امام مسلم اس حدیث کو بھی مندرجہ بالا باب کے تحت لائے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک دونوں روایات کا منشا ایک ہی ہے اور یہ واضح ہے کہ دوسری روایات مسبوق کے بارے میں ہیں۔

سوم ابوداؤد شریف کی حدیث ہے:

باب الرجل یدرک الامام ساجداً اکیفیت یصنع ؟قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذاجئتم الی الصلوٰۃ ونحن سجودٌ فاسجدوا ولاتعدوھا شیئاً ومن ادرک الرکعۃ فقدادرک الصلوٰۃ.

اس حدیث میں حسب تشریح محدثین رکعت سے مراد رکوع ہے اور یہ حدیث بھی مذکورہ دوسری حدیث کی طرح مسبوق کے بارے میں ہے۔

توجب ان تینوں روایتوں کا تعلق جماعت میں شامل ہونے والے مسبوق سے ہے تو حدیث مبحوث عنہا بھی اسی سے متعلق ہے نہ کہ فجر وعصر کے اوقات سے۔ اور اس بات کا قرینہ یہ بھی ہے کہ امام مسلم مذکورۂ بالا پہلی اور دوسری حدیث کے ساتھ اس حدیث کو بھی اسی باب کے تحت لائے ہیں جس کا تذکرہ سطور بالا میں آچکا ہے یعنی باب من ادرک رکعۃً من الصلوٰۃ فقد ادرک تلک الصّلوٰۃ. جس کے معنی یہ ہیں کہ امام مسلم ان تینوں حدیثوں کا محمل اور مدلول ایک ہی قرار دے رہے ہیں۔

اب رہ گئی یہ بات کہ یہ مسئلہ تو ہر نماز کے لیے ہے تو پھر اس حدیث میں فجر اور عصر کا ہی کیوں ذکر فرمایا گیا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا جو جواب دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں:

(۱) ممکن ہے کہ یہ حدیث اس دور کی ہو جبکہ دو نمازیں یعنی فجر اور عصر فرض تھیں باقی یہ بات کہ پھر ابو ہریرہؓ اس کے راوی کیسے ہو گئے؟ تو جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہو اور ان کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور صحابہ کا واسطہ ہو۔

(۲) آخر وقتِ نماز اتفاقی اور اجماعی طور پر صرف ان ہی دو نمازوں کا ہے۔ بقیہ نمازوں کے آخر اوقات مختلف فیہا ہیں۔

(۳) محسوس طور پر ہر خاص و عام کو ان ہی دو نمازوں کے آخر اوقات کی پہچان ہوتی ہے ورنہ دیگر نمازوں کے اختتام اور آخر وقت کی پہچان صرف اہل علم اور دقیقہ سنج حضرات کو ہی ہوتی ہے۔ ان دونوں نمازوں کے اوقات جب انتہا کو پہنچنے لگتے ہیں تو ہر ایک اس بات کو بخوبی جان لیتا ہے، اسی وجہ سے بطور خاص ان ہی نمازوں کا ذکر فرمایا گیا۔ اگر چہ اس حکم میں اور نمازیں بھی شریک ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (سورۂ ق)

البتہ حافظ ابن حجر نے بیہقی سے ایک روایت نقل کی ہے اگر اس کو سامنے رکھا جائے تو ہماری پیش کردہ یہ شرح کہ حدیث سے مراد مسبوق ہے نہ چل سکے گی۔ کیوں کہ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

من ادرک من الصبح رکعةً قبل ان تطلع الشمسُ و رکعةً بعد ما تطلع الشمس فقد ادرک الصّلوٰة. انتھی.

لیکن میں نے بیہقی کی سنن کبریٰ میں تلاش کیا یہ روایت کہیں نہیں ملی۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں اس روایت کو حافظ کے حوالے سے لیا ہے نہ کہ بیہقی کے حوالہ سے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ حافظ سے سہو ہوا ہے کہ اس کو مواقیت کی بحث میں لائے بلکہ یہ ایک دوسری حدیث ہے، فجر کی دو رکعتوں کے بارے میں آئی ہے اور امام رازی نے اس کے جملوں میں حد سے زیادہ اختصار کیا ہے ورنہ روایت کے اصل الفاظ یہ نہیں ہیں بلکہ اصل روایت اس طرح ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

مَن لَم یُصَلِّ رَکعَتَیِ الفَجرِ فلیُصَلِّھَا بَعد مَا تطلع الشَّمسُ انتھی.

یہ ساری بحث فیض الباری جلد دوم ص ۱۱۸ سے شروع ہوتی ہے، تفصیلات وہاں پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

خبر متواتر کی حقیقت اور اس کی تعریف کے سلسلہ میں اہل اصول نے مختلف تعبیرات اختیار فرمائی ہیں جس کا جامع ترین خلاصہ وہ ہے جس کی نسبت سید شریف علی جرجانی کی طرف کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے۔

جس کے روایت کرنے والے ہر زمانہ کے اندر اتنی بڑی تعداد میں موجود ہوں کہ عادۃً اتنے لوگوں کا جھوٹ پر متفق اور مجتمع ہونا محال ہو اور تعدادِ رواۃ کی یہ صورتِ حال از اوّل تا آخر ہر دور میں رہی ہو۔ جیسے حدیث: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فليتبوّأ مقعدهٗ مِنَ النَّارِ ۔اس کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک جم غفیر نے روایت کیا ہے کہ جن کی تعداد بعض حضرات چالیس بتلاتے (۱) ہیں اور بعض باسٹھ۔ اور ان میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں۔ پھر یہ تعداد آگے بڑھتی ہی چلی گئی۔،،

مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ پر جو تحقیق پیش کی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہونے کے باوجود نادر اور بے مثال ہے۔ سابق میں اس طرح کی تعریف و تقسیم کسی نے بھی نہیں کی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ امام العصر حضرت شاہ صاحب کو علم حدیث میں اصولی اور فنی اعتبار سے کس قدر بصیرت اور مہارت حاصل تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اکفار الملحدین میں اس کو لکھا ہے اور پھر بعد میں ان کے تمام منتسبین نے اپنی اپنی کتابوں میں اس کو ان کے ہی حوالہ سے لیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) تواتر اسناد: سید شریف علی جرجانیؒ کے حوالہ سے خبر متواتر کی جو تعریف اوپر ذکر کی گئی ہے اس کو حضرت شاہ صاحبؒ تواتر اسناد کا نام دیتے ہیں۔

(۲) محدثین کے طرز پر بہت سی سندوں کا لانا تو الگ رہا، اس طرز کی ایک سند بھی نہ

---

(۱) فتح الباری میں ہے کہ صحیح اور حسن کے ساتھ تیس صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) سے مروی ہے لیکن یہ راویوں کا قول ابن صلاح کا ہے۔ بعض حضرات ستر سے زائد حضرات صحابہ کو اس کا راوی بتلاتے ہیں (الرسالۃ فی فن اصول الحدیث للسید شریف علی جرجانی المنسلکۃ بالجامع الترمذی و مشکوٰۃ)

ہو، لیکن اوّل سے آخر تک طبقہ درطبقہ نقل ہو۔ جیسا کہ قرآن پاک کا تواتر ہے۔ یہ قرآن ہمارے پاس بعینہٖ وہی ہے جس کو نبی کریم ﷺ سے حضرات صحابہ نے لیا اور آپ ﷺ تک بذریعہ حضرت جبرئیل امین بصورت وحی پہنچا۔ اس میں ایک حرف کی کبھی کمی بیشی نہ ہوئی مگر ہمارے پاس اس قرآن کریم کے لیے آں حضرت ﷺ تک فلاں از فلاں کی سند نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہر دور میں مشرق سے مغرب تک لاکھوں کروڑوں انسان سینوں اور سفینوں میں محفوظ کیے رہے اور قراءت وتلاوت کرتے رہے اسی طرح ہم تک پہنچا، اور ہم سے دوسروں تک پہنچ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا دوست دشمن کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا، تو اسی کا نام تواتر طبقہ ہے۔

(۳) **تواتر عمل** :اس میں بھی محدثین کے طریقہ کے مطابق باقاعدہ بہت سی سندیں تو نہ ہوں لیکن کسی بات پر آنحضرت ﷺ کے وقت سے لیکر آج تک تسلسل کے ساتھ اتنے آدمی عمل کرتے آرہے ہوں کہ جن کا کسی غلط یا جھوٹے کام پر اس طرح عمل کرنا ممکن نہ ہو جیسے وضو میں مسواک کی سنّت، حج کے موقعہ پر نمازوں میں جمع تقدیم وجمع تاخیر، اسی طرح نماز وروزہ کی ہیئت ونوعیت وغیرہ۔

(۴) **تواتر قدر مشترک** :اس کو تواتر معنوی بھی کہا جاسکتا ہے، جس کے معنٰے یہ ہیں کہ راویوں کے الفاظ وتعبیرات ایک دوسرے سے مختلف ہوں، حتٰی کہ بیان کردہ واقعات میں بھی اختلاف ہو لیکن اس کے باوجود ایک بات ان سب میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہو جیسے جودِ حاتم کہ اس سلسلہ میں مختلف واقعات منقول ہیں اور کوئی ایک بھی واقعہ یا اس کے الفاظ متواتر نہیں۔ مگر سب کو ملانے سے یہ بات مشترک طور پر نکلتی ہے کہ وہ بہت بڑا سخی اور داد ودہش کرنے والا تھا۔ آں حضرت ﷺ کے عملی معجزات کی یہی نوعیت ہے کہ تواتر اسناد کے ساتھ شاید ہی کوئی معجزہ ثابت ہو لیکن ان سب سے بطور قدر مشترک یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ سے خوارق عادات کا ظہور ہوا ہے(۱)۔

---

(۱) اکفار الملحدین، ، از حضرت شاہ صاحبؒ، نفحۃ العنبر ، ، از مولانا یوسف بنوریؒ، ، فضل الباری، ، شرح اردو بخاری، از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔

بخاری شریف کی مشہور اور پہلی حدیث انّما الاعمالُ بالنیّاتِ میں شارحین نے طویل درطویل بحثیں کی ہیں اور اس کے مطلب کو واضح کرنے کے لیے مختلف النوع الفاظ کو بطور ,,بالنیّات،، کے متعلق بہ کے مقدر مانا ہے، جس کا تذکرہ حافظ ابن حجر نے بایں الفاظ کیا ہے:۔

فقیل تُعتبر وقیل تُکمل وقیل تُصحّ وقیل تُحصلُ وقیل تستقرُّ.

(فتح الباری ج ۱ ص ۱۱)

پھر الفاظ مقدرہ کے اختلاف کی بنیاد پر شوافع کے مابین بھی یہ حدیث معرض بحث میں آئی اور ہر ایک نے اپنے مسلک کی تائید میں قوت صرف کی لیکن حضرت امام العصر کشمیریؒ کا فرمانا یہ ہے کہ اس مباحثہ اور طویل تقریروں کا غرضِ شارع (علیہ السلام) سے کوئی تعلق نہیں ہے کیوں کہ اس حدیث میں مسائل فقہیہ بتلانے مقصود نہیں ہیں بلکہ سادہ انداز میں یہ آگاہی مطلوب ہے کہ اللہ کے نزدیک اعمال کا اعتبار نیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ظاہر میں کسی نیک عمل کو کرتے وقت ارادۂ قلبی اور دلی نیت خیر کی ہے تو وہ خیر ہے اور اگر نیت میں برائی ہے تو وہ عمل بھی برا ہے۔ مثلاً جہاد میں شرکت کا حقیقی مقصد اگر محض اظہارِ شجاعت یا دنیاوی امر میں دشمنی کی بنیاد پر انتقام لینا ہے یا مالِ غنیمت مقصود ہے اسی طرح انفاقِ مال سے مطلوب دکھلاوا اور بڑائی جتلانا ہے تو ان اعمال کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور نہ یہ قبول ہونگے۔ بلکہ مزید گناہ ہوگا کہ اعمالِ صالحہ کو ارادہ و نیت کی گندگی سے ملوث کر دیا۔

پھر چونکہ نیتوں کے اخلاص میں قوت وضعف اور زیادتی کمی کے لحاظ سے فرق مراتب ہوتا ہے اس لیے اس کے مناسب اعمال کے درجات میں بھی عند اللہ فرق مراتب ہوگا۔ حدیث کی اس سادہ تشریح کے بعد ظاہر ہے پھر کسی لمبی تقریر کی ضرورت نہیں رہتی۔ (نفحۃ العنبر ص:۵۲)

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تشریح سے واضح ہے کہ وہ اس حدیث میں لفظ تُعتَبَرُ کے مقدر ماننے کو صحیح سمجھتے ہیں جیسا کہ حافظ ابن کثیر اور شیخ عزّ الدین بن عبدالسلام نے مانا ہے(۲)،،

(۲) قال الحافظ فی الفتح وقال ابن عبد السلام الجملة الاولیٰ (ای الحدیث المذکور) لبیان مایعتبر من الاعمال والثانیة (وانما لکل امرئٍ مانوی) لبیان ما یترتب علیها. (فتح الباری، ص: ۱۲. جلد اوّل المطبعة الکبریٰ المیرتیه بولایة مصر: ۱۳۰۰ھ)

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: لیس منا من لم یتغنّ بالقرآن ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جو قرآن پاک کے ساتھ تغنّی نہ کرے۔ اس تغنّی کے معنی بر بنائے احتیاط یہ لیے گئے کہ قرآن حکیم کے ذریعے اپنے اندر غنائے نفس پیدا نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ لیکن الفاظ کی لغوی تحقیق اور جملہ کو مجموعی ترکیب سے یہ معنی بخوبی منطبق نہیں ہوتے بلکہ دیکھنے سننے والے کو کچھ تشنگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان کے معنی مراد بالکل مختلف انداز سے بتلائے کہ جو شخص قرآن حکیم کو اپنے غنا (خوش آوازی) کی جگہ نہ کردے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا ہر انسان کو چاہیے کہ گانے کے بدلے قرآن پاک کے ذریعے اپنے دل کو راحت بخشے، آگے حضرت فرماتے ہیں کہ یہ انسانی طبیعت کی خصوصیت ہے کہ جب وہ مغموم وافسردہ ہوتا ہے تو دھیان کسی گانے کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ تو شریعت مطہرہ نے تعلیم دی ہے کہ ایسی حالت میں بھی سکون قلب اور راحت کا سامان بجائے گانے کے قرآن سے حاصل کیا جائے (۱)۔

جس کی تشریح اس طور پر سمجھنی چاہیے کہ فطری طور پر جس طرح انسان کی طبیعت خوب صورتی، خوشبوؤں اور خوش ذائقہ چیزوں کو مرغوب رکھتی ہے۔ اسی طرح سلیم الطبع انسان خوش آوازی کو پسند کرتا ہے اور خاص طور پر غم والم کی حالت میں میلان طبع اس طرف ہوتا ہے کہ کسی خوش آواز نغمہ کو سن کر طبیعت بہلائی جائے۔ حدیث پاک نے اس فطری جذبہ کی رعایت سے جو فرمایا اس کا خلاصہ یہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ جو اپنے ذوقِ غنا کو قرآن میں استعمال نہ کرے بلکہ اس کی بجائے تسکینِ ذوق دوسرے گانوں اور نغموں سے کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ سبحان اللہ کتنی عجیب تشریح ہے۔

قرآن وحدیث میں غور وفکر کرنے والوں کو مختلف النوع گتھیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن کو ہر دور کے عمیق النظر ماہرین علم وفن نے سلجھانے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش اب بھی جاری ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا طرز اس باب میں ایسا حقیقت پسندانہ ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہتا ہے بلکہ ایک طرف تو مناسب موقع بات

---

(۱) فیض الباری، ص: ۱۷، جلد سوم۔

بن جاتی ہے، دوسری طرف روایات کے درمیان تطبیق ہو جاتی ہے، تیسرے اس ذیل کی مزید کچھ باتیں سامنے آ کر اضافۂ علمی کا سبب بنتی ہیں۔

مثلاً دیکھئے جامع ترمذی، مسند ابی داؤد، مسند احمد، مسند حاکم، صحیح ابن خزیمہ اور سننِ دارقطنی میں ایک حدیث مختلف حضرات صحابہ مثلاً ابن عباس، ابو ہریرہ، بریدہ، ابوموسیٰ ابوسعید، جابر، عمرو بن حزم، براء ابن عازب اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے مروی ہے۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس کی روایت کو لیکر اس کی تحسین کی ہے جس میں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کے پاس جبریلؑ نے دو مرتبہ یعنی دو دن امامت کی اور پہلی مرتبہ میں اوّلاً ظہر کی نماز پڑھی، اس کے بعد حدیث میں عصر، مغرب، عشاء اور فجر کا اوّل اوقات پنج گانہ میں، پھر دوسرے دن کی پانچوں نمازوں کی آخر اوقات پنج گانہ میں امامت کا تذکرہ ہے تو اس حدیث کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک سوال و جواب نقل کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ نے امامت کے لیے آغاز نماز ظہر سے کیوں کیا۔ نماز فجر سے کیوں نہیں کیا۔ جب کہ شب معراج میں پہلی فرض نماز نمازِ فجر ہی تھی اور بقول صاحب سیرت محمد بن اسحاق، حضرت جبریلؑ شب معراج میں صبح کے وقت ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرما رہے تھے۔ اس لیے حضرت جبریلؑ نے بیدار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر ظہر میں آ کر امامت کی۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے اور جواب دینے والے پر اصل بات واضح نہیں ہے بلکہ حقیقتِ واقعہ خلط ملط ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ التعریس کی صبح سو گئے تھے لیکن بعض راویوں نے لیلۃ التعریس ہی کو لیلۃ الاسراء (شب معراج) بتلا دیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج سے پہلے ہی سے فجر اور عصر کی نماز پڑھتے تھے۔ اس لیے آپ کو ان نمازوں کی تعلیم دیئے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاظ جاتے وقت نخلہ میں نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہری قراء،

ت کو جنات نے سنا تھا۔ بہر حال اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ آپ نماز فجر وعصر پڑھا کرتے تھے۔ البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ وہ دونوں قبل معراج فرض تھیں یا نفل۔ اکثر حضرات نفل ہی کہتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جب معراج سے قبل اور بعد اِن نمازوں کی یکساں نوعیت رہی تو پھر نفل اور فرض کا فرق کیوں قائم کیا جائے۔

نیز حافظ عماد الدین ابن کثیر الدمشقی کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں آسمان پر جاتے اور آتے بیت المقدس میں نماز پڑھی تھی، جاتے وقت تحیۃ المسجد تھی، اور آنے پر نماز فجر تھی۔

اور یہ جو بعض روایات میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نماز فجر کے وقت آئے تھے جیسا کہ دار قطنی نے ایسی روایات کی تخریج کی ہے، میرے نزدیک اس میں راوی کا وہم ہے اور اس کے یہاں حضرت جبریلؑ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم نماز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کے ایک آدمی کو تعلیم نماز (جس کا تذکرہ مسلم وترمذی وغیرہ کی احادیث میں ہے) کی بات خلط ملط ہوگئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو جو نماز کی تعلیم دی تھی، اس میں بلاشبہ سب سے پہلے نماز فجر ہی تھی۔

(حضرت شاہ صاحب کی یہ تقریر **العرف الشذی علیٰ جامع الترمذی** ص ۸۸ مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند میں موجود ہے)

حضرات! حسب تذکرۂ سابق مختصر وقت میں بطور نمونہ چند مسائل کی ہی بحث پیش کرسکا ہوں۔ ورنہ مسائل تو بہت ہیں جن میں حضرت امام العصر قدس سرہ کی اسی طرح نادر تحقیقات موجود ہیں۔ مثلاً:

(۱) مستحاضہ کی وضو ہر پنج گانہ نماز کے لیے ہے یا اس نماز کے وقت کے لئے۔ (۲) مسجد میں تھوک کا مسئلہ (۳) حدیث ذوالیدین (۴) مغرب کی فرض نماز سے پہلے نماز کی بحث۔ (۵) **اقتداء المفترض خلف المتنفل**. (۶) **اقتداء القائمِ خلف القاعدِ**. (۷) **رفع یدین**. (۸) **قرأت فاتحہ خلف الامام**. (۹) **جمعہ فی القریٰ**. (۱۰) فیض الباری جلد دوم میں ص ۱۴۱ پر اسرارِ صلوٰۃ کی عجیب وغریب بحث۔

(۱۱) الرهن مركب ومحلوب كي تحقيق. (۱۲) صوم داؤدی کومکروہ کہنے کارداور مفید بحث۔(۱۳) انبیاء علیہم السلام اور شہداء کی حیات کی بحث۔(۱۴) جہنم میں عورتوں کی کثرت والی حدیث پر کلام۔ (۱۵) یاجوج ماجوج اور سدِّ ذوالقرنین کی تحقیق۔(۱٦) ایمانِ فرعون کی بحث۔(۱۷) قضاءُ القاضی بشہادۃ الزور کا مسئلہ۔(۱۸) امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب قول ,,الایمان لایزید ولاینقص،، کی تحقیق۔

اور یہ فہرست بھی محض بطور نمونہ ایک کتاب پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہے۔ ورنہ اگر مکمل فہرست تحقیقاتِ انوری کی بنائی جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے گی۔ اسلئے سردست اسی مشہور عربی شعر پر رخصت چاہتا ہوں ؎

اولٰئِکَ اٰبَائِی فَجِئْنِی بِمِثْلِهِمْ ۞ اِذَا جَمَعَتْنَا یَاجَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

لیکن جہاں اپنے آباء پر فخر ہے وہیں اس کا قلق بھی ہے کہ ہم نہ انکے علوم سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ ذوق، کاش ایسا نہ ہوتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ اور ہندوستان کی تحریک آزادی

از: جناب مولانا سید محبوب رضوی دیوبند

کچھ عجیب سا عنوان معلوم ہوتا ہے، جو شخص سراپا علم وفضل ہو اور جس کے شب وروز درس وتدریس کی مصروفیتوں اور علمی مسائل کی گرہ کشائیوں میں گزرے ہوں، اس کا خارزارِ سیاست کی ہنگامہ خیزیوں میں حصہ لینے کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ علمی وعملی کمالات میں جو چیز حضرت شاہ صاحبؒ کو ان کے معاصرین میں ممتاز کرتی تھی، وہ مختلف علوم وفنون میں ان کی جامعیت تھی۔ علوم شرعیہ وعقلیہ میں کوئی علم ایسا نہیں جس میں انہیں کمال اور مہارتِ تامہ حاصل نہ ہو، ضبط واتقان، وُسعت مطالعہ، دقتِ نظر، جدتِ فکر، کثرتِ معلومات، ذکاوت وذہانت، فہم وفراست، تبحر علم اور استحضار میں وہ بلا مبالغہ اپنی نظیر آپ تھے۔ علماء متقدمین ومتاخرین میں ایسی جامع شخصیتیں شاذ ونادر ہی پائی جاتی ہیں۔ ایک ہوتا ہے با کمال اور ایک ہوتا ہے جامع الکمالات۔ با کمال سے اگر اس کا کمال چھین لیا جائے تو پھر اس کی شخصیت میں کچھ باقی نہیں رہتا مگر جامع کمالات کا کوئی وصف یا کمال اگر اس سے جدا کر لیا جائے تو دوسرے کمالات کے سبب سے اسکی شخصیت پھر بھی ممتاز اور نمایاں رہتی ہے۔ شاہ صاحبؒ اس طرح کی گوہر شب چراغ اور جامع کمالات شخصیت تھے، وہ اگر محدث نہ ہوتے تب بھی بہت کچھ ہوتے اور علم وفن میں ان کا اسم گرامی سرفہرست ہوتا۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی اعلیٰ تعلیم کے آخری مراحل دار العلوم دیوبند میں طے کیے تھے۔ جہاں ان کے ذہن وفکر پر آخری نقوش شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے فیضانِ

علمی کے ثبت ہوئے تھے، جن کی تحریک آزادئ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک روشن اور جلی عنوان ہے، یہ تحریک ''ریشمی خطوط'' کے نام سے موسوم ہے جس سے ہندوستان کا ہر لکھا پڑھا شخص واقف ہے، ہندوستان کے نامور عالم اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے دار العلوم دیو بند میں اپنے زمانۂ طالب علمی کی ایک دلچسپ سرگزشت ''دار العلوم دیو بند میں بیتے ہوئے دن'' کے عنوان سے بیان کی ہے۔ مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں کہ:

ایک دن میں حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت کے سیاسی مسلک کے بارے میں دریافت کیا، جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص کیفیت طاری ہے، اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت الاستاذ نے دار العلوم دیو بند کو کیا درس دیا۔ تدریس اور تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔

میں نے اپنے لیے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے حضرت الاستاذ نے دار العلوم دیو بند قائم کیا تھا۔،، (ماہنامہ دار العلوم دیو بند، مارچ ۱۹۵۳ء صفحہ ۴۲)

ہندوستان کے لیے آزادی کی جدو جہد کا یہی وہ شرارہ تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کے فیضانِ تربیت سے شاہ صاحبؒ میں منتقل ہوا اور علوم و فنون میں غایت شغف وانہماک کے باوجود وہ شرارہ رہ رہ کر ابھرتا رہا۔ ان کی طالب علمی کا آخری دور جس ماحول میں بسر ہوا تھا اس میں سیاست کے خارزار سے یکسر ان کا دامن کشاں رہنا مشکل تھا، چنانچہ سیاسی حیثیت سے شاہ صاحبؒ ہمیشہ جمعیۃ علماء ہند میں شامل اور اس کی مجلس عاملہ کے رکن رہے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے ہندوستان کی آزادی کے لیے جمعیۃ علماء ہند کی بصیرت افروز رہنمائی فرماتے رہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کو اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھتے تھے جب تک اس میں شاہ صاحبؒ کی شمولیت نہ

ہو۔ اکثر مشورے کے لیے مفتی صاحبؒ دہلی سے دیوبند تشریف لاتے رہتے تھے۔

تحریک شیخ الہندؒ کے نام سے بیسویں صدی عیسوی کے اوائل کا جو برطانوی حکومت کا سرکاری ریکارڈ سامنے آیا ہے اس سے بھی شاہ صاحبؒ کی سیاسی سرگرمیوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی جدوجہد آزادی سے پیشتر علماء کی ایک جماعت موجود تھی جس نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے لیے اپنے آپکو وقف کر دیا تھا۔ یہ تحریک حضرت شیخ الہندؒ نے چلائی تھی، کانگریس کے قائدین ابھی سو کر بھی نہ اٹھے تھے کہ یہ جماعت مسافت کا بڑا حصہ طے کر چکی تھی۔ شاہ صاحبؒ کی نسبت مذکورہ بالا سرکاری ریکارڈ میں لکھا ہے کہ:

''مولوی انور شاہ جو مدرسۂ دیوبند کے استاد اور نامور عالم ہیں جنگ بلقان کے زمانے میں انھوں نے ,,ہلال احمر،، کے لیے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا، وہ غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کے بھی حامی تھے، مولوی انور شاہ بھی اس سازش میں شریک تھے وہ مولانا محمود حسنؒ کے ہمراہ حجاز جانے والے تھے، لیکن مولانا محمود حسنؒ نے اپنے بعد ہندوستان میں قیام کرنے پر باصرار انھیں روک دیا''۔ (تحریک شیخ الہند: حصہ دوم۔ صفحہ:۳۱)

حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے تقسیم کار کا یہ وہی طریقہ تھا جو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اختیار فرمایا تھا، انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کو انگریزوں کے خلاف مسلح جدّ وجہد کے لیے مامور کیا اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کو درس و تدریس اور تعلم و تعلیم کی مسند تفویض فرمائی تھی، تاکہ علمی اور سیاسی دونوں محاذوں کو تقویت پہنچتی رہے، برطانوی سامراج کے خلاف یہ اسپرٹ ہمیشہ علمائے دیوبند میں بیدار رہی ہے اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں دیوبندی علمائے کا ایک طبقہ ہمیشہ پیش پیش رہا ہے سامراجی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور مسلمانوں میں تحریک آزادی کی روح پھونکنے کی پاداش میں علمائے دیوبند نے قید وبند کی مصیبتوں کو برداشت کیا ہے اور اس طرح مردانہ واران کا مقابلہ کیا ہے کہ راہ حق سے کبھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش مسلمانوں کے شریک ہونے کی راہ ہموار کی،

اس زمانے میں مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کانگریس میں شریک نہ تھے۔ کچھ لوگوں کو شرکت کے جواز میں شبہ تھا اور کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے، تعلیم اور دولت میں بھی مسلمان ہندوؤں سے پیچھے ہیں اس لیے اگر مسلمان کسی متحدہ جماعت میں شریک ہونگے تو ان کی ہستی پامال ہو جائیگی، اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصے تک مسلمانوں کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو الگ رہ کر اپنی جماعتی تنظیم کرنی چاہیے۔

جمعیۃ علماء ہند کے آٹھویں سالانہ اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۲۷ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کی زیر صدارت پشاور میں منعقد ہوا تھا، اس عظیم الشان اور تاریخی اجلاس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے بصیرت افروز خطاب میں جہاں متعدد اسلامی مسائل پر بحث کی ہے وہیں مسلمانوں کو برادران وطن کے ساتھ شریک کار ہو کر ملکی سیاست میں پوری سرگرمی اور جوش عمل کے ساتھ جدوجہد کرنے کی پرزور تلقین فرمائی ہے اور مسلمانوں کو جرأت مندانہ طور پر تحریک آزادی میں حصہ لینے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے استدلال کیا ہے اور اس معاہدے سے جو حضور اکرم ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ کے یہودیوں سے کیا تھا، یہ ثابت کیا ہے کہ ملک کے دفاع کے لیے اگر مسلمان غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ مل کر سیاسی جدوجہد میں حصہ لیں گے تو ان کا یہ عمل صرف سیاسی نوعیت کا نہ ہوگا بلکہ اسلام کے تقاضوں کے مطابق بھی ہوگا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں حضرت شاہ صاحب نے اس رہنما اصول کی جانب خاص توجہ دلائی ہے کہ کسی حکومت سے آزادی عطا کیے جانے کی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہیے اس لیے کہ آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت و ہمت سے حاصل کی جاتی ہے۔

معاہدۂ مدینہ کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ:

"معاہدہ کا یہ موضوع بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کا پورا پورا احترام کرے اور ایک دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو پر حملہ آور نہ ہو، ایذا دہی کو حرام سمجھے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہو، مگر دوسروں کی دل آزاری نہ کی جائے" (خطبۂ صدارت صفحہ ۸)

ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی گہرائی کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے، اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے، ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، ہندوستان کے چپّے چپّے پر مسلمانوں کی شوکت کے آثار موجود ہیں، جو زبان حال سے مسلمانوں کی وطن سے محبت کی شہادت دیتے ہیں، مسلمانوں کی موجود نسل کا تو خمیر ہی ہندوستان کی آب و گل سے بنا ہے، اس لیے مسلمانوں کو ہندوستان سے ویسی ہی محبت ہے جیسی کہ ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہئے"۔ (خطبۂ صدارت: صفحہ:۱۹)

مختلف العقائد آبادی میں صلح اور نباہ کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہر مذہب کے معتقد اپنے مذہبی عقائد و اعمال کی بجا آوری میں آزاد ہوں اور کوئی فریق دوسرے فریق کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے اعمال کو اسی انداز سے بجا لائے کہ دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے اور اسکے حقوق میں دست اندازی نہ ہو"۔ (خطبۂ صدارت: صفحہ:۳۰)

خطبے کے آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے اجتماعی تقاضوں کا جائزہ لیا ہے، چنانچہ ہندوستان میں دار القضاء کے فقدان اور اس کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ بہت سے ایسے امور ہیں جن میں شرعی فیصلے کی ضرورت ہے اور دار القضاء کے بغیر وہ نافذ اور جائز نہیں ہو سکتے، نکاح و طلاق اور خلع و میراث کے بہت سے معاملات ہیں جن کے جاری اور نافذ کرنے کے لیے علماء کے ہاتھوں میں طاقت کا ہونا ضروری ہے اور اس کا واحد حل دار القضاء کا قیام ہے۔

شاہ صاحبؒ نے خطبے میں اصلاحِ رسوم کے عنوان سے ان امور کی جانب بھی توجہ دلائی ہے جن کے مسلم معاشرے میں جڑ پکڑ لینے سے مسلمان معاشی اور اقتصادی پریشانیوں میں گھر گئے ہیں، ان میں شادی اور غمی کی قبیح رسمیں، لڑکیوں کی شادی پر تلک لینے کی رسم، سود پر قرض حاصل کرنا، اوقاف کی تنظیم و تحفظ اور اوقاف کی آمدنی کا صحیح استعمال وغیرہ امور شامل ہیں۔

غرض کہ شاہ صاحبؒ کے خطبۂ صدارت میں نہ صرف ملک کے سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ مسلم معاشرے کے معاشی اور اقتصادی مسئلے پر مسلمانوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے جو چیزیں

ضروری ہوسکتی تھیں ان سب کا پوری بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، اس لیے شاہ صاحبؒ کا یہ خطبہ ایک بڑی قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں جب گاندھی جی نے نمک پر لگائے گئے محصول کے خلاف اپنی تحریک شروع کی تو انھیں شاہ صاحبؒ کی رہنمائی سے بڑی مدد ملی تھی، اس کی تفصیل یہ ہے کہ نمک پر لگائے گئے محصول کے خلاف عوام میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی اس محصول کو ختم کرانے کے لیے گاندھی جی نے ایک مستقل تحریک چلائی اور اس کے لیے گجرات کا دورہ شروع کیا، اس دورے کی آخری منزل گجرات کا ڈانڈی نامی گاؤں تھا، اس لیے یہ دورہ ڈانڈی مارچ کے نام سے موسوم ہے، گاندھی جی نے اس تحریک کا آغاز تو کر دیا تھا مگر ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ ان کے اس عمل کے لیے مذہبی اور اخلاقی جواز ہونا چاہیے، گاندھی جی کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے ہر کام کے لیے ہردَے یعنی ضمیر کی آواز کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے جس کو اپنے الفاظ میں ''ہردَے کی آواز،، سے تعبیر کیا کرتے تھے، چنانچہ اس موقع پر بھی گاندھی جی ذہنی خلش محسوس کررہے تھے اور ہردے کی آواز کے منتظر تھے کہ انھیں اخبارات کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ ہندوستان کے ایک ممتاز عالم حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے لاہور میں ''انجمن خدام الدین'' کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث بیان کی ہے جس میں تین چیزوں پانی، گھاس اور نمک کو مباح الاصل بتایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حکومت پانی، گھاس اور نمک پر ٹیکس نہیں لگا سکتی۔

اس زمانے میں شاہ صاحبؒ کا قیام گجرات کے مدرسہ ڈابھیل میں تھا۔ گاندھی جی ڈانڈی کی جانب مارچ کرتے ہوئے جب ڈابھیل کے قریب سے گزرے تو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی گاندھی جی سے ملنے اور مارچ میں شریک ہونے کے لیے پہنچے، گاندھی جی کو معلوم تھا کہ یہ دونوں حضرات شاہ صاحب کے شاگرد ہیں گاندھی جی نے انھیں دیکھ کر کہا کہ ''آپ لوگوں کے استاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے نمک کے متعلق جو حدیث بیان کی ہے آپ اس حدیث کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مجھے دے دیں''۔ جب یہ حدیث گاندھی جی نے دیکھی تو انھیں بڑی خوشی ہوئی اور بولے کہ

میں نے نمک سازی کے لیے جو تحریک شروع کی ہے اس کے لیے میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی روحانی اور باطنی مدد ملنی چاہیے، اس کے لیے مجھے بڑی بے چینی تھی۔ میرا ہردَے اطمینان کی تلاش میں بے چین تھا، اب مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی بیان کردہ حدیث سے معلوم ہوا کہ میرے اس کام کو پیغمبر اسلام ﷺ کی تائید حاصل ہے، اور میرے ساتھ ایک بڑی روحانی اور آسمانی امداد شریک ہے۔ اب مجھے اپنے کام کی سچائی کا پورا پورا یقین ہو گیا ہے۔

گاندھی جی اس کے بعد اس حدیث کا ترجمہ شاہ صاحبؒ کے حوالے سے اپنے انگریزی اور ہندی اخبار ''ینگ انڈیا'' اور ''نوجیون'' کے پہلے صفحے پر شائع کرتے رہے۔

اگرچہ شاہ صاحبؒ کو اپنی علمی اور درس و تدریس کی مصروفیتوں کے سبب سے عملی طور پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور سیاسی میدان میں تگ و تاز کا موقع نہ مل سکا مگر وہ اپنی دانش و تدبیر اور فکر و نظر سے ہندوستان کے سیاسی قائدین کی ہمشہ رہنمائی فرماتے رہے، جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ مجلس احرار اسلام کے رہنماؤں کو بھی ہمیشہ شاہ صاحبؒ کی فکری بصیرت اور سرپرستی حاصل تھی اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسوں کو اسوقت تک کامیاب نہیں سمجھتے تھے جب تک شاہ صاحبؒ شریک نہ ہوں۔

ہندوستان کے نامور مجاہدین آزادی

مولانا ظفر علی خان	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری
مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی	چودھری افضل حق
مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی	مولانا نورالدین بہاری
مولانا عبدالحنان ہزاروی	قاضی احسان احمد شجاع آبادی

یہ سب حضرات دین و سیاست کی بڑی بڑی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان میں اکثر حضرات شاہ صاحبؒ کے براہِ راست شاگرد تھے اور چند جو باقاعدہ شاگرد نہیں تھے وہ آپ کے حلقۂ علم و فکر میں زیر تربیت رہ چکے تھے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کا ذوقِ سخن گوئی

(از: جناب مولانا محمد ابراہیم (ایم،اے) پروفیسر عربی گورنمنٹ ڈگری کالج اسلام آباد کشمیر

کاملِ شعر وادب انور شہ کشمیر بود ❁ زان سبب ماہر اداین محفلی بریا کنیم
مرد عالم بود فاضل، بود مرد نکتہ دان ❁ از وصف او کمال خویش را انشا کنیم

فارسی زبان کی مشہور کہاوت ہے ,,شعر مرا بمدرسہ کے بردند،، اس مقولے کے پیش نظر علماء اور شاعری دو متضاد شے خیال کی گئی ہیں۔ غالباً ایسا اس لیے ہے کہ شعروسخن کے متعلق علماء کا نقطۂ نظر قنوطی، خشک اور بے لچک ہے۔ علم تقشف اور عبوسیت کا مقتضی ہے جبکہ شعروسخن سے منافرت کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دینی انہماک انھیں اتنی مہلت نہیں دیتا کہ کبھی کبھار کتاب دل کا کھولکر مطالعہ کر سکیں۔ فقہی جزئیات اور مسائل میں الجھاؤ کم از کم ذوق سخن کے حق میں رکاوٹ ضرور بن جاتے ہیں۔ شاعر ایک خیالی انسان ہوتے ہوئے اپنی ایک ایسی خیالی دنیا آباد کرتا ہے جو اصلی وحقیقی دنیا سے بدرجہا بہتر اور خوب صورت ہوتی ہے۔ لیکن زندگی کی یہ سیمائی تصور علم کے لیے نا قابل برداشت ہے۔ وہ تو ظاہر کا دلدادہ ہے اور باطنیت اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ علاوہ ازیں علمائے کرام قال اللہ وقال الرسول سے اتنی فرصت نہیں پاتے کہ کتابِ دل کی طرف توجہ کر سکیں۔ اس موقف کے اختیار کرنے کے سلسلے میں غالباً علماء کے روبرو شعروشاعری کے متعلق قرآنی مذمّت بھی رہتی ہوگی۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس مشہور شعر کے ذریعہ ؎

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو ☆ یہ دل کی موت، وہ اندیشۂ ونظر کا فساد

عالم کو فساد نظر اور اندیشہ کہا تھا، لیکن میرے خیال میں دل کی موت میں فلسفی اور ملاّ دونوں شریک ہیں۔ دونوں کے جذباتِ لطیفہ سرد اور بے کیف ہوتے ہیں۔ غالباً اسی حقیقت کے پیش نظر کسی عالم نے کہا تھا ؎

وَلَولاَ الشِّعْرُ بِالعلماءِ یُزرِی ۞ لکنتُ الیومَ اشعرَمن لبیدٖ

یعنی اگر شعروسخن علماء کے لیے معیوب نہ ہوتے تو آج میں لبید سے بھی زیادہ بڑا شاعر ہوتا۔ (لبید سبعہ معلقہ کا سب سے مغلق اور گہرا شاعر ہے)

بہرکیف علماء دین کے شعروسخن سے منافرت کے جو بھی اسباب ہوں یہ امرواقعی ہے کہ مولانا وبالفضل اولینا حضرت علامہ محمد انورشاہ صاحب کشمیری اس کلیہ سے ضرور مستثنیٰ تھے۔ آپ اگر ایک طرف دورِ حاضر کے جید عالم دین، مصنف، مفکر زاہد ومتقی اور کامیاب مفسر ومحدث اور استاذ تھے، تو وہیں ذوق سخن بھی استاذِ ازل کی طرف سے ساتھ لائے تھے۔

حضرت مولانا انورشاہ صاحب مرحوم نے مذہبی اور دینی علم کی طرح ذوق سخن بھی ورثہ میں پایا تھا۔ بقول ڈاکٹر قاری رضوان اللہ صاحب مولانا کے والد ماجد مولانا معظم شاہؒ اور تین بھائی محمد یاسین شاہ، مولانا سیف اللہ شاہ اور عبداللہ شاہ فارسی کے اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک طرف مولانا کی طبع رسا اور دوسری جانب گھریلو ماحول دونوں مل کر شعروسخن کے حق میں سونے پر سہاگہ بن گئے۔ اسی لیے ہم مولانا انورشاہ صاحب کشمیریؒ کو فاضل دینیات وقرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ فاضل ادب وشعر بھی پاتے ہیں۔ آپ کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ وافی وکافی اور ذہن رسا تھا۔ مولانا کو قرآنی آیات، احادیث نبوی ﷺ اور فقہی جزئیات کے ساتھ ساتھ عربی وفارسی زبانوں کے بیشتر اشعار ازبر تھے۔ موزونیت طبع کا یہ عالم تھا کہ طویل سے طویل منظومات فی البدیہہ اور بے ساختہ آپ کی زبان گوہر فشاں سے منظوم ہوجایا کرتی تھیں۔

مولانا کی شاعری کا بیشتر حصہ عربی وفارسی میں طبع رواں کا یہ حال تھا کہ ۱۹۲۷ء میں جب والیٔ دکن نظام حیدرآباد دہلی تشریف لائے تو مولانا نے پندرہ اشعار کا ایک عربی قصیدہ فی البدیہہ منظوم کردیا۔ یہ قصیدہ ۲۱ردسمبر ۱۹۲۷ء کے اخبار مہاجر میں، دہلی میں شائع ہوا۔ آپ کا ذوق ادب اور سخن گوئی اس قدر شدید تھا کہ بقول مولانا ازہر شاہ صاحب ۱۳۴۰ھ میں جب شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی مرحوم نے نادیۃ الادب کے نام سے دارالعلوم دیوبند میں ایک ادبی انجمن قائم کی جس میں اساتذہ دارالعلوم دیوبند اور اہل ذوق

اپنا کلامِ بلاغت نظام پیش کیا کرتے تو مولانا بلا استثناء اس محفل کے میر مجلس ہوا کرتے تھے۔ خود بھی اشعار قلم بند کرتے اور دیگر اہلِ ذوق کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ ایسے بہت کم حضرات ہوں گے جو مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کے نام سے ناآشنا ہوں۔ موصوف علمی حلقوں میں مثنوی مولانا روم اور دیوانِ حافظ کی اردو شرح کے ذریعہ کافی سے زیادہ نام پیدا کر چکے ہیں۔ مولانا کے زمانے میں قاضی صاحب دارالعلوم دیوبند میں طالب علم تھے۔ ان ہی دنوں اتفاق سے مسیح الملک حکیم اجمل خانؒ دارِ فنا سے دارِ بقا کو سدھار گئے تھے۔ عالم اسلام خصوصاً مسلمانانِ ہند غم میں ڈوب گئے تھے۔ انھوں نے حکیم صاحب کی وفات حسرت آیات پر عربی میں ایک طویل مرثیہ لکھا۔ اس کی اصلاح مولانا انور شاہ صاحبؒ نے کی اور بہت سے اشعار اپنی طرف سے خود بھی داخل کر دیئے۔

ایک موقعہ پر قادیان کے مولویوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ وہ علمائے دیوبند سے عربی زبان میں مناظرہ ومباحثہ کریں گے۔ علماء دوڑ کر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کشمیری کے پاس آئے اور ان سے اس فرقے کے علماء کے مقابلہ پر آنے کی درخواست کی۔ مولانا نے ان کا چیلنج نہ صرف قبول کرلیا بلکہ فرط جوش میں آ کر کہا کہ یہ مناظرہ نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ہوگا۔ واقعہ کے راوی مولانا محمد انور لائل پوریؒ رقمطراز ہیں کہ اس فرقے کے علماء سن کر میدان سے ہٹ گئے۔

ذوقِ سخن کے ساتھ ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے جنھیں تقریر وتحریر میں مناسب اور برجستہ پیش کر دیا کرتے تھے۔ زبان وبیان کا حسن دوبالا ہو جاتا تھا۔ اس پر ترنم غضب کا پایا تھا۔ سوز وگداز جلا تھی۔ ترنم اور حسن آواز کی بدولت شعر شرابِ دوآتشہ ہو جاتا تھا جس میں سے سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ادبی ذوق کے پیش نظر عبارتیں بھی مقفیٰ ومسجع زبان دُرفشاں سے نکلتی تھیں۔ اس چیز کے پیش نظر مولانا نے حریری کی مقامات کے تتبع میں اپنی مقامات لکھی تھی جس میں کچھ مقامات بے نقطہ اور کچھ مقامات با نقطہ الفاظ کے تھے۔ الفاظ پر عبور اور مہارت کے پیش نظر بیسویں صدی میں مولانا نے دور اکبری کے مشہور شاعر وعالم فیضیؔ فیاضی کی یاد تازہ کر دی تھی جس نے قرآن پاک کی بے نقطہ تفسیر ''سواطع

الالھام" کے عنوان سے لکھ کر اپنی بے مثال عربی دانی کا آج تک سکہ بٹھا رکھا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق پندرہ ہزار سے زیادہ اشعار موزون کیے لیکن دستیاب اتنے نہیں ہیں۔ اس تعداد سے گیارہ سو پچپن اشعار خالص عربی کے اور باقی کا تعلق فارسی سے ہے۔

عربی نظم کے سلسلے میں اگرچہ مولانا کا رجحان موعظت و پند، اخلاقیات و دینیات کے موضوعوں کی طرف ہے، تاہم طبیعت کا اصلی جوہر نعوت ختم الرسلین صلی اللہ علیہ وسلم میں کھلتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے ہیئت اور موضوع کے بہت سے قیمتی اور بیش بہا تجربے کیے ہیں اور نئی بحور اور اوزان اختیار کر کے عربی شعر و ادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ کہیں قدیم اساتذہ کا اتباع ملتا ہے خاص طور پر شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ کا۔ چنانچہ مولانا کی ایک نعت شیخ کے اس مشہور و معروف شعر پر مبنی ہے:۔

شفیعٌ مطاعٌ نبیٌّ کریم ☆ قسیمٌ، جسیمٌ، نسیمٌ، وسیم

اسی زمین میں مولانا کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ (بحر متقارب مقبوض ہے)

صبیحٌ، ملیحٌ، مطیبُ الشمیم ✿ غیاث الوریٰ مستغاث الھضیم
مفاض الجبین کبدرٍ مبین ✿ قسیمٌ، جسیمٌ، نسیمٌ، وسیم
احیدٌ، وحیدٌ، مجیدٌ، حمید ✿ وخیر البرایا بفضل جسیم
واسریٰ بہ ربُّہٗ فی والسماءِ ✿ کنورٍ تجلّٰی بلیل بھیم
واٰتاہ ماشاءہٗ من عُلا ✿ وعزٍ عزیزٍ، حیاۃٍ قویم
فیارب صَلِّ وسلم علیہ ✿ شفیعٌ، مطاعٌ، نبیٌّ کریم

ترجمہ :ا: آپ خوبصورت، حسین اور عمدہ خوشبو والے ہیں، مخلوق کی جائے پناہ اور ٹوٹے ہوئے کی فریاد کو پہنچنے والے۔

۲: چودھویں رات کے روشن چاند کی طرح کشادہ پیشانی والے، خوبصورت، حسین عمدہ جسم والے اور صاحب نشان۔

۳: یگانہ و یکتا، عمدہ اور قابل تعریف اور خدا کی شاندار مہربانی سے تمام مخلوق سے بہتر۔

۴: آپ کا پروردگار آپ کو آسمانوں میں راتوں رات لے گیا۔ اس نور کی طرح جو کالی رات

میں چمکے۔

۵:اور اپنی منشا کے مطابق آپ کو بلندی، عزت اور قائم رہنے والی زندگی عطا کی۔

۶:اے پروردگار! آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور سلام بھیج، کیونکہ آپ سفارش کرنے والے، قابل اطاعت، عزت والے پیغمبر ہیں۔

نعت مذکورہ چوبیس اشعار کی ہے اور ہم نے یہاں بطور اختصار صرف چھ اشعار پر اکتفاء کیا ہے۔ ایک اور عربی نعت ۴۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے جس والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بہت کم نعتیہ قصائد میں ملتی ہے۔ یہاں چند اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

برقٌ تألق موهناً بالوادی ۞ فاعتاد قلبی طالع الانجادِ

شمس الضُحٰی بدر الدجٰی صدر العلٰی ۞ علم الهدٰی هو قدوة للقادی

ختم النبوةَ والرسالةَ انّها ۞ بدئت بهٖ ختمت بهٖ لمعادِ

والافصح الامّی اصدق لهجةً ۞ ممّن تکلّم باللسانِ الضادِ

وافی شهیدًا منذرًا اومشیرًا ۞ مِن ربّهٖ بالوعدِ والایعادِ

قد جاء والدّنیا علٰی ظلماتها ۞ والجهل والبؤس علٰی اعتادِ

فتحت بهٖ غلف القلوب وبصرت ۞ عمی العیون بسنّة وسدادِ

ثمّ الصّلوٰة مع السلام علی النّبی ۞ والہٖ مع صحبهٖ الامجادِ

ترجمہ :ا۔ہدایت کی بجلی رات کے وقت وادی میں چمکی جس کا میرا دل جو بلندیوں پر چڑھتا ہے، عادی ہو گیا۔

۲: آپ چاشت کے سورج، اندھیریوں میں چودھویں رات کے چاند، بلندیوں کے صدر، ہدایت کے جھنڈے اور رہنماؤں کے رہنما ہیں۔

۳: آپ نے نبوت اور رسالت کو ختم کر دیا، یقیناً وہ آپ ہی سے شروع ہوئی اور قیامت تک آپ ہی پر ختم ہو گئی۔

۴: باوجود امّی ہونے کے بہت بڑے فصیح یعنی اعلیٰ بیان تھے اور ان تمام لوگوں میں جو حرفِ

ضاد کا تلفظ کرتے ہیں، سب سے زیادہ صادق القول۔

۵: آپ نے بحیثیت گواہ، ڈرانے والے اور خوش خبری دینے والے کے اپنے رب کی طرف سے وعدے اور وعید کو پورا کر دیا۔

۶: آپ ایسے وقت تشریف فرما ہوئے جب دنیا تاریکیوں میں مبتلا تھی، اور جہالت اور سختی کے باعث لوگ سرکشیوں پر آمادہ تھے۔

۷: پھر درود اور سلام نبیؐ، آپ کی اولاد اور بزرگ صحابہؓ کرام پر ہو۔

مولانا کی عربی شاعری میں نعت کے بعد جس موضوع نے خاص طور پر اہمیت حاصل کی ہے، وہ فقہی اور دینی مسائل ہیں۔ مولانا کا عہد پنجاب میں ایک جدید مذہبی فرقے کی نشو ونما سے لگا کھاتا تھا۔ پنجاب اور ہندوستان اس وقت مذہبی مباحث کر گرفت میں شدت سے مبتلا تھا۔ ہر طرف سے ختم النبوت کی صدائیں بلند تھیں ایک اچھے اور کامیاب سخن گو کی طرح آپ بھی اپنے ماحول سے دامن نہ چھڑا سکے۔ اسی پس منظر میں آپ نے ''صدع النقاب عن جسامة الفنجاب'' کے عنوان سے ستر اشعار کا ایک قصیدہ قلم بند کیا جس میں ختم نبوۃ کے مسئلے کو دلائل و براہین سے عالمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مذہبی مباحث کے سلسلے میں ایک اور نظم ''ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم'' لکھی جو چار سو اشعار کی ہے اور جس میں حدوث عالم، وحدت الوجود، اثبات واجب، جعل بسیط اور جعل مرکب سے عالمانہ و فلسفانہ بحث کی گئی ہے۔

ایک اور صنف سخن جس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے خصوصیت کے ساتھ طبع آزمائی کی، مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ خیالی نہیں عملی ہے۔ ۱۳۳۹ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے شفیق استاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کا انتقال پُر ملال ہو گیا تو ایک وفادار شاگرد کی حیثیت سے آپؒ نے شیخ الہندؒ کا فصیح و بلیغ عربی میں ایک دردناک مرثیہ لکھا جو ۷۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ مرثیہ کی خوبی یہ ہے کہ اس سے شیخ الہندؒ کی تاریخ وفات بھی مستفاد ہوتی ہے۔ اس سے حقیقت نگاری اور اس شدید جذبے کا پتہ لگتا ہے جو آپ کو اپنے استاد سے تھا:

فقا نبک من ذکریٰ مزارِ فند معا ❁ مصیفاً و مشتیً ثم مرأیً و سمعًا

قد اختفه الالطاف عطفاً وعطفةً ۞ وبورک فیہ مربعاً ثمّ مربعاً

وان کان ممّا لیس یشفی ویشتقی ۞ بشیٔ ولکن خلّ عینیک تدمعاً

نہضت لأرثی عالماً ثمّ عالماً ۞ حدیثاً وفقہاً ثمّ ماشئتُ اجمعاً

ومولی الوریٰ محمود ھم وحمید ھم ۞ مسند ھم فیما رویٰ ثمّ اسمعا

ولم ارمثلَ الیومِ کم کان باکیاً ۞ وما کان دمع القوم دمعًا مضیعًا

سقی اللّٰہ مثواہُ کرامة دیمة ۞ وکان غداً الی شافعاً ومشفعاً

ترجمہ:(۱)اے میرے دودوستو!ٹھہر جاؤ،ہم مزار کی یاد میں آنسو بہالیں،گرمیوں میں بھی اورسردیوں میں بھی،غائبانہ بھی اورآنکھوں کے سامنے بھی۔

(۲) اس قبر کوالطافِ خداوندی نے مہربانی سے چھپالیا ہے اور ہر موسم بہار میں ان میں برکت دی جاتی ہے۔

(۳)اگرچہ مرحوم پر یہ غم کسی چیز سے شفانہیں دیگا۔تاہم تو اپنی آنکھوں کوآنسو بہاتا چھوڑ دے۔

(۴)میں اس لیے اٹھاتا کہ ایک عالم اور عالم،محدث فقیہ اوران کے علاوہ جوبھی وصف چاہے گامرثیہ کروں۔

(۵)ان کامحمودمخلوق کا آقااور پسندیدہ تھا۔مسموع اورروایتی چیزوں میں ان کی سند۔

(۶)میں نے آج جیسا کوئی دن نہیں دیکھا،جس میں کتنے رونے والے تھے،اوراس دن رونے والوں کے آنسو بیکارنہیں گئے۔

(۷)خدااس کے ٹھکانے کوسخاوت کی بارش سے سیراب کرے جوکل روز قیامت میری شفاعت کرے گا۔اور یہ شفاعت قبول بھی ہوگی۔

عربی کے بعد فارسی کلام کی نوبت آتی ہے۔ان کی دستیاب تعداد ۱۳۲۶اشعار ہے۔ ان میں تین نعتیں،تین اورقطعات شامل ہیں۔علاوہ ازیں کچھ تاریخیں بھی ہیں جومولانا نے بعض جلیل القدرہستیوں کی وفات حسرت آیات پرلکھی ہیں اورجن سے مادۂ تاریخ وفات نکلتا ہے۔کچھ قصائدعمائدین اسلام کی مدح میں ہیں۔ایک قصیدہ امیرامان اللہ خان والیٔ کابل کی تعریف میں ہے اور۱۱۵ابیات پرمشتمل ہے کچھ منظومات فقہی ودینی مسائل پر ہیں

خاص طور پر علم میراث نے آپ کی طبع شاعرانہ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

مولانا کے کلام کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ سخن میں خیال آرائی کے بجائے واقعیت اور حقیقت نگاری کو پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شعر دل بہلائی نہیں بلکہ مفید مطلب باتیں کرنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کے یہاں ایسے موضوعات پر طبع آزمائی بکثرت دیکھیں گے جن کی اہمیت سماجی ہے حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ بنیادی طور پر عالم دین تھے، شاعری کی طرف وہ دوسرے درجہ پر آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کے کلام میں ایسے رجحانات پائیں گے جن کی حیثیت مذہبی اور دینی ہے، ادیب اور شاعر اپنی فطری اور ذہنی افتادِ طبع سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مولانا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ آپ کے شاعرانہ کلام میں نثر کی طرح دینیات اور فقہی مسائل کی گہری چھاپ ہے۔ یہ بات ان کے آرٹ اور فن کے حق میں زیادہ اچھی ثابت نہ ہوسکی، کیونکہ فقہی جزئیات جس عمدگی سے نثر میں بیان ہوسکتے ہیں، شعر کی قبا ان کے لیے کسی قدر تنگ ہے۔ شاید مطالعہ کنندگان کو وہ لطف وشیرینی محسوس نہ ہو جو عموماً غزل گوئی شعراء کے کلام سے ہوتی ہے۔ ایسا ہونا ایک فطری امر ہے کیونکہ دینی مسائل اور فقہی جزئیات، جام وساقی پیمانہ اور صراحی کی گرفت سے یکسر باہر ہیں۔ مولانا نے ان مضامین کو شعر وسخن کے قالب میں اس لیے ڈھالا تاکہ یہ واضح کردیا جائے کہ وہ اس میدان کے بھی صحیح اور حقیقی معنوں میں مرد تھے۔

مولانا کی شاعری میں عشق ومحبت کی چاشنی قطعاً نہیں۔ اس کے برعکس شریعت وطریقت کے ٹھوس مسائل کا بیان ہے۔ ہمارے عربی وفارسی شعراء جو قصائد کے آغاز میں کسی خیالی محبوب یا محبوبہ سے تشبیب یا اظہار عشق کے قائل ہیں اور اس کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے، مولانا روایتی شاعری کی ان جکڑبندیوں سے قطعاً آزاد ہیں۔ آپ نے عربی وفارسی شعروادب کی قدیم روایت کو ترک کرکے اپنے لیے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ شعروسخن کے رحمانی جذبے کو بے سود اور لاطائل خیالات میں صرف کرنے کے بجائے مفید مطلب مضامین میں لگایا۔ اسی میں آپ کے فن کی پختگی کا راز ہے۔ مولانا نے اپنے کلام کے ذریعہ شاعری کو الفاظ کی مناسب نشست، تک بندی اور بے سود قافیہ پیمائی کے بجائے

اسے بامقصد بنایا۔ غالباً اسی لیے آپ ان کے یہاں خیالات کے پیچ وخم کے بجائے سیدھا سادا اور فطری لب ولہجہ اور اندازِ بیان پائیں گے۔ آپ نے وزن وقافیے کی قبا میں فقہی مسائل، احادیث نبوی، دوست واحباء کے مراثی اور نعوتِ سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والسلام منظوم کیں اور جو مقصد نثر سے لیا جاتا ہے، نظم سے لے لیا اور اس طرح شعروسخن کی بنیاد تخیل کے بجائے واقعیت واصلیت پر رکھی۔

مولانا کی نعوت اور فارسی تاریخیں اکثر قدماء کے انداز میں ہیں اور اس طرح ان میں متبعانہ پہلو زیادہ ہے۔ مراثی میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے مرثیے میں "قفانبکِ مِن ذکری مزارِ فندمعا" کے الفاظ مشہور جاہلی شاعر امرء القیس کی یاد دلاتے ہیں جس نے اپنے قصیدہ کا آغاز تقریباً ان ہی الفاظ سے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کیا ہے۔ بلاشبہ مولانا کے عربی وفارسی کلام میں بالعموم تقلیدی رنگ نمایاں ہے۔ تاہم کہیں کہیں جدید خیالات بھی مل جاتے ہیں۔ اور اس وقت یقیناً مولانا کی قوتِ مخترعہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ چونکہ عربی وفارسی مادری زبان نہ تھی، ادبی مشغلہ اور مصروفیت کی زبان تھی اس لیے کہیں کہیں الفاظ کی ثقافت ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مولانا کا سارا کا سارا کلام اسی ڈھرّے پر چلتا ہے۔ بعض مقامات پر عمدہ اور قیمتی خیالات اس طرح چمکتے نظر آتے ہیں جس طرح ریت میں چمکتے ہوئے ذرّے۔

بہر کیف اس مختصر سے مقالے کی تحریر سے ہمارا مقصد یہ بتانا نہیں کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کشمیری عربی وفارسی شعروسخن میں کس پایہ کے شاعر تھے، بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ باجود عالم متبحر، محدث، فقیہ اور مفسر ہونے کے شعروسخن کے کوچے سے بھی نابلد نہ تھے اور جس پر ثبوت ان کا کلام بلاغت نظام ہے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است ☆ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مولانائے مرحوم نے اپنی عربی وفارسی نثر کے ذریعہ گیسوئے علم وادب کو سنوارا اور شعروسخن کے ذریعے بھی اس کی مانگ پٹی کرتے رہے۔ جب کبھی ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تاریخ لکھی جائے گی اس میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری علیہ الرحمۃ کا نام

نامی جلی حروف سے تحریر ہوگا، سچ ہے۔

لوگ آئیں گے بہت، انور سے ہوں گے کم بہت
جس کے نور علم سے عالم منور ہوگیا
آپ بھی ہیں سینہ چاکاں اس کے غم میں چاک چاک
اہل فن کا گریۂ وزاری مقدر ہوگیا
خوب رولے دیدۂ خونناب اس کی یاد میں
جس کا ہر ہر لفظ ہر دل میں مصور ہوگیا
آج سونی سی پڑی ہے محفل شعر و ادب
وہ مہ تاباں کس مرقد کا بستر ہوگیا
کیوں نہ ہو کشمیر نازاں مہر عالم تاب پر
جس کے نغموں سے دماغ و دل معطر ہوگیا
آج بھی باطل سہم جاتا ہے اس کے نام سے
حق جب آیا دہر میں باطل مکدر ہوگیا
بعد مردن بھی ترے نغمات ہی گاتے رہے
حال مجلس کا ترے جانے سے ابتر ہوگیا
آج ابراھیم کیوں نازاں نہ ہو تحریر پر
اس کا ہر ہر شعر اک ماہِ منور ہوگیا

اخیر میں نامناسب نہ ہوگا اگر اس مقالے کا اختتام حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کشمیری کے آرٹ اور فن کے سلسلے میں اقبال کے اس شہرۂ آفاق شعر پر کیا جائے: ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات

از: مولانا مناظر احسن گیلانی

رسالہ دار العلوم میں احقر کی فرمائش پر مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات پر ایک طویل مضمون تحریر فرمایا تھا یہی مضمون احقر کے لیے اس پوری کتاب کی ترتیب واشاعت کا محرک بنا تھا۔ مضمون رسالہ کے متفرق پرچوں میں منتشر تھا۔ اب اسے یکجائی طور پر درج کیا جاتا ہے۔
مولانا دار العلوم میں طالب علمی کے سلسلہ میں اپنی آمد اور ابتدائی حالات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

بہر حال اس سے پہلے ہفتہ میں مدرسہ کی زندگی کی جو چیز بھی نظر سے گذر رہی تھی اس سے انس ہی میں انس کا اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ الآیہ کہ اسی ہفتہ میں ایک ''دہشت ناک'' خبر بھی کان میں گونجی۔ خیال یہ کیے ہوئے تھا کہ مدرسہ میں داخلہ کی جانب سے نائب مہتمم صاحب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مطمئن فرمادیا ہے۔ شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی کہ اچانک مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ قانون کی رو سے داخلہ کا امتحان بھی تجھے دینا ہوگا ''امتحان'' کان کے پردے پر تو اس لفظ کی چوٹ پڑی۔ لیکن اس چوٹ سے دماغ بوکھلا گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ اب تک میری تعلیم ٹونک میں اس طور پر ہوئی تھی کہ تحریری امتحان تو دور کی بات تھی۔ جہاں تک خیال آتا ہے شاید ایک یا دو مرتبہ تقریری امتحان کی مصیبت وہ بھی نام نہاد طور پر سر سے گذری تھی۔ استاد مرحوم نے پہلے ہی سے بتادیا تھا کہ فلاں فلاں

مقامات پر تجھ سے پوچھوں گا۔ (۱) ''دریا دیدہ نہ بود'' والے گلستان سعدی کے غلام (لڑکے) کی جو حالت تھی وہی حال دارالعلوم کے احاطہ میں امتحان کے لفظ سے مجھ پر طاری ہوا۔ گو مدرسہ میں چند ہی دن گذرے تھے لیکن باتونی ہونے کی وجہ سے طلبہ خصوصاً جن کے ساتھ نشست و برخاست زیادہ تھی۔ ان پر ایک گونہ کچھ رنگ بھی قائم ہو گیا تھا۔ اب یہ رنگ پھٹ جائے گا۔ ہوا جو دھوکے اور فریب سے باندھی گئی ہے اکھڑ جائے گی۔ انہیں وسوسوں کی دل و دماغ کے میدانوں میں تگ و دو لکد کوب شروع ہو گئی؟ کیا رسوائی کے پیش آنے سے پہلے نکل بھاگوں کیا کروں؟ طرح طرح کے خیالات ستانے لگے۔ سب سے زیادہ اہم سوال یہ سامنے آیا کہ امتحان کون صاحب لیں گے۔ ادھر ادھر سے چاہا کہ اس کا سراغ لگاؤں۔ مختلف بزرگوں کا نام لیا جاتا جو عموماً داخلہ کا امتحان لیا کرتے تھے۔ خیال آتا ہے عموماً حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا نام زیادہ اس سلسلہ میں لیا جاتا تھا۔ اگرچہ مولانا اس زمانہ میں بجائے استاذ العلماء کے ابھی استاذ الطلبہ ہی تھے۔ لیکن پھر بھی دارالعلوم کے اساتذہ میں ان کا شمار تھا۔ بعض طلبہ نے اطمینان بھی دلایا کہ مولانا اعزاز علی صاحب زیادہ سختی سے داخلہ کے امتحان میں کام نہیں لیتے۔ اس سے کچھ امید بندھی۔

الغرض چند دن اسی ادھیڑ بن میں گذرے۔ اور جب مدرسہ میں پڑھنے ہی کے ارادہ سے داخل ہو چکا تھا تو آنے کے بعد واپس ہو جانے پر دل راضی نہ ہوا۔ خصوصاً دارالعلوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا دل و دماغ پر اتنا غیر معمولی تسلط ہو چکا تھا کہ اس ماحول میں پہنچ جانے کے بعد اس کے منافع سے محض اپنی بزدلی کی وجہ سے محروم رہ جانا بڑا

(۱) عام طور پر یہ بات امتحان کے مفہوم کے مناسب نہ تھی۔ اس لیے خیال گذرا کہ ایسا امتحان ہی کیا ہوا؟ لیکن جب کتاب کھلی بتایا ہوا سوال پوچھا گیا تو جواب میں دشواری کیا تھی دیدیا گیا۔ یہ فلسفہ کی ایک کتاب کا سوال تھا۔ لیکن استاذ مرحوم نے جب فرمایا کہ میں یہ نہیں دریافت کر رہا ہوں کہ تمہاری کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے۔ بلکہ پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ تم خود بھی اس سوال کا کوئی جواب اپنی طرف سے دے سکتے ہو۔ تب معلوم ہوا کہ اب میرا امتحان ہو رہا ہے۔ جواب دیا گیا تھا۔ استاذ مرحوم نے تعریف کی، کچھ توقعات اس ناکارہ کی ذات کے ساتھ قائم کیے گئے جو افسوس کہ میری شورہ بختی کی وجہ سے پورے نہ ہو سکے۔

حسرت انگیز احساس بن جاتا۔ آخر جس دن کا ڈر تھا وہ سامنے آہی گیا۔ اور مجھے مطلع کیا گیا کہ داخلہ کے لیے امتحان کتب خانے کے بالا خانے پر حاضر ہو جاؤں۔ اب یاد نہیں رہا کہ پہلے ہی سے کچھ بھنک مل چکی تھی یا اچانک یہ صورت پیش آئی کہ اب تک دور ہی سے دور جس روح پرور جاں افروز وجود کے جلوؤں سے اپنی آنکھوں کو سینکا کرتا تھا۔ ناگاہ میں نے پایا کہ وہی مقدس ہستی میرے سامنے ہے یا میں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا ہوں۔ یہ حضرت الاستاذ الامام العلامہ سیدنا مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ کی ذات پاک تھی۔ فقیر کے داخلہ کا امتحان معلوم ہوا کہ حضرت ہی لیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ شاہ صاحب ہی کے ذمہ اس سال اس امتحان کا معاملہ کر دیا گیا تھا یا واللہ اعلم بالصواب، کوئی خاص اشارہ اس باب میں ان کو اربابِ حل وعقد کی طرف سے ملا تھا۔

بہر حال میری آنکھوں کے سامنے پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ معنوی معصومیت کو دیدہ اور مرئی قالب میں ڈھال کر کسی نے رکھ دیا ہے۔ آنکھوں میں معصومیت، چہرے پر معصومیت، لبوں میں معصومیت، از سرتا پا ہمہ تن معصومیت، حسن کردار کا مجسمہ، عفاف واستغناء، صفاء قلب وتقوی کی ڈھلی ہوئی کوئی گڑیا، جو کچھ باہر میں ہے وہی سب کچھ اندر بھی ہے۔ سنہرا دمکتا ہوا چہرہ جس پر رونق ونضارت، شادابی وتر تازگی کھیل رہی تھی نثار ہو رہی تھی، ڈاڑھی کے بال سیاہ حد سے زیادہ سیاہ، زردی مائل سرخی کی جھلک کے ساتھ روئے انور کے رنگ کا ایک جان بخش دل آویز نظارہ میری نگاہوں کے سامنے آیا(۱)۔ حضرت الاستاذ الامام کا شباب کا زمانہ تو شاید نہ تھا۔ غالبا چالیس سے اس وقت عمر مبارک متجاوز ہو چکی ہوگی۔ لیکن آب ورنگ کی تازگی وشادابی ایسی تھی کہ ہزار ہا ہزار شبابی مظاہر اس پر نثار تھے۔ غالباً چھوٹی سی دستی میز پر کتاب تھی۔ یہ میر زاہد رسالہ تھا۔ شاہ صاحب نے کتاب کھولی وہ کتاب کھول رہے تھے اور میرے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ پیشانی پسینہ سے شرابور، کانپ رہا

---

(۱) حضرت الاستاذ الامام الکشمیری کے سیماء حلیہ کا ذکر انشاء اللہ تعالی آئندہ آئے گا۔ اس وقت اپنے پہلے تاثر کا اظہار مقصود ہے۔ آئندہ اس سلسلہ میں جن باتوں کا خیال آتا جائے گا عرض کروں گا ان کے زیر سایہ بعد کو کافی مدت فقیر کی گذری۔

تھا۔ دیکھئے کہاں سے پوچھتے ہیں۔ کیا پوچھتے ہیں۔ شاید ابتدائی ورق ہی میں خیال آتا ہے کہ **بتحقق کل فرد منه بعد تحقق الموصوف** کے الفاظ ''**العلم المتجدد**'' کی تعریف میر زاہد نے جو کی ہے۔ دریافت فرمایا گیا کہ اس عبارت کا مطلب بیان کرو۔ یہ وہی مقام تھا جس کے مالہ، وماعلیہ کے پڑھنے میں تقریباً ایک مہینہ ٹونک کی درسگاہ میں صرف ہو چکا تھا میر زاہد کا منہیہ، غلام یحییٰ کے حواشی، عبدالعلی بحرالعلوم العلامہ کے اضافے، مولوی عبدالحق خیر آبادی نے اپنے حاشیہ میں ان سب پر جو کچھ لکھا تھا، اور خود استاذ مرحوم کا ذاتی حاشیہ اس مقام پر جو تھا سب ہی کو گھونٹے ہوئے اور پیئے ہوئے تھا لیکن جواب تو وہ دے جو اپنے آپ میں موجود بھی ہو، تین چار دن یا کم وبیش ایک ہفتہ کے اس عرصے میں جو دارالعلوم کے احاطہ میں داخلہ کے اس امتحان سے پہلے گذرا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے فضائل وکمالات، علمی تبحر اور غیر معمولی معلومات ومخزونات کے ذکر سے دل اس حد تک مرعوب ہو چکا تھا کہ جس وقت پوچھا گیا کہ مطلب بیان کرو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کبوتر شاہین کے پنجوں میں آ گیا ہے، نہ ہوش ہی باقی تھا اور نہ حواس، کچھ یاد نہیں کہ بدحواسی کے اس عالم میں منہ سے کیا اول فول بے تکی باتیں بے ساختہ نکلیں۔ ایک دو سوال ہی کے بعد کتاب بند ہو گئی اور اجازت اٹھ جانے کی عطا فرمائی گئی۔ جس وقت اٹھا اس یقین کے ساتھ اٹھا کہ دارالعلوم سے روانگی کا نظم کر لینا چاہیے۔ داخلہ کے لیے جس قابلیت کی ضرورت مدرسہ کے قانون کی رو سے ہے۔ اس معیار پر جس حد تک کوئی کھوٹا ثابت ہو سکتا ہے، میں نے محسوس کیا کہ قسمت نے آج وہی مجھے ثابت کر دیا۔ اٹھا اور سفر کے خیال کو دماغ میں لے کر اٹھا۔ منہ خشک تھا لب پر پپڑیاں تھیں۔ واپس ہوتے ہوئے دوسرے ہم چشم طلبہ کے خیال سے مصنوعی اطمینان کی کیفیت کو دل چہرے پر منتقل کرنے کی کوشش اترتے ہوئے سیڑھی کے زینوں پر کرتا رہا، نیچے اترا۔ ساتھیوں میں پہنچا دل کے خیال کو دل ہی دل میں دبائے رکھا۔ واقعہ کا علم ان لوگوں کو خود ہو جائے گا کہ داخلہ کی اجازت اس منحوس طالب علم کو دورے میں شریک ہونے کی نہیں ملی۔

بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ ہلکا ہلکا سا خیال اس کا بھی آتا ہے کہ میر زاہد رسالہ کے ساتھ غالباً ہدایہ اولین میں بھی میرا امتحان لیا گیا۔ ہدایہ اولین کا کچھ حصہ ٹونک میں اپنے پنجابی استاذ سمینہ (ملتان) کے رہنے والے مولانا محمد اشرف مرحوم (۱) سے خصوصی طور پر فقیر نے پڑھا تھا۔ ورنہ عام طور پر ہدایہ اوّلین درس نظامیہ کے نصاب میں شریک نہیں ہے۔ جو حشر میر زاہد رسالہ کے امتحان کا میری نظروں میں ہوا تھا شاید وہی کچھ انجام ہدایہ اولین کے امتحان کا ہوا ہو۔ میر زاہد والی بات تفصیلاً اب تک یاد ہے۔ لیکن ہدایہ کا خیال کچھ مٹ سا گیا ہے۔

بہر حال امتحان کے قصہ میں جو کچھ گذری تھی اسے دل ہی میں دبائے اور دار العلوم سے بوریا بستر اٹھا لینے کی اندرونی فکروں ہی میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک حکیم منظر حسن صاحب ہی نے غالباً یہ خبر سنائی کہ آپ کے امتحان کی بڑی تعریف ہو رہی ہے اور داخلہ آپ کا دورے میں منظور کر لیا گیا ہے۔

اب یہاں سے حافظہ کچھ جواب دے رہا ہے تفصیلات پر نسیان وذہول کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بعض باتوں کا خیال بھی آتا ہے تو چاند کی اس روشنی کی طرح جو گھنگور گھٹا

(۱) یہ بڑے دلچسپ بزرگ تھے۔ لاہور میں شاہی مسجد کے مدرسہ میں ان کی تعلیم پوری ہوئی تھی۔ مولانا غلام محمد صاحب پنجاب کے مشہور مدرس اپنے زمانہ میں تھے، ان ہی سے کتابیں پوری کی تھیں۔ پنجاب کا خصوصی علم اس زمانہ میں نحو کا علم تھا۔ مولانا کی دستگاہ اس میں علم کافی تھی۔ ادب عربی اور ریاضی سے بھی خاصی مناسبت رکھتے تھے۔ مدرس ہونے اور کافی معمر ہونے کے بعد فلسفہ اور منطق کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور ٹونک مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر طالب العلمی شروع کی۔ لیکن ان کے علم نے فوراً ٹونک میں ہی ان کو مدرس ہی بنا دیا۔ مدرسہ خلیلیہ میں باضابطہ مدرس ہو گئے۔ پڑھتے بھی رہتے اور پڑھاتے بھی تھے۔ خاکسار نے مولانا مرحوم سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ادب عربی کی نصابی کتابیں حریری، متنبی حماسہ، معلقہ سب ان ہی سے پڑھیں اور ریاضی، ہیئت، ہندسہ کی کتابیں بھی ان ہی سے پوری کیں، جن کے دوبارہ دیکھنے کا پھر موقعہ نہ ملا۔ ان کی بے نفسی کا حال یہ تھا کہ درس کے کمرے میں تو وہ استاذ بن جاتے اور ان کے طلبہ طلبہ، لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد طالب العلموں سے بھی فروتر اپنے آپ کو خیال کرتے۔ اور طلبہ کے ساتھ ملنے جلنے میں اسی خیال کا اثر نمایاں ہوتا۔ بعد کو جب کوئی ان سے کسی کتاب کے پڑھنے کی خواہش کرتا تو ان کی غایت نیک نفسی تھی کہ فقیر کا نام لیتے اور کہتے کہ بھائی گو وہ میرا شاگرد ہے۔ لیکن اب مجھ سے زیادہ ان کتابوں کو سمجھتا بھی ہے اور سمجھاتا بھی اس کو راضی کرو۔ خوب پڑھائے گا اللّٰھم ارحم واغفر لہ اب اسی پاک طینت پیداواروں کو ہم مسلمانوں کے گھروں میں کہاں ڈھونڈیں۔ ؎

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

کے کسی پھٹے ہوئے حصے سے اچانک نمودار ہوتی ہو۔ اور پھر چھپ جاتی ہو۔ اور کیا کیا صورتیں اس سلسلہ میں پیش آئیں یاد نہ رہیں۔ بس اب اتنا یاد رہ گیا ہے کہ جس امتحان کے متعلق اپنی ناکامی کا قطعی یقین مجھ میں پیدا ہو چکا تھا۔ ثابت ہوا کہ وہ یقین نہیں صرف وہم تھا۔ اور حضرت الاستاذ العلامہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے خاکسار کے داخلہ کی سفارش اس امتحان کے بعد فرمائی ہے۔

کتابیں مل گئیں اور کچھ دنوں بعد غالباً شوال کی ۲۰/۲۱ سے باضابطہ درس دورہ کا جاری ہو گیا۔ دیوبند میں تعلیم پانے والے تو دورہ کی اصطلاح سے واقف ہی ہیں لیکن جن کے لیے مدرسہ کی یہ اصطلاح اجنبی ہو ان کے لیے اتنی بات کہہ دینی چاہیے کہ صحاح ستہ حدیث دورے کی مشہور و مسلمہ کتابوں کو ایک ہی سال میں بطریقہ سرد پڑھانے کا قاعدہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مدینہ منورہ سے سیکھ کر ہندوستان تشریف لائے اور اسی طریقۂ درس کو آپ نے یہاں جاری کیا۔ طریقہ یہ تھا کہ حدیثوں کے معانی و مطالب، مشکلات وغیرہ کے متعلق جو کچھ پڑھانا ہوتا تھا وہ مشکوٰۃ شریف میں پڑھا دیا جاتا تھا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو قاعدہ تھا کہ ایک دن مشکوٰۃ کی حدیثیں پڑھاتے۔ اور دوسرے دن ان ہی حدیثوں کے متعلق علامہ طیبی کی شرح کا درس طلبہ کو دیتے۔ اسی طرح سے مشکوٰۃ جب ختم ہو جاتی تھی تب دوسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحاح ستہ کی حدیثوں کی سند کو متصل کرنے کے لیے مشکوٰۃ ہی کی حدیثوں کو جو اس میں سند کے بغیر پڑھائی گئی تھیں، اب سند کے ساتھ اس طور پر پڑھاتے کہ طالب علم حدیثوں کو پڑھتا جاتا اور استاذ سنتا جاتا۔ بیچ بیچ میں خاص اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوا تو ذکر کر دیا گیا۔ یوں روزانہ پانچ ورق چھ ورق ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کے درس کے اس طریقۂ کا نام طریقہ سرد رکھا ہے۔ لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے عام اساتذۂ حدیث کا یہی دستور اس زمانہ میں تھا جب وہ حدیث کا علم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان سے سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ اسی سرد کے لفظ کا ترجمہ سمجھئے، یا زیادہ مانوس لفظ میں اسی کی تعبیر دورہ کے لفظ سے دارالعلوم دیوبند میں مشہور ہو گئی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے زمانے کے حساب سے دارالعلوم والے

دورے یا طریقۂ سرد میں اتنی ترمیم اور کردی گئی تھی کہ اہل حدیث کا نیا فرقہ ہندوستان میں جو اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور حنفی مذہب کے متعلق یہ شہرت دینے لگا کہ کلیۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے خلاف امام ابوحنیفہؒ نے اپنے ذاتی قیاسات سے اسلامی شریعت کا ایک مستقل نظام قائم کر دیا تھا۔

اسی مغالطہ کے ازالہ کے لیے اکابر دیوبند میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے درس میں اس التزام کا اضافہ کیا کہ حنفی مذہب کے جن مسائل کے متعلق فرقہ اہل حدیث نے مشہور کر رکھا ہے کہ صریح حدیثوں کے وہ مخالف ہیں ان کے اس الزام کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند میں طریقۂ سرد کے ساتھ اس التزام کو باقی رکھا گیا، اور بحمد اللہ اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اگرچہ وہ محاذ جو اہل حدیث طبقہ نے قائم کیا تھا۔ تقریباً ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا ہے، لیکن مبادا کہ یہ فتنہ پھر سر اٹھائے گا، دارالعلوم میں اب تک تروتازہ حالت میں درس حدیث کا یہ التزام زندہ و پائندہ ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کو اسی طرح جاری رکھنا چاہیے کہ اس سے جامد تقلید کی سمیت کا ازالہ بھی ہوتا رہتا ہے اور حنفی مسلک پر علمی بصیرت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔

گذشتہ ادیان و مذاہب میں یہ حادثہ پیش آچکا ہے کہ بنیادی تعلیم سے ہٹتے ہوئے لوگ فروعی مباحث میں کچھ اس طرح منہمک اور مستغرق ہو گئے کہ بنیادی تعلیم کے سارے وثائق ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئے۔ اسلام کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ابتداء ہی سے کچھ ایسے قدرتی اسباب پیش آتے رہے جن سے مذاہب و ادیان کے اس عام عارضہ کا ردعمل مسلسل ہوتا رہا۔ خدا خنک اور ٹھنڈی رکھے امام شافعیؒ کی قبر مبارک کو کہ دوسری صدی ہجری میں سب سے پہلے وہی اس سلسلہ میں چونکے۔ خطیب نے بغداد کی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ امام مالک اپنے استاذ کے حلقۂ درس سے فارغ ہو کر امام شافعیؒ عباسیوں کے جدید دارالسلطنت بغداد جب تشریف لائے، اور وہاں کی جامع مسجد میں اہل علم کی درس گاہوں کا جب آپ کو تجربہ ہوا دیکھا کہ چالیس پچاس کے قریب حلقے قائم ہیں۔ لیکن جس حلقہ میں بھی پہنچتے، وہاں نہ قال اللہ کا ذکر تھا اور نہ قال الرسول کا بلکہ فرماتے تھے کہ:

ھم یقولون قال اصحابنا (تاریخ بغداد: ص:۶۱۔ ج:۲) ان میں ہر ایک یہی کہتا کہ ہمارے اصحاب یعنی اساتذہ نے یہ کہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام کی دینی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی۔ اس طرز عمل کا جو انجام ہوسکتا تھا وہ ان کے سامنے آگیا اور ٹھیک جیسے اس زمانہ میں ہر پارلیمانی مجلس میں ایک اپوزیشن پارٹی بھی قائم ہوجاتی ہے۔ اور نہیں ہوتی ہے تو ایسی صورتیں نکالی جاتی ہیں کہ ارکان پارلیمان کی لگام کھینچنے کے لیے کسی نہ کسی طرح مخالفانہ تنقید کرنے والوں کی ٹولی پیدا ہوجائے۔ کچھ اسی نوعیت کی خدمت حضرت امام شافعیؒ سے بن آئی، انہوں نے بھی اپنا حلقہ بغداد ہی کے جامع میں قائم فرمایا۔ اور بجائے ''اصحابنا'' کے قال اللہ اور قال الرسول کے سننے کا عادی لوگوں کو آپ نے اس طرح بنادیا کہ خطیب نے اسی موقعہ پر نقل کیا ہے۔

(حتی مابقی فی المسجد حلقة غیره) یہاں تک کہ مسجد میں امام شافعیؒ کے سوا کوئی دوسرا حلقہ باقی نہیں رہا۔

اس سلسلہ میں حضرت امام شافعیؒ میں فرض کا احساس شدت پذیر ہوتے ہوئے اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اس راہ میں اپنے استاذ حضرت مالکؒ کے احترام کی بھی دیکھا گیا کہ اس بارے میں ان کو پرواہ نہ ہوئی بیہقی کا بیان ہے کہ:

''امام شافعی کو جب اس کی اطلاع ملی کہ امام مالک کے تلامذہ بجائے یہ کہنے کے کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے، عموماً اپنے حلقوں میں کہتے ہیں کہ امام مالک کا قول یہ ہے تو میں نے ایک سال تک استخارہ کیا۔ اور اس کے بعد میں نے اعلان کیا کہ امام مالک جو کچھ بھی ہوں بہر حال آدمی تھے اور آدمی سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

بیہقی نے اس قصے کو نقل کر کے آخر میں لکھا ہے کہ:۔

(فدعاه ذالک الی تصنیف الکتاب فی اختلافه معه) اور اسی احساس نے امام شافعیؒ کو آمادہ کیا کہ امام مالک کے مقابلہ میں کتاب تصنیف کریں۔

اس معاملہ میں امام شافعی کا جو حال تھا اس کا ندازہ اس قسم کی روایتوں سے بھی ہوتا ہے تو الی التاسیس میں حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ کسی نے امام شافعی سے کوئی مسئلہ

دریافت کیا۔ جواب میں آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس مسئلہ میں یہ ہے۔ لیکن پوچھنے والا جو لوگوں کا بگاڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ فرمایئے کہ اس باب میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور امام شافعیؒ کا خون کھول رہا تھا۔ اپنی بات پوچھنے والے نے جب ختم کی تو وہ سن رہا تھا کہ امام کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں:

''بھلے آدمی! تو نے کیا میری کمر پر زنار (جنیئو) دیکھا۔ یا کسی گرجے سے نکلتے ہوئے مجھے کبھی دیکھا ہے؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا اور تو پھر بھی پوچھتا ہے کہ میری رائے کیا ہے۔'' (توالی، ص:۶۳)

سچ تو یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی وثائق ''الکتاب و السنۃ'' کی طرف واپس لے جانے کا رواج قائم فرما دیا۔ میرا تو خیال بھی ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ان ہی کی آواز کی بازگشت اسلامی ممالک میں گونجتی رہی۔ جب کبھی دین کے حقیقی سرچشموں (کتاب وسنت) سے مسلمان کسی ملک میں دور ہوئے تو اپوزیشن پارٹی (حزب الاختلاف) کسی نہ کسی شکل اور نام سے عموماً نکل پڑی ہے۔ اور اپنے تنقیدی ہنگاموں سے مسلمانوں کو ہمیشہ مجبور کرتی رہی ہے کہ:

کتاب وسنت پر پیش کر کے پھر اس دستور کو جانچ لیں۔ جس کی پیروی دین کے نام سے وہ کر رہے ہیں۔

اسلامی علماء کی اسی اپوزیشن پارٹی کے مشہور سرگرم ممبر حافظ ابن حزم اندلسی جو ظاہریوں کے ممتاز پیشواؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے زمانہ میں بھی یہی صورت پیش آئی تھی ابوبکر ابن العربی صاحب احکام القرآن وشارح ترمذی شریف نے اپنی کتاب ''العواصم والقواصم'' میں لکھا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی اندلس کے مسلمانوں پر آ گیا تھا۔ جو مالکی مذہب کے پیرو تھے کہ قرآن وحدیث یعنی الکتاب والسنۃ تو دور کی بات تھی۔ ابن العربی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''لوگوں نے امام مالک اور ان کے جلیل القدر ممتاز تلامذہ کا ذکر بھی ترک کر دیا۔ بلکہ

عام رواج یہ ہو گیا تھا کہ فتوی دیتے ہوئے لوگ کہتے کہ قرطبہ والے یہ کہتے ہیں۔ طلیطلہ کے مولویوں کا خیال یہ ہے"۔

طلیطلہ کے علماء کا قول یہ ہے ابن العربی کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ:

فانتقلوا من المدينة وفقهائها الى طلبيرة وطريقها. (القواصم والعواصم، ص: ۱۴۱) لوگ مدینہ اور مدینہ کے فقہاء کو چھوڑ کر طلبیرہ اور طلبیرہ کے راستے پر چل پڑے تھے۔

قرطبہ، طلیطلہ، طلبیرہ یہ اندلس کے ان شہروں کے نام تھے۔ جو ابن حزم کے زمانہ میں دینی علوم کی مرکزیت میں غیر معمولی شہرت حاصل کیے ہوئے تھے۔ گویا اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر دیوبند، سہارنپور، فرنگی محل، بریلی، بدایوں، دہلی وغیرہ شہروں کا حال ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ہندوؤں میں کاشی متھرا، ہردوار، کورک شیتر، پراگ جیسے مذہبی مقامات کی جو نوعیت ہے، یہی کچھ نوعیت اندلس کے ان شہروں کی مسلمانوں کے عہد حکومت میں تھی۔ حافظ ابن حزم اور ان کے ماننے والوں کو جہاں تک میرا خیال ہے مذہب کی آزاد تنقید پر بغیر کسی رو رعایت کے اسی حال نے آمادہ کیا تھا۔

اور دور کیوں جائیے، خود ہمارے ملک ہندوستان کو بھی اسی زمانہ میں جب مسلمانوں نے اس کو اپنا وطن بنایا تھا اور ان وطن بنانے والوں میں زیادہ تعداد خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ علاقوں کے مسلمانوں کی تھی۔ ان کی دینی ذہنیت کا اندازہ اس مشہور تاریخی مناظرہ سے ہوتا ہے جو غیاث الدین تغلق کے دربار میں مسئلہ سماع پر ہوا تھا۔ ایک طرف خراسان اور ماوراء النہر کے نووارد مولوی تھے۔ جو ہندوستان پہنچ کر شیخ الاسلام اور قضاء وافتاء کے عہدوں پر سرفراز تھے۔ اور دوسری طرف صوفیوں کے سرخیل وامام حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاءؒ تھے۔ مسئلہ جب چھیڑا اور سلطان جی کی طرف سے بجائے فقہ کی کتابوں کے صحیح مسلم وغیرہ جیسی حدیث کی کتابوں کی روایتیں پیش ہونے لگیں، جن سے جوازِ سماع کا پہلو پیدا ہوتا تھا۔ تو خود سلطان جی کا مشہور بیان ہے کتابوں میں یہ فقرے آپ کی زبانی نقل کیے گئے ہیں کہ مناظرہ کی مجلس سے اٹھ کر جب اپنے لوگوں میں سلطان جی تشریف لائے تو فرمایا کہ:

"درمعرض حجت احادیث صحیح حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نمی شنوند ہمیں گویند کہ

درشہر ماعمل براویت فقہ مقدم ست برحدیث"۔(سفرنامہ ضیاءالدین برنی)

یعنی مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں کو (یہ خراسانی مولوی) نہیں سنتے تھے۔اور یہی کہے چلے جاتے تھے کہ ہمارے شہر (دہلی) میں حدیث کے مقابلہ میں فقہ کی روایتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

خیر میں کہاں کی ہانکنے لگا۔عرض یہ کررہا تھا کہ مغلوں کے زوال حکومت کے بعد جب سلطنت کا دباؤ اٹھ گیا اور براہ راست اس کے بعد دلوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے یا پیدا کرنے والوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لے کر مسلمانوں میں انتشار وافتراق کی وبا پھیلانے کے لیے ان خیالات کو پیدا کرایا جن میں ایک حادثہ یہ بھی تھا کہ ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی مخالف ثابت کرنے کی کوشش ملک کے مختلف گوشوں میں جاری ہوئی۔اور ان مسلمانوں کے پیشوا اور امام حضرت امام ابوحنیفہؒ کو لعن طعن کا نشانہ چاروں طرف سے بنایا گیا تھا تو گو بذات خود اس تحریک کو آپ جو کچھ بھی قرار دیں لیکن خیر کا بہترین پہلو اسی شر سے یہ نکل آیا کہ جس ملک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے زیادہ فقہاء کے اقوال اور فتوؤں کو اہمیت دینے کا دستور چلا آرہا تھا۔اس میں ایک نئی علمی ہلچل پیدا ہوئی۔اور حنفی علماء کے ایک طبقہ نے سنجیدگی کے ساتھ واقعی حنفی مذہب کے مسائل کا کتاب وسنت سے بغیر کسی جنبہ داری کے مقابلہ کر کے جائزہ لینا شروع کیا۔ان کی سعی اس باب میں مشکور ہوئی اور امام ابوحنیفہؒ کے خلاف بہتان کا جو طوفان اٹھایا گیا تھا ان کی کوششوں سے خدا خدا کر کے بیٹھ گیا۔انہوں نے حنفی مذہب کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق احادیث وآثار کا ذخیرہ جمع کر کے رکھ دیا۔کتابیں بھی لکھی گئیں۔لیکن کتابوں سے زیادہ مؤثر اور کارگر مفید طریقہ اس راہ میں حدیثوں کے درس کا دیوبندی طریقہ ثابت ہوا۔اسی کا نتیجہ ہے کہ بلاخوف تردید اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ حنفی مذہب کا ایسا کوئی جزئیہ نہیں نکالا جاسکتا جس کے متعلق آپ کو دیوبندی درس کے پڑھے ہوئے مولوی حدیث اور آثارِ صحابہ سے تائیدی موادنہ پیش کرسکتے ہوں۔باتیں عام ہوگئیں اور ہر کہ ومہ تک ان باتوں کو درس کے اسی عام طریقہ نے پہنچادیا۔اب ایک حنفی حنفی

مذہب پر عمل ضرور کرتا ہے۔ لیکن اس لیے نہیں کرتا کہ وہ صرف امام ابوحنیفہ کا فتوی یا ان کی رائے ہی ہے بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ یہی اقتضاء فلاں فلاں حدیثوں کا بھی ہے۔ اور یہی طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے فلاں فلاں صحابی کا بھی تھا۔ یعنی یہ طریقہ ان بزرگوں کا ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا گیا ہے:

تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (فتح)

تو دیکھتا ہے ان لوگوں کو رکوع کرتے ہوئے سجدے کرتے ہوئے ڈھونڈتے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودیوں کو صلاح کے نشانات جھلکتے ہیں ان کے چہروں میں سجدوں کے اثر سے۔

بھلا قرآن میں جن کی نمازوں اور جن کے رکوع جن کے سجدوں کی تعریف کی گئی ہو۔ حرف گیری کی ان ہی کے متعلق گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے۔

الغرض حدیث کے درس کے اس دیوبندی طریقہ نے مسلمانانِ ہند کے دینی تعلقات کو دین کے اصلی سرچشموں اور حقیقی بنیادوں (الکتاب والسنۃ) کے ساتھ وابستہ کرکے نئے سرے سے پھر تروتازہ اور شگفتہ کردیا۔ اوران کی تقلید کے اسی تحقیقی پہلو نے:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللّٰہ.

بنالیا (یہود ونصاریٰ نے) اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب۔

کی قرآنی لعنت سے ان کو ان کے دین کو بحمد اللہ محفوظ کردیا۔ اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ درس حدیث کی اس خصوصیت کو جب تک زندہ رکھا جائے گا اور وہی اہمیت اس کو حاصل رہی جو پچھلے دنوں میں تھی اور اس وقت تک جہاں تک میں جانتا ہوں کسی قسم کی لاپروائی اس سے اختیار نہیں کی گئی ہے تو مسلمانانِ ہند کی دینی زندگی قرآنی لعنت کے اس زہر سے انشاء اللہ پاک رہے گی۔ واللہ ولی التوفیق۔

میں قلم روک رہا ہوں، مگر رک نہیں رہا ہے مفید خیالات سامنے آتے چلے آتے ہیں۔ میں بھی لکھتا ہی چلا گیا ورنہ ذکر تو اس کا ہو رہا تھا کہ ۱۳۳۰ھ کے ماہ شوال کی ۲۱ر

یا ۲۲؍ تاریخ یا اس کے قریب قریب کسی تاریخ میں جہاں تک میرا حافظہ مجھے یاد دلا رہا ہے دورۂ حدیث کے آغاز کی خبر مجھ تک پہنچی۔ اب یہ یاد نہیں رہا کہ باضابطہ کسی نوٹس کے ذریعہ اطلاع شائع ہوئی تھی یا افواہاً یہ خبر طلبہ میں پھیل گئی۔ زیادہ احتمال دوسری صورت ہی کا ہے اور فقیر بھی دورے کے دوسرے طلبہ جن کی تعداد صحیح طور پر تو محفوظ نہ رہی۔ مگر ستر اسّی کے درمیان غالباً ہوگی۔ (۱۳۳۰ھ کے داخلہ کی تعداد اس سال کی روداد میں مل سکتی ہے)۔

بہرحال اب تک بہ مشکل دس پندرہ سے زیادہ ساتھیوں کے ساتھ پڑھنے کا موقعہ ساری زندگی میں جسے نہیں ملا تھا، اسی کے لیے طلبہ کے اس جم غفیر کے گویا میلے یا جھمیلے میں پڑھنے کا نیا بالکل نیا تماشا اور نیا تجربہ تھا۔ اس میں یو پی بہار کے سوا بنگال، پنجاب، سرحد، کشمیر، کابل، قندھار، بخارا اور غالباً چینی، ترکستان، کاشغر وغیرہ کے طلبہ بھی تھے۔

بہرحال یوں ہی اب صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ ہفتہ یا ہفتہ سے زیادہ دن گذرے کہ درس کا اعلان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کل سے دورے (۱) کے اسباق شروع ہوں گے۔ کتابیں جن کے اسباق شروع ہونے والے تھے، کتب خانے سے برآمد کرلی گئی تھیں۔ صبح کی نماز کے بعد ہی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حضرت سیدنا الامام الکشمیری کے یہاں صحیح مسلم کا سبق شروع ہوگا۔ طلبہ کا ہجوم تھا۔ ان ہی کے جھمیلے میں خاکسار بھی نو درہ کی چھت کے شمالی سمت پر جو ایک کمرہ تھا اسی میں حاضر ہوگیا۔ اتنی بڑی تعداد والی جماعت میں شریک ہوکر پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ خیال آتا ہے کہ صحیح مسلم کا اتفاقاً وہی نسخہ مجھے کتب خانے سے ملا تھا جو اپنے طول و عرض میں حدیث کی دوسری کتابوں

---

(۱) دارالعلوم میں تعلیم پانے والے علماء تو دورہ کی اصطلاح سے واقف ہیں۔ لیکن عام ناظرین کی آگاہی کے لیے شاید عرض کرنا مفید ہوگا کہ حدیث کی تعلیم کے جس طریقہ کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں ''طریقہ سرد'' سے فرمایا ہے تفصیل جس کی خاکسار نے ان کی کتابوں سے اخذ کر کے اپنی کتاب ''مسلمانانِ ہند کا نظام تعلیم و تربیت'' میں درج کی ہے درحقیقت اسی طریقہ سرد کی تعبیر دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی حلقوں میں ''دورہ'' کے لفظ کی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس کے اس طریقہ میں تھوڑی سی ترمیم یہ کردی گئی کہ غیر مقلدین یا فرقہ اہل حدیث نے یہ چرچا جو پھیلا دیا تھا کہ حنفی مذہب کے مسائل صحیح حدیثوں کے مخالف ہیں، اس غلط بے بنیاد خیال کی تصحیح کے لیے ان تمام مسائل کے متعلق جن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ غیر مقلدوں نے بنا رکھا تھا سنبھل کر گفتگو کی جاتی ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کی صحیح بنیاد سے طلبہ کو واقف بنایا جاتا ہے اور گویا ''خلافیات'' پر بحث بھی اب دورہ کے طریقہ درس کا ایک گونہ لازمی جز بن گیا ہے۔

کے مقابلہ میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا۔ لیکن کرتا کیا اسی طویل وعریض کتاب کو لے کر کوٹھے پر چڑھ گیا۔ درس کے کمرے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ طالب علموں نے ان ہی تپائیوں پر قبضہ کرلیا۔ ایک تپائی میرے حصہ میں بھی آئی۔

خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے طلبہ کتاب کی عبارت پڑھیں گے اور حضرت شاہ صاحب پھر اس عبارت کا مطلب اور ترجمہ طلبہ کو بتائیں گے لیکن پہلی دفعہ درس کے ایک نئے طریقہ کے تجربہ کا موقع میرے لیے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی نہیں شروع ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحرِ بے کراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دل و دماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا۔

ایسے اساتذہ (غفر اللہ لہم) سے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی۔ اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کے عادی تھے۔ صلوۃ کی شرح اور مختلف امور کی طرف اس لفظ کا انتساب اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے۔

الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچہ کے عمومی اجزاء کے متعلق سوال و جواب، ردوقدح کا موروثی سرمایہ حواشی و شروح میں جو منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اسی کو غریب طالب علموں پر پیش کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے۔ لیکن الامام الکشمیری نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو۔ ایک خاص قسم کی دل کش، ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی۔ کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا۔ تقریباً چالیس سال بعد اس کا دہرانا آسان نہیں ہے۔ لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظے پر جہاں تک خیال کرتا ہوں اب بھی باقی ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ صحیح مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ بطور مقدمہ کے شروع کتاب میں امام مسلمؒ نے حدیث کے بعض بنیادی کلیات اور اساسی اصول و نظریات کی طرف سیدھے سادے الفاظ میں ایسے بلیغ و عمیق اشارے کیے ہیں۔ جن کے صحیح وزن کو گو فن سے ناواقف آدمی محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام مسلم کے بعد یوں تو اصول

حدیث میں بڑی چھوٹی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمہ میں اب بھی پانے والے اس علم کے ایسے اہم نکات اور حقائق کو پاتے ہیں، یا پاسکتے ہیں جو شاید دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ حق تعالیٰ کے افضال بے پایاں میں ایک بڑا فضل اس شور بخت، سیاہ کار کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حدیث ہی نہیں بلکہ اصول حدیث کے ان چند قیمتی اوراق کے پڑھنے ہی کا نہیں بلکہ ان اوراق پر وقت کے ایک امام کے عالمانہ خطبات کے سننے کا موقع اس بے بضاعت کے لیے آسان کیا گیا۔ پہلے دن کے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکا یک میرے سامنے آگئے۔ اس وقت تک میرا تاثر تھا کہ قرآن کے سوا بجز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتساب نہیں کیا جاسکتا۔ گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی اور یقین کی قوت سے محروم ہے۔ لیکن یہ پہلا دن تھا۔ جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا تواتر طبقہ، تواتر عمل، تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سنا۔ سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعویٰ عام کتابوں میں کیا جاسکتا ہے یہ دعویٰ صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے۔ ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ اور تواتر عمل و تواتر قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہوکر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہنچا ہے، اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے۔ جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے (۱) یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا

(۱) واقعہ یہ ہے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً ان ہی باتوں میں ہوئی ہے جو روایت کی راہ سے منتقل ہوئی ہوں۔ لیکن ایسی بات کہ شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کے حکمراں تھے یا سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنے والے ان کے کون ہیں۔ جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہے اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر مثلاً پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے۔ سال میں رمضان کا مہینہ جب آئے تو روزہ مسلمانوں کو رکھنا پڑتا ہے یہ ایسی باتیں ہیں جو مسلمان ہی نہیں۔ بلکہ جو مسلمان نہیں ہیں ان کے نزدیک بھی اسلام کے یقینی عناصر ہیں۔ یہی تواتر عمل کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت، اگرچہ گذرے ہوئے واقعات ہیں۔ لیکن ان کی تفصیلات مثلاً حاتم کی طرف سخاوت کے یا رستم کی طرف بہادری کے جو قصے مشہور ہیں۔ ان قصوں کا یقین ہونا تو ضروری نہیں ہے۔ لیکن ان قصوں کا قدر مشترک یعنی حاتم سخی تھا۔ رستم بہادر آدمی تھا۔ اس قدر مشترک کے یقینی ہونے میں کون شبہ کرسکتا ہے۔ حضرت الاستاذ العثمانی مولانا شبیر احمدؒ نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کی ان قسموں کا ذکر کر کے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ مولانا انور شاہ کشمیری صاحب سے یہ بات سننے میں آئی۔

سارا بینائی نظام میرے لیے یقینی و قطعی ہوگیا اور جیسے جیسے تمیز و شعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا، بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا۔ خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا۔ مسلمانوں کے دینی اختلاف کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا۔

حضرت شاہ صاحبؒ یوں تو فطرتاً ادیب تھے۔ اسی لیے اردو زبان جو ان کی مادری زبان نہ تھی۔ چاہتے تو اس زبان کے بہترین ادیب و خطیب کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں فرما سکتے تھے۔ لیکن مسلسل عربی کتابوں کے مطالعہ اور ادب عربی کی دوامی مزاولت کا یہ اثر تھا کہ زبان مبارک پر عربی زبان کے الفاظ ہی زیادہ تر چڑھ گئے تھے۔ بلکہ طریقۂ بیان بھی آپ کا عربی طرز بیان سے زیادہ متاثر تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ گو تعلیمی و تدریسی زبان آپ کی اردو ہی تھی۔ لیکن عربی زبان کے ایسے الفاظ جو اردو میں عموماً مستعمل نہیں ہیں، اضطراراً آپ کی زبان مبارک سے مسلسل نکلتے رہتے تھے۔ تواتر کے مذکورہ بالا اقسام چارگانہ کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان سے پہلی دفعہ میں نے طبقۃ بعد طبقۃ کے عام الفاظ کے ساتھ جیلا بعد جیل کے الفاظ سنے تھے۔ ان کی غرابت کا احساس اب بھی میرے حافظہ میں زندہ ہے۔ شاید اسی موقعہ پر ''الکافہ عن الکافہ'' یا الکواف عن الکواف'' ابن حزم کی مخصوص اصطلاح بھی سننے میں آئی تھی۔

اس قسم کے غیر مشہور یا اردو زبان میں جو الفاظ عربی کے مروج نہ تھے۔ ان کے استعمال کرنے کی غرض ممکن ہے کہ یہ بھی ہو کہ عام مسلمانوں کو نہ سہی لیکن عربی مدارس کے طلبہ کا ان الفاظ سے مانوس ہونا ان کی شان کے مناسب تھا۔ اور شاہ صاحب شاید اس طریقہ سے طلبہ کو ان عالمانہ اصطلاحات اور تعبیروں سے مانوس بنانا بھی چاہتے تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ شاہ صاحب نے ان غریب اصطلاحات کے استعمال کی توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جن کا ذکر کنائے اور اشارے ہی میں کرنا عام انسانی تہذیب کا اقتضاء ہے۔ پھر یہ نکتہ ان ہی سے سننے میں آیا اور بالکل صحیح بات تھی کہ تراشنے والے ان ہی چیزوں کی تعبیر کے لیے اچھے اچھے الفاظ تراش

لیتے ہیں ''پائین خانہ'' مکان کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں پھر اس سے ''بیت الخلا'' مراد لینے لگے لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ ''پائخانہ'' کی شکل اختیار کر کے خود یہ لفظ بھی گندہ ہوگیا۔ فرماتے تھے کہ معانی کی گندگی رفتہ رفتہ الفاظ تک منتقل ہو کر پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد اس قسم کے الفاظ پر نظر ثانی کی جائے۔ اپنے اسی خیال کے مطابق عورتوں کے ایام کی تعبیر میں وہ ہمیشہ ایام طمث استعمال کرنے کے عادی تھے۔ کیونکہ ''حیض'' کا لفظ حالاں کہ خود کنائی تعبیر ہے لیکن کثرت استعمال نے اس کو بھی اس قابل نہیں رکھا کہ مہذب مجلسوں میں اس کے استعمال کو آئندہ جاری رکھا جائے۔

بہر حال پہلے دن کے درس میں علاوہ معانی کے نئے نئے عربی الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی میرے دماغ میں شاہ صاحب کے درس کے اندر جمع ہوگیا۔ ان کے بیان کی خصوصیت کا ایک غیر شعوری اثر مجھ میں پیدا ہو رہا تھا کہ عربی زبان میں اب تک کسی مطلب کو ادا کرنے کی ہمت مجھے نہ ہوئی تھی۔ لیکن سبق پڑھ کر جب قیام گاہ پر آیا۔ اور شاہ صاحب کے عطا کیے ہوئے گونا گوں معلومات کا جائزہ لینے لگا تو یہ محسوس ہوا کہ اپنے کمزور حافظہ سے اس کی امید نہیں کہ ان کی بتائی ہوئی باتوں کو وہ یاد رکھے گا۔

اسی لیے فیصلہ کیا کہ کل سے کاغذ اور پنسل ساتھ لیتا جاؤں گا اور ان کی تقریر کو قلم بند کروں گا۔ اور آج جو کچھ سن کر آیا ہوں قبل اس کے کہ میرے حافظہ سے وہ نکلے اسے لکھ لینا چاہیے۔ شاہ صاحب کی تقریر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس کا اسلوب ہی ایسا تھا کہ بجائے اردو کے ان کے معلومات کا مجھے محسوس ہوا کہ عربی میں قلم بند کرنا شاید زیادہ آسان ہے۔

یہی سوچ کر جو کچھ آج سن کر آیا تھا، پنسل سے ان کو عربی عبارت میں نوٹ کرنے لگا اور پہلی دفعہ مجھے اس کا اندازہ ہوا کہ غلط سلط سہی لیکن ٹوٹی پھوٹی عربی میں مطالب کی تعبیر کی گونہ صلاحیت مجھ میں بھی ہے۔

دار العلوم میں حدیث کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا رواج نیا رواج نہ تھا۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کی تقریر بعض لوگوں کے پاس مکتوبہ شکل میں پائی جاتی تھی اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ کی بھی ترمذی والی تقریر متعدد بزرگوں کی مرتب کی ہوئی طلبہ میں پھیلی ہوئی

تھی۔لیکن میں جہاں تک جانتا ہوں۔ حضرت الامام الکشمیری کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا ارادہ شاید اس فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہیں کیا تھا۔ یوں بھی عربی زبان میں حدیث شریف کی تقریروں کی تعبیر کی روایت مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس فقیر کے بعد اس سے کہیں زیادہ لائق وفائق قابل وفاضل مستعد اور جفاکش محنتی طلبہ حضرت شاہ صاحبؒ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ قرار دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ''معارف انوریہ'' کے اس بحر بے کراں کو قید تحریر میں لانے کی کوشش کی جائے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا محمد یوسف البنوری (متعنا اللّٰہ بطول بقائھما (۱)) کے سوا پنجاب کے ایک بزرگ مولانا محمد چراغ جامع تقریر ترمذی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے سوا سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی افادات کے جمع کرنے کی توفیق خاکسار کے بعد مختلف افراد کو بخشی گئی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ان صاحبوں نے بھی بجائے اردو کے عربی زبان ہی کو تعبیر کے لیے اختیار فرمایا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ حضرت شاہ صاحب کے طرز بیان، اور طریقۂ تدریس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اردو سے زیادہ عربی زبان ہی میں ان کو تقریروں کی قلم بند کرنا آسان معلوم ہوتا تھا ''ہے'' ''نہیں ہے'' یا ازیں قبیل اردو کے عام افعال کے سوا الفاظ کا بڑا ذخیرہ ان کی تقریروں میں عربی کا ہی ہوتا تھا۔ کم ازکم فقیر کا احساس تو یہی ہے۔ اور اسی چیز نے خود مجھ میں بھی یہ جسارت پیدا کی کہ پہلے عربی عبارت لکھنے کی مشق وعادت کا موقعہ حالاں کہ اپنی تعلیمی زندگی میں نہ ملا تھا۔ لیکن امام کشمیری کے صف فعال میں شریک ہو جانے کا اثر تھا کہ روزانہ تین تین چار چار ورق بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ برجستہ قلم عربی میں انکی تقریروں کو لکھ لیا کرتا تھا۔

اس کا افسوس ہے کہ ظلم کرنے والوں نے مجھ پر ظلم کیا اور زندگی کے اس مسودے کو جو جان سے بھی زیادہ عزیز تھا کسی صاحب نے اس سے مجھے محروم کر دیا۔ جب اس کا خیال آتا ہے تو بے ساختہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ کا مشہور شعر ؎

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گمشدے ❁ ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

(۱) دو حضرات وفات پاچکے۔ رحمہما اللہ تعالیٰ

میرے پاس زمانے تک کئی سو صفحات کی یہ تقریر موجود تھی، جلد بندھوالی گئی تھی۔ حضر سفر میں ساتھ رہتی تھی۔ اچانک ایک دن تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی نے اڑالی (۱)۔

سچ تو یہ ہے کہ فقیر کے بعد ترمذی اور بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری مرتبہ مولانا بدر عالم المیر ٹھی۔ اور اسی کے ساتھ مجلس علمی ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کے دوسرے افادات کو شائع کر کے محفوظ نہ کردیتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی شکستہ وپراگندہ تقریر کے گم ہوجانے کا اثر مجھ پر کیا مرتب ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے مشہور قرآنی قانون:

وَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَایَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (رعد)

لیکن جھاگ سوسوکھ کر ختم ہوگیا اور لوگوں کو جس سے نفع پہنچتا ہے وہ ٹھہر گیا زمین میں۔

کی عملی تفسیر اس باب میں بھی مرنے سے پہلے اپنے سامنے آگئی جو چیز مٹنے اور کم ہونے کی مستحق تھی وہ گم ہوگئی۔ لیکن واقعی منافع الناس کی جن چیزوں میں ضمانت تھی قدرت کی طرف سے اس کے باقی رکھنے کا ایسا استوار محکم نظم کردیا گیا کہ جس وقت خاکسار نے اپنی املائی تقریر کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا اس زمانہ میں اس کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حق تعالیٰ نے اپنے بعض خاص مخلص بندوں (۲) کے دل میں ''معارفِ انوریہ''

---

(۱) فقیر کے رفقائے درس میں سے دو صاحب ایک تو بخارا کے ملا عبدالحکیم اور دوسرے دربھنگہ کے مولانا عبدالرحیم دونوں التزاماً میری مرتبہ تقریر کو روزانہ نقل کرلیا کرتے تھے۔ اور ان دونوں کے پاس بھی مجلد شکل میں موجود تھی۔ بخاری صاحب بیچارے کے متعلق تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہیں، اس دنیا میں ہیں بھی یا عالم آخرت کی طرف منتقل ہوگئے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ جب بخارا جاؤں گا تو یہی تقریر تیری یاد کو تازہ رکھے گی۔ بڑے نیک شریف بزرگ تھے۔ ''گذر پلاؤ'' کبھی کبھی خوش ہوکر خاص فقیر کے لیے پکاتے تھے۔ بڑا لذیذ پلاؤ ہوتا تھا۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے پاس بھی وہ تقریر محفوظ ہے یا نہیں۔ شاید ستار العیوب کا لطف خفی بھی اس تقریر کے گم ہوجانے میں کارفرما ہو۔ کیوں کہ لکھنے کی حد تک فقیر نے لکھ ضرور لیا تھا لیکن معنوی اور لفظی اغلاط کے انبار کے سوا جہاں تک میرا اندازہ ہے شاید وہ نوشتہ اور کچھ نہ تھا۔ اور نہ اس کے سوا وہ کچھ اور ہوسکتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی رسوائی اس کے باقی رہ جانے کی صورت میں کیسی اور کہاں تک پہنچتی۔

(۲) یہ فقیر کے کرم فرما میزبان کریم مولانا محمد موسیٰ الجوہانسبرغی الافریقی ثم الپاکستانی ہیں۔ شاید اپنے نام کا اظہار ان پر اب بھی گراں ہو۔ لیکن واللہ مخرج ماکنتم تکتمون کے لاہوتی قانون کا وہ کیسے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ حدیث بھی تو ہے لو ان رجلا عمل عملا فی صخرة صماء لا باب فیها ولا کوة خرج عمله الی الناس کائنا ما کان (رواہ احمد والحاکم صححہ) پھر یہ عمل تو محفلها ومجلسها کا عمل ہے راز نہاں بنکر کیسے رہ سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا کیا۔ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مسودے کو لے کر ایک صاحب مصر بھیجے گئے۔ اور مصر میں قیام کر کے اس عزیز الوجود گرامی منزلت کتاب کو بہترین کاغذ پر روشن اور مجلی ٹائپ کے حروف میں طبع کرا کے واپس آئے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وہی افادات قیمہ جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے احاطہ ہی میں خدانخواستہ گم ہو کر ختم ہو جائیں گے۔ چاہنے والے نے جب چاہا تو اسلامی دنیا کے مشارق الارض و مغاربہا کے آخری حدود تک ان کو پہنچا دیا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ کتنی نسلیں سرزمین ہند کے ان علمی اکتشافات سے مستفید اور تمتع پذیر ہوتی رہیں گی، قابل رشک ہیں۔ وہ لوگ جنہیں اس علمی فہم کی مختلف منزلوں میں حصہ لینے کی توفیق بخشی گئی۔ تاہم میرا یہ مظنہ اگر صحیح ہے کہ اپنی ساری کوتاہ نصیبیوں کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریروں کی قلم بندی کے سلسلے میں تقدم و سبقت کی نعمت سے ابتداء وہی دیوانہ سرفراز ہوا تھا جس کا جنون اس علمی امانت کے بار کا متحمل نہ ہو سکا۔ تو ارادی نہ سہی اضطراری سعادت سے چاہیے تو یہی کہ اسے بھی محروم نہ ٹھہرایا جائے جب ''ورقاء غفص ایکہ'' (بکائن کی شاخ پر کوکو کرنے والی فاختہ) کے ''فضل تقدم'' کا اعتراف کرتے ہوئے عرب کے شاعر نے کہا تھا۔ اور چڑیا تک کے متعلق انسانوں نے اقرار کیا کہ:

ولکن بکت قبلی فهیج لی البکاء ❁ بکاها فقلت الفضل للمتقدم

(لیکن فاختہ مجھ سے پہلے رو پڑی۔ اسی کے رونے سے مجھ پر بھی گریہ طاری ہوا۔

---

[۱] امام الکشمیریؒ کا حلقہ تلامذہ اگرچہ کافی وسیع و عریض ہے لیکن سمت دہد یا دولا بلکہ شکلاً وزیاً وریاً ان سے جتنا زیادہ قریب مولانا محمد بن موسیٰ کو میں نے پایا۔ فنائیت کی یہ کیفیت دوسروں میں کم از کم مجھے تو نہ ملی۔ نعم المال الصالح العبد الصالح کی شرح بھی جوہانسبرگ کے التاجر الامین ہی قالب میں، میرے سامنے پہلی دفعہ پیش ہوئی۔ ان کی ذرہ نوازیوں کو دل بھلا نہیں سکتا۔ میزبانی کا شرف چند دنوں کے لیے اس فقیر کو جب حاصل ہوا تھا۔ تو ان ہی کو نہیں ان کے گھر کے ارکان بلکہ نوکروں اور ملازموں میں بھی اکرام ضیف کے بہترین سلیقہ کا تجربہ ہوا تھا۔ فیض الباری بخاری کی شرح کشمیری اور اسی کے طفیل میں امام زیلعی کی تخریج ہدایہ دونوں کتابیں فقیر تک مولانائے موصوف کے بذل و نوال کے توسط سے پہنچیں فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔ اس موقع پر مولانا احمد رضا بجنوری ابدہ اللہ بروح منہ کا ذکر بھی مجھے کرنا چاہیے کہ مجلس علمی ڈابھیل انہی کی انتھک کوششوں کی رہین منت ہے اس مجلس کے ناظم وہی ہیں جنکا دفتر اب کراچی میں منتقل ہو گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب سے خویشگی کے پیوند کا شرف بھی مولانا کو حاصل ہے۔ طال اللہ عمرہ۔

اسی لیے میں نے مان لیا کہ برتری اسی کو حاصل ہوئی جس نے رونے میں سبقت کی)۔
شاید کہنے والا کہہ سکتا ہے:۔

میں جو رویا تو رو پڑی دنیا ❁ شور سے اپنے شور ہے برپا

بہر حال بقول شخصے کہ:

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد ❁ قیس مرحوم کو کریں گے یاد

اور میں ممنون ہوں کہ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مقدمہ میں صحیح مسلم کی گم شدہ مرتبہ املائی تقریر کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ جزاہم اللہ عنی خیر الجزاء۔

خیر قصہ تو حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم کلیات ہاتھ ان کے درس میں آجاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعہ سے شاید ساری عمر ان تک ہم جیسے نارساؤں کی رسائی آسان نہ تھی۔

حدیث کے متعلق "تواتر" کی اقسام چارگانہ کے سوا اصول حدیث کے الاعتبار کی اصطلاح کی شرح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی۔ حالانکہ تقریباً نصف صدی کے قریب زمانہ گذر چکا ہے۔ لیکن وساوس وشبہات، شکوک واوہام کی جو تاریکیاں اچانک میرے سامنے سے چھٹ گئی تھیں۔ اور سکینت وطمانیت کی جو لذت اس وقت میسر آئی تھی۔ دل میں اس کی خنکی اور حلاوت اس وقت تک موجود ہے۔ ایک ہی حدیث کے متعلق اعتبار کے قاعدے سے اعتماد اور بھروسہ کی جو منطقی قوت فراہم ہوتی ہے۔ صحیح طور پر اس وقت کے واقف ہو جانے کے بعد اپنی جبلت سے آدمی اعتماد کی اس کیفیت کے نکالنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ جو قدرتاً اس عمل کے بعد دلوں میں حدیثوں کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے (۱)۔

(۱) ایک ہی حدیث کی مختلف اسناد کا مقابلہ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ قدر مشترک سب کی روایتوں کا کیا ہے اور اختلافی عناصر اس میں کتنے پائے جاتے ہیں۔ جستجو کے بعد قدر مشترک کے متعلق یقین کرنا پڑتا ہے کہ راویوں کے ارادی یا اضطراری تصرف سے وہ پاک ہے۔ آخر خود سوچئے کسی کا پیغام دس آدمیوں کے ذریعہ آپ تک پہنچے۔ پہنچانے والوں کے بیان میں جو حصہ سب میں مشترک ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے متعلق بھی ماننا پڑے گا کہ کم از کم پیغام کا یہ مشترک حصہ ضرور اسی پیغام کا جز ہے جسے پیغام بھیجنے والے نے ہم تک روانہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر اعتبار کے اس عمل سے قدر مشترک کا کافی ذخیرہ دستیاب ہو جاتا ہے۔ عوام کو اندازہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن فن کے ماہرین دمذاق جانتے ہیں کہ اس معیار پر حدیثوں کا کتنا بڑا ذخیرہ شکوک وشبہات سے پاک بلکہ لفظی روایت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ جسے ''تواتر'' کی تقسیم کی روشنی میں حدیثوں کا متعد بہ معقول حصہ جزاحاد کی مظنونیت کے دائرے سے نکل کریقین واذعان کی قوت کا حامل بن جاتا ہے اسی طرح عموماً جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ روایت کرنے والوں نے بجائے الفاظ کے حدیثوں کے سلسلے میں زیادہ تر حاصل مطلب یعنی روایت بالمعنی کو اداء فرض کے لیے کافی قرار دیا ہے۔ کافی ہونے میں جیسا کہ بجائے خود یہ ثابت ہے روایت بالمعنی کے طریقہ پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ قطع نظر تفصیلات کے اور کچھ نہیں صرف ترجمہ ہی کی حقیقت اگر آدمی کے سامنے ہو تو روایت بالمعنی کی افادیت کے اعتراف پر وہ مجبور ہو جائیگا۔ آخر روایت بالمعنی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک ہی مطلب کو اسی زبان کے دوسرے الفاظ اور تعبیروں میں راوی ادا کرے جس زبان میں بات اس سے کہی گئی تھی۔ پھر ترجمہ میں تو دوسری زبان کے الفاظ میں مطلب کو ادا کرنا پڑتا ہے پس لفظوں صرف لفظوں کے ادل بدل جانے سے اگر یہ کلیہ ٹھہرالیا جائے کہ مطلب بھی ہمیشہ بدل جاتا ہے تو چاہیے کہ ترجمہ اور اس ذریعہ سے علوم وفنون کی جو اشاعت دنیا میں ہوتی ہے سب کو لغو اور مہمل قرار دیا جائے۔ جنون کے سوا خود سوچئے کہ یہ اور بھی کچھ ہے۔

لیکن قطع نظر اس سے حضرت شاہ صاحب نے ''الاعتبار'' کے جس طریقۂ عمل سے روشناس فرمایا تھا اس کی روشنی میں جیسا کہ شاہ صاحب نے بھی فرمایا تھا۔ حدیثوں کا بڑا ذخیرہ بجائے روایت بالمعنی کے روایت باللفظ کی مد میں داخل ہو جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ہم پاتے ہیں کہ مثلاً دس صحابی کسی روایت کو بیان کرتے ہیں۔ ان صحابیوں کی روایت میں مشترک الفاظ کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ براہ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہیں تو عقل کا تقاضا ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ عام حالات میں کسی مطلب کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے والوں کے الفاظ میں وحدت مشکل ہے۔ اعتبار کے طریقہ سے تائیدی روایتوں کو اصطلاحاً متابعات وشواہد کہتے ہیں۔ خاص خاص کتابیں اس عمل میں امداد دینے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ صحیح مسلم میں امام مسلم کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے

الاطراف کی کتابوں سے بھی کافی مدد اس راہ میں ملتی ہے۔

بہرحال یہ تو ایک علمی مسئلہ ہے۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ جیسے حدیث کے متعلق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں گرُ کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایسی باتیں جن سے تاثرات میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہوجاتا تھا۔ یہی حال دوسرے علوم وفنون کے متعلق تھا۔ درس تو ہوتا تھا حدیث کا لیکن شاہ صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے معلومات کا جو گرانمایہ قیمتی سرمایہ ان کے اندر جمع کردیا تھا وہ ان کے اندر سے بے ساختہ چھلکتے رہتے تھے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ قانون اور شریعت کے متعلق جو دو مختلف قدرتی فرائض ہیں۔ یعنی واقعات وحوادث پر قانون کو منطبق کرنا۔ ایک قاضی اور جج کا سب سے اہم فریضہ یہی ہے۔ اسی طرح قانون کے محدود کلیات سے ہر نئے پیش آنے والے حادثے کے متعلق حکم لگانا۔ یہ فرض مجلس وضع قوانین اور ارباب اجتہاد کا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ قانون کے مناط کی تقسیم کرتے ہوئے تنقیح مناط تخریج مناط، تحقیق مناط کے اقسام کو بیان کرکے جو سیر حاصل بحث ان اقسام پر کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ قضا (ججی) اور اجتہادی یعنی قانون سازی دونوں راہوں کی ایسی روشنی ان کی تقریر سے مہیا ہوتی ہے کہ دونوں پر چلنے والے انشاء اللہ اس کی روشنی میں بھٹک نہیں سکتے تھے۔ تفصیلات کے لیے ان کی مطبوعہ تقریروں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حالاں کہ اپنی حنفیت پر اصرار بلیغ تھا اور ائمہ اجتہاد میں ابوحنیفہؒ الامام کے مقابلہ میں دوسروں کا اجتہاد ان کو بہت کم متاثر کرتا تھا مگر بایں ہمہ یہ ان ہی کے درسی افادات کا شعوری اور کچھ غیر شعوری اثر ہے کہ اپنے دل کو اہل السنّت والجماعت کے تمام ائمہ اجتہاد امام مالک شافعیؒ اور احمدؒ کی عظمت سے بھی معمور پاتا ہوں۔ اور انہی کے سمجھانے سے یہ سمجھ میں آیا ہے کہ سارے اجتہادی مسائل جن میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، سب ہی حق ہیں۔ اور سب حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہیں۔

خیال آتا ہے کہ ائمہ اجتہاد میں حق دائر ہے۔ یعنی ان میں سے لاعلی سبیل التعین کوئی ایک حق پر ہے۔ بجائے اس کے شاہ صاحب نے طلبہ کو سمجھایا کہ سب ہی کو حق پر سمجھنا

چاہیے تو سرحد کے بعض خشک مزاج علماء پر یہ بات گراں گذری۔ اور مختلف قسم کے اراجیف کی اشاعت ان کی طرف سے طلبہ میں ہونے لگی۔ لیکن ان بیچاروں کو کون سمجھاتا کہ:۔

اشفق علی الرأس لا تشفق علی الجبل(۱)

بظاہر تصوف اور صوفیاء کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ اس طبقہ اور ان کے علوم ومعارف سے شاہ صاحب کو شاید چنداں دلچسپی نہیں ہے۔

لیکن وہی بھولے بسرے خیالات جو دماغ میں رہ گئے ہیں ان ہی میں دو باتیں میرے اندر اس طرح جاگزیں ہوگئی ہیں کہ تصوف کے نظری وعملی دونوں حصوں کے متعلق بعد کو جو کچھ بھی اس فقیر نے سوچا سمجھا زیادہ تر ان ہی دونوں کی روشنی میں سوچا اور سمجھا۔ حادث یعنی کائنات ومخلوقات کا قدیم یعنی خالق تعالیٰ جل مجدہ سے کیا تعلق ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں ''ربط الحدیث بالقدیم'' کا عنوان قائم کر کے اس سلسلہ میں جو کچھ فرماتے تھے یہی تصوف کے نظری حصہ کا بنیادی واساسی مسئلہ تھا۔ پہلی دفعہ شاہ صاحب نے اس مغالطہ کا ازالہ فرمایا کہ عوام الناس خالق ومخلوق کے تعلقات کو صانع ومصنوع یا معمار ومکان کی مثال سے سمجھنا چاہتے ہیں حالاں کہ مصنوع اپنے باقی رہنے میں چونکہ صانع کا محتاج نہیں رہتا۔ یعنی مکان کو مثلاً بن جانے کے بعد معمار کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ عوام کی سمجھ میں صحیح طور پر اسی لیے یہ نہیں آتا کہ پیدائش میں تو عالم خدا کا محتاج ہے۔ لیکن پیدا ہوجانے کے بعد عالم کو اپنی بقاء میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟ صوفیہ اسی وسوسہ کا ازالہ اپنے اس نظریہ سے کرتے ہیں جو ''وحدت الوجود'' وغیرہ ناموں سے مشہور ہے۔ اور جاننے والوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ صوفی وحدت الوجود کے جو قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان وحدت الموجود پر ہے، یعنی سارے موجودات ایک ہیں۔ حالاں کہ ''وحدت الوجود'' کی وحدت کو ''الموجود'' کی وحدت سے کیا تعلق۔

خاکسار نے اپنی کتاب ''الدین القیم'' میں اسی وحدت الوجود کے مسئلہ کی جو تشریح

---

(۱) یک عربی شعر کا مصرعہ ہے۔ ایک کوہی بکرا پہاڑ پر سینگ مار رہا تھا۔ اسی کو خطاب کر کے شاعر نے کہا تھا کہ اے بکرے! اپنے سر پر رحم کر پہاڑ پر شفقت کرنے کی ضرورت نہیں۔

وتفصیل کی ہے سچی بات یہ ہے کہ بنیادی اموراس کے شاہ صاحب کی تقریر ہی سے ماخوذ ہیں۔

اسی طرح حدیث جبرئیل جس میں ہے کہ ایمان اور اسلام اور احسان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسافر کے بھیس میں جبرئیل علیہ السلام نے سوالات کیے تھے اس حدیث میں ''الاحسان'' کے لفظ کا ترجمہ ہی شاہ صاحب نے ایسا کیا کہ تصوف کے عملی حصہ کی اصل خصوصیت سامنے آگئی۔ فرمایا تھا کہ احسان کا صلہ جب الی کے ساتھ آتا ہے تو کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اس کا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن صلہ کے بغیر صرف احسان کا ترجمہ ''حسن پیدا کردن'' کرنا چاہیے یہی یا قریب قریب اسی کے فارسی زبان میں احسان کا ترجمہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ عقائد واعمال اور زندگی کے ان تمام شعبوں میں جو مذہب کے دائرے میں داخل ہیں۔ ان کو بار ٹھہراتے ہوئے سر سے ٹالنا، ایک حال تو یہ ہوتا کہ لیکن ان میں ''حسن آفرینی'' کی کوشش بس یہی احسان ہے۔ اور تصوف کا مطلب یہی ہے کہ بجائے تکلیف کے دین ہی زندگی کا اقتضاء بن جائے۔ اور یوں دین کے ہر شعبہ میں حسن کے اندر حسن کا اور جمال میں جمال کا اضافہ کرتے چلا جانا چاہیے۔ یہی الاحسان کے مقام کا اقتضاء ہے۔ خیال آتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں ''المحسنین'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کا صحیح مصداق شاہ صاحب کے نزدیک مسلمانوں کا وہی طبقہ ہے جو دینی مطالبات کی تعمیل میں اپنے پیش نظر احسانی نقطۂ نگاہ کو رکھتا ہے(۱)۔

ان کی تقریروں کو سنے ہوئے عرض کر چکا ہوں کہ چالیس سال کے قریب زمانہ گذر چکا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا تحریری نوٹ جو میرے پاس تھا مدت ہوئی وہ بھی غائب ہو چکا ہے لیکن تصوف کے عملی حصہ کے متعلق زمانہ کی اس طویل مدت میں جو کچھ فقیر نے بعد کو پڑھایا سمجھایا لکھا زیادہ تر جوہری اثر سب میں شاہ صاحب کی اسی تقریر کا تھا۔ اگرچہ افسوس کے ساتھ اس کا بھی

(۱) بخاری وغیرہ کی مشہور حدیث ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیئ (الحدیث) سے بھی شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ پس جبرئیل امین سے جواب میں یہ جو فرمایا گیا یعنی خدا ہمیں دیکھ رہا ہے اس عام بین الادیانی غیر مشتبہ یقین کی روشنی میں چاہیے کہ عبادت کرتے ہوئے اپنے معبود خالق کائنات کے ساتھ ایسا ربط پیدا کیا جائے کہ عبادت کرنے والا گویا اس کو دیکھ رہا ہے، ساری کائنات اس کے لیے آیات اللہ اور خدا کی نشانی بن جائے۔ گویا الاحسان کے سمجھانے کی ایک مثال ''تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک'' کے جواب کو خیال کرنا چاہیے۔

اقرار کرنا پڑتا ہے کہ پڑھنے سمجھنے سمجھانے اور لکھنے لکھانے ہی کی حد تک میرا کام محدود رہا۔ اور کرنے کی توفیق میسر نہ آئی۔ لے دے کر اپنا سرمایۂ نازو احساس صرف وہی ہے کہ:

احب الصالحین ولست منهم ۞ لعل الله یرزقنی صلاحاً

لیکن آہ! کہ: میرا لعل اب لیت کے حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ جس چیز کو عمر بھر اچھا سمجھتا رہا اسی کو اپنی عملی زندگی میں داخل کرنے سے کیوں قاصر رہا۔ قسمت کی تہی دستی کے سوا اس کی اور کیا توجیہ کی جائے۔

شاہ صاحب کی بعض باتیں عجیب وغریب تھیں۔ بظاہر ان کے مطالعہ کا موضوع دینیات ہی کی کتابیں تھیں۔ لیکن جب عقلی مسائل پر اتفاقاً کچھ فرمانے کا موقعہ آجاتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نادان بچوں سے زیادہ ان کے سامنے بڑے سے بڑے فلاسفہ کی وقعت نہیں ہے۔ ایمان بسیط ہے یا مرکب، یعنی عمل بھی ایمان کا جزء ہے یا نہیں۔ علم کلام کا مشہور خلافیہ ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ مناطقہ (منطقی کے لفظ کی جمع عموماً معقولیوں کے متعلق اسی لفظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے۔ اور اسی کے ساتھ علیہم (۱) ما علیہم کے توبیخی الفاظ بھی اس موقعہ پر ان کی زبان مبارک سے خلافِ دستور نکل جاتے) بہر حال فرماتے کہ ان مناطقہ کی طرف سے ان لوگوں پر جو ایمان کی حقیقت میں سارے دینی اعمال کو شریک سمجھتے ہیں۔ ان پر اعتراض کرتے ہوئے جو یہ کہا جاتا ہے کہ جزء کے ارتفاع سے قاعدہ ہے کہ کل بھی مرتفع ہو جاتا ہے یعنی کسی کل کا کوئی جزء اگر غائب ہو جائے تو منطقی نقطۂ نظر سے کل کل باقی نہ رہا۔ اور اسی بنیاد پر ایمان کو مرکب حقیقت قرار دینے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی اسلامی عمل اگر نہ پایا جائے تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ ایمان ہی کا اس سے ازالہ ہو گیا اور وہ مومن باقی نہ رہا۔ حالاں کہ ایمان کو مرکب قرار دینے والے بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ایمان مرکب ہے، یا بسیط دلچسپ بات اس موقعہ پر شاہ صاحب جو فرمایا کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ذرا ان منطقیوں کی حماقت ملاحظہ کیجئے۔ درخت ایک مرکب حقیقت ہے۔ جڑ، تنہ، شاخیں، برگ و بار سب ہی

(۱) کبر و نخوت کے بیجا جذبات معقولیوں میں جو ابھر آتے ہیں یہ ان ہی کا ردعمل تھا۔

اس کے اجزاء ہیں۔ فرض کیجیے کہ کوئی ہلکا سا پتہ درخت کا گر گیا، تو منطقی کہہ دے گا کہ درخت باقی نہ رہا اس لیے کہ جزء کا ارتفاع کل کے ارتفاع کو مستلزم ہے۔ لیکن منطقیوں کے سوا کوئی انسان جب تک پاگل نہ ہو جائے کیا اس کا قائل ہو سکتا ہے کہ کسی ایک پتے کے جھڑ جانے سے درخت ہی ناپید ہو گیا۔ کل اور اجزاء کے صحیح تعلق کو بتاتے ہوئے فرماتے کہ دراصل ہر کل میں دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں بعض اجزاء کے نکل جانے سے تو کل یقیناً غائب ہو جاتا ہے۔ مثلاً گردن آدمی کی کٹ جائے سر اڑ جائے، دل نکل جائے۔ ان کے مقابلہ میں کل ہی کے بعض اجزاء ایسے بھی ہوتے ہیں جو جزء ہونے کے باوجود کل سے اگر غائب ہو جائیں تو کل باقی رہتا ہے۔ جیسے آدمی کا بال گر جائے انگلی کٹ جائے تو کیا کسی بال کے گر جانے سے زید اس لیے زندہ باقی نہ رہا کہ زید کے کل کا بال بھی ایک جزء تھا۔ یا کسی قلعہ کی دیوار کی کوئی اینٹ نکل جائے تو سمجھنا چاہیے کہ قلعہ ہی غائب ہو گیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ کثرتوں کو واحد تعبیر کے قالب میں لا کر کلی بنا لینا مناطقہ اسی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ اصل حقیقت سے اپنے آپ کو اندھا بنانے کی یہ بدترین شکل ہو سکتی ہے۔

فرماتے کہ میرے نزدیک اعقل الناس فی الناس اہل لغت یا زبانوں کے بنانے والے ہیں جو کائنات کے ایک ایک ذرہ کی خصوصیت پر نظر جما کر الگ الگ الفاظ بناتے ہیں۔ زبان اور لغت والوں کے بعد فقہاء کی تعریف کرتے اور ان کے عقلی رسوخ کی داد دیتے کہ مشتبہ مسائل کے مختلف پہلوؤں کو متعین کرا کر کے ہر ایک پہلو کے متعلقہ احکام کا سراغ لگانا چاہتے ہیں۔

الغرض ہر ہر چیز کے امتیازی اوصاف کا جاننا ان کے نزدیک کمال تھا۔ اور ان امتیازی اوصاف سے قطع نظر کر کے کلی کی لاٹھی جزؤں پر چلانا اندھے کی لاٹھی کے سوا ان کے نزدیک اور کچھ نہ تھی۔

بہرحال خاکسار کو دوسرے علماء اور شاہ صاحب میں جو کھلا ہوا فرق محسوس ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ عموماً لوگوں میں استعدادی علم پایا جاتا ہے یعنی اس پر قناعت کر لیا جاتا ہے کہ جب اپنے متعلقہ علوم کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو مسائل کے مالہا وماعلیہا سے واقف ہو جائیں گے۔ لیکن شاہ صاحبؒ کو عموماً ہر اس علم سے حضوری تعلق تھا جس سے وہ دلچسپی

رکھتے تھے۔ اوران علوم کے کلیات وجزئیات کا کافی ذخیرہ فعلیت کے رنگ میں ان کے حافظہ کے محافظ خانے میں اس طرح محفوظ رہتا تھا کہ جس مسئلہ کو چاہتے آسانی کے ساتھ اپنے حس مشترک کے سامنے لے آتے۔ طلبہ اسی لیے ان کے دماغ کو کتابوں کی الماری سے تشبیہ دیتے تھے۔ فقیر بجائے الماری کے اسے ایک مستقل کتب خانہ ہی خیال کرتا تھا۔

بہر حال وہ اپنے عہد کے طلبہ کی علمی بے بضاعتیوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے، مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے ان کی ولادت ووفات کے سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات اوران کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔ یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلبہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہوکر علم کے ذیلی ساز وسامان سے مسلح ہو جاتے تھے۔ یا کم از کم مسلح بننے کا ڈھنگ ان کو آجاتا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس اوراستاذ کے بس کی یہ بات ہے بھی نہیں کہ مطالعہ کیے بغیر جس بڑے عالم کا ذکر آجائے تو ان کے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے طلبہ کو آگاہ کرنے پر قادر ہو۔ یہ تو ان کے خصوصی حافظہ کا کمال تھا۔

ایک دلچسپ تجربہ شاہ صاحبؒ علیہ کے متعلق میرا یہ بھی تھا کہ اشخاص ورجال جن کا وہ تذکرہ درس میں فرمایا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر ایسی ہستیاں تھیں، جواب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ زندہ علماء کا ذکر مشکل ہی سے ان کے درس میں ہوتا۔ اور زندہ کیا سچ پوچھیے تو حافظ ابن حجر نویں صدی ہجری کے عالم ومحدث کے بعد والوں کے نام بھی ان کی زبان مبارک پر اتفاقاً ہی کبھی آتے ہوں۔ ان کے حلقۂ درس میں پہنچ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ درمیان کی چند صدیاں گویا حذف ہوگئی ہیں اور ہم نویں، آٹھویں اوران سے پہلے کی صدیوں میں گویا زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پچھلوں کا نہ وہ نام ہی عموماً لیتے تھے اور نہ ان کے کام ہی کا مدحاً یا قدحاً ذکر کرتے۔ انکا معاملہ بس ان ہی گذرے ہوئے اگلے بزرگوں تک محدود رہتا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ اپنے معاصر اور ہم چشم علماء کے متعلق ان کے تاثرات کا دریافت کرنا مشکل تھا۔ اور میرا تو خیال کچھ ایسا ہے کہ کسی قسم کا تاثر اس باب میں وہ رکھتے ہی نہ تھے۔ اس

ذریعہ سے حق تعالیٰ نے علماء کے ایک بڑے مہلک اخلاقی رذیل سے ان کو محفوظ فرمادیا تھا۔

اس سلسلہ میں معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ علماء کی علمی اور فنی تنقید کی طرف ان کے جذبہ کا رخ پھیر دیا گیا تھا۔ ان کی علمی چشمک اگر کچھ تھی بھی تو ان ہی وفات یافتہ بزرگوں سے تھی، حافظ ابن حجرؒ کے ساتھ ایک طرف ان کی غیر معمولی عقیدت کا حال یہ تھا کہ جبل العلم، حافظ الدنیا کے الفاظ سے ان کی مراد حافظ ہی ہوتی۔ لیکن شافعی ہونے کی وجہ سے اختلافی مسائل میں حنفی مذہب کے متعلق جہاں شاہ صاحب کو محسوس ہوتا کہ جان بوجھ کر حافظ سرد مہری اور لاپروائی سے کام لے رہے ہیں تو اس وقت مسکراتے ہوئے فرماتے۔ حافظ الدنیا نے اس موقعہ پر کف لسانی سے کام لیا ہے۔ کبھی کبھی ان کے طرزِ عمل کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے۔ جو آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتا ہے۔ اختلافی حدیثوں کے باب میں اصح مافی الباب کا ترجیحی طریقہ شوافع میں عموماً جو مروج ہے جب ان کے اس اصول کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ لیجیے علماء شافعیہ نے پتھے ٹٹولنے کا کام شروع کر دیا(۱)۔ عموماً وہ اس کا بھی موقعہ تلاش کیا کرتے کہ علاوہ حدیث کے اسلامی علوم کے طلبہ وعلماء کے لیے دوسرے متعلقہ علوم وفنون کے جن اصول وکلیات کا جاننا ضروری ہے ان کا بادنیٰ مناسبت ذکر فرماتے اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان کرتے جس کے سننے کے بعد معلوم ہو جاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتداء کس شکل میں ہوئی۔ اور کن کن نقاطِ نظر سے گذرتے ہوئے اپنے موجودہ حال تک پہنچا ہے۔ یاد آتا ہے ایک دفعہ مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو کسی زمانہ میں علی گڈھ کالج کے روحِ رواں جزء وکل یا کم از کم غیر معمولی مؤثر عنصر تھے۔ پچھلے دنوں جب علی گڈھ اور دیوبند کی درمیانی خلیج کی وسعت کم

(۱) مطلب یہ تھا کہ اسماء الرجال کی کتابوں کو اٹھا کر راوی پر جرح کر کے مخالف کی حدیث کو نا قابل لحاظ بنادیا۔ اور صرف رجالی رجسٹروں کی مدد سے کسی روایت کو ترجیح دینا، لیکن آثار صحابہؓ قرآنی آیات کے اقتضاء اور اسلام کے کلی قوانین اور اصول سے چشم پوشی کر لینا، حضرت شاہ صاحب شافعیوں کے اس طرز عمل کو رواتیوں کی ترجیح میں پسند نہیں فرماتے۔ اور جرح کرنے کے لیے رجالی رجسٹروں میں راوی کی کمزوریوں کو ٹٹولنا اسی کا نام انہوں نے پٹھا ٹٹولنا رکھ لیا تھا۔ فرماتے کہ یہ تو قصابوں کا کام ہوا جو جانور کمزور معلوم ہوا اسی کو ذبح کر دیا۔

ہو رہی تھی (۱) تو صاحب زادہ مرحوم کبھی کبھی دیوبند تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آ کر وہ بھی شریک ہوئے، واپس ہو کر میں نے خود ان سے سنا کہتے تھے کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر مرے سامنے آ گیا تھا۔ یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا۔

یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم پذیر رہتا تھا۔ خیال آتا ہے کہ کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے اسی کی مناسبت سے ان کا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہوتا۔ تو عموماً فرماتے دفاع ہو گیا مجھے اس مسئلہ کی طرف، ان دفاعی مسائل میں صرف ونحو، معانی، بیان، بدیع، وغیرہ فنون تک کے مسائل شریک تھے۔

عربیت سے تعلق رکھنے والے ان علوم سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ان علوم کی اعلی بنیادی کتابوں کا غیر معمولی فکر ونظر کے ساتھ انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کافیہ اور شرح جامی کے ساتھ مدارس کے عام مولویوں کا جو تعلق ہوتا ہے یہی تعلق شاہ صاحب کو سیبویہ کی الکتاب سے تھا۔ ابن عصفور جس کے نوٹ اور کچھ حواشی سیبویہ کی کتاب پر ہیں۔ اس نام کو پہلی دفعہ ہی خاکسار نے شاہ صاحب ہی سے سنا تھا۔ اور کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد پھر کسی مولوی کی زبان سے یہ لفظ سننے میں نہ آیا۔ دوسروں کی کیا کہوں سیبویہ کی اس الکتاب کے مطبوعہ نسخہ پر میری نظر تو ضروری پڑی ہے۔

(۱) ۱۳۲۸ھ میں دستار بندی کا مشہور تاریخی جلسہ کبیرہ دارالعلوم دیوبند کے احاطہ میں جب خاص شان آن بان سے منعقد ہوا تھا تو پہلی دفعہ علی گڈھ کالج کے نمائندے بنکر صاحبزادہ مرحوم اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے دیوبند پہنچے تھے۔ انگریزی خواں طبقہ کی طرف سے علماء دیوبند کی طرف رجحان کا اظہار گویا پہلی دفعہ عملی شکل میں ہوا تھا۔ علی گڈھ کی گرم پارٹی پر صاحبزادے صاحب مرحوم کا یہ اقدام کافی گراں ثابت ہوا تھا۔ اٹاوہ کے اخبار "البشیر" کے ایڈیٹر مولوی بشیر نے تو علانیہ صاحبزادے صاحب پر لعنت وملامت کی تھی، لکھا تھا کہ اس قسم کی للو چپو باتوں سے کچھ فائدہ نہیں ان مولویوں سے مصالحت کی امید فضول ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سیاست کی آندھی میں اچانک الٹ پلٹ گئے اور جس کا تصور بھی ناممکن تھا وہی سب دیکھا گیا اور دیکھا جا رہا ہے۔

شاید ادھر ادھر سے کچھ اس کو دیکھا اور پڑھا بھی ہوگا۔ لیکن ابن عصفور کے حاشیہ کے دیکھنے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا۔ معانی و بیان، بدیع کے مسائل میں الجرجانی کی دلائل الاعجاز۔ اسرار البلاغت یا زمخشری کی مفصل کے سوا تفتازانی وغیرہ مصنفوں کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ صاحب کو فقیر نے کبھی نہیں دیکھا۔

اصول فقہ میں وہ ابن ہمام کی تحریر کے گویا حافظ تھے۔ فقہ میں ابوبکر کاشانی صاحب بدائع شمس الائمہ سرخسی اور ابن نجیم صاحب بحرالرائق سے ان کو بہت متاثر پاتا تھا۔ شامی کے تفقہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چنداں بھروسہ نہیں فرماتے۔ صاحب ہدایہ کے بڑے مداح تھے۔ عموماً فرماتے کہ ابن ہمام کی فتح القدیر کی جیسی کتاب کے لکھنے کا ارادہ چاہوں تو کر سکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی کتاب لکھنے سے اپنے آپ کو قطعاً عاجز پاتا ہوں۔

ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ زبان کے کسی مشکل لفظ کی تشریح کرتے ہوئے یا کسی اور ضرورت سے عربی شعر کو پیش کرنا چاہتے تو گو شہادت کے لیے ایک مصرعہ یا ایک شعر ہی کافی ہوتا ہے لیکن یادداشت کی بے پناہ قوت کا نتیجہ تھا کہ ایک مصرعہ کے لیے بیس بیس پچیس پچیس بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعار والی نظموں کو مسلسل سناتے چلے جاتے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم طالب علموں کی حیثیت ٹھیک ان بھینسوں کی ہو جاتی تھی جن کے سامنے بجانے والا بین باجہ بجا رہا ہو اور غریب بھینس ٹک ٹک اس کو دیکھ رہی ہوں۔ دوسروں کے متعلق تو مجھے کہنے کا حق نہیں لیکن فقیر کی حیثیت تو اس وقت ''اخفش'' کے بز ہی کی ہو جاتی تھی۔ اپنی یافت اور سمجھ کے مطابق جیسا کہ عرض کر چکا ہوں شاہ صاحب کی تقریروں کو میں مسلسل نوٹ کرتا چلا جاتا تھا لیکن جب انشاد و شعر گوئی کا یہ جذبہ شاہ صاحب پر طاری ہوتا تو میرے قلم اور انگلیوں کو آرام کرنے کا قدرتی موقعہ مل جاتا۔

اسی لیے میری مرتبہ تقریر تقریباً شاہ صاحب کے ان سنائے ہوئے اشعار سے خالی تھی۔ شاید چند ضروری مصرعے یا اشعار مشکل ہی سے اس سلسلہ میں قلم بند ہوئے ہوں میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے۔ جنہیں جس وقت جی چاہتا وہ سنا سکتے تھے۔ فارسی ادب

کا مذاق بھی کافی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی درسی تقریروں میں فارسی کے موزوں اشعار کو ترنم کے خاص لہجہ میں استعمال فرماتے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ❁ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند(۱)

جب توحیدی کیفیت کا غلبہ ہوتا تو مسکراتے ہوئے حافظ کے اس مشہور شعر

مصلحت نیست کہ از پردہ برآں افتد راز ❁ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

کو خاص مستانہ انداز میں سناتے۔ فرماتے کہ جی ہاں! یہ سب بڑے میاں کی کارروائی ہے۔ اس وقت ایک خاص قسم کی سرمستی ان کے جبین مبارک کے اساریر میں چمکنے لگتی۔ عموماً یہی وقت ہوتا جب بٹوا کھولتے۔ چھالیاں اور زردہ نکال کر پان کے ساتھ استعمال فرماتے۔

اپنے باطنی حال کے اخفاء میں ان کی کوشش حد سے گذری ہوئی تھی۔ کھلنے کا موقع اتفاقاً کہیں آجاتا تو اسی وقت ظرافت اور طیبت کا لہجہ اختیار فرمالیتے۔ بظاہر عام مجلسوں اور صحبتوں میں ان پر سکینت و وقار کی خاموشی طاری رہتی۔ لیکن حلقۂ درس میں طیبت و مزاح کا جبلی رجحان ان کا نمایاں ہوجاتا اس وقت ان کی زبان مبارک پر معصومانہ انداز میں بڑے پُر کیف فقرے جاری ہوتے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کرتے کہ جی ہاں! ظرافت کی یہ مدوہاں بھی کافی وسیع ہے۔ بڑے صاحب کے یاں بھی اس کا تماشا پیش ہوگا۔ پھر مثلاً ان حدیثوں کا ذکر فرماتے جن میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض گنہگاروں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ ان ہی سے ان کے گناہوں کا اعتراف کرا کے حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ہر وہ گناہ جس کا اس نے اقرار کیا ہے اس کے مقابلہ میں اسے نیکی کا اجر دیا جائے۔ اقرار کرنے والا گنہگار اس حکم کو سنکر فرشتوں سے کہے گا کہ ٹھہرو! میرے گناہوں کی فہرست تو بہت طویل ہے جب ہر گناہ کے بدلہ میں نیکی کا اجر مجھے دیا جائے گا تو ان گناہوں کو بھی گن لو۔ او کما قال۔

صحیح مسلم ہی کی مشہور حدیث جس میں جنت کے داخل ہونے والے سب سے کمتر درجہ کے آدمی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جہنم سے نکلنے

---

(۱) تقدیر و تدبیر کے فرق کو بتاتے ہوئے عموماً اس شعر کو ضرور دہراتے۔ فرماتے تھے کہ خلیفہ بنانے کا فیصلہ تو بڑے صاحب نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ لیکن فیصلہ کا ظہور اس شکل میں ہوا کہ آدم سے غلطی صادر ہوئی اور نور میں پڑ جانے کا حکم دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ خلافت کا فیصلہ یہی تقدیر کی مثال ہے اور جس شکل میں اس فیصلہ کا ظہور ہوا اسی کو تدبیر کہتے ہیں۔

کے بعد اپنے سامنے ایک درخت کو پائے گا۔ عرض کرے گا کہ اے اللہ اس درخت کی چھاؤں کے نیچے پناہ لینے کی اجازت دی جائے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ اس سے اقرار لیں گے کہ اس سے زیادہ تو اپنے مطالبہ کو تو آگے نہ بڑھائے گا، تو قسم کھا کر اقرار کرے گا کہ بس اس سے زیادہ میں کبھی اور کچھ نہ چاہوں گا۔ اجازت دیدی جائے گی۔ یوں ہی ایک درخت کے بعد اس سے زیادہ گھنا اور درخت اس کے سامنے آئے گا اور اپنے معاہدہ کو توڑ کر اس کے نیچے جانے کی اجازت چاہے گا۔ تا آنکہ بالآخر سرکتے ہوئے وہ جنت کے دروازے پر پہنچ کر جنت میں داخل ہو جانے کی اجازت چاہے گا۔ اس وقت حق سبحانہ وتعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ:

"ما یصرفنی منک" تجھ سے میرا پیچھا آخر کون سی چیز چھڑائے گی۔

ایک فرمائش کے بعد اس سے زیادہ بہتر فرمائشیں کرتا ہی چلا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ارشاد ہوگا کہ:

"کیا اس پر تو راضی ہو جائے گا کہ تجھے ساری دنیا اور اس دنیا کے مانند دوسری دنیا دیدی جائے"۔

تب وہ غریب گنہگار عرض کرے گا:

یارب اتستھزء منی وانت رب العلمین آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں حالانکہ آپ سارے جہانوں کے مالک ہیں۔

حدیث کے راوی صحابی ابن مسعود رضی اللہ عنہ جب اس روایت کو بیان کرتے تو ہنسنے لگتے، اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یوں ہی اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے ہنستے تھے، جب آپ سے ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا تھا کہ:

"اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے یہ سن کر کہ سارے جہانوں کے مالک ہو کر مجھ غریب سے مذاق کرتے ہیں"۔

گنہگار کے اس فقرے پر خود اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائے گی اور اس کے بعد اس غریب بندے سے ارحم الراحمین فرمائیں گے کہ:

"میرے بندے میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا لیکن جو میرے جی میں آتا ہے وہ کرتا ہوں"

اس حدیث پر پہنچنے کے بعد شاہ صاحب کے جذبات چھپانے کے باوجود چھلک کر باہر آجاتے تھے، اور اس قسم کی عام حدیثوں کو "مد ظرافت" میں شریک فرما کر آگے بڑھ جاتے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ان پر خاص جذبہ طاری ہوتا، طلبہ کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے تم سمجھتے ہو کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں، حالاں کہ جانتے ہو، میری حیثیت بھی وہی ہے جو مدرسہ کے منیر خان (۱) کی ہے، منیر خان بھی چکی پیستے ہیں اور میں بھی دقیق ہوں، دقیق (آٹا) پیستا ہوں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، اسی موقعہ پر خیال آتا ہے کہ بسا اوقات انکی زبان مبارک سے فقیر ان الفاظ کو سنا کرتا تھا، فرماتے تھے کہ:

"مجھے کچھ چاہئے صرف دو پیالیاں کشمیری (۲) چائے کی، دلسکٹ ایک نیزا ایک گھوڑا"

بظاہر مطلب حضرت مرحوم کا یہ ہوتا کہ اصلی اور صحیح زندگی ایک مومن مسلم کی یہ ہے کہ "میدان جہاد" میں اپنا وقت صرف کرے، ان کے دل کی یہی حسرت حقیقی حسرت تھی، اس کے مقابلہ میں درس و تدریس تعلیم و تعلم کے جذبات کی انکی نظروں میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی، لیکن جیسے اللہ اور اس کے رسول (علیہ السلام (۳)) کے ساتھ اپنے صحیح تعلقات کو

---

(۱) مدرسہ کے ایک بوڑھے ان پڑھ ملازم منیر خان تھے، اور مسجد کے احاطہ کی طرف دروازے کے پاس ایک جھونپڑے میں مقیم تھے، عموماً مدرسہ کے تعمیری کاموں کے لیے چکی میں چونا پیسا کرتے تھے، معلوم نہیں ان کا انتقال کب ہوا شاہ صاحب کے درس میں ان کا اکثر تذکرہ اسی سلسلہ میں آتا رہتا تھا۔۱۲

(۲) مشروبات میں یہی قسم ایک مرغوب مشروبہ انکا تھا، نودرے کی چھت کے جنوبی سمت میں ٹھیک شمالی سمت کے اس کمرے کے مقابلہ میں جس میں شاہ صاحب اور حضرت شیخ الہند درس حدیث دیتے تھے، ایک کمرہ تھا کافی وسیع و عریض و طویل میرے زمانے میں شاہ صاحب کی قیام گاہ یہی کمرہ تھا، اس کے ایک گوشہ میں لوہے کے چولہے پر کشمیری چائے کی دیگچی چڑھی رہتی تھی، دودھ مل جانے کی وجہ سے اس کا رنگ گلابی ہو جاتا تھا، جب کبھی حاضر ہوتا اس دیگچی کو گرم ہی پاتا، اس ساغر کرم سے استفادہ کا موقع کبھی کبھی اس فقیر کو بھی میسر آجاتا تھا، منیجر اس چائے خانے کے مولانا ادریس تھے، شاہ صاحب کی مخلصانہ خدمت کی سعادت مدتوں مولانا کو میسر آئی۔ فهنيئاً ثم هنيئاً له۔

(۳) خاکسار کو شاہ صاحبؒ کے حلقۂ درس میں شرکت کی سعادت جن دنوں حاصل ہوئی تھی اس وقت تک ازدواجی تعلق سے آزاد تھے۔ عمر بھی انکی اس زمانہ میں بہ مشکل چالیس سال اور پچاس کے درمیان ہوگی، اس زمانہ میں ستر حال کی غیر معمولی کوششوں کا ان کے یہی رنگ تھا۔ لیکن پچھلے دنوں جب خاکسار حیدر آباد سے دار العلوم کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کے لیے آیا کرتا تھا تو اچانک دیکھا کہ شاہ صاحب کے سیاہ بال سفید ہو چکے ہیں، ایک دفعہ خیال آتا ہے، دورہ ختم ہو چکا تھا، عصر کی نماز کے بعد طلبہ کو وداعی خطاب سے سرفراز کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو اب ان کا رنگ ہی دوسرا تھا، رسالت مآب ﷺ کے ذکر پر اپنے آنسو کو ضبط کرنے کی قوت کھو چکے تھے، ذکر مبارک آتا تو آواز بھرا جاتی اور خاص حال میں طلبہ سے کہتے کہ جاؤ! ان ہی کے دین کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنا لینا۔۱۲

کوشش کر کے چھپانے کے عادی تھے، اسی طرح وہ اپنے دل کی اس آرزو کے متعلق بجائے لمبی چوڑی تقریروں کے صرف مزاجی کنایوں اور اشاروں میں کبھی کبھی فرما کر:

باہم نگرستیم گرستیم وگذشتیم

کے نفسیاتی اثر کے ساتھ گذر جاتے۔

دورہ اختتام کی حد پر جب پہنچتا تو اس وقت اپنے خاص انداز میں فرماتے کہ اب زیادہ دیر نہیں ہے میں مرغوں کا ڈبہ کھول دوں گا، یہ مرغے جو ہمارے ارد گرد جمع ہیں ڈبے سے نکلیں گے، دیکھتا ہوں کہ بلندیوں پر چڑھ چڑھ کر بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے کون بانگ دیتا ہے کسی کی آواز کتنی اونچی ہوتی ہے، اس قسم کے لطیفوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا کرتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔ **نور اللّٰہ ضریحہ و طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ کما ربّیٰنی صغیرا.**

حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ درس کی ایک خصوصیت کا خیال ہی نہ آیا، حالاں کہ درسِ انوری کا یہی لازمی جز تھا۔ شدتِ ظہور کہتے ہیں کہ کبھی خفا کا سبب بن جاتا ہے، جسے سب سے زیادہ یاد رہنا چاہئے تھا وہی یاد نہ آیا خیر قصہ یہ ہے مجھ سے پہلے، اور میرے بعد والوں کا مشاہدہ اس باب میں کیا ہے، لیکن میں نے تو یہی دیکھا تھا کہ صحیح مسلم کا درس ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ روزانہ ہوا کرتا تھا، اور پورا وقت علمی مباحث و مسائل کی شرح و تفسیر و تطبیق و ترجیح میں صرف ہوتا تھا، نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اور طلبہ کی طبیعت کے ملال، اور تکان کا خیال کر کے یہ طرزِ عمل شاہ صاحب نے اختیار کر رکھا تھا، یا فطرت میں ان کی ظرافت و مزاح کا جو فطری جذبہ پوشیدہ تھا یہ اس کا اقتضا تھا، کچھ بھی ہو، درس کے پہلے ہی دن سے دیکھنا شروع کیا کہ ہمارے ایک رفیق درس جن کا اسم گرامی غالباً مولوی محمد عیسیٰ تھا، شاید بکھرہ نامی قصبہ کے رہنے والے تھے، بیچارے بڑے متین اور سنجیدہ اور نیک آدمی معلوم ہوتے تھے، شدت نیکی کی وجہ سے تعلق ان کا علم کے ساتھ کچھ نیک ہی نیک سا تھا، شاہ صاحب کے متصل دست چپ کی طرف شروع ہی سے اپنی جگہ انھوں نے بنالی تھی، وقت پر ٹھیک اپنی اسی مقرر جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے، شاید کسی دوسرے طالب علم کی ہمت بھی نہ

ہوتی تھی کہ ان کی جگہ پر قبضہ کرے، ہوتا یہ تھا کہ کسی بلند و بالا مسئلہ پر شاہ صاحب کے معلومات کا بحر ذخار موجیں مارتا ہو چلا جارہا ہے، حافظ الدنیا اور شیخ ابن ہمام شمس الائمہ سرخسی ابن نجیم کا ذکر ہو رہا ہے کہ اچانک شاہ صاحب مولوی محمد عیسیٰ کی طرف تبسمانہ لہجہ میں مخاطب ہو جاتے اور ان کی طرف خطاب کر کے کچھ فرماتے رہتے، صحیح الفاظ تو اس وقت یاد نہ رہے اور الفاظ کی نوعیت ایک رہتی کب تھی تاہم حاصل یہی ہوتا تھا کہ جو کچھ بیان کیا گیا گویا مولوی محمد عیسیٰ صاحب سے اس کی تصدیق چاہی جارہی ہے، بیچارے مولوی عیسیٰ صاحب خاموش مسکرانے لگتے، سارا حلقہ اس وقت صرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تبسم ہی تبسم بن جاتا تھا۔ ''ہاں! مولوی عیسیٰ صاحب تو اب آپ کی رائے اس مسئلہ میں کیا ہے'' یہ یا اسی کے قریب قریب عموماً ان سے سوال کیا جاتا۔ بظاہر مولوی عیسیٰ صاحب کے وجود سے استرواح اور ازالہ ملال وسامہ کا کام لیا جاتا تھا، شاید ہی کوئی دن ایام درس کے اس طویل عہد میں ایسا گذرا ہو جس میں دلوں کے انبساط و انشراح کا یہ موقعہ اول یا آخر یا وسط میں نہ نکل آتا ہو۔ معلوم نہیں ہمارے یہ رفیق درس آج کل کہاں ہیں کس مشغلہ میں ہیں، اسی دنیا میں ہیں یا اپنے محبوب استاد اور سلف صالحین کے ساتھ لاحق ہو گئے، اگر اسی دنیا میں موجود ہوں تو ان سے معافی کا خواستگار ہوں، درس انوری کی اس خصوصیت سے سکوت پر دل راضی نہ ہوا۔ **اللّٰھم ارحمنی بعبادک الغز الکرماء.**

جیسا کہ میں نے عرض کیا اسلامی علوم وفنون کے دائرے کا شاید ہی کوئی علم یا فن ہوگا جس سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دلچسپی نہ تھی، اور ہر ایک علم وفن کے اصولی مسائل کے متعلق کوئی خاص تحقیقی نظریہ وہ نہ رکھتے ہوں، بلکہ عہد حاضر کے جدید کارآمد علوم کے صحیح معلومات کا بھی کافی ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا، خصوصاً ہیئت (اسٹرانومی) کی جدید تمام اصطلاحات کا انھوں نے تحقیقی و تفصیلی مطالعہ کیا تھا، انگریزی زبان سے ناواقف تھے، اگرچہ کبھی کبھی حلقۂ درس میں ہی فرماتے کہ ابتداءً جیسا کہ مجھے خیال آتا ہے کہتے تھے کہ کشمیر کے کسی عصری اسکول میں کچھ دن شریک ہونے کا موقعہ بھی ان کو ملا تھا لیکن فرماتے کہ انگریزی زبان وادب کے دو لفظ غالباً پگ (Pig) اور فش (Fish) یہی دو لفظ مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ ایک تو اسلامی عبادات کے متعلق کچھ دنوں سے "فیلاسوفی" نکالنے کا رواج جو چل پڑا ہے مثلاً وضوء باعث نشاط ہے، اور ورزش جسمانی کا فائدہ نماز کے قیام وقعود سے حاصل ہوتا ہے، ازیں قبیل مصالح وحکم ان شرعی امور کے جو بیان کیے جاتے ہیں شاہ صاحب ان کی تعبیر حکمت سے کرتے تھے اور فرماتے کہ ارباب قانون وتفقہ کی نظر حکمت پر نہیں، بلکہ حکم کی علت پر ہوتی ہے۔ مثلاً کہتے کہ سفر میں روزے کی تاخیر کی حکمت تو یہ ہے کہ مشقت سے بچانا مقصود ہے، لیکن سفر میں تاخیر صوم کی یہ علت نہیں ہے، اسی لیے ایسا مسافر جسے سفر میں روزہ رکھنے کی سہولت ہی کہیں میسر نہ ہو وہ تاخیر صوم کے اس قانون سے مستفید ہوسکتا ہے قانون کا فیصلہ یہی ہوگا۔

بہرحال شرائع کے متعلق حکمت نوازیوں کے اس مذاق کی شاہ صاحب حوصلہ افزائی نہیں فرماتے تھے اسی سلسلہ میں عموماً حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرکے سنایا کرتے تھے کہ کسی نے تشہد میں انگلیوں کے اٹھانے کی مصلحت یا حکمت آپ سے دریافت کی، تو سوال کو بے پروائی کے ساتھ سنتے ہوئے اور شاید یہ فرماتے ہوئے کہ ان باتوں میں کیا رکھا ہے جی میں آئے تو کہہ دیا جاسکتا ہے کہ انگلی تشہد کی اٹھا کر اقرار توحید اور دوسری انگلی کے بند کرنے کا مطلب یہ لیا لیا جائے کہ اسی توحید کے ساتھ اپنے دل کے اعتقاد کو نمازی وابستہ کرتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نماز وروزہ کے فلسفہ سے شاہ صاحب کو کوئی دلچسپی نہ تھی، اور جیسے کہتے ہیں کہ سور تو حرام اپنی نجاست کی وجہ سے ہے، اور آدمی کا گوشت بھی حرام ہے لیکن کرامت کی وجہ سے، اسی طرح حضرت شاہ صاحب کتابوں میں اگر کسی کتاب سے مرعوب اور حد سے زیادہ مرعوب تھے وہ اللہ کی کتاب قرآن تھا، قرآنی آیات کی تشریح وتفسیر میں آج جس طرح بے جا جسارتوں کا مشاہدہ ہم کررہے ہیں، اس کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن اور قرآنیات کے ساتھ شاہ صاحب کے سکوت کا راز کیا تھا۔

کبھی کبھی اس باب میں ان سے کچھ سنا بھی تو یہ سنا کہ بعض غالی عقیدت مندوں نے یہ جو مشہور کر رکھا ہے کہ دین اور دنیا کا کوئی کلی اور جزئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو، یا قرآن سے نکالا نہ جاسکتا ہو، اس خیال کی شدت کے ساتھ تردید فرماتے،

فرماتے کسی بڑے عجمی کا یہ شعر ہے کہ ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن ☆ تقاصر عنه افهام الرجال

یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں مگر لوگوں کی سمجھ اس کے پانے سے قاصر ہے، مگر اپنی تقریر کو بس اسی غلط خیال کی تردید تک محدود رکھتے، لیکن یہ سوال کہ پھر قرآن میں کیا ہے؟ یا اس کی بحث کا حقیقی موضوع کیا ہے، کم از کم اس باب میں ان کا کوئی خاص خیال مجھے معلوم نہ ہوسکا، بعض خانگی صحبتوں میں ڈرتے ڈرتے فقیر نے ایک دفعہ اس پہلو کے متعلق کچھ دریافت کرنا بھی چاہا، لیکن کچھ تو ان کے علم وتقویٰ اور شخصیت سے غیر معمولی مرعوبیت کی وجہ سے اپنے دل کی بات واضح لفظوں میں پیش نہ کرسکا، اور انھوں نے میرے اس سوال کو جس توجہ سے چاہئے تھا، سنا بھی نہیں، گو ''مشکلات القرآن'' کے نام سے ان کے بعض ارشد تلامذہ نے ایک مجموعہ شائع بھی کیا ہے لیکن میرا احساس اس کتاب کے بعد بھی یہی ہے کہ قرآن کی غیر معمولی عظمت وجلال ان کو اس کتاب کی طرف اس طریقہ سے متوجہ ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا جیسا وہ انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

بہر حال سیدنا الامام الکشمیری سے براہِ راست قرآن پڑھنے کا موقعہ تو مجھے نہ مل سکا، لیکن حدیث ہی کے درس میں جہاں دوسرے علوم وفنون کے مسائل کی طرف شاہ صاحبؒ کا ذہن موقعہ سے منتقل ہوتا رہتا تھا، اور اپنے اس ذہنی انتقال کا حضرت والا نے اپنی خاص اصطلاح میں ''دفاع'' نام رکھ لیا تھا۔

درس کی تقریر کرتے ہوئے قاعدہ تھا کہ بیچ بیچ میں فرماتے کہ ''دفاع ہوگیا'' اس وقت مجھے اصول فقہ کے فلاں مسئلہ کی طرف یا معانی وبیان وبدیع کے نکات کی طرف، پچھلے تینوں علوم یعنی معانی، بیان، بدیع جن میں عربی زبان کی نثر ونظم کے محاسن اور خوبیوں کے سمجھنے کا سلیقہ کلی قاعدوں کی مدد سے اس لیے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قرآنی تعبیروں کے اعجازی پہلوؤں کی یافت کی صلاحیت طلبہ میں نشو ونما پائے، لیکن بجز حضرت شاہ صاحبؒ کے کم از کم میں نے تو کسی مولوی کو نہیں دیکھا جسے صرف یہی نہیں کہ ان علوم کے مسائل مستحضر ہوں، بلکہ ان کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کی مہارت رکھتا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہ صاحب نے ان علوم کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور دلچسپی کے ساتھ کیا تھا، قرآنی آیات، حدیث کے فقروں، عربی زبان کے اشعار کے ساتھ کبھی کبھی فارسی بلکہ کبھی تو اردو تک کے اشعار کے ان پہلوؤں کو نمایاں کر کے طلبہ کے ادبی مذاق کو بلند کرنا چاہتے تھے کیوں کہ سخن طرازی اور عبارت آرائی کے لیے گو فطری مناسبت کی ضرورت ہے لیکن سخن سنجی اور سخن فہمی کا سلیقہ مصنوعی کدو کاوش سے بھی پیدا ہو سکتا ہے، مگر سچی بات یہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے درس کا یہ پہلو بھی عموماً طلبہ کے لیے کچھ غیر مفید ہی سا بن کر رہ جاتا تھا۔

محروموں میں دوسروں کے ساتھ خود یہ فقیر بھی تھا، تاہم اس ذریعہ سے کبھی کبھی قرآن وقرآنیات کے متعلق شاہ صاحب کے خصوصی نقاطِ نظر سے سننے کا موقع مل گیا، اور نہیں کہہ سکتا کہ ان گنی چنی باتوں سے کتنے بے شمار فوائد مجھے حاصل ہوئے مثلاً ایک خیال ان کا یہ تھا کہ:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ.

اور ہم نے آسان کیا ہے قرآن کو چونک پیدا کرنے کے لیے۔

یا اسی قسم کی دوسری آیتوں میں سہولت اور آسانی اپنی خصوصیت قرآن نے جو قرار دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآنی حقائق ومعارف کی گہرائیوں تک ہر کہ ومہ کی رسائی آسان ہے، بلکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کی مرضئ مبارک کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ قرآن میں پیش کیا گیا ہے اس کا ذکر کچھ ایسے انداز میں قرآن کے اندر کیا گیا ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری سمجھ میں وہ نہ آیا، اس بارے میں قرآن کا طریقۂ خطاب اتنا واضح صاف وشستہ اور روشن ہے کہ کوئی سمجھنا ہی نہ چاہے تو یہ دوسری بات ہے ورنہ قرآن اپنی حجت پوری کر چکا ہے، مثالاً توحید وشرک کے مسئلہ میں قرآن پڑھنے کے بعد بھی خود سوچنا چاہیے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بات میری سمجھ میں نہ آئی؟ قرآن پڑھنے اور سمجھنے کے بعد بھی مشرکانہ کاروبار میں کوئی الجھا ہوا نظر آئے تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ قصداً وارادتاً قرآنی مطالبات سے کترا رہا ہے، بلکہ کہا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ٹکرا رہا ہے اور بغاوت کی راہ اختیار کر رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اسی نکتہ کو فقیر کبھی کبھی اس تمثیل کے رنگ میں اپنے طلبہ کے آگے پیش کیا کرتا تھا کہ جمادات ونباتات، آب وآتش، خاک وبادوغیرہ کی شکلوں میں مادے کا جو ذخیرہ تمھارے سامنے پھیلا ہوا ہے، یہ خدا کا کام ہے، اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہر عامی وخاصی، جاہل وعالم کی ضرورت اس سے پوری ہو رہی ہے، بلکہ انسانوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہئے تو عقل سے جو محروم ہیں یعنی حیوانات بھی مادے کے اسی ذخیرے سے مستفید ہو رہے ہیں۔ان میں ہر ایک کی شخصی ونوعی بقاء کی ضمانت استفادے کے اس عام پہلو کے ساتھ وابستہ ہے، اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق سب ہی اسی سے اپنا اپنا حصہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے حاصل کرتے چلے آ رہے ہیں، اس وقت بھی حاصل کرر ہے ہیں، آئندہ بھی رہتی دنیا تک عام افادہ واستفادہ کا یہ قصہ تو یونہی جاری رہے گا لیکن اسی کے مقابلہ میں مادے کے اسی ذخیرے اور اسی کے مختلف مظاہر کے ساتھ تعلق ہی کی دوسری نوعیت وہ ہے کہ جو سائنس اور حکمت والے اس سے رکھتے ہیں، یہی مٹی یہی پانی یہی ہوا، یہی لوہا، یہی لکڑی، یہی معدنیات وجمادات ان کے سامنے بھی ہیں، جیسے ہر دیکھنے والے کے سامنے ہیں، مگر حکمت وسائنس والے انھیں پیش افتادہ چیزوں کے اندر غور کرتے ہیں، ٹٹولتے ہیں، ڈھونڈتے ہیں، تجربے کرتے ہیں اور آئے دن ان پر نت نئے نوامیس واسرار کا انکشاف ہوتا رہتا ہے اور کیسے کیسے انکشافات کہ ہم جن باتوں کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، آج ان ہی مادی انکشافات کی بدولت وہی ہمارے سامنے ہیں، سائنس والوں کے طفیل میں ہم بھی ان کو برت رہے ہیں، موٹروں پر چلتے ہیں، ہوائی جہاز پر اڑ رہے ہیں، گھر بیٹھے سارے جہان کی خبر سنتے ہیں۔

عرض کیا کرتا تھا کہ قدرت کے کام کا یہ رنگ جو نظر آ رہا ہے، کچھ یہی حال اس قدرتی کلام کا بھی ہے جسے ہم ''القرآن'' کہتے ہیں۔ ضرورت کی حد تک تو اس کتاب پر ایمان لانے والوں میں سے ہر ایک مستفید ہو رہا ہے۔اپنی اپنی حاجت کے مطابق اپنا اپنا حصہ ہر ایک اس قدرتی کلام سے حاصل کر سکتا ہے، اور کرر ہا ہے، لیکن اس قدرتی کلام کے ساتھ دوسرا تعلق ان لوگوں کا ہے جو تدبر وتذکر کی دولت سے سرفراز کیے گئے ہیں یہی لوگ اس قدرتی کلام کے

حکماء (سائنٹسٹ) ہیں، ان کو ان ہی آیتوں میں جنھیں پڑھنے والے پانچوں وقتوں کی نمازوں میں دہراتے رہتے ہیں، اسرار و رموز کا سمندر موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔

بعض روایتوں میں قرآن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے اس کی ایک شان کا اظہار:

لا تنقضی عجائبه ولا يخلق على كثرة الرد.

اس کے (یعنی قرآن کے) عجائب (یعنی ایسے انکشافات جو لوگوں کو حیرت میں ڈال دیں) ختم نہ ہوں گے اور بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے یہ کلام کبھی پرانا نہ ہوگا۔ کے الفاظ میں جو کہا گیا ہے سمجھنے والوں کے نزدیک ان الفاظ کا یہی مطلب ہے(۱)۔

میں نے مراجعت کی تو حسن اتفاق سے بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری میں قرآن کے متعلق حضرت شاہ صاحب کے اس نقطہ نظر کا بھی دیکھا کہ ذکر کر دیا گیا ہے، جامع تقریر نے حضرت شاہ صاحب کے مقصد کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے یعنی فرماتے تھے:

ليس معنى قوله تعالىٰ ولقد يسرنا القراٰن الاية ان كنهه يحصل لكل من جل وقل بل معنى يسره انه يغترف منه كل غليل ويشتفى منه كل عليل فيهتدى منه كل احد الى مايرضى به ربه والى مايسخط عنه ولا يحتاج فى ذلك الى كبير تنقير وتفكير، اما معانية الغامضه ومزاياه الرائقة ومراميه الناعمةفقد انقصمت ظهور الفحول عن ادراكها وعجزت الافكار عن التطواف حول حريمها. (فیض الباری، ص: ۸۷، جلد: ۴)

حق تعالیٰ کے ارشاد ولقد یسرنا القرآن (یعنی ہم نے قرآن کو آسان کر دیا) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر کہہ و مہ کی رسائی قرآن کے کنہہ اور تہ تک آسان کی گئی ہے،

---

(۱) تقریباً تیس اکتیس سال پہلے رسالہ "القاسم" میں خاکسار نے "کائنات روحانی" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کرایا تھا، جس میں قدرت کے کام اور قدرت کے کلام کی باہمی مشابہتوں کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بعد کو رسالہ کی شکل میں بعض قدر فرماؤں نے اس مضمون کو چھاپ دیا تھا، اب پھر بھی بعض تجارتی کتب خانوں میں یہ رسالہ مل جاتا ہے، غالباً مکتبہ الفرقان (لکھنؤ) گوئن روڈ میں اس کے کچھ نسخے ابھی محفوظ ہیں، کوئی صاحب دیکھنا چاہیں تو وہاں سے منگوا سکتے ہیں۔۱۲

بلکہ اس آسانی سے مراد یہ ہے کہ ہر پیاسے کو موقع دیا گیا ہے کہ اس سرچشمہ سے پی سکتا ہے، اور ہر بیمار اس سے اچھی شفا حاصل کر سکتا ہے یعنی جن باتوں سے اللہ خوش ہوتے ہیں، اور جن باتوں کو ناپسند کرتے ہیں ان کو وہ پا سکتا ہے اس کے لیے مزید کد وکاوسوچ بچار کی ضرورت نہیں باقی قرآن کے گہرے معانی اور اس کے عمیق شاداب پہلوؤں اور جن دل آویز حقائق کی نشان دہی اس کتاب میں کی گئی ہے، تو ان کی یافت آسان نہیں ہے مردانِ راہ کی پیٹھیں اس نے توڑ دیں، ان لطائف ورموز کے احاطہ تک پہنچنا، ان کے گرد چکر کاٹنا، اس نے بڑے بڑے سوچنے والوں کو تھکا مارا ہے۔

کیا قرآن میں سب کچھ ہے؟

لیکن اس کے ساتھ حضرت شاہ صاحب وقتاً فوقتاً طلبہ کو اس پر بھی متنبہ کرتے رہتے تھے، کہ قرآن کے نادان دوستوں میں یہ عامیانہ خوش اعتقادی جو پھیلی ہوئی ہے کہ ''قرآن میں سب کچھ ہے'' گویا کچھ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خدا سب کچھ چوں کہ جانتا ہے اس لیے چاہئے کہ اس کتاب میں بھی سب کچھ ہو۔

لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین .

نہیں ہے کوئی تر یا خشک بات مگر کتاب مبین میں سب کچھ ہے۔

یہ یا اسی کے ہم معنی وہم مفہوم آیتوں کو تائید میں پیش کر دیا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ اہل علم کے سنجیدہ طبقات میں اس قسم کی خوش اعتقادیوں کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی گئی، لیکن کھلے کھلے صاف الفاظ میں اس عامیانہ احساس کا ازالہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں بار بار مختلف پیرایوں میں جس زور اور قوت کے ساتھ کیا جاتا تھا اس کے تأثرات اب تک اپنے اندر پاتا ہوں، ان ہی کی زبان مبارک سے غالباً پہلی دفعہ یہ عربی شعر سنا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ کسی ''غبی'' کا شعر ہے کہ:

جمیع العلم فی القرآن لکن ۞ تقاصر عنہ افہام الرجال

(یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں، لیکن لوگوں کی سمجھ ان کے پانے سے کوتاہ ہو کر رہ گئی)۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے معلومات کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن کو خدا نے نازل کیا ہے۔ اگر یہ مانا جائے تو ساری کائنات بھی کاغذ کی شکل اختیار کر لیتی ہے جب بھی ''خدائی معلومات'' کے لیے وہ قطعاً کافی نہ ہوتے، میں تو کہتا ہوں کہ غریب جاہل آدمی بھی اپنی معلومات کو قلم بند کرنا چاہے تو ان کے لیے مجلدات کی ضرورت ہوگی پھر خدائی معلومات تو خدائی معلومات ہیں، اور معلومات کا اظہار اگر مقصود نہیں ہے، بلکہ نسل انسانی اپنے صحیح انجام تک علم و عمل کے جس نظام کی پابندی کر کے پہنچ سکتی ہے فقط اس نظام کے بنیادی کلیات سے آگاہ کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا ہے، اور یہی اس کتاب کی بحث کا اساسی وجوہری موضوع ہے بھی تو اس کے سوا قرآن میں خارج از موضوع معلومات کی تلاش کرنا، نہ صرف تلاش کرنے والوں کی غباوت و بلادت ہی کی دلیل ہے بلکہ قرآن کے نازل کرنے والے کی طرف ایک ایسے نقص کو منسوب کرنے کی یہ جرأت ہوگی جسے بہ ثبات عقل و ہوش کوئی صاحب تمیز و خرد آدمی بھی اپنی کسی تصنیف کے متعلق شاید برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر طب کی کسی کتاب میں شرح وقایہ کے فقہی مسائل یا شرح وقایہ میں امیر اور وداغ کے کلام کے تنقیدی مضامین کو جو ڈھونڈھے گا، اس کے جنون میں کیا کوئی شبہ کر سکتا ہے؟

یاد آتا ہے کہ مذکورہ بالا شعر کو شاہ صاحب اکثر دہراتے تھے۔ کبھی تو کہنے والے کو صرف ''غبی'' ہی کہہ دینے پر اکتفا کرتے تھے اور جب زیادہ جلال آتا تو کہتے کہ کس ''غبی الاغبیاء'' کا یہ شعر ہے(۱)۔

(۱) افسوس ہوتا ہے کہ افواہی قصوں تک بات محدود رہتی تو غنیمت تھا، صاحب نور الانوار ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ جو علماء ہند میں واقعی غیر معمولی فضل و کمال کے حامل ہیں، اپنے عنفوان شباب میں قرآن کی ایک مختصر سی تفسیر لکھی ہے جو تفسیرات احمدیہ کے نام سے مشہور ہے اس عمر میں ملا صاحب کی یہ کتاب واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس شاندار علمی مستقبل کی دلیل ہے جس کا مشاہدہ بعد کے لوگوں نے کیا، لیکن پھر بھی کم عمری کی وجہ سے تفسیر کے دیباچہ میں ان کے قلم سے فقرہ نکل گیا ہے کہ فما من شیئ الا یمکن استخراجه من القرآن (کوئی ایسی چیز نہیں جس کا نکالنا قرآن سے ممکن نہ ہو) اسی سلسلہ میں مثالاً لکھ دیا ہے کہ بعضوں نے تو قرآن سے علم ہیئت و ہندسہ نجوم کے مسائل بھی نکالے ہیں ملا صاحب کے اسی قول پر بمبئی کے کوئی مولوی جن کا نام ''المولوی رحیم بخش'' بتایا گیا ہے، اور لوح کتاب میں ان کے نام کے ساتھ آیۃ من آیات اللہ کے الفاظ بھی لکھے ہوئے ہیں، ان ہی المولوی رحیم بخش صاحب نے حاشیہ میں مزید اضافہ یہ فرمایا ہے کہ ہندسہ و ہیئت و نجوم ہی نہیں قرآن سے تو جبر و مقابلہ، نجامت، حداوت، نسج، غزل (یعنی سوت بنانے تاگا بانٹنے) فلاحت (زراعت) صباغت

قرآنی تعبیروں کے متعلق ایک عالمانہ نکتہ

بلکہ اس باب میں قرآن کے پیرایۂ بیان اور طریقۂ تعبیر کے ایک خاص پہلو کی طرف بھی شاہ صاحبؒ اشارہ فرمایا کرتے تھے۔ اس کو اگر سمجھ لیا جائے تو بہت سی غلط فہمیوں کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے اور بیسیوں بے معنی الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن میں مثلاً حکم دیا گیا ہے کہ کیا تم اونٹ کو نہیں دیکھتے، یا آسمانوں کو، پہاڑوں کو زمین کو نہیں دیکھتے؟

الغرض دیکھنا (نظر و بصر) ایک انسانی فعل ہے جس کو قرآن عموماً گردوپیش کی چیزوں کی طرف منسوب کرتا ہے، اب کوئی یہ کہنے لگے کہ آدمی درحقیقت صرف رنگ کو دیکھتا ہے، رنگ کو بھی نہیں بلکہ روشنی سے حقیقی تعلق آدمی کی قوت بینائی کا قائم ہوتا ہے، اور روشنی کے توسط سے رنگوں (ہرے، پیلے، سبز وغیرہ) کو دیکھتا ہے لیکن جو چیز نہ روشنی ہے اور نہ رنگ اس کے ساتھ تو بینائی کی قوت کا تعلق ہی پیدا نہیں ہوسکتا، بینائی کی گرفت میں ہوا مثلاً اسی لیے تو نہیں آتی کہ وہ بے رنگ ہے، اس میں شک نہیں کہ قدیم و جدید حکیمانہ تحقیق کا یہی صحیح نتیجہ ہے بھی۔ اب سائنس کی اس تحقیق کو بنیاد بنا کر قرآن پر کوئی معترض ہو کہ جو چیزیں نہ رنگ

(رنگریزی) طباخی وغیرہ فنون کے مسائل نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے، دعوی کر کے دلائل حق میں جن آیتوں کی یہ لوگ تلاوت کرتے ہیں تو وہی لطیفہ جاہل پیر کا یاد آجاتا ہے، پیر صاحب مریدوں کو باور کرار ہے تھے کہ قرآن میں سب کچھ ہے اتنے میں کسی نے آکر دریافت کیا کہ ایک شخص مر گیا ہے، دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اس نے ماں بھی چھوڑی ہے پھر اس کا ترکہ کس کو دیا جائے، پیر صاحب نے فرمایا کہ تو نے سورۂ تبت یدا ابی لهب نہیں پڑھی؟ اسی میں تو صاف لکھا ہے کہ "ما کسب" یعنی سب کچھ ماں کا ہے، ما قدروا الله حق قدره کے سوا ایسے موقعوں پر اور کیا پڑھا جائے یہ تفسیرات احمدیہ کے دیباچہ ہی میں ملا صاحب نے لکھا ہے کہ طالب علمی سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے، اور عمران کی اکیس سال سے متجاوز نہ ہوئی تھی، عالمگیرؒ کے ایام حکومت میں یہ تفسیر لکھی۔ (دیکھو ص ۸ مطبوعہ کریمہ بمبئی)۔ لا رطب ولا یابس وغیرہ جیسی آیتوں کا مطلب یہی ہے کہ اپنے خاص موضوع بحث کے لحاظ سے قرآن میں کوئی بات چھوٹ نہیں گئی، بشرطیکہ کتاب مبین سے مراد قرآن ہی ہو۔ تبیانا لکل شیء وغیرہ کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ تدمر کل شیء (راہ کی ہر چیز کو ڈھاتی چلی جاتی تھی) اس میں "کل" کا لفظ ظاہر ہے کہ منطقیوں کا موجبہ کلیہ کا سور نہیں ہے جس میں ہر شی داخل ہو، بلکہ ڈھے جانے کی صلاحیت جن چیزوں میں تھی اس کو آندھی برباد کر رہی تھی۔" ۱۲

ہیں نہ روشنی ان کی طرف بصر یا نظر (یعنی بینائی اور دیکھنے) کو منسوب کر کے قرآن نے ایک ایسی بات بیان کی ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض قرآن پر اعتراض کرنے والے کے مخبوط ہونے کی دلیل ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ اپنے احساسات و تأثرات کی تعبیر کا جو عام طریقہ انسانوں میں مروج ہے، اسی طریقۂ معتبر کو اختیار کر کے قرآن کی باتیں سمجھا جاتا ہے۔ اور قرآن ہی کیا؟ یوں بھی سائنس اور فلسفہ کے مسائل کا کوئی خبطی اپنی بیوی سے کہہ بیٹھے کہ ''تم کو اگر میں دیکھوں تو تم پر طلاق پڑ جائے''۔

اس کے بعد بیوی کو دیکھنے کے بعد دعویٰ کرے کہ میں نے بیوی کو کب دیکھا میں نے تو صرف اس رنگ کو دیکھا جو اس کے چہرے کی کھال پر چڑھا ہوا ہے، اور اس لیے کہتا پھرے کہ طلاق نہیں پڑی، پاگل خانوں کے سوا ایسوں کے لیے اور بھی کہیں جگہ ہو سکتی ہے؟

اس مثال کو سمجھانے کے بعد فرمایا کرتے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتیں جو پائی جاتی ہیں جن میں حرکت اور جاری ہونے کے تعلق کو آفتاب و ماہتاب کی طرف منسوب کیا گیا ہو مثلاً:

وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا. اور آفتاب اپنے ٹھکانے کے لیے جاری ہے۔

وغیرہ جیسی آیتوں میں یہی کہا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے بلکہ یہی ہے کہ اپنے مشاہدات و احساسات کی جو تعبیر عموماً لوگوں میں مروج ہے، اسی طریقۂ معتبر اور پیرایۂ بیان کو قرآن نے اختیار کیا ہے، جیسے نظر و بصر (بینائی) کو ان ہی چیزوں کی طرف قرآن نے منسوب کر دیا ہے، جس کی طرف منسوب کرنے کا رواج ہے، لیکن نظر و بصر کے متعلق جیسے یہ سمجھا جاتا ہے کہ واقعی بینائی کا حقیقی تعلق جن چیزوں سے ہوتا ہے، اس حقیقت کا اظہار، یہ قرآن کا مقصود نہیں ہے۔

اسی طرح آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی طرف جاری ہونے کے فعل کے انتساب سے یہ سمجھ لینا رات اور دن کا جو چکر ہمارے سامنے جاری ہے اس کی اصل حقیقت کو قرآن واشگاف کرنا چاہتا ہے، کیوں کہ اس کا مطلب تو پھر وہی ہوا کہ اپنی معلومات کو ظاہر کرنے

کے لیے قرآن کو حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔

لیکن جب معلوم ہو چکا کہ قرآن کے موضوع پر بحث سے جو جاہل ہے وہی اس قسم کی مالیخولیا میں مبتلا ہو سکتا ہے تو حوادث کائنات کی توجیہ و تاویل کے قصوں کو قرآن میں ڈھونڈنا اس سلسلہ میں قرآن کی طرف کسی قطعی فیصلہ کی جرأت خود اپنی عقل کی بھی اہانت ہے، اور ایسے عیب و نقص کو قرآن کی طرف منسوب کرنا جسے عرض کر چکا ہوں، کوئی صحیح العقل آدمی بھی اپنی تصنیف میں پسند نہیں کر سکتا، دیوانہ ہی ہوگا جو تاریخ کی کتاب میں ڈاکٹری نسخوں کا ذکر چھیڑ دے یا طب کی کتاب میں شعر و ادب کی تنقید ڈھونڈھنے لگے۔

بہر حال رات اور دن کے الٹ پھیر کے واقعی اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، زمین گھومتی ہو یا آفتاب چکر لگا رہا ہو، یا آسمان گردش میں ہو، قرآنی مباحث کے دائرے سے یہ سوالات خارج ہیں۔

شاہ صاحبؒ یہی فرمایا کرتے تھے کہ اس سلسلہ میں اپنی تعبیروں کو عام انسانی احساسات کے مطابق اگر قرآن رہنے نہ دیتا، مثلاً رات دن کے اسی قصہ میں اعلان کر دیتا کہ زمین کی گردش کا یہ نتیجہ ہے تو مطلب اس کا یہی ہوتا کہ جب تک زمین کی گردش کا مسئلہ طے نہ ہوتا قرآن پر ایمان لانے سے لوگ محروم رہتے۔

کہا کرتے تھے کہ لوگ دن و رات ہی کے ایک قصے میں الجھے ہوئے ہیں لیکن حقیقت کی پیش گاہ میں انسانیت جب داخل ہوگی، السرائر... پوشیدہ حقائق ابل کر اپنی اصلی شکلوں میں جب سامنے آجائیں گے تو اس وقت پتہ چلے گا کہ دن اور رات کے الٹ پھیر ہی کی صرف یہی ایک بات نہیں بلکہ جو کچھ دیکھا سنا جا رہا ہے، چکھا اور چھوا جا رہا ہے(۱)۔

(۱) چھونے سے قوت لامسہ کی بو العجبیوں کو دیکھئے، موسم سرما میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ کنوؤں کا پانی گرم ہو جاتا ہے، اور کتنا گرم کہ تازہ پانی ڈول میں نکالا جاتا ہے تو تھوڑی دیر تک اس سے بھاپ بھی نکلتی رہتی ہے، لیکن تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ کنویں کا پانی کا ٹمپریچر (درجۂ حرارت) جو گرمی کے موسم میں رہتا ہے، سردیوں کے موسم میں کسی قسم کی تبدیلی اس میں نہیں ہوتی، البتہ پانی کے چھونے والوں کی قوت لامسہ سردیوں میں ٹھنڈک سے متاثر ہو جاتی ہے، یعنی ہاتھ آدمی کا زیادہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اس لیے کنویں کے پانی کا درجۂ حرارت کے احساس میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور وہی پانی جو گرمی میں ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا، سردیوں کے موسم میں معلوم ہوتا ہے کہ گرم ہے، شدت برودت اور ٹھنڈک کے بڑھ جانے کی وجہ سے بخارات جو

الغرض ہمارے احساسات کا بڑا حصہ معلوم ہوگا، اس کی نوعیت حالات سے مختلف ہے جنھیں اس وقت ہم پا رہے ہیں گویا وبدا الھم من اللہ مالا یعلمون کی قرآنی خبر چہرے سے نقاب الٹ کر سامنے آجائے گی، تب پتہ چلے گا کہ ہم کیا سوچتے تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

یہ بھی کبھی کہا کرتے کہ لیل ونہار کا انقلاب زمین کی گردش کا نتیجہ ہے، حالاں کہ علم کے عصری حلقوں میں اس کو ایک ثابت شدہ غیر مشتبہ فیصلہ قرار دیا جا چکا ہے، لیکن بایں ہمہ بولنے والے اب بھی جب بولتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے، طلوع ہو رہا ہے، سورج سمت الراس پر آگیا، یہ کیا ہے؟

وہی بات کہ افہام وتفہیم میں عام قاعدہ یہی ہے کہ عام احساسات کے مطابق تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں، بجائے اس کے کوئی طلوع کی اطلاع دیتے ہوئے کہنے لگے کہ گھومتے ہوئے زمین اس نقطہ تک پہنچ گئی ہے جہاں سے آفتاب کا کنارہ دکھائی دیتا ہے، اور خیال کریئے کہ واقعہ کی صحیح نوعیت یہی ہے، ممکن ہے کہ واقعہ بھی ہو(۱)۔ لیکن طریقۂ تعبیر

گرمی وسردی ہر زمانہ میں پانی سے اٹھتے رہتے ہیں ان ہی بخارات میں فضا کے ٹھنڈے ہونے کی وجہ سے تکالیف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھاپ نکل رہی ہے۔ دیکھا آپ نے واقعہ کیا ہے لیکن اس واقعہ کے متعلق ہمارے احساسات کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی بیسیوں مثالیں سائنس کی کتابوں میں آپ کو مل سکتی ہیں ۔۱۲

(۱) مطلب یہ ہے کہ انقلاب لیل ونہار یعنی رات دن کے الٹ پھیر کا مشاہدہ تو ایک عام مشاہدہ ہے مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا چراغ گھوم رہا ہے؟ یا چراغ سے جو چیز روشن ہو رہی ہے اس کی گردش سے الٹ پھیر کی یہ صورت سامنے آتی ہے، حقائق کائنات پر غور کرنے والوں کے حلقہ کا یہ پرانا سوال ہے حکیم فیثاغورس کا دعویٰ تھا کہ چراغ یعنی آفتاب نہیں بلکہ زمین ہی آفتاب کے گرد چکر لگا رہی ہے، مگر بطلیموسی نظام میں فیثاغورس کے اس نظریہ کو رد کر دیا گیا ہے اور شب وروز نیز موسموں کی تبدیلیوں کی توجیہ یہ تسلیم کی جاتی رہی کہ آسمان گھوم رہا ہے جیسا کہ معلوم ہے پچھلے دنوں یورپ کے بعض ارباب نظر نے مختلف آلاتی تجربات سے فیثاغورس کے پرانے خیال کو زیادہ قرین قیاس پایا، اور ہمارے زمانہ کی جدید ہیئت کے سارے نتائج اس مسلمہ پر مبنی کر کے پیدا کیے جاتے ہیں۔ لیکن زمین کی حرکت کی نوعیت اس وقت تک غیر منفصل ہے۔ حال میں ایک روسی ریاضی داں الگونڈر رازوٹاف کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ یک ہی محور پر زمین گردش نہیں کر رہی ہے، جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ ازوٹاف کے نزدیک تین تین محوروں پر زمین گھوم رہی ہے جن میں ایک محور قطبی ہے اور دو استوائی، استوائی گردش دو محوروں پر ہو رہی ہے، اس کی دلیل پروفیسر موصوف یہ پیش کرتے ہیں کہ قطبین کا ارتعاش دائرے میں نہیں، بلکہ اہلیلج میں ہوتا ہے ان کا خیال یہ بھی ہے کہ خط استواء کو دائرہ کی شکل میں جو تصور کیا جاتا ہے صحیح نہیں بلکہ اہلیلجی نما یا بیضوی ہوتا ہے (صدق جدید ۲۱ مارچ ۱۹۵۲ء بی، ٹی، آئی کے حوالہ سے اس علمی خبر کو نقل کر کے

غلط ہے، آپ نے ملازم کو حکم دیا کہ بالا خانے پر چڑھ کر دیکھے آفتاب نکلا یا نہیں؟ دیکھنے کے باوجود آپ کا فلسفی ملازم یہ فلسفہ بگھارنے لگے کہ آفتاب مجھے نظر نہیں آیا، اور مطلب یہ لے کہ میں نے جس چیز کو دیکھا یعنی روشنی وہ آفتاب کی نہ تھی، اور واقع میں جو آفتاب ہے وہ مجھے نظر نہ آیا؟ خود ہی بتائیے کہ اپنے اس فلسفی ملازم پر آپ کا غصہ تھم سکتا ہے(۱)؟ یا وضو کے لیے ملازم سے کہا جائے کہ کنویں کا گرم تازہ پانی نکال کر لاؤ، ملازم یہ سوچ کر کہ پانی کا درجۂ حرارت تو گرما اور سرما دونوں موسموں میں ایک ہی رہتا ہے، نہ جائے اور کہنے لگے کہ پانی کنویں کا گرم کب ہوتا ہے جو لاتا، تو اس کی ملازمت کے سلسلہ کو اس کا فلسفہ آئندہ کیا جاری رہنے دے گا؟۔

شاہ صاحبؒ کے اسی خیال نے تو میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا، کہ قرآنی آیات کو محکمات و متشابہات دو حصوں میں تقسیم کر کے قرآن ہی میں جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ جن

مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے اور بالکل صحیح ارشاد ہوا ہے کہ ریاضیات جیسے علوم جن کے مسائل سمجھے جاتے ہیں کہ فیصلہ کن قطعی ہوتے ہیں جب ان کا یہ حال ہے تو تخمین وظن پر جن علوم کے نظریات کی بنیاد قائم ہے مثلاً معاشیات (اکانومی) عمرانیات (شوشیالوجی) وغیرہ کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ ۱۲)

(۱) قرآن میں بعض مقامات پر اس قسم کی آیتیں بھی ملتی ہیں مثلاً ذوالقرنین کے قصے میں ہے کہ آفتاب کو سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں ڈوبتے ہوئے اس نے پایا یعنی وجدھا تغرب عین حمئۃ اس میں تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ آفتاب کے غروب کی حقیقت نہیں بیان ہو رہی ہے۔ بلکہ ذوالقرنین کے وجدان اور یافت کی یہ تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین یہ پا رہا تھا کہ سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں آفتاب ڈوب رہا ہے اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس قسم کی تعبیروں میں قرآن کے سامنے بجائے واقعہ کے پانے والوں کے وجدانات اور احساسات ہوتے ہیں، یہاں پر تو الفاظ بھی ایسے استعمال کیے گئے ہیں جن سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ دیکھنے والے کے احساس کے مطابق تعبیر اختیار کی گئی ہے، لیکن اس کو اب کیا کہیے کہ بعض لوگوں نے اسی آیت کی بنیاد پر یہ دعوی کر دیا تھا کہ مغرب کے وقت آفتاب جیسا طویل وعریض جسم جس کے مقابلہ میں زمین کا ہمارا کرہ رائی کے دانہ سے زیادہ وقیع نہیں اسی زمین کے کسی چشمہ میں آفتاب سما جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے، اگرچہ ابتداء ہی سے مفسرین اس قسم کی غلط اندیشیوں کی تصحیح کرتے چلے آئے ہیں، مگر اتنی بات تو بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ تصریح کے باوجود جب قرآن کے طریقہ تعبیر کو بعض لوگ نہ سمجھ سکے تو جہاں اس قسم کی تصریحات نہیں ہیں وہاں قرآن کے موضوع پر بحث سے ناواقف لوگوں کو کچھ غلط فہمی ہو جائے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، جہاں تک میں جانتا ہوں کھلے کھلے صاف الفاظ میں قرآن کے طریقۂ تعبیر کے اس پہلو کو شاہ صاحب سے پہلے شاید ہی کسی نے اتنی قوت کے ساتھ واضح کیا ہو۔ ۱۲

کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہے، وہی فتنہ انگیزیوں کے لیے متشابہ آیتوں کی تاویل وتوجیہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، فرمایا گیا ہے کہ:

فالذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابه منهم ابتغاء الفتنۃو ابتغاء تاویله.

کچھ ادھر دھیان جاتا ہے کہ قدرت کے کلام کی یہی خصوصیت قدرت کے کام میں بھی نظر آتی ہے، یعنی جیسے کلامی آیات کی ایک قسم وہ ہے جس کا نام متشابہات رکھا ہے، اسی طرح کائناتی آیات اور نشانی آیات اور نشانیاں جنھیں صحیفۂ قدرت پر حق تعالیٰ نے نمایاں فرمایا ہے، ان آیات کے بھی بعض مظاہر کی نوعیت تقریباً ''متشابہات'' ہی جیسی نظر آتی ہے، بجائے خود کائناتی آیات کے متشابہات کی تاویل وتوجیہ انکے اسباب وعلل کا سراغ اور ٹوہ لگانا یہ دوسری بات ہے۔

لیکن بعض لوگ جنھیں درحقیقت نہ حکمت اور سائنس ہی کا ذوق ہوتا ہے، اور نہ دین اور مذہب ہی کی قدرو قیمت کا انھیں صحیح اندازہ ہوتا ہے، لیکن اپنے قلبی زیغ اور ذہنی کجی کی وجہ سے خواہ مخواہ ان کو اس کا شوق ہوتا ہے کہ کائناتی آیات کے متشابہات یعنی جن کی توجیہ وتاویل میں مختلف پہلو پیدا ہوسکتے ہیں، ان کے درپے ہوجاتے ہیں، اور دینیات وعقلیات کے تصادم وتناقض کا ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔

مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ **الراسخون فی العلم** کا مذاق متشابہات کی دونوں قسموں کے متعلق کتنا صاف وپاک، ستھرا اور اجلا ہے، ہر ایک کے متعلق اپنے اندر:

اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران)

ہم سب ہی کو مانتے ہیں سب ہمارے پروردگار کے پاس کی چیزیں ہیں، اور نہ چونکتے مگر وہی لوگ جو مغز والے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ متشابہات خواہ قدرت کے کلام سے ان کا تعلق ہو، یا قدرت کے کام سے، دل میں زیغ اور ٹیڑھ ہو تو دونوں ہی سے فتنہ انگیزی اور فساد پردازی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن جن کا علم راسخ ہے اور قلب سلیم ہے وہ جانتے ہیں کہ قدرت ہی نے جن آیات اور نشانیوں میں ''تشابہ'' کا رنگ بھرا ہے ان میں بہرحال یہ رنگ باقی ہی رہتا ہے، اس رنگ

کو دور کر کے ''متشابہات'' کو بھی ''محکمات'' کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش سچ پوچھئے تو قدرت اور اس کے قوانین سے کش مکش کی یہ گستاخانہ کوشش ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ مادّی کائنات اور قرآنی آیات جنھیں اپنی خاص اصطلاح میں فقیر ''روحانی کائنات'' بھی کہتا ہے، ان دونوں قدرتی آیات اور نشانیوں میں مشابہت ومجانست کے جہاں بیسیوں وجوہ خاکسار پر واضح ہوتے ہیں، جن میں بعضوں کا تفصیلی ذکر آپ کو میرے رسالہ ''کائناتِ روحانی'' میں ملے گا۔

مناسبت ومشابہت کے ان ہی پہلوؤں میں ایک یہ بھی ہے کہ قدرتی آیات کے ان دونوں ہی شعبوں میں محکمات کے ساتھ ساتھ ایسی آیتیں اور نشانیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کو ''متشابہات'' کے سوا ہم اور کچھ کہہ نہیں سکتے۔ دونوں ہی کی توجیہ وتاویل میں مختلف شکوک اور احتمالات پیدا ہوتے ہیں۔

یہی رات دن کے الٹ پھیر کے قصہ میں دیکھئے، مادی کائنات کے بے شمار مشاہدات میں ایک مشاہدہ یہ بھی ہے۔ لیکن یہ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ سن چکے کہ مادی کائنات کی اس آیت اور نشانی کی توجیہ میں سوچنے والوں کا دھیان کن کن باتوں کی طرف گیا، ہزار ہزار سال گذر چکے ہیں، بیسویں صدی عیسوی کا نصف حصہ بھی گذر چکا ہے لیکن قطعی اور محکم فیصلہ جس میں آئندہ کسی ترمیم کی گنجائش باقی نہ رہے، اس وقت تک طے نہ ہوسکا، زمین ہی کی گردش کا نتیجہ اسکو مان لیا جائے، جیسا کہ اس زمانہ میں مان لیا گیا ہے لیکن خود زمین کی اس حرکت اور گردش کی نوعیت کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ خبر آپ تک پہنچا چکا ہوں کہ صحیح معنوں میں اب تک متعین نہیں ہوئی ہے۔

یورپ وامریکہ کے حکماء اس باب میں جو کچھ مان چکے تھے پھر بحث طلب مسئلہ بن گیا ہے، اور خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ سوچنے والے اس راہ میں کن کن خیالات اور تجویزوں کو پیش کرنے والے ہیں، اور اسی کو میں ''تشابہ'' کہتا ہوں۔ یہ مثال تو مادی کائنات کی ایک قدرتی آیت اور نشانی کی ہوئی، اب روحانی کائنات میں آئیے، دور کیوں جائیے، اسی رات اور دن جس کا بہرحال سورج کی روشنی ہی سے تعلق ہے جس وقت تک اس کے جس حصہ پر سورج کی

روشنی پڑتی ہے، اس حصہ کا وہ وقت دن ہے اور روشنی اس کی جب اس حصہ سے غائب ہو جاتی ہے تو وہی رات اس حصہ کی قرار پاتی ہے۔

قرآن میں اسی سورج کی طرف تجری کا لفظ منسوب کیا گیا ہے، لیکن یہ ہمارے عام احساس کی تعبیر ہے یا خالق کائنات کے علم میں واقعہ کی جو صحیح نوعیت ہے، اسی واقعہ کے مطابق تجری کے اس لفظ سے اپنے علم کو حق سبحانہ تعالیٰ ظاہر فرمانا چاہتے ہیں؟ ذہن دونوں پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے، یہی "تشابہ" کا اقتضاء ہے پھر جن کے دلوں میں کجی ہوگی اور زیغ سے جن کے قلوب ماؤف ہیں وہ اس سے فتنہ انگیزی کا کام لے سکتے ہیں لیکن راسخ علم والے امنا بہ کل من عند ربنا کو متشابہات کے متعلق اصل قرار دے کر تاویل کی راہ اگر اختیار بھی کریں گے تو وہ ایسی راہ ہوگی جس سے بجائے بھڑکنے کے فتنوں کے دبانے میں مدد مل سکتی ہے۔

شاہ صاحبؒ کی اسی توجیہ کو دیکھئے، گردش لیل ونہار کی وجہ خواہ کچھ ہو، آسمان یا آفتاب یا زمین کے گھومنے کا یہ نتیجہ ہو، یا آئندہ اس انقلابی مشاہدے کے متعلق سوچنے والوں کا کوئی نیا راز واضح ہو، کچھ بھی ہو ہر حال میں قرآن کے حریم ادب کا تقدس واحترام قائم ودائم باقی برقرار رہتا ہے، اس کے سر پردۂ عصمت وجلال کو حکمت وسائنس کا کوئی نتیجہ بھی ہو چھو بھی نہیں سکتا، یوں فلسفہ وحکمت کے سیمیائی نظریات اور موسمی تاثرات کی دست نگری سے قرآن پر ایمان لانے والے جیسے آزاد رہتے ہیں ٹھیک اسی طرح کائناتی آیات اور نشانیوں کی توجیہ وتاویل، تلاش وجستجو کے اطلاقی اختیارات پر بھی قرآن کی طرف سے کسی کی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی، ایمان بھی آزاد، اور عقل بھی آزادی اپنی اپنی راہوں پر دونوں ہی کسی تصادم اور کش مکش کے بغیر سرگرم سیر رہتے ہیں۔

یقین کیجئے کہ دانش کی پختگی، علم کا رسوخ، خواہ قرآنی آیات میں ارزانی ہو، یا کائناتی آیات میں میسر آئے، ہمیشہ اس نے اسی خوشگوار ماحول کو پیدا کیا ہے، لیکن خام فکروں، خام کاروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر پکی باتیں بھی کچی بن جاتی ہیں[1]۔ عارف روم نے سچ فرمایا ہے۔

(۱) قرآن میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف بعض صفات کا انتساب جن الفاظ میں کیا گیا ہے، مثلاً وہ بصیر وسمیع ہے یعنی دیکھنے والا سننے والا ہے، یہ مان لیا جاتا کہ جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں انکو ہی جانتا ہے جو سنی جاتی ہیں انکا ہی عالم ہے تو بات ختم ہو جاتی، لیکن دیکھنے کے بعد آنکھوں اور آنکھوں کے بعد آنکھوں کے پردوں اور ان اسباب واعمال کی طرف لوگوں کا

ہر چہ گیرد علتی علت شود ❁ کفر گیرد کاملی ملت شود

اسی مضمو کو کسی ظریف نے یوں موزوں کیا تھا۔

اصیل مرغ سمجھتے ہیں اور ہیں خاموش ❁ سنو گے ٹیئیوں میں چوں و چرا کا جوش و خروش

تفسیر بالرائے

اسی سلسلہ میں قرآن ہی کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی اس اصولی بات کا بھی خیال آتا ہے کہ یہ ''تفسیر یا تاویل بالرائے'' کا مسئلہ ہے بعض روایتیں جن میں تاویل بالرائے کی ممانعت کی گئی ہے اور اسے جرأت بے جا قرار دیتے ہوئے دھمکی دی گئی ہے کہ اس جرم کا ارتکاب جہنم کو آدمی کا ٹھکانہ (مقعد) بنا دیتا ہے' عام طور پر اسی روایت کو بنیاد بنا کر کچھ اس قسم کا خیال پھیلا دیا گیا ہے کہ قرآنی آیات کا مطلب کوئی بیان نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس مطلب کی تائید میں کسی روایت کی پشت پناہی اسے حاصل نہ ہو، اسی وجہ سے تفسیروں کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، جن میں ہر آیت کے ذیل میں روایات کے درج کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

ابن جریر طبری کی تفسیر کی عظمت کا مدار زیادہ تر اسی پر ہے کہ تفسیری روایات کا غیر معمولی سرمایہ اس کتاب میں جمع ہو گیا ہے یا طبری کے بعد السیوطی کی تفسیر ''در منثور'' کی قدر و قیمت کا راز بھی یہی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے کہنے والوں نے ''امام فخر الدین رازی'' کے متعلق یہ لطیفہ مشہور کر رکھا ہے کہ:

فیہ کل شیٔ الا التفسیر(۱)

ذہن خلل ہوا، جن کے بغیر آدمی دیکھ نہیں سکتا، مثلاً رنگ اور روشنی کے دیکھنے کو بھی خدا کے دیکھنے کے متعلق خام کاروں نے چھیڑ دیا مباحث کا طوفان برپا ہو گیا، فرقوں پر فرقے بنتے چلے گئے، مختصری بات کتنی طویل ہو گئی۔ ۱۲

(۱) امام رازی کی تفسیر کے متعلق ہی نہیں عموماً اہل بصیرت کا خیال یہی ہے کہ اس فقرے کو مشہور کر کے امام پر اور امام کی کتاب پر ظلم بے جا کیا گیا ہے لیکن منہ سے جو بات نکل جاتی ہے اپنی قیمت وہ کبھی نہ کبھی حاصل ہی کر لیتی ہے ہمارے زمانے میں مصر کے ایک صاحب جو علامہ طنطاوی کے نام سے مشہور ہیں شاید پچیس ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے عنوان تو کتاب کا یہی ہے کہ ''قرآن کی یہ تفسیر ہے'' لیکن مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ ''فیہ کل شیٔ الا التفسیر'' کا صحیح

امام رازی کی تفسیر میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے۔

اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ روایات کی طرف امام نے اپنی تفسیر میں جتنی توجہ چاہئے نہیں کی ہے، اوراس لحاظ سے کچھ یہ واقعہ بھی ہے۔

نہ سوچنے والوں میں یا کچھ اسی قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں، اسی کے مقابلہ میں ایک طبقہ بے باکوں کا بھی ہے جو قرآنی آیات کی تشریح وتوجیہ میں نہ اس ماحول ہی کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا ہے، جس میں قرآن نازل ہوا تھا یا جن بزرگوں کو اپنا مخاطب قرآن نے پہلی دفعہ بنایا تھا (یعنی صحابۂ کرام) قرآنی آیات کے متعلق انکے تأثرات کی وہ پرواہ نہیں کرتا، حتی کہ شوریدہ سری میں عقل باختوں کا یہ گروہ کبھی کبھی ترقی کر کے اس حد تک آ پہنچا ہے کہ عربی لغت اور الفاظ کے لغوی معانی کی رعایت سے بھی اس راہ میں اگر ضرورت ہوئی ہے تو آزاد ہو گیا ہے۔

آج ہی معلوم نہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اس قسم کی ناہمواریوں کا مشاہدہ قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح کے سلسلے میں کیا گیا ہے ''اتقان'' میں سیوطی نے نقل کیا ہے کہ ''لیطمئن قلبی'' میں ''قلبی'' کے لفظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک دوست کی طرف اشارہ کیا تھا جس کا نام ''قلبی'' تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں تو مطمئن ہوں لیکن میرا دوست قلبی مرنے کے بعد جی اٹھنے کے مسئلہ میں چوں کہ متردد ہے اس کی تسکینِ خاطر کے لیے بعض لوگوں نے دعوی کیا ہے کہ:

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی.

اے میرے پروردگار! دکھادے مجھے کہ مردے کو تو کیسے زندہ کرے گا؟

کی استدعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے بارگاہ الٰہی میں پیش ہوئی تھی۔

اسی طرح بعضوں کا قول تھا کہ میتہ، لحم خنزیر وغیرہ بعض مردوں اور عورتوں کے نام ہیں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ ان سے ملنے جلنے میں پرہیز کریں، اوران خرافات کا ذکر کہاں تک کیا جائے بقول ابومسلم اصفہانی ان اقوال کا ذکر صرف اس لیے کرنا چاہئے۔

مصداق اگر کوئی تفسیر ہوسکتی ہے تو طنطاوی صاحب ہی کی یہ تفسیر ہے، خدا جانے سیکڑوں سال پہلے خواہ مخواہ امام رازی کی تفسیر کے متعلق اس فقرے کو کس نے استعمال کر دیا تھا، لیکن غلط بات اب جا کر صحیح ہوگئی، اوراس کو حقیقی مصداق اپنا مل گیا ۱۲۔

ان یعلم ان فیمن یدعی العلم حمقی (اتقان: ص: ۱۵۵ حصہ دوم)
تاکہ معلوم ہو کہ علم کے دعویٰ کرنے والوں میں احمقوں کی کمی نہیں ہے۔

اوران حماقتوں کا تعلق تو ''قدیم علم'' یا ''دانش پارینہ'' سے تھا، اس کے مقابلہ میں ''دانش نو'' کی بوالعجبیوں کا جو طوفان عہد حاضر میں امنڈ آیا ہے اس کا نہ اور ہے اور نہ چھور۔

بھلا اس دعویٰ کے ساتھ کہ قرآن میں نہ غلامی کا ذکر ہے اور نہ تعدد ازواج کے قانون کا، نہ معجزوں کا، نہ کرامتوں کا، نہ فرشتوں کا، نہ جنوں کا، نہ جنت کا اور نہ دوزخ کا اور نہ جنت کی حور کا، نہ قصور کا، نہ اس کے اشجار کا، نہ انہار کا، نہ دوزخ کی نار کا، نہ اس کے ملائکہ غلاظ شداد کا، نہ اس کے زقوم کا، نہ غسلین کا۔ الغرض قرآن میں جو کچھ ہے وہی سب کچھ قرآن میں نہیں ہے۔

اس عجیب وغریب ادعا کے ساتھ قرآنی الفاظ کی تشریح وتوجیہ میں جس طلسماتی نیرنگیوں کے تماشے سامنے آسکتے ہیں اور لفظوں کے ساتھ ساحرانہ کھیل کھیلے جاسکتے ہیں، اس کا اندازہ ہر صاحب عقل وشعور کرسکتا ہے، یہ صرف احتمال نہیں ہے، بلکہ یہی کر کے دکھایا گیا ہے، اور قرآن کے ساتھ ان بد بختانہ بازیگریوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے، عربی زبان کی ایک سطر بھی صحیح طریقہ سے جو پڑھ نہیں سکتے وہی قرآن کے اردو ترجموں کی مدد سے ان ہی ناقابل عفو گستاخیوں پر کوتاہ نصیبوں کا یہ گروہ جری ہو گیا ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ اپنی ان مذبوحی حرکات پر داد کا بھی طالب ہے آج ہی ان ہی مجرمانہ جسارتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ جس مطلب اور مقصد کو بھی چاہا جاتا ہے، قرآن اور قرآنی الفاظ پر اسے تھوپ دیا جاتا ہے۔

بہرحال یہ بھی ہو رہا ہے اور وہ بھی ہو رہا ہے۔ ایک طرف اس پر اصرار ہے کہ روایت کے بغیر کسی آیت کے مطلب کا بیان کرنا جہنم کو اپنا ٹھکانا بنانا ہے، روایت کسی درجہ کی ہو، صحیح ہو، حسن ہو، ضعیف ہو، ضعف میں اس کا حال جو کچھ بھی ہو۔ لیکن صحیح تفسیر وہی ہے، اور قابل اعتماد مفسر وہی ہے جو ان روایتوں ہی کی روشنی میں قرآنی آیتوں کے مطلب اور منشا کو متعین کرتا ہو، دوسری طرف آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے جس وسوسہ اور وہم کو جی چاہے قرآن کی طرف منسوب کردے بقول اکبر مرحوم ؎

مجھے تفسیر بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہئے

اسی کو بنانے والوں نے اپنا علمی پیشہ اور ذہنی مشغلہ بنا رکھا ہے۔

بجنسہٖ پوری تقریر تو محفوظ نہیں ہے، لیکن مطلب شاہ صاحب کا یہی تھا کہ مسلمانوں میں نسلاً بعد نسلٍ، سلفاً عن خلف جن حقائق سے اسلامی دین کی تعمیر وتقویم ہوئی ہے، جن کے بغیر اسلام کا تصور مسلمان تو مسلمان شاید کوئی لکھا پڑھا، غیر مسلم بھی نہیں کر سکتا یعنی دین کی ضروریات میں جو چیزیں شمار ہوتی ہیں، اول سے آخر تک بغیر کسی اختلاف کے اسلام کی جو جانی پہچانی باتیں ہیں، ان سے ہٹ کر قرآنی آیات کی توضیح وتشریح کی جرأت، ایمان سوز جرأت ہے۔ گویا فقیر اپنی خاص اصطلاح میں ''البینات'' سے جن کی تعبیر کرتا ہے، دین کے ان بیناتی مسلمات پر جس تفسیر سے زد پڑتی ہو، قرآنی آیتوں کی جس تاویل سے مذہب کا یہ غیر شرعیہ حصہ متاثر ہوتا ہو، تفسیر وتاویل کی یہی وہ قسم ہے جسے شاہ صاحب ''تاویل بالرائے'' قرار دیتے تھے (۱)۔

لیکن یہ بات کہ قرآن کی کسی آیت کا کوئی مطلب تفسیری روایتوں کی پشت پناہی کے بغیر بیان کرنا ہر حال میں یہ ''تفسیر بالرائے'' ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ قرآن کی تشریح وتاویل اپنے من مانے خیالات کے زیر اثر کر رہا ہے، جہاں تک میں جانتا ہوں حضرت شاہ صاحبؒ شدت کے ساتھ اس کی بھی تردید فرمایا کرتے تھے، اس سے زیادہ باخبر اس حقیقت سے اور کون ہو سکتا تھا کہ تفسیر کی کتابوں میں جن روایتوں کا لوگ ذکر کرتے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ اکثر وبیشتر حصہ ان کا ایسا ہے جس کی اصل نہیں ہے۔

سیوطی نے اتقان میں امام کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

قال احمد ثلاثة کتب لیس لها اصل التفسیر والملاحم

(۱) بخاری کی املائی شرح میں اور شاہ صاحب کی دوسری تحریروں میں لوگ ان کے اس اجمالی دعوی کی تفصیل پڑھ سکتے ہیں، مثلاً بخاری کی شرح میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ فاذا اوجب تغیرًا المسالة المتواترة اور تبدیلاً عقیدة مجمع علیها فذالک هو التفسیر بالرائے وهذا الذی یستوجب صاحبه النار (یعنی متواتر مسئلہ دین کا جس تفسیر سے ادلتا بدلتا ہو یا مسلمانوں کا جو اجماعی عقیدہ ہو اس میں تبدیلی پیدا ہوتی ہو، یہی ہے درحقیقت تفسیر بالرائے، جس کا مرتکب جہنم کا حقدار بن جاتا ہے)۔ فیض الباری شرح بخاری ص ۱۵۰ ج ۴۔

والمغازی. (ص: ۵۳۸. ج: ۲)

تین کتابیں روایتوں کی ایسی ہیں جن کی اصل نہیں ہے، ایک تفسیر، دوسرے ملاحم آئندہ پیش آنے والی جنگیں اور فتنے) اور جنگی معرکے عہد نبوت میں جو پیش آئے ان کے متعلقہ قصے جن کو المغازی کہتے ہیں۔

پھر خود بھی سیوطی نے اپنی طرف اس دعوے کو پیش کیا ہے:

اصل المرفوع منه فی غایة القلة. (ص: ۵۳۱. ج: ۲)

ایسی روایتیں جو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحت کے ساتھ منسوب ہوں، تفسیر کے متعلق بہت ہی کم ہیں۔

یہ حال تو ان روایتوں کا ہے جن کو اصطلاحاً مرفوع حدیثوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں، باقی رہے صحابۂ کرام کے تفسیری اقوال سو ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اس باب میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے، لیکن جو ذخیرہ اس سلسلے میں ان کی طرف منسوب ہے خود السیوطی نے بھی اسی کے متعلق علماء کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ:

وهذا التفاسير الطوال التی اسندوها الی ابن عباس غیر مرضیة ورواتها مجاهیل. (۵۵۳)

یہ لمبی لمبی تفسیری روایتیں جو ابن عباس کی طرف منسوب ہیں سنداً ناپسندیدہ ہیں ان کے روایت کرنے والے نامعلوم اشخاص ہیں۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس کی طرف منسوب تفسیری اقوال کا جائزہ لیا تو اس نتیجہ تک پہنچے کہ:

لم یثبت عن ابن عباس فی التفسیر الاشبیه بمائة حدیث. (۵۵۴)

تقریباً سو روایتوں کے سوا ابن عباس کی طرف منسوبہ اقوال صحیح ثابت نہیں ہوئے۔

جس کی ایک کھلی دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیثوں کا سب سے زیادہ معتبر اور صحیح مجموعہ صحیح بخاری میں تفسیری روایات کا سرمایہ شاید تمام دوسرے ابواب کے مقابلہ میں سب سے زیادہ کم ہے، امام بخاری نے بجائے روایتوں کے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں

قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پر زیادہ توجہ کی ہے، اور وہ بھی بقول شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ ''فیض الباری'' میں بھی نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اس راز کو واضح کیا ہے ''ابو عبید معمر بن المثنی'' کی کتاب ''مجاز القرآن'' پر امام نے زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ:

لم یعرج الی النقد اصلاً۔

امام بخاری نے معمر بن المثنی ہی کے اقوال تنقید کے بغیر اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں۔ اسی لیے ابن المثنی کی کتاب میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہی کوتاہیاں صحیح بخاری کی کتاب ''التفسیر'' میں باقی رہ گئی ہیں، یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

شاہ صاحب فرماتے تھے کہ صحیح بخاری میں جو تفسیری اقوال پائے جاتے ہیں، ان کے متعلق یہ سمجھنا مناسب نہ ہوگا کہ یہی امام بخاری کا فیصلہ بھی ہے، بلکہ اس باب میں ان کی حیثیت صرف ایک ناقل کی ہے(۱)۔

کچھ بھی ہو کم از کم امام ابوحنیفہؒ کے متعلق جب یہ مانا جاتا ہے کہ ضعاف وحسان ہی نہیں بلکہ خبر واحد خواہ محدثین کی اصطلاح کی رو سے مرفوع و متصل صحیح ہی کیوں نہ ہو، باوجود اس کے قرآنی نصوص میں کسی ترمیم کو احاد خبروں کی روشنی میں امام صاحب جائز نہیں سمجھتے تھے۔

اصول فقہ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں ان کے اسی فیصلہ کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ کتاب میں زیادۃ خبر واحد سے نہیں ہوسکتی، اس کے بعد بھلا یہ کون کہہ سکتا ہے کہ روایتوں کی دست گیری کے بغیر قرآنی آیات کے مطالب کے سمجھنے اور سمجھانے کی اجازت ہی نہیں دی جاسکتی۔ کتنی عجیب بات ہے، قرآنی نصوص قطعیت اور تعین آفرینی کے جس زور اور قوت کی حامل ہیں، واحد خبروں سے ان کے سمجھنے میں مدد لینے کے بعد ان کا یہ زور اور ان کی یہ

---

(۱) مناسب ہوگا کہ ان تفصیلات کے لیے شاہ صاحب کی کتابوں کی طرف بھی مراجعت کی جائے، خصوصاً قادیانیوں کے رد میں جو کتابیں حضرت والا نے لکھی ہیں صحیح بخاری کی املائی شرح (ص ۱۴۸ ج ۲) میں بھی ان کے خیالات کا کچھ خلاصہ مل جاتا ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابوعبیدہ کے لفظ سے کہیں دھوکہ نہ ہو، یہی کنیت مشہور محدث قاسم بن سلام کی بھی تھی جن کی کتاب ''الاموال'' حال میں شائع ہوئی ہے اور غیر معمولی قیمتی معلومات سے مالامال ہے، بلکہ یہ ابوعبیدہ ''مجاز القرآن'' کا مصنف دوسرا آدمی ہے، اسکا نام معمر بن المثنی تھا۔۱۲

قوت کیا باقی رہ سکتی ہے؟ واحد خبروں کا مفاد بہر حال ظنی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی مظنونیت کی صفت نصوص قرآن کی طرف بھی منتقل ہو جائے گی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اگر خبر احاد سے کتاب پر زیادت کو جائز نہیں سمجھتے تھے تو بتایا جائے کہ یقین آفرینی اور قطعی سکون بخشی کی طاقت جو قرآنی آیات میں پائی جاتی ہے اس کی حفاظت کی دوسری شکل ہی کیا تھی؟ مگر افسوس ہے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کی بلندی کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہ ہوا، بلکہ برعکس اس کے بھی یہی پھیلا دیا گیا کہ قرآنی نصوص کے مطالب کو بجائے روایات کے صرف قرآنی الفاظ ہی سے سمجھنے کی جو کوشش کرے گا، یا دوسرے کو سمجھائے گا وہ تفسیر بالرائے کے جرم کا مجرم اور دوزخی ہے۔

خدا جزائے خیر دے حضرت شاہ صاحبؒ کو کہ تفسیر بالرائے کے اس غلط مطلب کا اپنے درس میں ازالہ فرماتے رہتے تھے، خدا کا شکر ہے کہ ان کا یہ فیصلہ بخاری کی املائی تقریر میں بھی درج کر دیا گیا ہے، ان کی طرف آخر میں یہ فقرے بھی اسی کتاب میں منسوب کیے گئے ہیں کہ فرمایا کرتے تھے:

ومن حجر على العلماء ان لا يبرزوا يبرز معانى الكتاب بعد الامعان فى السباق والسياق والنظر الى حقائق الالفاظ المراعية لعقائد السلف.

کس نے اہل علم کو روکا ہے اس بات سے کہ کتاب اللہ کے معانی اور مطالب کو آیات کے سیاق وسباق اور الفاظ کے اقتضاء کے مطابق جس میں سلف صالح کے عقیدے کی بھی رعایت کی گئی ہو، ان امور کو پیش نظر رکھ کر نہ ظاہر کریں۔

آگے اس کے بعد اسی میں یہ بھی ہے کہ:

بل ذلك حظهم من الكتاب فانهم هم الذين ينظرون فى عجائبه ويكشفون الاستار عن وجوه دقائقه ويرفعون الحجب عن خشبات حقائقه فهذا النوع من التفسير بالرائے حظ اولى العلم ونصيب العلماء المستنبطين.

بلکہ اللہ کی کتاب میں اہل علم کا واقعی حصہ یہی ہے وہ اس کتاب کے نت نئے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور اس کے پوشیدہ اسرار سے نقاب الٹتے ہیں۔ جو باتیں چھپی ہوئی ہیں انھیں نمایاں کرتے ہیں، اگر یہی تفسیر بالرائے ہے تو اہل علم کا یہی حصہ ہے، اور قرآنی آیات سے نتائج پیدا کرنے والے صاحبان آگہی کی خوراک یہی ہے۔

آخر میں اسی کے ساتھ اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے تھے:

واما من تكلم فيه بدون صحة الادوات لا عنده علم من كلام السلف والخلف ولا ذوق بالعربية وكان من اجلاف الناس لم يحمله على تفسير كتاب الله غير الوقاية وقلة العلم فعليه الاسف كل الاسف وذلك الذى يستحق النار.

مگر قرآنی مطالب سے صحیح واقفیت کے لیے جن قدرتی اسباب وذرائع کی ضرورت ہے جو ان سے تہی دامن ہو، اس کے پاس اگلوں اور پچھلوں کے اقوال کا علم نہ ہو اور نہ عربی ادب کا ذوق رکھتا ہو، اس قسم کے کمینے آدمیوں میں قرآن کی تفسیر کی جسارت محض بے شرمی اور بے حیائی اور جہالت ہی کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ان پر افسوس صد افسوس بیشک یہی لوگ جہنم کے مستحق ہیں۔

سمٹنا چاہتا ہوں، مگر پھیل جاتا ہوں، سیدنا الامام الکشمیری قدس اللہ سرہ سے میرے غیر معمولی تأثرات کا یہ شاید شعوری یا غیر شعوری نتیجہ ہے کہ سمجھتا ہوں کہ ان کے متعلق باتیں ختم ہوگئیں کہ ذاکرہ کسی نئی چیز کو سامنے پیش کر دیتا ہے، ایسی نئی چیز کہ دل اس کے چھوڑ دینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا، ناظرین شاید تھک چکے ہوں گے، دل پر جبر کر کے اپنے محبوب ومرحوم استاذ کے ذکر کو ختم کرتا ہوں۔

آپ انصاف کیجیے، اپنے حقیر وفقیر، جہول وظلوم ادنیٰ ترین شاگرد کی حوصلہ افزائیوں میں جس کا یہ حال ہو کہ دار العلوم دیوبند میں طالب علمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد کچھ دنوں خاکسار القاسم والرشید نامی ماہواری پرچوں کی ادارت کے ساتھ کچھ درسی وتدریسی وغیرہ کی خدمات جب انجام دے رہا تھا، لیکن تنخواہ جو مدرسہ سے ملتی تھی ضروریات کے لیے کافی نہ تھی، رخصت لے کر مکان آ گیا، اور دار العلوم کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کو یہ

اطلاع دینے پر مجبور ہوا کہ ”موجودہ تنخواہ پر کام کرنا تو اپنے حالات کے لحاظ سے خاکسار کے لیے دشوار ہے“ یہ درخواست جب پہنچی تو اس کا اثر اور انجام کیا ہوا اس کو تو چھوڑیئے، کہنا یہ ہے کہ بعد کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے جب نیاز حاصل ہوا تو براہِ راست ان سے یہ سن کر ششدر و حیران ہو گیا، فرمانے لگے کہ:

”بھائی! مولانا انور شاہ صاحب تم سے تو غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتے ہیں، تمھاری وہ درخواست جب پہنچی تو میں نے شاہ صاحب سے اس مسئلے میں مشورہ لیا، جواب میں انھوں نے کہا کہ آپ کے یہاں جتنے کام کرنے والے ہیں ان کو دیکھتا ہوں کہ جو درس دیتے ہیں وہ تحریر کا کام نہیں کرتے، یا کر نہیں کر سکتے، جو تحریری سلیقہ رکھتے ہیں ان سے آپ تقریر و وعظ کا کام نہیں لے سکتے، الغرض ان تین شعبوں یعنی درس و تحریر و تقریر کے لیے اسی وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب سے رسالہ کی ادارت و تحریر کا کام بھی آپ لیتے رہے، درس و تدریس کا کام بھی اس کے سپرد کرتے رہے جہاں سے طلبی آئی وعظ و تقریر کے لیے بھی بھیجتے رہے، گویا ان تینوں شعبوں کا کام حسب دلخواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا، اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلہ میں ایک ایک آدمی کی تنخواہ اسے دی جائے تو شاید اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا“۔

سفارش کی اس تحلیلی ترکیب کا خطرہ خود میرے دل میں بھی نہیں گذرا تھا۔

بہر حال الفاظ تو بجنسہٖ یاد نہ رہے مفہوم یہی تھا، حضرت شاہ صاحب کے ان الفاظ کو جس وقت میرے کان سن رہے تھے، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا خیال آیا۔

اف زنگی کو اس کا آقا کافور ٹھہرا رہا تھا، حالاں کہ پہلے بھی زنگی ہے اور بعد کو بھی زنگی، اس وقت تک زنگی ہونے کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے، سوچتا ہوں کہ استاذ مرحوم کی قدر شناسیوں کا دھیان آتا ہے، دل کہتا ہے ؎

بریں قول گر جاں ببازم رواست

علم و معرفت کا احتساب ایک ذرہ کو چمکا رہا تھا، حالاں کہ ذرہ کے پاس تھا بھی کیا اور جو کچھ تھا سب آفتاب کا تھا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی بعض خصوصی عنایات و نوازشوں کا سلسلہ حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف سے آخر وقت تک جاری رہا، اس زمانہ میں بھی جب دائرۂ اہتمام اور حضرت شاہ صاحب میں شکر رنجیوں کی صورتیں پیش آ گئیں یعنی دارالعلوم دیوبند کی تاریخی زندگی کا وہی شہر جس سے گجرات کے مشہور دارالعلوم ڈابھیل کا جز پیدا ہوا، اس زمانے میں بھی جب خاکسار حیدر آباد میں تھا، اور کش مکش کی ان دونوں صورتوں پر حیدر آباد کا دباؤ بھی پڑ رہا تھا یا چاہا جا رہا تھا کہ حیدر آباد کی حکومت بھی اپنا اثر اس پر ڈالے، اس زمانہ میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا اور شاید مشہور بھی کر دیا گیا تھا کہ اس دباؤ میں بجائے شاہ صاحب کی جماعت کے فقیر دائرۂ اہتمام کے بزرگوں کی پشت پناہی کر رہا ہے، مجھ تک بھی اس قسم کی بدگمانیوں کی خبریں پہنچائی جا رہی تھیں، حضرت شاہ صاحب کے قلب مبارک کی گرانی کا خیال مجھے بے چین کیے ہوئے تھا کہ عین انھیں دنوں میں قطعاً خلاف دستور اپنے دستخط خاص سے ایک رجسٹرڈ والا نامہ حضرت شاہ صاحب کا اس فقیر کے نام شرفِ صدور لایا، تھراتے ہوئے مرتعش ہاتھوں سے لرزتی ہوئی اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس گرامی نامہ کو کھولا پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا، اللہ اللہ سنانے والے مجھے کیا کیا سناتے رہے اور آنکھیں آج کیا دیکھ رہی ہیں، مودت و محبت، سرفرازی و محبت بیکراں کے سوا اس میں اور کچھ نہ تھا، ایک خاص خدمت کے لیے اس ذرۂ ناچیز کا انتخاب فرمایا گیا تھا۔

حیران تھا کہ ہزار ہزار تلامذہ جس کے اقطار ہند بلکہ اسلامی دنیا کے کناروں میں پھیلے ہوئے ہیں اسی کے حافظہ میں مجھ جیسے کس مپرس ہیچمداں، طالب الدنیا کا خیال اور وہ بھی اتنی خصوصیتوں کے ساتھ کیسے باقی تھا، افسوس ہے کہ بخت کی تہی دستی اور مزاج کے لا ابالی پن کی وجہ سے اس والا نامہ کی حفاظت میں کامیاب نہ ہو سکا، ورنہ آج جس حال میں ہوں شاید وصیت کرتا کہ میرے کفن کے ساتھ اس کو میرے ساتھ دفن کر دیا جائے، تاہم امید ہے کہ اس میں جو ''راز'' تھا ان شاء اللہ وہ اپنے ساتھ ہی دفن ہو گا۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب کے ظل عاطفت وسایۂ عافیت میں رہنے کا موقع اگر چہ دوڈھائی سال سے زیادہ اس فقیر کو نہیں ملا ہے، لیکن اب میں کیا کروں کہ جن صحبتوں میں قرنہا قرن گذرے ان کی یاد پیرانہ سری کے ان ایام میں تقریباً کچھ مٹ ہی سی گئی ہے، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ دوڈھائی سال کی ان متبرک، علم ریز، معارف بیز، محبت خیز ایام کی ایک ایک بات دماغ میں کیوں تروتازہ ہے، اسی لیے سچ پوچھئے تو شاہ صاحبؒ کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کا عشر عشیر بھی نہ کہہ سکا، لیکن پڑھنے والوں کی نفسیات کا خیال کرکے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب دوسرے اساتذۂ کرام کے متعلق ارتسامی تأثرات کو پیش کروں۔ واللہ ولی الامر والتوفیق.

حضرت الاستاذ محدث کشمیریؒ

از: جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی فضلنا علی کثیر من عبادہ المؤمنین وجعلنا من ورثة الأنبیاء والمرسلین، والصلوة والسلام علی سیدنا ومولانا محمد خاتم الانبیاء وسید الاوّلین والآخرین وعلی الہ واصحابہ الاکرمین، وعلینا معھم یا ارحم الراحمین امین یارب العالمین. امابعد:

ہمارے مولائے برحق، اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے قرآن کریم میں جابجا علماء اور صلحاء کے فضائل اور مناقب اور واقعات بیان فرمائے، اور جابجا اپنے عباد صالحین اور علماء ربانیین کے تذکرہ کا حکم دیا اور **اذکر عبادنا ابراھیم واسحاق ویعقوب آلایة... واذکر فی الکتاب اسمعیل واذکر فی الکتاب موسیٰ.**

اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں اپنے پاک بندوں کے تذکرہ کا حکم دیا، تاکہ موجب تذکر ہو اور:

فاقصص القصص لعلھم یتفکرون میں قصوں کے بیان کرنے کا حکم دیا تاکہ موجب تفکر ہو۔ اور سورہ لقمان جو کہ ایک عالم ربانی کے تذکرہ میں نازل ہوئی وہ اسی عالم کے نام سے موسوم ہوئی جس میں حق جل شانہ نے اس حکم ربانی کی پند ونصائح کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور سورہ کہف میں خلوت گزینوں اور گوشہ نشینوں اور دنیا سے بھاگ کر پہاڑوں اور غاروں میں ٹھکانا ڈھونڈنے والی ایک جماعت کا قصہ بیان فرمایا اور انکی کرامتیں ذکر فرمائیں۔

سبحان اللہ خود ہی علم وحکمت عطا فرمایا اور خود ہی کرامتوں سے سرفراز فرمایا اور پھر خود ہی ان کا ذکر فرماتے ہیں، معلوم ہوا کہ علما اور صلحاء کا ذکر سنت الٰہی ہے جو صد ہزار انوار

وبرکات کا موجب ہے، اور کیوں نہ ہو، علماء انبیائے کرام کے وارث ہیں اور انبیائے کرام خداوند ذوالجلال والاکرام کے خلفاء ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ کے علوم اور احکام اولاً انبیائے کرام پر نازل ہوئے، اور پھر حضرات انبیائے کرام کے صدقہ وطفیل سے علماء کے سینوں میں منتقل ہوئے اور پھر علماء کے واسطہ سے عوام تک پہنچے، اس لیے عوام پر علماء کا حق ہے کہ ان کا تذکرہ کریں کہ جن کے ذریعہ سے ان تک خدا کے علوم اور احکام پہنچے، اگر علماء نہ ہوتے تو ہم کو انبیائے کرام کا دین اور شریعت کون سمجھاتا۔ اور اگر حضرات انبیاء ومرسلین نہ ہوتے تو خدائے تعالیٰ کی راہ ہم کو کون دکھلاتا **صلوات اللہ وسلامہ علی جمیع الانبیاء والمرسلین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ علی العلماء الربانیین الی یوم الدین** انھیں علمائے ربانیین میں سے ہمارے شیخ اکبر حضرت مولانا الشاہ السید محمد انور کشمیری قدس اللہ سرہٗ ہیں جن کا مختصر تذکرہ اس وقت پیش نظر ہے، حافظ ابوعمرو بن صلاح مقدمہ اصولِ حدیث میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

عند ذکر الصالحین تنزل الرحمۃ

صالحین کے ذکر اور تذکرہ کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔

یہ اس ناچیز کا گمان اور امید ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ بھی ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ انھیں علمائے صالحین میں سے ہیں جن کے تذکرہ سے نزولِ رحمتِ خداوندی کی توقع اور امید کی جاسکتی ہے، اور حدیث قدسی میں ہے کہ **انا عند ظن عبدی بی** خصوصاً جب کہ وہ تذکرہ شیخ کے افادات علمیہ اور حقائق ومعارف کو بھی ساتھ لیے ہوئے ہو تو علاوہ رحمت وبرکت کے زیادتیٔ علم کا بھی موجب ہوگا جو حسب ارشاد باری **رب زدنی علما** مطلوب اور محبوب ہے۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں مگر قلت فرصت وضعف ونقاہت اور مشاغل کی کثرت مانع ہے۔ خیر **مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ** جو کچھ یاد آتا ہے وہ مختصر اہدیہ احباب کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور بارگاہِ خداوندی میں ملتجی ہوں کہ اے پروردگار یہ تیرا وعدہ حق ہے **والحقنا بھم ذریتھم** کہ ہم اولاد اور ذریت کو ان کے آباء صالحین کے ساتھ ملحق فرمائیں گے۔

اے پروردگار تیرے کلام پاک میں ذریت کا لفظ عام ہے، ذریت خواہ روحانی ہو یا جسمانی سب کے لیے الحاق کا وعدہ ہے، اگر اس نابکار و ناہنجار کو بھی اس وعدہ میں شامل فرمالیا جائے تو تیری رحمت سے کوئی بعید نہیں۔ جس طرح تو نے محض اپنی رحمت سے علم کا انعام فرمایا، اسی طرح محض اپنی رحمت سے الحاق بالصالحین کے انعام سے بھی سرفراز فرما۔ **یا فاطر السموات والارض انت ولیّ فی الدنیا والاخرة توفنی مسلما والحقنی بالصالحین. آمین یارب العلمین.**

سلسلۂ نسب

استاذنا قدوتنا حضرت الشاہ السید محمد انور الکشمیری ثم الدیوبندی ابن شیخ معظم شاہ بن شاہ عبدالکبیر بن شاہ عبدالخالق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ محمد عارف بن شاہ محمد حیدر بن شاہ علی کشمیری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت استاذ خاندان سادات سے تھے، اصل آبائی وطن بغداد تھا، تقریباً دو صد سال پیشتر یہ مبارک خاندان بغداد سے ہندوستان آیا، اور اولاً شہر ملتان میں فروکش ہوا، اور پھر ملتان سے لاہور اور پھر لاہور سے کشمیر منتقل ہوا، اور کشمیر جنت نظیر کو وطن اور جائے سکونت بنایا۔

ولادت اور تعلیم وتربیت

۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ یوم شنبہ بوقت صبح دُدوان علاقۂ لولاب میں ولادت ہوئی، والد مرحوم کی تربیت میں نشوونما ہوا، اول قرآن کریم پڑھا اور فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں، اور کشمیر اور ہزارہ کے علماء اور فضلاء سے استفادہ کیا، فارسی اور عربی کی نثر اور نظم میں مہارت حاصل ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کے لیے شدّ رحال

جب کشمیر اور ہزارہ کے علماء اور فضلاء کے استفادہ سے فراغت حاصل ہوئی تو بغرض تکمیل دارالعلوم دیوبند کا قصد فرمایا، جو ہندوستان کے براعظم میں علوم دینیہ کا ایک مرکز اور

چشمہ جاریہ ہے، اس وقت اس مبارک درس گاہ کے صدر مدرس، محدث العصر، قطب دہر، شیخ زمن حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہٗ تھے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے شاگردِ خاص اور جانشین با اختصاص تھے، اور علم حدیث میں مرجع خلائق تھے، نورِ علم اور نور تقوی چہرے سے نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ ان کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور علم حدیث ان سے پڑھا۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہ اپنے زمانہ میں علم اور ورع کے لحاظ سے امام احمد بن حنبلؒ کا نمونہ تھے، حدیث کے پروانے آپ کے گرد جمع تھے، آپ کے بے شمار شاگردوں میں حضرت مولانا السید انور شاہ امام بخاری کا نمونہ تھے، اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی امام مسلمؒ کا نمونہ تھے، اور حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ امام ابوداؤدؒ کا نمونہ تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن نے جب ہندوستان سے حرمین کا قصد فرمایا تو صحیح بخاری کا درس مولانا انور شاہ کے سپرد فرمایا اور صحیح مسلم کا مولانا شبیر احمد عثمانی کے اور سنن ابوداؤد مولانا سید اصغر حسین دیوبندی کے سپرد فرمائی۔ چناں چہ یہ تینوں حضرات ساری عمر یہی تین کتابیں پڑھاتے گذر گئے جو ان کے امام احمد ان کے سپرد کر گئے تھے، آج ہندوستان کی سرزمین میں صدہا جگہ بخاری اور مسلم اور ابوداؤد کے درس جاری ہیں، جن کے درس دینے والے شیخ الہند کے خدام اور خدام الخدام ہیں، لیکن ان اسباق ثلاثہ کی خصوصی تقسیم کی خصوصیت سوائے ان حضراتِ ثلاثہ کے اور کسی کو حاصل نہیں۔

حضرت شیخ الہند کی قائم مقامی

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت مولانا سید انور شاہ باضابطہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے، صحیح بخاری اور جامع ترمذی کے سبق حضرت شاہ صاحب کے لیے مخصوص ہوئے، اور صحیح مسلم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے لیے مخصوص ہوئی۔ ان دونوں حضرات کا وجود دارالعلوم میں ایک عجیب شان رکھتا تھا، حضرت مولانا سید

انور شاہ علم کے بحر ذخار تھے، مگر زبان میں کچھ لکنت تھی، اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نہایت فصیح اللسان تھے گویا کہ حضرت شاہ صاحب شانِ موسوی کا ایک پرتو تھے، اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شانِ ہارونی کا ایک عکس تھے جیسا کہ حدیث میں ہے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل حضرت ہارون علیہ السلام افصح لساناً تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اعلم قلباً تھے۔

اور بلا تشبیہ کے جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وزیر اور مشیر تھے، اسی طرح حضرت مولانا عثمانی علم میں، حضرت شاہ صاحب کے وزیر اور قائم مقام تھے، تمام اہل علم کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ اگر مولانا سید انور شاہ اپنے زمانہ کے بخاری تھے تو مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے زمانہ کے مسلم تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا نکاح اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی حسن تدبیر

حضرت مولانا انور شاہ صاحب پر شان یحیوی کا کچھ عکس اور پرتو پڑا تھا۔ عالم شباب گذار کر عالم کہولت میں داخل ہو چکے تھے، مگر نکاح نہیں فرمایا تھا، تجرد اور عزلت کو اپنے لیے پسند فرماتے تھے، باوجود محمدی ہونے کے سنت یحیوی کے مطابق حصور اور صالح رہنا چاہتے تھے، اور بار بار ارضِ حرم کی طرف ہجرت کا ارادہ فرماتے تھے، تاکہ ازدواجی تعلق اس راہ میں حائل نہ ہو۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت دار العلوم دیوبند کے مہتمم ثانی تھے، وہ اس ارادہ سے پریشان تھے کہ مبادا اگر یہ آفتابِ علم دیوبند سے ہجرت کر جائے تو فقط دیوبند ہی نہیں سارا ہندوستان ظلمت میں رہ جائے گا، اس لیے شاہ صاحب کے روکنے کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جو اہل یمن نے حضرت معمر کے روکنے کے لیے کی تھی، معمر بصرہ کے رہنے والے تبع تابعین میں سے ہیں، بڑے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث ہیں، سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ اور شعبہ اور عبداللہ بن مبارک جیسے اکابر معمر کے تلامذہ میں سے ہیں:

لما دخل معمر الیمن کرھوا ان یخرج من بینھم فقال رجل

قیدوہ فزوجوہ شرح الامام النووی علی البخاری. (ص:۶۴. ج:۱)
معمر (بصرہ کے رہنے والے تھے) جب یمن میں داخل ہوئے تو اہل یمن نے یہ گوارانہ کیا کہ معمر یہاں سے واپس چلے جائیں۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر ان کو روکنا چاہتے ہو تو معمر کو یہاں قید کرلو، یعنی نکاح کردو۔

حضرت شاہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ نے یہی کیا کہ حسن تدبیر سے گنگوہ کے سادات میں شاہ صاحب کا نکاح کرادیا تاکہ معمر کی طرح شاہ صاحب دیوبند میں مقید ہوجائیں، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو جزائے خیر دے کہ شاہ صاحب کے وجودِ مسعود کو اسطرح محفوظ فرمایا۔

علم وفہم اور حافظہ

دنیا کے علم میں خیر وشر محمود و مذموم کی تقسیم ہے، مگر آخرت اور دین کے علم میں یہ تقسیم نہیں، آخرت اور دین خداوندی کا علم، خیر ہی خیر اور محمود ہی محمود ہے، کتاب وسنت علم دین کے فضائل سے بھرا پڑا ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اول مرتبہ ایمان اور اسلام کا ہے اور اس کے بعد علم دین کا ہے۔ بندہ کا اولین فرض یہ ہے کہ خداوند ذوالجلال کو ماننے اور پھر اس کے دین اور اسکے احکام کو جانے پھر اس علم کے لیے دو قوتیں درکار ہیں ایک قوت فہم اور ایک قوت حافظہ، قوتِ فہم اور خداداد عقل سے خدا کے دین کو سمجھے اور قوت حافظہ سے اس کو محفوظ اور یاد رکھے۔

حق جل شانہ نے حضرت شاہ صاحب کو ان تینوں نعمتوں سے خاص طور پر سرفراز فرمایا تھا جس کی نظیر اس وقت عالم کے سامنے نہیں۔

علم کی خصوصیت یہ تھی کہ ذخیرۂ روایات اور ائمہ مذاہب کے نقول اور اقوال ہر وقت پیش نظر رہتے تھے، جب کوئی عالم کسی مسئلہ میں شاہ صاحب کی طرف مراجعت کرتا تو یہ مسئلہ کا مادہ اس کے سامنے کردیتے، اور اس کے بعد اپنا فیصلہ بھی بتادیتے کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں میری رائے یہ ہے۔

بار ہا حضرت شاہ صاحب سے کسی مسئلہ کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے نزدیک ہر مسئلہ طے شدہ ہے، اختلافِ اقوال کی وجہ سے تذبذب اور تردد نہیں بلکہ راجح اور مرجوح متعین ہے۔

فہم کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کی اصل اور اس کا سرا معلوم تھا، اصل کلی کے بتلا دینے کے بعد یہ بتلا دیتے تھے کہ فلاں فلاں مسئلہ اس مسئلہ پر متفرع ہے اور ان مسائل مختلفہ اور متشتتہ میں مابہ الاشتراک یہ ہے، اور مابہ الاختلاف یہ ہے، جیسا کہ **ھدایة المجتھد و نھایة المقتصد** میں ابن رشد کا طریق ہے، یہ طریق نہایت دقیق اور عمیق ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک روایات مختلفہ میں فقہائے کرام کا منشاء خلاف اور سبب اختلاف معلوم نہ ہو، مسئلہ کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔

حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا اور سن لیا تو وہ ضائع ہونے سے محفوظ اور مامون ہو گیا، گویا کہ اپنے زمانہ کے زہری تھے۔ امام زہری جب مدینہ منورہ کے بازار سے گذرتے تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے، کسی نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں، فرمایا کہ میرے کانوں میں جو داخل ہو جاتا ہے وہ نکلتا نہیں، اس لیے بازار سے گذرتے وقت کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں تاکہ بازار کی یہ خرافات میرے کانوں میں داخل نہ ہو سکیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ جب درس میں مسائل خلافیہ پر کلام فرماتے تو جا بجا شیخ ابن ہمام کی تحقیقات کو مع نقض اور ابرام کے ذکر فرماتے، ایک مرتبہ بطور تحدیث بالنعمۃ فرمایا کہ میں نے تمام فتح القدیر (آٹھ جلد) کا تقریباً چھبیس روز میں مطالعہ کیا، اور اب چھبیس سال گذر گئے اور مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو مضمون بیان کروں گا اگر تم اس کو مراجعت کرو گے تو ان شاء اللہ بہت کم تفاوت پاؤ گے۔ **ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء.**

حالاں کہ فتح القدیر نہایت دقیق اور غامض کتاب ہے جو فقہ اور اصول کی دقائق اور غوامض پر خصوصاً اور اصول حدیث کے مشکلات پر عموماً مشتمل ہے۔

ایسی دقیق کتاب کا چھبیس روز میں مطالعہ غیر معمولی فہم اور خداداد نورِ فراست کی دلیل

ہے، اور پھر مدۃ العمر اس کا بلا مراجعت استحضار قوۃ حافظہ کے کمال کی دلیل ہے۔

شہاداتِ اکابر و علمائے عصر

حضرت شاہ صاحب کا علم اور حافظہ ایسا خارق عادت اور موجب کرامت تھا کہ جس کو دیکھ کر مخلوق حیران تھی۔ اکابر اور معاصر سب ہی اس کی مدح اور ثناء میں رطب اللسان تھے۔ شاہ صاحب کے وجود کو نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے۔

محدث الہند، جنیدزمن حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند قدس اللہ سرہ جو حضرت شاہ صاحب کے استاذ تھے، مسائل مشکلہ شاہ صاحب سے دریافت فرمایا کرتے کہ تمھاری اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے اپنی مجلس میں ایک واقعہ امام غزالی کا بیان فرمایا کہ ایک عیسائی فیلسوف نے لکھا ہے کہ اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ غزالی جیسا محقق اور مدقق اسلام کو حق سمجھتا ہے، یہ واقعہ بیان کر کے حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ میرے زمانہ میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثانی دیوبندی رحمہ اللہ جو تحقیق و تدقیق اور حسن بیان میں امام ابو الحسن اشعری کی زبان اور ترجمان تھے وہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق یہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح ہماری آنکھوں نے شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا، اسی طرح شاہ صاحب کی آنکھوں نے بھی اپنا مثل نہیں دیکھا۔ اور اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ کیا تو نے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید کو دیکھا؟ اور کیا تو نے حافظ ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے تو میں کہوں گا کہ ہاں میں نے انکو دیکھا، جب شاہ صاحب رحمہ اللہ کو دیکھا تو گویا ان کو دیکھا۔

مولانا شبیر احمد عثانی صاحب رحمہ اللہ کا یہ کلمہ وہ کلمہ ہے جو اس سے پہلے امام ابو القاسم قشیری اور پھر امام غزالی اور پھر شیخ تقی الدین ابن دقیق العید کے بارہ میں علماء نے کہا ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند یہ فرمایا

کرتے تھے کہ شاہ صاحب سلف صالحین کا نمونہ ہیں اور علم کا ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ہیں۔ چناں چہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد عازم سفر ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب بھی تھے تو کسی اخبار میں اس وفد کی خبر شائع ہوئی، اور یہ لکھا کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد فلاں جگہ جارہا ہے اور ایک کتب خانہ اس کے ساتھ ہے، یعنی حضرت شاہ صاحبؒ اس کے ساتھ ہیں۔

سندِ حدیث

شاہ صاحبؒ حدیث شریف شیخ زمن حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند سے پڑھی اور اجازت حاصل کی بعد ازاں جنید عصر و شبلی دہر قطب دوراں، سید طائفہ مردان حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حدیث کی اجازت لی۔

ان ہر دو حضرات کی اسانید اہل علم میں معروف اور متداول ہیں، یہ دونوں حضرات شریعت اور طریقت اور علم ظاہری اور باطنی کے مجمع البحرین تھے۔

بعد ازاں ۱۳۲۳ھ میں جب حرمین شریفین کی زیارت کو تشریف لے گئے تو شیخ حسین جسر طرابلسی سے مدینہ منورہ میں حدیث کی اجازت حاصل کی۔

علاوہ ازیں اور بھی دیگر علماء و صلحاء سے سند حاصل کی، اور یہ اسانید فیض الباری مؤلفہ محب محترم مولانا الحاج مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی اطال اللہ بقاءہ میں مذکور ہیں۔

حسنِ صورت اور حسنِ سیرت اور نورِ تقویٰ

حق تعالیٰ نے شاہ صاحب کو علم و فضل کے ساتھ حسن صورت اور حسن سیرت سے مُحَسَّنُ اور نورِ تقویٰ سے بھی مزین فرمایا تھا۔ انور شاہ صاحب اسم بامسمیٰ تھا۔ انور اسم تفضیل کا صیغہ ہے کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے تفضیل کے حامل تھے کمیت سے مراد نورِ علم اور نورِ تقویٰ اور نورِ صورت اور نورِ سیرت۔ یعنی نور کے یہ انواع واقسام مراد ہیں، اور کیفیت سے نفس علم مراد ہے، اس لیے کہ علم مقولہ کیف سے ہے، امام مالکؒ کا مشہور مقولہ

ہے کہ علم کثرت روایت کا نام نہیں، علم ایک نور۔خداوندی ہے جس کے دل میں چاہتا ہے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

علماء اور حکماء کے نزدیک علم ایک نورانی حالت اور کیفیت کا نام ہے جس سے معلوم کی صورت اور حقیقت اور صفت کچھ نظر آ جاتی ہے۔ جس درجہ کی نورانیت ہوگی، اسی درجہ کا انکشاف ہوگا، حق تعالیٰ نے شاہ صاحب کو اس نورانی کیفیت کے اعتبار سے بھی (انور) بنایا تھا۔

انور اگرچہ علم ذات تھا، مگر بطور کنایہ نور علم اور نور تقویٰ پر بھی دلالت کرتا تھا، اور یہ دلالت اس درجہ مشہور ہوئی کہ انور شاہ کا نام علم وحفظ پر اس طرح دلالت کرنے لگا جس طرح کہ لفظ حاتم جود وسخا کی دلالت میں مشہور ہے۔

شاہ صاحب نہایت حسین وجمیل تھے، اور حسن ظاہری کے ساتھ حسن سیرت اور جمالِ باطنی کے ساتھ بھی موصوف تھے، تواضع اور حلم اور وقار اور سکوت اور خاموشی آپ کا طرۂ، امتیاز تھا، بلاضرورت کلام نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرنے آتا تو اس کو جواب دیتے اور اس کے بعد اگر وہ بیٹھتا اور باتیں کرتا تو یہ فرماتے، جاؤ بھائی آرام کرو، آرام بہت اچھی چیز ہے، یعنی لایعنی سے احتراز میں دنیا اور آخرت دونوں کی راحت ہے۔نور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جو شخص بھی دیکھتا وہ اول نظر میں یقین کر لیتا کہ یہ خدا کا کوئی نیک بندہ ہے، حق یہ ہے کہ نورِ تقویٰ اجلی بدیہیات میں سے ہے مگر حقیقت کی تنقیح بہت دشوار ہے اور درجۂ اتصاف کی دشواری کو تو پوچھو ہی مت وانها لكبيرة الا على الخاشعين۝ الذين يظنون انهم ملاقوا ربهم وانهم اليه راجعون۝.

شاہ صاحب اگر کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور باہر سے کوئی اجنبی مجلس میں داخل ہوتا تو دیکھتے ہی یہ سمجھ لیتا تھا کہ اس مجلس میں سب سے بڑا عالم اور متقی یہی شخص ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور ❁ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

یہ ناچیز جب بھی شاہ صاحب کو دیکھتا تو یہ شعر زبان پر آتا ؎

اَلْمُسْلِمُوْنَ بِخَيْرٍ مَا بِقِيْتَ لَهُمْ ❁ وَلَيْسَ بَعْدَكَ خَيْرٌ حِيْنَ تُفْتَقَدِ

جب تک آپ زندہ ہیں اس وقت تک مسلمان خیر وبرکت میں ہیں، اور تیرے گم

ہونے کے بعد خیر نہیں۔

طبقات الشافعیہ میں ہے کہ یہ شعر کسی نے امام بخاری کو دیکھ کر پڑھا تھا، شاہ صاحبؒ چوں کہ اس زمانہ کے امام بخاری تھے، اس لیے یہ ناچیز ان کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتا تھا۔

بشاراتِ تمام

حدیث شریف میں ہے کہ رؤیائے صالحہ مؤمنین کے لیے بشارت ہے، دیکھنے والے کے لیے بھی اور جس کے لیے دیکھا گیا اس کے لیے بھی متعدد اشخاص نے سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں شاہ صاحبؒ کی صورت اور شکل میں دیکھا، جو درحقیقت اس کی بشارت تھی کہ شاہ صاحب **العلماء ورثة الانبياء** کا مصداق ہیں۔

اس ناچیز نے بھی شاہ صاحبؒ کو بارہا خواب میں دیکھا، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضور تشریف فرما ہیں، اور مولانا انور شاہؒ کی شکل میں ہیں۔

ایک مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں رمضان المبارک میں تراویح سے فارغ ہوکر سونے کے لیے لیٹ گیا اور کچھ نیند آ گئی، یکا یک گھر میں سے جگایا کہ دیکھو عائشہ بیگم بچی کو کیا ہوگیا، دیکھا کہ جس طرح آسیب زدہ کچھ بولیاں بولا کرتا ہے، اس قسم کی بولیاں بول رہی ہے میں نے اس وقت وہ دعاء پڑھ کر دم کی، جو صحیح بخاری میں ہے کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بچوں کو پڑھ کر دم فرمایا کرتے تھے **اعيذك بكلمات الله التامات من كل شيطان وهامة ومن كل عين لامة** جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ دعا پڑھ کر اور بچی پر دم کر کے لیٹ گیا، شب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ تشریف فرما ہیں اور شاہ صاحبؒ کی شکل میں ہیں، جب سحر میں اٹھا تو گھر میں یہ خواب بیان کیا اس نے تسلی دی اور بتلایا کہ بے فکر ہو جاؤ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد سحر اور آسیب کا اثر نہیں رہ سکتا، سو الحمد للہ اس کے بعد سے آج تک لڑکی پر کوئی آسیب کا اثر نہیں ہوا، الحمد للہ سحر کا وقت تھا، اور سحر اور آسیب سے مامون ہونے کی بشارت سامنے تھی۔

پاکستان آنے کے بعد ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ

ایک مسجد میں مقیم ہیں اور سفر آخرت کی تیاری فرمارہے ہیں اور لوگ عموماً اور اہل علم خصوصاً الوداعی سلام کے لیے حاضر ہورہے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا کتب خانہ بھی اسی مسجد میں ہے اہل علم میں سے جو ملنے کے لیے آتا ہے اس کو کوئی کتاب ضرور مرحمت فرماتے ہیں۔ اسی اثناء میں یہ ناچیز بھی سلام اور وداع کے لیے حاضر ہوا، بہت مسرور ہوئے، اور اٹھ کر حجرے میں تشریف لے گئے، اور ایک نسخہ صحیح بخاری کا لے کر برآمد ہوئے اور یہ فرمایا کہ صحیح بخاری میں نے تیرے لیے رکھ چھوڑی تھی، بعدازاں آنکھ کھل گئی، اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

اسی خواب کے متصل ایک دوسرا خواب دیکھا، وہ یہ کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ کے یہاں یہ ناچیز مع اہل وعیال کے مدعو ہے اور کھانے کا خاص اہتمام ہے اور اس ناچیز کے علاوہ اس وقت اور کسی کی دعوت نہیں، اہل وعیال حضرت کے یہاں چلے گئے اور یہ ناچیز بعد میں حاضر ہوا، دیکھا کہ حضرت حکیم الامت ایک پلنگ پر تشریف فرما ہیں، یہ ناچیز پائتیں بیٹھ گیا، کچھ دیر تک باتیں فرماتے رہے، بعدازاں ایک نسخہ صحیح بخاری کا اس ناچیز کو عطا فرمایا، اور فرمایا کہ یہ لے لو، اور اس کے سوا کچھ نہیں فرمایا۔

(تعبیر) تعبیر بظاہر یہ سمجھ میں آئی کہ یہ ناچیز اب تک دارالعلوم دیوبند میں بیضاوی شریف پڑھاتا رہا، اب پاکستان آنے کے بعد بظاہر یہ خواب اس لیے دکھلایا گیا کہ اب زیادہ توجہ صحیح بخاری کی طرف کرو، یہاں اس کے درس کی ضرورت ہے، اور حضرت حکیم الامت تھانوی اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ دونوں حضرات کی طرف سے صحیح بخاری کا نسخہ عطا ہونے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے لون (رنگ) اور نوع علم کو ملا کر سبق پڑھاؤ۔ سوالحمد اللہ بخاری شریف آج کل پڑھارہا ہوں اور دونوں بزرگوں کے رفع درجات کے لیے دعا کرتا ہوں اور دونوں بزرگوں کے علوم درس میں بیان کرتا ہوں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ وماتوفیقی الا باللّٰہ۔

درسِ حدیث

درس کی عجب شان تھی جس کا اب دکھلانا تو ممکن نہیں البتہ بتلانا کچھ ممکن ہے۔

(۱) درسِ حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت اور بلاغت کے واضح ہو جائے، کوشش اس کی فرماتے کہ حدیث کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے، اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً ورتبۃً مقدم ہے، حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلاف ادب ہے، نیز جس طرح حضرات مفسرین قرآن کریم کے اسرارِ بلاغت بیان کرتے ہیں، اسی طرح شاہ صاحب رحمہ اللہ حدیث کے اہم بلاغی نکات پر متنبہ فرماتے، چناں چہ اس ناچیز نے جو تعلیق صبیح لکھی وہ حضرت شاہ صاحب ہی کا ارشاد تھا، اور مقصد یہ تھا کہ احادیث کی شرح میں بلاغی نکات کا خاص اہتمام کیا جائے، اور فرمایا کہ اس بارہ میں حافظ تورپشتی اور علامہ طیبی کی شرح سب سے زیادہ لطیف اور لذیذ ہے اس لیے اس ناچیز نے طیبی اور تورپشتی کے لطائف اور نکات میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی کہ جو تعلیق صبیح میں درج نہ کردی ہو۔ تصنیف کے بعد حضرت شاہ صاحب کی خدمت مبارکہ میں اس تالیف کو پیش کیا، اول کی تین جلدیں حرف بحرف شاہ صاحب کے مطالعہ سے گذر چکی ہیں۔ **فلله الحمد والمنة.**

(۲) خاص خاص مواضع میں حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے، اور اس مناسبت سے بہت سی مشکلات قرآنیہ کو حل فرمادیتے۔

(۳) بقدر ضرورت اسماء الرجال پر کلام فرماتے، خصوصاً جن رواۃ کے بارہ میں محدثین کا اختلاف ہوتا، اس جرح وتعدیل کے اختلاف کو نقل کرکے اپنی طرف سے ایک قول فیصل بتلادیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول ہے، اس کی روایت حسن کے درجہ میں رہے گی یا صحیح کے درجہ میں یا قابل رد ہوگی یا قابل اغماض اور مسامحت اور اغماض اور مسامحت میں جو فرق ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ رکھتے کہ جب کسی راوی کے جرح وتعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ بتلادیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے۔ اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

(۴) فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے، اور پھر ان کے وہ دلائل بیان فرماتے جو اس مذہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی

ہوتے، اور پھر ان کا شافی جواب اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے۔

حنفیت کے لیے استدلال اور ترجیح میں کتاب وسنت کے تبادر اور سیاق اور سباق کو پورا ملحوظ رکھتے، اور اس بات کا خاص لحاظ رکھتے کہ شریعت کا منشاء اور مقصد اس بارہ میں کیا ہے اور یہ حکم خاص شریعت کے احکام کلیہ کے تو خلاف نہیں، شریعت کے مقاصد کلیہ کو مقدم رکھتے، اور احکام جزئیہ میں اگر بے تکلف تاویل اور توجیہ ممکن ہوتی تو اس کی توجیہ فرماتے، اور اگر تکلف معلوم ہوتا تو قواعد کلیہ کو ترجیح دیتے جو طریقہ فقہائے کرام کا ہے۔

فائدہ در بیانِ تعریفِ مجتہد

حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ فقیہ اور مجتہد وہ ہے کہ جو جزئیات کو دیکھ کر کلیات کو مستنبط کرے، اور مفتی وہ ہے جو ان کلیات کو معلوم کر لینے کے بعد یہ سمجھ سکتا ہو کہ فلاں جزئیہ، فلاں کلیہ کے تحت درج ہے، محض چند جزئی احکام شرعیہ کے دلائل یاد کر لینے سے انسان مجتہد نہیں بن جاتا۔

اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجتہد وہ ہے کہ جو پوری شریعت کا کلی مزاج سمجھے ہوئے ہو، جیسے طبیب وہ ہے جو طب کے مزاج سے واقف ہو اگر کسی پہاڑی کو دو چار جڑی بوٹیوں کے خواص معلوم ہو گئے تو وہ طبیب نہیں بن جاتا۔

(۵) نقل مذاہب میں قدماء کے نقول پیش فرماتے، متاخرین کے نقول پر متقدمین کی نقول کو مقدم رکھتے، ائمہ اجتہاد کے اصل اقوال نقل فرماتے، اور مشائخ کے اقوال بعد میں۔

(۶) مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے، گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لیے موجب طمانینت ہوتا۔

(۷) درسِ بخاری میں تراجم کے حل کی طرف خاص توجہ فرماتے، اولاً بخاری کی غرض اور مراد واضح فرماتے۔ بہت سے مواقع ایسے بھی آئے ہیں جہاں حل ترجمہ میں شارحین کے خلاف مراد منقح فرمائی۔ اور اس کے دلائل اور شواہد بیان فرماتے جو شاہ صاحبؒ کی شائع شدہ تقریر مسمی بہ فیض الباری کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں۔

اور ثانیاً یہ بھی بتلاتے کہ اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ائمہ اربعہ میں سے کس امام کا مذہب اختیار فرمایا، پوری بخاری کے پڑھانے سے یہ معلوم ہوا کہ سوائے مسائل مشہورہ کے اکثر جگہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی موافقت کی۔

(۸) درس بخاری میں فرمایا کہ حافظ عسقلانی چونکہ امام شافعی کے مقلد ہیں، اس لیے امام شافعی کی تائید کے لیے فتح الباری میں جا بجا امام طحاوی کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس کی پوری سعی فرماتے ہیں کہ امام طحاوی کا جواب ضرور ہو جائے، بغیر امام طحاوی کے جواب دیئے گذرنے کو حافظ عسقلانی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے حق شافعیت ادا نہیں کیا، اس کے بعد فرمایا کہ اس ناچیز کی تو کوشش یہ رہتی ہے کہ مسائل فقہیہ میں بغیر حافظ عسقلانی کا جواب دیئے نہ گذرے۔

(۹) اسرار شریعت میں شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی کا کلام زیادہ نقل فرماتے۔

(۱۰) درس کی تقریر نہایت جامع اور نہایت موجز اور مختصر ہوتی تھی، ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحبؒ دیوبند تشریف لائے، بڑے مہتمم صاحب یعنی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے یہاں تھے، بڑے مہتمم صاحب نے فرمایا کہ مولانا! آپ مدرسہ کے سرپرست ہیں، آپ ہمارے صدر مدرس کا درس تو سنیں، فرمایا بہت اچھا درس میں تشریف لے گئے، فراغت کے بعد حضرت حکیم الامت نے یہ ارشاد فرمایا کہ درس کا ہر جملہ اس قدر موجز اور مختصر تھا کہ ہر جملہ کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ درس کو دیکھ کر محدثین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، جب متون حدیث پر کلام فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ بخاری اور مسلم بول رہے ہیں اور جب فقہ الحدیث پر کلام کرتے تو محمد بن حسن شیبانی معلوم ہوتے، اور جب حدیث کی بلاغت پر کلام فرماتے تو تفتازانی اور جرجانی معلوم ہوتے اور جب شریعت کے اسرار بیان فرماتے تو ابن عربی اور شعرانی معلوم ہوتے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ

از: جناب محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر ''الفرقان'' لکھنؤ

خداداد نورانیت ومحبوبیت

حضرت استاذ قدس اللہ سرہ کے کمالات میں یقیناً علم وعمل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر اور مخلوق کی نگاہ میں بھی زیادہ قدر و قیمت علم وعمل ہی کی ہے، اس لحاظ سے مجھے پہلے حضرت ممدوح کے وہی واقعات اور ارشادات اور اپنے وہی تأثرات ذکر کرنے چاہئیں جن کا تعلق علم وعمل جیسے اعلیٰ کمالات سے ہے، لیکن یہ عاجز چوں کہ سب سے پہلے حضرت کی ظاہری نورانیت ومحبوبیت ہی سے واقف اور متاثر ہوا اس لیے سلسلۂ سخن اسی سے شروع کرتا ہوں۔

آج سے قریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اگلے سال دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ تھا، مراد آباد میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ہوا، یہ عاجز بھی گیا، حضرت شاہ صاحب کا ذکر اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا، لیکن ابھی تک آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، غالباً صبح کا وقت تھا دیکھا کہ چند حضرات ایک طرف سے تشریف لا رہے ہیں، ان میں ایک بزرگ جو گہرے سبز رنگ کا عبا پہنے ہوئے تھے، اور غالباً ہلکے زرد رنگ کا عمامہ زیب سر تھا، بڑے حسین وجمیل اور بڑے نورانی نظر پڑے۔ آپ سے آپ دل میں آیا کہ شاید یہی دیوبند کے حضرت شاہ صاحب ہیں۔ کسی سے پوچھا جواب ملا کہ ہاں شاہ صاحب یہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اس دید ہی سے دل میں ایک خاص محبت وعقیدت ڈال دی۔

اجلاس کے سلسلہ میں تین دن مراد آباد رہا، اب تک یاد ہے کہ اس تاک میں رہا کرتا

تھا اور گھوم پھر کے بھی اس کی کوشش کیا کرتا تھا کہ حضرت کو کہیں دیکھوں، غالباً دیکھنا تو بار بار نصیب ہوا، لیکن تقریر یا بات سننا کیا معنی، ان دنوں میں آواز سننا بھی یاد نہیں۔

چند مہینے کے بعد دیو بند پہنچ گیا۔ اس سال چوں کہ میں نے دورۂ حدیث نہیں لیا تھا، اس لیے حضرت کے یہاں میرا کوئی سبق تو نہیں تھا، لیکن پھر بھی روزانہ کئی کئی بار آنکھوں کو دید کا موقع ملتا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ جی بھرتا نہیں تھا اور ہر دفعہ دیکھنے میں لذت ملتی تھی۔ اگلے سال میں نے دورہ لیا، اور حسب معمول بخاری شریف اور ترمذی شریف پوری حضرت کے یہاں ہوئیں، اور دونوں سبقوں کے سلسلہ میں روزانہ قریباً ۳-۴ گھنٹے خدمت میں حضوری کی سعادت نصیب ہوتی تھی، لیکن اپنی اس گذشتنی کے ذکر اور اس کی یاد میں آج بھی لذت محسوس کرتا ہوں کہ حسب توفیق علمی استفادہ کے علاوہ یہ عاجز آنکھوں کے ذریعہ بھی لذت و سرور حاصل کرتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ میں اس حال میں منفرد نہ تھا، بلکہ بہت سے شرکائے درس غالباً میرے شریک حال تھے۔

سیرت و باطن کے کمال کے ساتھ ساتھ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو صورت و ظاہر کی نورانیت و زیبائی اور اس میں جذب و کشش بھی نصیب فرمائے تو بلاشبہ یہ بڑا انعام ہے، اور میرا خیال ہے کہ افادہ استفادہ میں اس سے بڑی جان پڑ جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر پیغمبر کو ظاہر و صورت کی زیبائی بھی عطا فرمائی جاتی ہے، ایک حدیث میں ہے:

مابعث اللّٰہ نبیاً الا حسن الوجہ حسن الصوت وصاحبکم احسنھم وجھاً واحسنھم صوتاً.(۱)

کمالِ علمی اور علوم میں جامعیت

یوں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت استاذؒ کو گوناگوں ظاہری اور باطنی کمالات سے نوازا تھا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آپ کا علمی کمال دوسرے تمام کمالات پر غالب تھا، اتنا غالب کہ

(۱) یہ حدیث امام قاضی عیاض نے اپنی "کتاب الشفاء" میں نقل کی ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے بھی پیغمبر آئے وہ سب خوبرو اور خوش آواز تھے، اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دونوں چیزیں بھی دوسروں سے زیادہ عطا فرمائی گئی تھیں، اور آپ اس پہلو میں بھی سب سے فائق تھے۔ ۱۲۔

دوسرے کمالات گویا بالکل اس کے نیچے دبے ہوئے تھے (۱)۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے متعلق صرف یہی کہتے ہیں کہ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے ایک علامہ تھے اور بعض حضرات جن کی واقفیت اور زیادہ ناقص ہے، وہ علوم میں بھی صرف علم حدیث میں آپ کے امتیاز اور علو مقام کے قائل ہیں، اور آپ کو اس دور کے صرف ایک ممتاز محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حضرت کے مقام علمی سے کچھ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت ممدوح کا خاص امتیاز علوم کی جامعیت تھی اور وہ بھی ایسی جامعیت کہ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس علم میں حضرت کی مہارت اور مناسبت نسبۃً زیادہ تھی۔

وسعتِ علم کے ساتھ دقتِ نظر

اس موقع پر بعض حضرات کی ایک اور غلط فہمی کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے ایک نامور عالم جنھیں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات سے بلاواسطہ واقف ہونے کا غالباً کبھی موقع نہیں ملا۔ ان کے متعلق میں نے سنا کہ کسی موقع پر انھوں نے حضرت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور چوں کہ حافظہ بھی بہت قوی تھا اس لیے آپ بذات خود ایک وسیع کتب خانہ تھے، لیکن نظر میں گہرائی نہیں تھی، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وسیع النظر اور کثیر المعلومات تو تھے، لیکن دقیق النظر اور عمیق العلم نہیں تھے۔

یہ عاجز پورے وثوق اور بحمد اللہ پوری بصیرت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ جن اہل علم

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض شخصیتیں جامع الکمالات ہوتی ہیں، لیکن ان میں کوئی ایک کمال اتنا غالب اور ایسا نمایاں ہو جاتا ہے کہ دوسرے کمالات اس کی وجہ سے دب جاتے ہیں اور لوگ انکو محسوس بھی نہیں کرتے۔ مثال میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مرزا مظہر جاناں جان شہید، حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمہم اللہ کی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے کہ اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا پایہ فقر و درویشی میں بھی کم نہیں ہے لیکن ان پر کمال علم اتنا غالب ہے کہ ان کا نام سن کر لوگوں کا ذہن فقر و درویشی کی طرف جاتا ہی نہیں بخلاف حضرت مرزا صاحب شاہ غلام علی صاحب کے اگرچہ وہ علم سے خالی نہیں ہیں، لیکن ان پر درویشی کا ایسا غلبہ ہے کہ انکا نام سن کر لوگوں کا ذہن علم کی طرف بالکل نہیں منتقل ہوتا، بلکہ صرف فقر و درویشی ہی کی طرف سبقت کرتا۔ ۱۲

ونظر کو حضرت کی علمی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے انھیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت کے یہاں دقت نظر کا پلہ کسی طرح بھی وسعت نظر کے مقابلہ میں ہلکا نہیں تھا۔ البتہ علم کی سطح ہمارے اس زمانہ کی عام سطح سے اتنی بلند تھی کہ نہ سمجھنے والے بھی معذور سمجھے جانے کے قابل ہیں۔ ایک دفعہ خود فرمایا:

"بعض اوقات بہت نیچے اتر کر بات کرتا ہوں، لیکن پھر بھی لوگ نہیں سمجھتے"۔

یہ ایک بڑا علمی سانحہ ہے کہ حضرت ممدوح نے اپنے علم کی نشانی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن اس کی وجہ غالبًا یہ بھی ہوئی کہ حضرت کو اہل زمانہ کی طرف سے مایوسی تھی، تاہم بعض خاص خاص مسائل اور موضوعات پر جو چند رسالے خود آپ کے لکھے ہوئے ہیں ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی سطح زمانہ کی عام سطح سے کس قدر بلند ہے، اور آپ کی نظر کتنی دقیق اور علم کتنا عمیق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے اہل علم اپنے کو ان رسالوں کو سمجھنے سے عاجز اور قاصر پاتے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تعبیر و ادا میں کوئی اغلاق و تعقید ہے، بلکہ یہ صرف علمی سطح کے غیر معمولی تفاوت کا نتیجہ ہے، اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسا آج کل کے بہت سے اہل علم حضرات امام محمد اور شافعی کی کتابوں سے اتنی آسانی سے استفادہ نہیں کر سکتے جتنی آسانی سے متاخرین کی کتابوں سے وہ استفادہ کر لیتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت کا طرزِ فکر اور طرزِ استدلال بہ نسبت متاخرین کے متقدمین سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

قرآن مجید میں تدبر و تفکر

علم کی گہرائی اور دقت نظر کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نے اپنا یہ حال خود ایک دفعہ بیان فرمایا کہ:

"میں رمضان مبارک میں قرآن مجید شروع کرتا ہوں اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا۔ جب دیکھتا ہوں کہ آج رمضان مبارک ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خاص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی

ہوتا ہے اس دن ختم کر کے دور پورا کر لیتا ہوں''۔

• یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ رمضان مبارک میں کبھی حضرت کے قریب رہنے کا اتفاق تو نہیں ہوا، لیکن یہ معلوم ہے کہ آپ ''اُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْآنُ'' والے اس مبارک مہینہ میں زیادہ وقت قرآن مجید ہی کی تلاوت اور تدبر و تفکر پر صرف فرماتے تھے، اس کے باوجود قرآن مجید ختم نہیں کر پاتے تھے۔

حدیث میں غور و تدبر

خود حضرت نے ایک دن بیان فرمایا:

''کہ میں نے غور و فکر کے ساتھ صحیح بخاری کے صرف متن کا تیرہ دفعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، شروح یا حواشی کے ساتھ جو مطالعہ کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے''۔

قرآن مجید میں تدبر و تفکر کی مثالیں تو بہت سی سنی ہیں اور کتابوں میں بھی پڑھی ہیں، لیکن حدیث میں تفکر کی ایسی مثال نہ سنی نہ کتابوں میں کہیں نظر سے گذری۔

اور جن لوگوں کو حضرت کے درسِ حدیث سے کچھ مستفید ہونے کا موقع ملا ہے غالباً وہ سب اس کی شہادت دیں گے کہ آپ کے درس کا رنگ بھی یہ تھا کہ اس میں اسنادی و روایتی بحث و تنقید کے مقابلہ میں معنوی اور درایتی مباحث کم نہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے، اور اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے صرف ایک صاحب روایت محدث کی حیثیت سے حدیث کے متون و اسانید ہی سے واقفیت حاصل نہیں کی اور اسی طرح یہ کہ آپ کے علم کا ماخذ اور مبلغ صرف چند حواشی و شروح ہی نہیں ہیں، بلکہ ایک صاحب فکر درایت اور دقیق النظر فقیہ کی طرح آپ نے احادیث کے معانی و مقاصد پر بطور خود بھی بڑا گہرا غور کیا ہے۔ اور چند خاص خاص مسئلوں پر حضرت کے جو بعض رسائل ہیں وہ بھی حضرت کی اس خصوصیت و جامعیت پر شاہد ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی قابل ذکر ہے، جو شاید بہت سے اہل علم کے لیے ایک ''نیا انکشاف'' ہو۔ اچھا ہے اس بہانہ سے وہ بھی قرطاس کی امانت بن جائے۔

علامہ نیمویؒ کی آثار السنن اور حضرت استاذؒ

حضرت استاذ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی رحمۃ اللہ اور انکی معرکۃ الاراء نا تمام ''آثار السنن'' سے اور اس کی غیر معمولی اہمیت سے کم از کم حضرات اہل علم ضرور واقف ہوں گے۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں تو علمی اور درسی حلقوں میں اس کتاب کی دھوم مچی ہوئی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثانہ طرز پر حنفیت کی تائید میں یہ کتاب ہمارے اس زمانہ کا شاہکار ہے، افسوس یہ پوری نہ ہوسکی، اور اس کے پہلے دو حصے تالیف فرما کر علامہ ممدوح اس عالم سے رحلت فرما گئے۔

حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن درس میں اس کتاب کے متعلق یہ واقعہ بیان فرمایا کہ:

''جس زمانہ میں مولانا ظہیر احسن صاحب نیموی رحمۃ اللہ علیہ آثار السنن تالیف فرما رہے تھے، انھوں نے اس کے کچھ اجزاء حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجے کہ ملاحظہ فرما کر مشورے دیں اور جو اضافے فرمائے جاسکیں وہ اضافے فرمادیں۔

حضرت استاذؒ نے ملاحظہ فرما کر وہ اجزا واپس فرمادیئے اور انکو میرا پتہ لکھ دیا کہ آپ اس مقصد کے لیے اس پتہ پر خط و کتابت فرمائیں، میں اس زمانے میں اپنے وطن (کشمیر) میں رہتا تھا۔

مولانا ظہیر احسن صاحب نے حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مجھے خط لکھا، اور اس طرح میری ان کی خط و کتابت شروع ہوگئی، اور پھر انھوں نے اپنی کتاب بھیجنی شروع فرمائی، جتنی لکھ لیتے تھے وہ مجھے بھیج دیتے تھے اور میں ان کے حکم کی تعمیل میں اضافے کرتا تھا، میں نے جو اضافے کیے وہ مقدار میں ان کی اصل کتاب سے زیادہ تھے، لیکن میرے یہ اضافے زیادہ تر معنوی بحثوں سے متعلق بھی تھے، کیوں کہ مولانا موصوف نے علل و اسانید کی بحثوں کے اضافے کی گنجائش کسی کے لیے بہت کم چھوڑی تھی، مگر چونکہ میری وہ معنوی بحثیں مولانا کے ذوق کی چیز نہیں تھی، اور اپنی کتاب میں خالص محدثین

کے طرز پر علل واسانید ہی سے بحث کرنا چاہتے تھے۔اس لیے انھوں نے میرے اس باب کے (یعنی علل واسانید کے متعلق) اضافے تو قبول فرمائے اور کتاب میں لے لیے، لیکن معنوی مباحث تمام تر حذف کردیئے‘‘۔

اس عاجز نے حضرت استاذ سے یہ پوری بات درس میں سنی ہے۔اور حضرت ہی کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ علامہ شوق نیموی جب تک رہے حضرت سے علمی مراسلت اور مشاورت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت استاذؒ ہی سے سنے ہوئے بعض جزئیات اس عاجز کو یاد بھی ہیں لیکن وہ خالص علمی باتیں ہیں اس مقالہ میں ان کا ذکر مناسب نہ ہوگا۔

علامہ نیموی حضرت استاذ کی نظر میں

جب علامہ شوق نیمویؒ کا ذکر آ گیا ہے تو اس واقعہ کا اظہار بھی میرے لیے ضروری ہے کہ حضرت استاذؒ فن حدیث میں علامہ ممدوح کا مقام بہت بلند مانتے تھے اور معرفت علل واسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے عالم کو ان کا عدیل ومثیل نہیں قرار دیتے تھے۔ اس عاجز کو خوب یاد ہے یہاں تک فرماتے تھے کہ مولانا ظہیر احسن صاحب حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ (لکھنوی فرنگی محلی) کے شاگرد ہیں، لیکن صناعت حدیث میں ان سے بہت فائق ہیں۔

اس سے یہ اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے اکثر علمی حلقوں میں جو یہ بیماری آ گئی ہے کہ اپنے خاص حلقہ اور اپنی خاص جماعت سے باہر ان کو کوئی صاحب کمال ہی نظر نہیں آتا اور ہر میدان میں وہ اپنے ہی حلقہ اور سلسلہ والوں کا جھنڈا اونچا رکھنا چاہتے ہیں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو الحمد اللہ یہ بیماری بالکل نہیں لگی تھی اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں یہ تو بڑی خراب بیماری ہے۔

خیر! یہ باتیں تو استطراداً ذکر میں آ گئیں ورنہ میں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا اب پھر وہیں آ جایئے۔

حیرت انگیز یادداشت

اپنے حافظہ کے انحطاط پر رنج وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک دن فرمایا:
"پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر آج ایک مضمون متعدد کتابوں میں دیکھوں اور مجھے ان کتابوں کی عبارتیں نقل کرنی ہوں، لیکن کسی وجہ سے آج نقل نہ کرسکوں اور کل بھی موقع نہ ملے تو پرسوں تک بھی اس پر قدرت رہتی تھی کہ ہر کتاب کی اصل عبارت صفحہ کے حوالہ کے ساتھ دوبارہ کتاب دیکھے بغیر نقل کرسکتا تھا، لیکن اب حافظہ اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ صبح کی دیکھی کتابوں کی عبارتیں شام تک تو نقل کرسکتا ہوں لیکن رات درمیان گذر جانے کے بعد کل نقل نہیں کرسکتا"۔

یادداشت کے متعلق اپنے بعض تجربے

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے کئی سال بعد تک درس وتدریس اس عاجز کا مشغلہ رہا، اوراس زمانہ میں کتابوں کے مطالعہ سے بھی کچھ زیادہ شغف تھا، کبھی زیر درس کتابوں میں اور کبھی خارجی مطالعہ میں ایسے اشکالات بھی پیش آجاتے تھے جن کے حل کرنے سے اپنا غور وفکر عاجز رہتا تھا۔ میں ایسے تمام اشکالات کو اپنی نوٹ بک میں نوٹ کرتا رہتا تھا، اور جب حضرت استاذ کی خدمت میں حاضری میسر ہوتی تو وہ نوٹ بک جیب سے نکال کر اکثر پہلی ہی ملاقات کی مجلس میں حضرت کے سامنے میں اپنے وہ اشکالات عرض کرتا، اور حضرت میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دیتے گویا اس سوال کے تمام اطراف پر آپ نے خاص طور سے حال ہی میں غور فرمایا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس تجربہ کی شہادت ہر وہ شخص دے گا جس نے کوئی علمی اشکال کبھی حضرت کے سامنے پیش کرکے جواب چاہا ہو۔

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ جب تک حضرت اس دنیا میں رہے میرا برابر یہ دستور رہا بلکہ اپنے مطالعہ کے اشکالات کے علاوہ بعض دوسرے اہل علم واصحاب درس کے اشکالات وسوالات بھی ان سے دریافت کرکے میں اپنی نوٹ بک میں لکھ کرلے جاتا تھا،

اگر یہ عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت کی خدمت میں حاضری کے ہر موقع پر میری نوٹ بک کے یہ سوالات ہی حضرت کے لیے میرا خاص ہدیہ ہوتا تھا۔ جس کا میں بڑا اہتمام کرتا تھا۔ اور حضرت کا معاملہ بھی یہ تھا کہ اگر کبھی میں حاضر ہوا اور کسی وجہ سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا تو حضرت خود فرماتے تھے ''مولوی صاحب کچھ پوچھنا ہے؟'' اور پھر اس کے بعد میں پوچھتا تھا۔

خیر یہ تو تمہید تھی، اب یادداشت اور قوت حافظہ کا وہ واقعہ سنئے جس کے لیے مجھے یہ لمبی تمہید لکھنی پڑی ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا میں نے حوالہ دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے، بہت غور کیا لیکن حل نہیں ہوسکا۔

فرمایا ''مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہوگئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں، اور انھیں پتہ نہیں چلتا، ورنہ جو اشکال آپکو پیش آیا سب کو پیش آنا چاہئے، پھر فرمایا، صحیح عبارت اس طرح ہے۔

بس سارا اشکال جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا ایک منٹ میں رفع ہوگیا۔

اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات بتلائی تھی۔

ایک واقعہ اور سنئے! سورہ نساء کے سولہویں رکوع کی آیتیں چوری اور دھوکہ بازی کے ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، اس واقعہ کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ کس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور یہ آیتیں نازل ہوئیں، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو تفسیریں مجھے ایسی ملیں جن میں آیات سے متعلق روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، میں نے ان سب کو دیکھ ڈالا، مگر واقعہ کا زمانہ اور سنہ مجھے کہیں سے معلوم نہ ہوسکا، عاجز آکر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے فلاں واقعہ کے سنہ وقوع کی تلاش ہے، کتابوں میں دیکھا مگر مجھے نہیں ملا؟

فرمایا ''کون کون سی کتابیں آپ نے دیکھیں؟'' میں نے تفسیر ابن جریر و ابن کثیر

ومعالم وغیرہ چند تفسیروں کے نام لیے، فرمایا درمنثور میں نہیں دیکھا؟ میں نے عرض کیا کہ در منثور کا نسخہ اس وقت کتب خانہ میں موجود نہیں تھا کہیں عاریت میں گیا ہوا ہے، اس لیے اس کو تو نہیں دیکھ سکا۔

فرمایا جاؤ اس میں دیکھ لو اس میں مذکور ہے۔

چناں چہ تلاش کر کے درمنثور کو دیکھا تو ابن سعد کی ایک روایت میں یہ صریح الفاظ موجود تھے:

وکان ذالک فی شھر ربیع سنة اربع

(کہ یہ واقع ماہ ربیع ۴ھ میں پیش آیا)

گویا جو چیز بھی کسی کتاب میں کبھی حضرت نے دیکھی وہ حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی تھی۔

حدیث کے درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ چند اور احادیث کی کتابیں حضرت کے سامنے رکھی رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تھا تو صرف زبانی حوالہ پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ تقریر جاری رکھتے ہوئے بے تکلف اسی کتاب پر ہاتھ جاتا تھا اور حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل ایک خاص انداز میں کہتے ہوئے ایسا انداز فرما کر کتاب کھولتے تھے کہ بعض اوقات تو وہی صفحہ کھلتا تھا جس پر وہ حدیث ہوتی تھی، ورنہ بس دو چار ورق ادھر سے یا ادھر سے الٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے ہوتی تھی، جن حضرات نے یہ منظر نہیں دیکھا انھیں آج یہ سن کر غالباً حیرت ہوگی اور شاید بہت سوں کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا، لیکن جن لوگوں کو حضرت کے درس میں چند روز بھی بیٹھنے کا موقع ملا ہوگا انھوں نے قریباً روزانہ سبق میں یہ عجوبہ دیکھا ہوگا۔

علمی اطمینان اور اتقان

حضرت استاذ کے علمی امتیازات اور خصوصیات میں ایک نہایت اہم اور قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلہ میں آپ سے رجوع کیا جاتا آپ جواب اس طرح دیتے کہ گویا

اس کے سارے پہلوؤں اور تمام مالہ وماعلیہ پر آپ نے ماضی قریب ہی میں غور فرمایا ہے اور آپ بالکل مطمئن ہیں۔ ''شاید یوں ہو، یا شاید یوں ہو'' والی بات آپ کے یہاں بالکل نہ تھی۔

فقہ حنفی کے بارہ میں اطمینان

جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث کا طالب علم تھا (اور وہی سال دارالعلوم دیوبند میں حضرت کے درس کا آخری سال تھا) شعبان کے مہینہ میں جب کہ طلبہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے وطن جانے والے تھے، آپ نے ایک دن بعد نماز عصر تمام طلبہ سے بالعموم اور دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والے اپنے تلامذہ سے بالخصوص خطاب فرمایا۔ اس میں منجملہ اور باتوں کی ایک بات یہ بھی فرمائی:

''ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لیے صرف کیے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارہ میں اطمینان حاصل کیا جائے سو الحمد اللہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد میں اس بارہ میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استناد کرتے ہیں کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے، اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لیے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے''۔

یہاں مجھے فقہ حنفی کے بارہ میں تو حضرت کا صرف اتنا ہی ارشاد نقل کرنا تھا جو دراصل حضرت نے ایک دوسری بات کے لیے بطور تمہید کے فرمایا تھا لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں وہ اصل بات بھی ذکر کر دی جائے جس کی یہ تمہید تھی۔

حضرت نے فقہ حنفی کے سلسلہ میں اپنی تیس سالہ محنت و تحقیق اور اس کے نتیجہ میں اپنے اس اطمینان کا ذکر فرمانے کے بعد خدام سے فرمایا۔ سننے والے گوش دل سے سنیں کیا فرمایا۔ فرمایا:

''لیکن مجھے افسوس ہے! کاش میرا یہ وقت دین کے اس سے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری

کام میں صرف ہوا ہوتا تو آخرت میں اس کے کام آنے کی زیادہ امید کرسکتا تھا"

پھر اسی تقریر میں آپ نے فرمایا:

"میں نے اپنے عربی اور فارسی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیشہ اردو لکھنے پڑھنے سے احتراز کیا ہے یہاں تک کہ عام طور سے اپنی خط وکتابت کی زبان بھی میں نے عربی اور فارسی میں رکھی، لیکن اب مجھے اس پر بھی افسوس ہے، ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین سے دفاع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دنیا میں دین کا کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے، میں اس بارہ میں آپ صاحبوں کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں"۔

آگے کسی موقع سے ان شاء اللہ میں اس کا مستقلاً ذکر کروں گا کہ حضرت استاذ کو اس زمانہ میں دو فتنوں کی بڑی سخت فکر تھی، اندرونی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ، اور خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا فتنہ۔ اپنی زندگی کے اس دور میں حضرت کے دل کی خاص لگن بس یہی تھی کہ امت محمدیہ کو ان فتنوں کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اہل علم پوری تیاری اور طاقت سے میدان میں آئیں اور حضرت سمجھتے تھے کہ یہ کام اس زمانہ میں اردو اور انگریزی ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اس لیے ان دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے خاص طور سے فرمایا کرتے تھے۔

اسی سے ناظرین یہ بھی اندازہ فرماسکتے ہیں کہ خالص "کتاب بیں عالم" ہونے کے باوجود آپ کے ذہن وفکر میں کتنی وسعت تھی اور آپ کی نظر میں وقت کے تقاضوں کی کتنی اہمیت تھی۔

خیر یہ تو گویا ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ میں فقہ کے سلسلہ میں حضرت کی بعض علمی خصوصیات کا تذکرہ کررہا تھا۔ اب آگے اسی سلسلہ میں سنئے:

فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول

ایک موقع پر فرمایا:

''اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں، اور مرجحین اور اصحابِ فتویٰ مختلف وجوہ واسباب کی بناء پر ان میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں، میں اسی قول کو زیادہ وزنی اور قابل ترجیح سمجھتا ہوں جو از روئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے ائمہ مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہو جاتا ہو۔ (اسی سلسلہ میں فرمایا) میرا اپنا اصول تو یہی ہے لیکن دوسرے اہل فتویٰ اپنے اصول پر جو فتویٰ لکھتے ہیں میں ان کی بھی تصدیق کر دیتا ہوں، اور میری اس تصدیق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ از روئے فقہ حنفی یہ جواب بھی صحیح ہے''۔

بعض مسائل میں آپ کی خاص تحقیق

وسعت علم ونظر اور خاص فقیہانہ فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بعض مسائل میں آپ کی تحقیق ہمارے زمانہ کے عام علمائے احناف سے الگ تھی۔ بلکہ شاید واقعہ کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ عام علماء واہل فتویٰ کے لیے فقہ حنفی میں وہ ایک نئی علمی دریافت ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک مثالیں اس عاجز کو یاد ہیں، لیکن ان میں سے ایک ایسی ہے جس کا ذکر اردو کے اس مقالہ میں نامناسب نہ ہوگا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں چاند دیکھا جائے تو دوسرے تمام مقامات پر اس کا اعتبار کیا جائے گا، مثلاً اقصائے مغرب میں رمضان کا چاند ایک دن دیکھا گیا تو اگر شرعاً قابل اعتبار ذریعہ سے اس کی اطلاع اقصائے مشرق میں رہنے والوں کو پہنچ جائے تو ان کو بھی اسی حساب سے روزہ رکھنا ہوگا۔ خاص علمی اور فقہی تعبیر اس مسئلہ کی یہ کی جاتی ہے کہ ''حنفیہ کے یہاں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں اور دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا اعتبار ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ عام طور سے علمی اور فقہی حلقوں میں حنفیہ کا یہی مذہب معلوم ومشہور ہے اور عموماً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اور حنفی فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا بھی ہے، حالاں کہ ہیئت کے حساب سے یہ بالکل ناقابل فہم ہے۔

حضرت استاذ قدس سرہ کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ تھی کہ عام مصنفین سے اس کی تعبیر میں لغزش ہوگئی ہے اور اصل مسئلہ حنفیہ کا یہ ہے کہ ایک اقلیم میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، فرماتے تھے کہ مشرق و مغرب کے درمیان مطالع کا اعتبار نہ کرنا بداہۃً غلط ہے اور حضرت استاذ اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں جہاں تک اب یاد پڑتا ہے ابن رشد کی بدایۃ المجتہد اور فقہ حنفی کی کتابوں میں سے بدائع کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

(واضح رہے کہ پہلے تو یہ صرف ایک قابل غور علمی مسئلہ تھا جو محض معقولیت پسندوں کے لیے اشکال اور خلجان کا باعث ہوتا تھا، لیکن اب یہ واقعاتی مسئلہ ہوگیا ہے، کیوں کہ اکثر ممالک عربیہ میں عموماً ہندوستان سے ایک دن پہلے چاند نظر آجاتا ہے۔ اور ہیئت کے اصول پر ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ اور ہوائی جہاز جدہ سے پرواز کر کے ۸۔۹ گھنٹے میں بمبی آجاتا ہے اور ۱۲ گھنٹے سے کم میں دہلی آسکتا ہے، پس یہ ہوسکتا ہے کہ ۲۹ رمضان کی شام کو کچھ لوگوں نے جدہ میں عید کا چاند دیکھا اور اسی شب کو وہ ہوائی جہاز سے روانہ ہوکر صبح کو بمبی پہنچے تو اگر اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو ان لوگوں کی شہادت پر ہندوستان والوں کے لیے اس دن روزہ ختم کر کے عید منانے کا حکم دیا جائے گا، حالاں کہ یہاں اس روز انتیسواں، بلکہ کبھی تو اٹھائیسواں ہی روزہ ہوگا۔ اپنے زمانہ کے بعض اکابر علماء اور اہل فتویٰ کے متعلق سنا ہے کہ جب ان کے سامنے یہ واقعاتی اشکال اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتوی دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی ناگزیر صورتوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ عاجز عرض کرتا ہے اگر ان بزرگ کو اس مسئلہ کے متعلق حضرت استاذ کی مندرجہ تحقیق و تنقیح پہنچی ہوتی تو اس مسئلہ میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے کو وہ ناگزیر نہ سمجھتے)۔

علم اسرار و حقائق

حضرت استاذ علم اسرار و حقائق میں بلاشبہ اس دور کے شیخ اکبر تھے۔ شیخ ممدوح کے علوم سے خاص مناسبت بھی تھی اور شیخ کے بہت سے نہایت اعلیٰ اور قیمتی افادات زیادہ تر ان

کی مشہور کتاب ''فتوحات مکیہ'' کے حوالہ سے درس میں بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ بعض مشکل دینی حقیقتوں کے بارہ میں ان سے بڑا انشراح اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

حضرت استاذ کے شاگرد رشید مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم حال مدینہ طیبہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے انھوں نے فیض الباری (۱) میں بھی حضرت کے اس سلسلہ کے افادات کا خاصا حصہ لے لیا تھا اور اب حدیث کی جو ایک نئی جامع کتاب وہ خود مرتب فرمارہے ہیں، جو انہی کے اردو ترجمہ اور مفصل تشریحی نوٹوں کے ساتھ ''ندوۃ المصنفین دہلی'' سے ''ترجمان السنۃ'' کے نام سے شائع ہورہی ہے، اور پہلی دو جلدیں شائع بھی ہوچکی ہیں۔ اس میں بھی انھوں نے حضرت استاذ کے اس خاص الخاص علمی شعبہ کے نہایت گراں قدر افادات کو اردو میں منتقل کرنے کی اور غیر عالم اردو خوانوں کو بھی سمجھا دینے کی بڑی مبارک اور کامیاب کوشش کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ شیخ اکبر کے مضامین کو صحیح سالم اور محتاط طریقہ پر اردو جیسی کسی زبان میں منتقل کردینا یقیناً بڑا مشکل کام ہے، مگر ترجمان السنۃ کے ابتدائی ابواب ہی کے مطالعہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا بدر عالم صاحب کے لیے اس کو کس حد تک آسان فرمادیا ہے۔

جدید مغربی علوم پر بھی نظر

مصر والوں نے جدید مغربی علوم پر عربی میں جو کتابیں شائع کی ہیں اور مختلف مغربی زبانوں سے جو تراجم کیے ہیں حضرت استاذ ان کے ذریعہ ان نئے علوم اور نئی تحقیقات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے، خاص طور سے طبیعیات میں یورپ نے جو علمی ترقی کی ہے اس کے معترف اور اس کے افادی پہلو کے قدر داں تھے اور اسی وجہ سے مشہور مصری فاضل

(۱) مولانا بدر عالم صاحب نے مسلسل کئی سال حضرت استاذ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے درسی افادات کو خاص محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے اور مجلس علمی ڈابھیل نے بڑے اہتمام سے مصر میں چھپوا کر اس کو شائع کیا۔ گویا صحیح بخاری کے سلسلہ میں یہ حضرت کے ''امالی'' ہیں اسی کا نام ''فیض الباری'' ہے چار ضخیم جلدیں ہیں، حضرت کی علمی و درسی خصوصیات کا ایک خاص حد تک اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مولانا بدر عالم صاحب اور مجلس علمی کا بلاشبہ یہ بڑا کارنامہ ہے اور ہم لوگوں پر بڑا احسان ہے، مگر کاش یہ کتاب حضرت کی زندگی میں مرتب ہوکر نظر انور سے بھی گذر چکی ہوتی۔ ۱۲

طنطاوی جوہری کی تفسیر ''جواہر القرآن'' کے مطالعہ اور اس سے علمی استفادہ کا مشورہ دوسرے اہل علم کو بھی دیتے تھے، حالاں کہ اس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو سخت ناپسندیدہ ہیں۔

سلسلۂ درس کی بعض قابل ذکر چیزیں

جو طلبہ صرف ونحو کی خامی اور عربی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے حدیث صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور اعراب میں غلطیاں کرتے تھے حضرت استاذ ان کے لیے حدیث پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر طالب علم سے سبق کی قرأت میں کسی ایسے راوی کے نام میں غلطی ہوجاتی جو سلسلہ سند میں بار بار اور کثرت سے آتا تو اس سے بھی آپ کو بڑی سخت اذیت ہوتی تھی اور گویا یہ تکلیف آپ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ایک دن ترمذی شریف کا سبق ہورہا تھا، ایک طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی شاید پہلی یا دوسری حدیث تھی سلسلہ سند میں آیا ''عَنِ الشَّعَبِیُ '' اس بچارہ نے شَعَبِیُ کے شُعُبِیُ پڑھا، حضرت استاذ نے تصحیح فرماتے ہوئے فرمایا ''عَنِ الشَّعَبِیُ '' لیکن اس بندۂ خدا کی زبان سے پھر وہی نکلا عَنِ الشُّعُبِیُ حضرت استاذ نے اسی وقت سبق سے اٹھادیا اور فرمایا کہ جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد اور کم فہم ہوں کہ روزانہ سند میں آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بار بار بتلانے سے بھی نہ سمجھ سکیں ان کو دورۂ حدیث میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔

صحیح قسم کے طالب علمانہ سوالات سے حضرت بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی بشاشت کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے لیکن مہمل قسم کے اور لا یعنی یا غیر متعلق والات کی بالکل گنجائش اور اجازت نہ تھی۔ جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں تھا اس سال دورہ میں تقریباً سو طالب علم تھے ان میں ۴۔ ۵ کو حضرت نے خود متعین فرمایا تھا کہ صرف یہی سوال کیا کریں اور ان کے علاوہ جس کو سبق کے سلسلہ میں کچھ پوچھنا ہو تو وہ پہلے ان کو بتلادے، اگر یہ اس کو پیش کرنے کے قابل سمجھیں تو پیش کریں، حضرت کے اس طرز

عمل کی وجہ سے کسی فضول اور لایعنی بات میں بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا یہ ہمیشہ کا رویہ تھا یا اسی سال یہ طرزِ عمل اختیار فرمالیا۔

حضرت استاذ قدس اللہ سرہ کے متعلق اس مقالہ میں ذکر کرنے کے لائق علمی اور درسی سلسلہ کی جو باتیں اس وقت یاد آئیں وہ یہی تھیں جو حوالۂ قلم ہو چکیں، اب زندگی کے بعض دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی بعض جستہ جستہ چیزیں جو حافظہ میں ہیں وہ بھی ہدیۂ ناظرین کرام ہیں۔

دو فتنوں کا شدید احساس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی امت کے بارہ میں آپ کو دو فتنوں کی طرف سے بڑی گہری فکر تھی۔ خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا مغربی فتنہ جو اقوام مغرب کے سیاسی غلبہ اور علوم وفنون میں ان کی بالاتری کی وجہ سے تمام عالم پر چھایا جا رہا ہے۔اور داخلی و اندرونی فتنوں میں مسیلمۂ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ۔ ان دونوں فتنوں کی شدت احساس سے آپ بے چین رہتے تھے، اور ان کے مقابلہ اور امت کی ان سے حفاظت کرنے کے واسطے تیاری کرنے کے لیے آپ طلبہ کو بڑے درد کے ساتھ ترغیبیں دیتے تھے اور اس کے لیے درس کے علاوہ آپ مستقل تقریریں بھی کرتے تھے، بلکہ اس زمانہ میں حضرت کی تقریروں کا موضوع عموماً یہی ہوتا تھا۔

قادیانی فتنہ سے آپ کی غیر معمولی بے چینی

خاص طور سے مؤخر الذکر قادیانی فتنہ کے بارہ میں آپ کی فکر اور بے چینی کا جو حال تھا جن لوگوں نے دیکھا نہیں وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ارتداد کی جو وبا پھیلی تھی اور خاص کر مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے کا فتنہ جو اس وقت ایک دم زور پکڑ گیا تھا اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی بے چینی اور حرارت ایمانی کا

ذکر جو روایات میں آتا ہے حضرت استاذ قدس سرہ کے احوال میں بالکل اس کی جھلک نظر آتی تھی اور اس زمانہ میں حضرت اپنی اکثر تقریروں میں اس فتنہ ارتداد کے زمانہ کے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جوش ایمانی سے بھرے ہوئے خطبات اور کلمات اکثر دہرایا کرتے تھے، خاص طور سے صدیق اکبر کا وہ ایمان افروز جملہ جو آپ نے حضرت عمرؓ سے اس وقت فرمایا تھا جب مرتدین کے خلاف جنگ کے بارہ میں مصلحت اندیشی سے کام لینے کا حضرت صدیق اکبر کو انھوں نے مشورہ دیا تھا۔

وہ جملہ کتب حدیث وسیر میں آج تک محفوظ ہے اور حضرت ابوبکرؓ کے مقام صدیقیت کی شہادت دے رہا ہے، اس کے الفاظ جو حضرت استاذ اس زمانہ میں اکثر دہرایا کرتے تھے یہ ہیں:

"اجبار فی الجاهلية وخوار فی الاسلام انه قد انقطع الوحی وتم الدين اينقص وانا حی"(۱)

بہرحال قادیانی فتنہ کی فکر حضرت استاذ کی سب سے بڑی فکر تھی اور اس معاملہ میں آپ کا حال وہ تھا جو ان بندگانِ خدا کا ہوتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنا کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے اور پھر اس کی فکر اور اس کے لیے بے چینی ان پر طاری کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت استاذ نے قادیانیت سے متعلق اپنے تین خواب سنائے تھے، جو آپ نے دس دس سال کے فاصلے سے دیکھے تھے، اپنی اس نالائقی پر آج سخت رنج وافسوس ہے کہ نہ کہیں ان کو نوٹ کیا اور نہ یاد رکھا۔ اجمالاً صرف اتنا یاد ہے کہ پہلا خواب آپ نے قیام دہلی کے زمانہ میں دیکھا تھا، دوسرا اس سے ٹھیک دس سال بعد اور تیسرا اس کے ٹھیک دس سال بعد دیکھا تھا ان تینوں خوابوں میں آپ کو پنجاب کی اس متنبی کذاب کے فتنہ سے امت محمدیہ کے ایمان کی حفاظت کے لیے جدوجہد کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اس راستہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی بشارت تھی۔ مجھے اجمالاً اتنا ہی یاد رہ گیا ہے حضرت نے ایک موقع پر پوری تفصیل سے یہ

(۱) مطلب یہ ہے کہ "تم جاہلیت میں تو بڑے سخت اور زور آور تھے اور آج اسلام کی حالت میں ایسی کمزوری اور نامردی کی باتیں کرتے ہو، نبوت ختم ہو چکی ہے، وحی کی آمد کا سلسلہ بند ہو چکا اور دین ہر طرح مکمل ہو گیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دنیا میں زندہ رہوں اور دین میں قطع و برید ہو۔ ۱۲

تینوں خواب سنائے تھے شاید حضرت کے خدام اور تلامذہ میں سے کسی اور کو یاد ہوں۔

اس فتنہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کام حضرت استاذ سے لیے ان کا ذکر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں۔ (جو غالباً اس مجموعۂ مضامین میں بھی شامل ہوگا جس کے لیے یہ سطریں یہ عاجز لکھ رہا ہے) تاہم اس سلسلہ میں دو تین باتیں ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(ا) قادیانی فتنہ کے ظہور نے جن مسائل اور مباحث پر گفتگو کا سلسلہ پیدا کر دیا ہے ان میں دو مسئلے مختلف وجوہ و اسباب سے علمی طور پر کچھ مشکل ہیں یعنی ان میں لوگوں کے لیے مغالطہ کھانے کی گنجائش بہ نسبت دوسرے مسئلوں کے کچھ زیادہ ہے، ایک مسئلۂ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرا ایمان و کفر کے حدود کا مسئلہ۔

یہ دوسرا مسئلہ اگرچہ فی نفسہ مشکل نہیں ہے، بلکہ سیدھی سادی بات ہے لیکن کچھ تو مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی بعض مبہم اور غیر واضح تعبیروں نے اور کچھ تکفیر جیسے سنگین معاملہ میں بعض لوگوں کی بے احتیاطیوں۔ نے مسئلہ کو اچھا خاصا مشکل بنا دیا ہے۔ اور اس میں ایسی الجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ بہت سے لوگ خواہ مخواہ اس میں الجھ جاتے ہیں۔ حضرت استاذ نے ان دونوں مسئلوں کی طرف خود توجہ مبذول فرمائی۔

مسئلہ حیاتِ مسیح پر پہلے ایک رسالہ ''عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام'' لکھا اس کے بعد بطور اس کے حواشی یا ضمیمہ کے دوسرا رسالہ ''تحیۃ الاسلام'' تالیف فرمایا۔ یہ دونوں عربی زبان میں ہیں، اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کا طرزِ فکر اور طرزِ بیان واستدلال متاخرین کا سا نہیں ہے جس کا سمجھنا ہم جیسوں کے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے؛ بلکہ ائمہ متقدمین کا سا ہے اس لیے افسوس ہے کہ ہر عربی داں کے لیے بھی ان دونوں رسالوں کو پوری طرح سمجھ لینا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو سلیم القلب ان دونوں رسالوں کو سمجھ کر پڑھے لے، اس کو ان شاءاللہ اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں رہے گا کہ قرآن مجید کی قطعی شہادت قادیانیوں کے دعوے ''ممات مسیح'' کے خلاف ہے اور قادیانیوں کی طرف سے جو سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات اس مسئلہ پر لکھے گئے ہیں ان کی

بنیاد یا لکھنے والوں کی جہالت پر ہے یا علمی خیانت اور دھوکہ بازی پر۔

جس سال یہ عاجز دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اسی سال ممالک عربیہ میں سے غالباً مصر کے ایک بڑے وسیع النظر عالم اور ممتاز فاضل جو مغربی علوم میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے اور جرمنی میں ایک عرصہ تک ان کا قیام بھی رہا، دیوبند تشریف لائے تھے اور دارالعلوم میں چند روز قیام فرمایا تھا، ان کی تشریف آوری کا باعث جیسا کہ اس وقت سنا تھا صرف یہ ہوا تھا کہ حضرت استاذ کے رسالہ ''عقیدۃ الاسلام'' کا نسخہ کہیں ان کی نظر سے گذرا، اس کو دیکھنے کے بعد انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس علم کا آدمی اگر دنیا میں کہیں زندہ موجود ہے تو مجھے اس سے ضرور ملنا چاہئے۔

دوسرے مسئلہ کفر و اسلام کے حدود پر حضرت استاذ نے رسالہ ''اکفار الملحدین فی شیء من ضروریات الدین'' تالیف فرمایا، یہ بھی عربی میں ہے، اور ہر عربی داں کے لیے یہ بھی سہل الفہم نہیں ہے، لیکن کفر و اسلام کے حدود کی ایسی تنقیح غالباً اس سے پہلے نہیں ہوئی، اس کو سمجھ کر پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کر کے اور اس کی امت نے اس کو نبی مان کر اپنے کو اسلام کے وسیع دائرہ سے اس طرح نکال لیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر ایمان رکھتا ہو وہ اب کسی طرح ان لوگوں کو مسلمانوں میں شمار نہیں کر سکتا، اور اگر وہ (قادیانیت سے اور قادیانیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ایسا کرے گا تو اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے بعض اہم حصوں کی تکذیب یا آپ کی بعض واضح تعلیمات میں تحریف کرنی پڑے گی، اگر چہ وہ اپنی کج فہمی یا نادانی کی وجہ سے اس پوزیشن کو سمجھتا نہ ہو)۔

''اکفار الملحدین'' کا تعلق چوں کہ کفر و اسلام کے مسئلہ سے تھا اور اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت پر کفر کا حکم لگایا گیا تھا اور بلاشبہ یہ بہت اہم معاملہ تھا، اس لیے حضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ اس زمانہ کے دوسرے اکابر اور مشاہیر اہل علم کی آراء بھی اس کے بارہ میں حاصل کی جائیں، چناں چہ کچھ اکابر اہل علم مثلاً حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری وغیرہ کی آراء تو پہلے ہی اڈیشن میں شامل کر دی گئی تھیں اور اس عاجز کے پاس اسی اڈیشن کا نسخہ ہے لیکن دوسرے حلقوں کے بعض علماء وافاضل کی رائیں اور تصدیقیں بعد میں حاصل ہوئی تھیں، مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (صدر یار جنگ) مرحوم کے متعلق راقم سطور کو معلوم ہے کہ پہلے اڈیشن کی اشاعت کے کافی عرصہ کے بعد موصوف کی تصدیق موصول ہوئی تھی، مگر مجھے معلوم نہیں کہ بعد کے اڈیشنوں میں بعد والی وہ تصدیقات شامل ہوئیں یا نہیں، اگر شامل نہیں ہوئی ہیں اور کہیں محفوظ ہیں تو ان کو شامل ہونا چاہئے۔

الغرض قادیانی فتنہ کی غارت گری سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ایک کام تو آپ نے یہ کیا کہ ان دو مسئلوں کو خود صاف کیا لیکن چوں کہ اردو میں لکھنے کی حضرت کو عادت نہ تھی اس لیے مجبوراً یہ دونوں رسالے عربی میں لکھے اور اس امید پر کہ لکھے کہ خود علماء کے ذہن جب ان دونوں مشکل مسئلوں کے بارہ میں ان رسالوں سے صاف اور مطمئن ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دے گا وہ ان کے مضامین کو حسب ضرورت اردو وغیرہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل کر دیں گے۔

ایک رسالہ آپ نے مسئلہ ختم نبوت پر ''خاتم النبیین'' کے نام سے فارسی زبان میں بھی تحریر فرمایا اور یہ آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا، کیوں کہ وہاں کے جس طبقہ کو آپ سمجھانا چاہتے تھے اس کے لیے آپ کے نزدیک فارسی زبان ہی اچھا ذریعہ بن سکتی تھی۔

(۲) ان رسالوں کے علاوہ آپ کی فکر اور بے چینی نے آپ کے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے اس فتنہ کے انسداد میں مختلف شکلوں میں بہت کچھ کام لیا، جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے جس مضمون کا ابھی اوپر میں نے تذکرہ کیا ہے اس سے ناظرین کو اس کی کچھ تفصیل معلوم ہوگی۔

سلوک وتصوف

میں عرض کر چکا ہوں کہ علمی شغف وانہماک اور علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ

دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو "سلوک وتصوف" سے تعبیر کرنا چاہئے، اس علمی کمال اور شغف علمی سے دبا ہوا تھا، اسی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے اس رخ سے بالکل ناواقف ہیں، یہ عاجز بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے لیکن اجمالاً اتنا ضرور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور یقیناً آپ آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے، حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ سے مجاز بھی تھے۔ لیکن اس لائن میں باتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔ البتہ ایک دفعہ ایک واقعہ سنایا، اور اس سلسلہ میں جو کچھ جوش آ گیا تو ایک آدھ بات ہم لوگوں کو ایسی بھی سننی میسر آ گئی جس سے کچھ سمجھا جاسکا کہ اس فضا میں حضرت استاذ کی پرواز کتنی بلند ہے۔ جو واقعہ حضرت نے سنایا وہ یہ تھا:

فرمایا کہ ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لیے چلا، راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑتی تھی، راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا، یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے اور ان ہی کے پاس جا رہے تھے، یہ مجھ سے اپنے ان پیر صاحب کا اور ان کے کمالات اور کرامات کا تذکرہ راستہ بھر کرتے رہے، ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی ان پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں، اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا، میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پر پہنچے تو ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے میں پہلے جا کر آپ کے لیے اجازت لے لوں چناں چہ وہ اندر تشریف لے گئے ان بزرگ نے اطلاع پا کر خود اپنے صاجزادے کو مجھے لینے کے لیے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے، خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین وطالبین نیچے فرش پر تھے مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے طریقہ پر ان پر توجہ ڈالنی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے میں یہ سب دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو آپ

مجھ پر توجہ فرمائیں۔ انھوں نے توجہ دینی شروع کی، اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا، بیچاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا، کچھ دیر کے بعد انھوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت استاذ نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:

"کچھ نہیں لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے، ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں"۔

پھر اسی سلسلہ میں اور اسی جوش کی حالت میں فرمایا:

"اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے لیکن یہ بھی کچھ نہیں، اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت و سنت پر استقامت ہے"۔

اس ایک موقع کے سوا حضرت سے کبھی کوئی ایسی بات سننا اس عاجز کو یاد نہیں جس سے حضرت کے اس باطنی کمال کا کچھ سراغ ہم کو ملا ہو۔

اپنے بعض اکابر سے خصوصی تأثر

جیسا کہ میں عرض بھی کر چکا ہوں سلوک و تصوف کے سلسلہ کی باتیں کرنے کی حضرت استاذ کی عادت نہیں تھی، کم از کم اس عاجز کا علم و تجربہ تو یہی ہے، اسی لیے اس سلسلہ کے اپنے اکابر کے خاص احوال و واقعات یا ان کی زندگی کے خاص اس شعبہ کے متعلق اپنے تأثرات حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سننے کا ہم نیاز مندوں کو کبھی شاذ و نادر ہی اتفاق ہوتا تھا۔ ایک ہی دفعہ کی یاد ہے درس ہی میں کسی سلسلہ میں فرمایا:

"ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہی کے یہاں دیکھا، اس کے بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہند) اور حضرات رائے پوری (یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ) کے یہاں دیکھا اور اب جو

دیکھنا چاہے وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے یہاں جاکر دیکھے“۔

اپنے سلسلہ کے ان اکابر کے علاوہ ہم عصر مشائخ میں سے دو اور بزرگوں کے بارہ میں بھی حضرت استاذ کے بہت بلند کلمات اس عاجز کو یاد ہیں، ایک حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددی نقش بندی اور دوسرے حضرت مولانا احمد خاں صاحب مجددی نقش بندی ان دونوں بزرگوں کے متعلق حضرت فرماتے تھے کہ اس عصر میں یہ نقش بندی سلوک کے امام ہیں۔

یہ دونوں بزرگ ضلع میانوالی کے تھے، دونوں کے وصال کو عرصہ ہو چکا ہے دونوں ایک ہی شیخ کے تربیت یافتہ اور مجاز تھے، لیکن بعض مسائل میں نقطۂ نظر کے فرق کی وجہ سے درمیان میں کچھ بعد پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت استاذ دونوں کو سلوک کا امام مانتے تھے، یہ عاجز بھی ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے مشرف ہوا ہے۔ وللّٰہ الحمد والمنة۔

بعض شمائل نبوی کی جھلک

اگرچہ شمائل واخلاق میری اس تحریر کا موضوع نہیں اور غالباً ان چیزوں پر کوئی اور صاحب مستقلاً لکھیں گے، لیکن یہاں پہنچ کر حضرت استاذ کی دو تین عادتیں ذکر کرنے کو بھی بے اختیار جی چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اخلاق وشمائل کتب حدیث میں روایت کیے گئے ہیں ان میں ایک یہ عادت مبارکہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے (گویا بلاضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ”کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم طویل الصمت“ یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مبارک عادت کا جیسا کامل نمونہ حضرت استاذ کو دیکھا ایسا کوئی اور دیکھنا یاد نہیں، معلوم ہوتا تھا کہ ان کو صرف علمی ودینی افادہ واستفادہ کے لیے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی کے لیے زبان دی گئی ہے۔

اور اس خاموشی میں تنفس کی منضبط کیفیت اور ایک خاص نوعیت سے محسوس کرنے والے صاف محسوس کر لیتے تھے کہ پاس انفاس (۱) کے شغل میں برابر مشغول ہیں۔

(۱) صوفیہ کے اشغال میں سے صرف پاس انفاس کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ اس کی اصل حدیث وسنت سے کچھ معلوم ہوتی ہے، اس لیے خود اپنا شغل بھی تھا اور رجوع کرنے والے نیازمندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے۔ ۱۲

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ میں صحابۂ کرام ذکر فرماتے ہیں کہ:
''مسکرانے کی بہت زیادہ عادت تھی لیکن کھل کھلا کر ہنستے کبھی نہیں دیکھا''۔
بالکل یہی حال حضرت استاذ کا تھا۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدی ہوگئی ہے اور اس سے اور اس کے اڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا کتنا مشکل ہوگیا ہے، اس کا اندازہ بہت سے حضرات کو شاید نہ ہو لیکن اس عاجز کو خوب ہے اور اس لیے میرا یقین ہے کہ اللہ کا جو بندہ اس دور میں غیبت سے محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی ''کرامت'' ہے۔

مگر حضرت استاذ قدس سرہ کو الحمد اللہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارۃً کنایۃً بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سننا یاد نہیں۔ بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔

حضرت استاذ کے متعلق بس یہی کچھ منتشر باتیں اس وقت اس مقالہ میں ذکر کے قابل یاد آئیں جو حوالۂ قلم و قرطاس کر دی گئیں۔

اے کہ تو مجموعۂ خوبی!

(از: مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی (مدیر رسالہ برہان دہلی)

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا☆ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

برادر عزیزم مولوی سید ازہر شاہ قیصر صاحب سلمہ نے حضرتنا الاستاذ العلام مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق چند مضامین کا ایک مجموعہ بصورت کتاب چھاپنے کا ارادہ کیا ہے اور مجھ سے بھی اس بزم میں شرکت کی فرمائش کی ہے، ارادہ خدا مبارک کرے، بہت نیک اور اچھا ہے، اور آں عزیز کی طلب پر یہ چند سطریں بھی زیر تحریر ہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شاہ صاحب کا جو بھاری قرضہ ان کے تلامذہ، اربابِ حاشیہ اور عقیدت مندوں کے ذمہ حضرت مرحوم کے روز وفات سے اب تک برابر چلا آ رہا ہے، وہ سب تو کیا اس کا عشر عشیر بھی ایک آدھ کتاب لکھ دینے سے کیوں کر ادا ہو سکتا ہے؟

حضرت الاستاذ اپنی ذات سے چند در چند علمی کمالات و فضائل کے باعث ایک انجمن اور صحیح معنوں میں اس شعر کا مصداق تھے:

ولیس علی اللہ بمستنکر ۞ ان یجمع العالم فی واحدِ

خود میرا اپنا حال یہ تھا کہ علمائے سلف کے شوق علم، وسعت مطالعہ، قوت وحفظ، ذہانت غیر معمولی وسعت علم وعمیق نظر وغیرہ، علمی وذہنی کمالات سے متعلق ایک دو نہیں سیکڑوں حیرت انگیز واقعات پڑھے تھے، میں ان کو پڑھتا تھا اور دل میں خیال کرتا تھا کہ مؤرخین نے اپنی عام عادت کے مطابق رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کر دیا ہے، ورنہ ایک انسان میں بیک وقت اتنے کمالات کیوں کر جمع ہو سکتے ہیں، مدتوں دماغ پر یہی خیال مسلط رہا، لیکن جب حضرت شاہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا اور حضرت موصوف کی صحبت میں

بیٹھ کر سمندر سے کچھ قطرے حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو اب معاوہ پہلا خیال بدلا اور یقین ہوگیا کہ جب عالم اسلامی کے انتہائی دور زوال میں بھی دیوبند نامی ایک قصبہ کے افق سے ایک ایسی شخصیت بلند ہوسکتی ہے جو حفظ حدیث میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی وقسطلانی، کتب قدیمہ کے علم وتبحر میں حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم، علم معانی وبیان میں سعد الدین تفتازانی اور فخر خوارزم جار اللہ زمخشری، منطق وفلسفہ میں ملا محب اللہ بہاری اور صدر الدین شیرازی، عربی میں حافظ اور بدیع الزماں ہمدانی کا اور فارسی شعر وسخن میں خاقانی وانوری کا ہم پایہ اور حریف وہمسر ہو تو پھر یہ کیوں کر مستبعد اور عقلاً محال ہوسکتا ہے کہ اسلام کے اور مسلمانوں کے دورِ شباب وترقی میں ایسے علمائے اعلام پیدا ہوئے ہوں جن کی نظیر مادر گیتی کے بطن سے آج تک پیدا نہ ہوئی، گویا حضرت شاہ صاحب کو دیکھ کر اپنے علمائے سلف کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہوا اور پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ اتنے ائمہ سلف کی نسبت جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں وہ مبالغہ پردازی نہیں، بلکہ واقعات کا اصل اور بے کم وکاست بیان ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم ۞ میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

اس بناء پر حضرت شاہ صاحب کا حق کسی درجہ میں اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ تن تنہا کوئی ایک شخص نہیں، بلکہ ایک مجلس کی شکل میں مختلف علوم وفنون کے ماہر چند علماء ایک جگہ یکسو ہوکر بیٹھ جائیں اور وہ اپنے اپنے ذوق واستعداد کے مطابق حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات وتالیفات، رسائل ومقالات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ حضرت شاہ صاحب کا کس علم وفن میں صحیح مرتبہ ومقام کیا ہے اور اس علم وفن کے دوسرے ائمہ کے بالمقابل حضرت مرحوم کے امتیازات ومختصات کیا ہیں؟ حضرت شاہ صاحب کا (اصل میں جو ان کے لیے بقائے دوام اور حیات جاوید کا ضامن ہے وہ) علم وفن میں ان کا یہی امتیاز واختصاص ہے، اس بناء پر حضرت مرحوم کی کوئی سوانح عمری اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس میں انھیں علمی امتیازات ومختصات پر کماحقہ روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

حضرتنا الاستاذ کا یہی علمی جاہ وجلال تھا جس کے باعث بڑے بڑے فضلائے عصر جو

مسلک و مشرب کے لحاظ سے حضرت الاستاذ سے کھلا ہوا اختلاف رکھتے تھے، حضرت سے جب کبھی دوچار ہوتے تھے تو ان کے لیے بھی علم وفضل اس مسند نشین یگانہ کے سامنے سر اطاعت وحلقہ بگوشی خم کرنے کے سوا چارہ نہ رہتا تھا۔ علامہ سید رشید المصری قاہرہ کے نامی گرامی علمی ودینی ماہنامہ ''المنار'' کے اڈیٹر تفسیر المنار اور بیسیوں بلند پایہ علمی کتابوں کے نامور مصنف مفتی محمد عبدہ اور سید جمال الدین افغانی کے مخصوص صحبت یافتہ و جانشین، خود عرب اور عربی کے بلند پایہ ادیب وانشاء پرداز اور خطیب ومقرر، ان تمام اوصاف وکمالات کے باوجود عالم اسلام کی جب اس نامور شخصیت نے دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں حضرت الاستاذ کی تقریر عربی زبان میں سنی جو مسلسل دو گھنٹہ تک جاری رہی تھی اور جس کا اصل موضوع حدیث اور علمائے دیوبند تھا، تو یہ مصری عالم سرتاپا حیرت بنا ہوا تھا، اور آخراسے اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندوستان کے سفر میں اسے مولانا سید محمد انور شاہ کی زیارت وملاقات کا اور موصوف کی یہ تقریر سننے کا موقع نہ ملتا تو وہ سمجھتا کہ وہ ہندوستان کے سفر سے تہی داماں آیا ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو کون نہیں جانتا ایک نامور مشہور فلسفی شاعر ہونے کے علاوہ فلسفہ کے دقیق النظر عالم تھے، اور فلسفۂ یونانی اور اسلامی بھی، اور عہد حاضر کا فلسفۂ مغرب بھی، اس کے علاوہ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے برملا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اپنی انگریزی زبان کے چھ لکچروں (یہ لکچر *The Reconstruction of Religion Thaught in Islam* کے نام سے چھپے ہوئے اور بہت مشہور ہیں) کی تیاری میں حضرت الاستاذ سے کافی مدد لی ہے، یہاں شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا، کہ حضرت الاستاذ کا ایک منظوم رسالہ حدوث عالم کی بحث پر ہے، یہ رسالہ حجم میں تو بہت مختصر ہی ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس مسئلہ (حدوث عالم) پر سارے قدیم وجدید فلسفہ کا عطر اور اس پر تنقید ہے اور اس بناء پر جب تک کوئی شخص فلسفہ کا اچھا اور مبصر عالم نہ ہو وہ اس رسالہ سے پورے طور پر نفع حاصل نہیں کرسکتا، یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اس کا ایک نسخہ حضرت الاستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفۂ ارسال فرمایا، ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اس کے اعتبار سے ان کے لیے کوئی تحفہ اس چند ورقی

رسالہ سے زیادہ قیمتی نہیں ہوسکتا تھا، بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور وفکر کے ساتھ پڑھا، میں اس زمانہ میں بسلسلۂ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا اور گاہے گاہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کی علمی وادبی مجلس سے لطف اندوز ہوتا تھا، ڈاکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب کے ادنیٰ درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے، بلکہ اس بارگاہ علم وفضل میں شخصی تقرب واختصاص کا مرتبہ بھی میسر ہے اس بناء پر میرے ساتھ کرم وشفقت بزرگانہ کا معاملہ کرتے تھے، اور جب کبھی حاضر ہوتا گھنٹوں بڑی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ مختلف اسلامی مسائل پر گفتگو فرماتے تھے، اسی قسم کی ایک صحبت میں ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ صاحب کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک وبصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالہ کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعر ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا، میں نے ان پر نشان لگادیا ہے، آپ اب دیو بند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کرتے آئیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی، دیو بند آکر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کرکے ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا، لیکن حضرت الاستاذ نے مجھ کو ان اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اسی میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔ یہ خط میں ہی دستی لے کر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔

یہ حکیم الامت جس نے خود اپنے متعلق کہا تھا ؂

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں ❁ کبھی سوز وسازِ رومی کبھی پیچ وتابِ رازی

اس کے دل میں حضرت الاستاذ کی کس درجہ عظمت تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دار العلوم دیو بند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاذ نے اپنے عہدۂ

صدرالاساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمانے لگے کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں میں نے بڑے تعجب سے کہا عرض کیا ''کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں ہے ؟'' فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی، لیکن اسلام کے لیے اب جو کام شاہ صاحب سے میں لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد انھوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے، مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں، ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے، پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں، یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے اس طرح ہم دونوں کے اشتراک وتعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آ جائے گی'' چناں چہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے ماتحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں، اور وہیں مقیم ہو جائیں، لیکن افسوس! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا، اور حضرت شاہ صاحب لاہور کے بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے جس کا ڈاکٹر صاحب کو واقعی بڑا املال اور صدمہ ہوا۔

باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قادیانی فتنہ کی شرانگیزی واسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں بڑا دخل

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اس لکچر کا ہے جو ختم نبوت پر ہے اور ساتھ ہی اس مقالہ کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا، لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب ہی تھے۔

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب انجمن خدام الدین کے کسی سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لے گئے تو ڈاکٹر صاحب ملاقات کے لیے حضرت موصوف کی قیام گیاہ پر آئے اور پھر ایک دن اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا، دعوت کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل مقصد علمی استفادہ تھا چناں چہ کھانے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ختم نبوت اور قتل مرتد کا مسئلہ چھیڑ دیا جس پر کامل دو ڈھائی گھنٹہ تک گفتگو رہی، ڈاکٹر صاحب کی عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی اسلامی مسئلہ پر بڑے عالم سے گفتگو کرتے تھے تو بالکل ایک طالب علمانہ انداز سے کرتے تھے، مسئلہ کے ایک پہلو کو سامنے لاتے اور اس پر اپنے شکوک وشبہات بے تکلفانہ بیان کرتے تھے، چناں چہ اس وقت بھی انھوں نے ایسا ہی کیا، حضرت شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ شکوک وشبہات اور ایرادات واعتراضات کو بڑے صبر وسکون کے ساتھ سنا اور اس کے بعد ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی کہ ڈاکٹر صاحب کو ان دو مسئلوں پر اطمینان کلی ہو گیا اور جو کچھ خلش ان کے دل میں تھی وہ جاتی رہی، اور اس کے بعد ہی انھوں نے ختم نبوت پر وہ لکچر تیار کیا کہ جو ان کے چھ لکچروں کے مجموعہ میں شامل ہے اور قادیانی تحریک پر وہ ہنگامہ آفریں مقالہ سپرد قلم فرمایا جس نے انگریزی اخبارات میں شائع ہو کر پنجاب کی فضا میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔

بہرحال یہ دو تین واقعات صرف اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ جن لوگوں کو براہ راست یا تصنیفات وتالیفات کے ذریعہ حضرت الاستاذ کے بحر ناپیدا کنار علم سے جرعہ نوشی کا موقع نہیں ملا، وہ ایک جوہر گرانمایہ کی قدر وقیمت کا اندازہ اسی سے کر سکیں کہ دنیا کے جوہریوں کی رائے اس کے متعلق کیا تھی۔

شکل وصورت

قدرت نے حضرت الاستاذ کو جس طرح اقلیم علم کی تاجداری عطا فرمائی تھی اسی طرح

جسمانی ہیئت، ڈیل ڈول، قد وقامت اور شکل وصورت میں بھی ایک خاص امتیاز عطا فرمایا تھا، مجھ کو ہندوستان مصر وحجاز اور دوسرے ممالک عربیہ کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے لیکن جو وجاہت جو وقار ومتانت اور جو دلکشی اور جاذبیت میں نے حضرت الاستاذ میں پائی وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی، ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے ہی الگ اور سب سے ہی نمایاں رہتے، دیکھنے والوں کی نگاہ ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہیں پر جاکر ٹھہر جاتی اور پھر جمتی تو اس طرح کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتی کشمیری النسل تھے اس لیے خوب کھلا ہوا سپید رنگ، کشیدہ ودراز قامت، چوڑا چکلا سینہ، دوہرا اور گداز جسم، بڑی بڑی مگر رسیلی اور شرمیلی آنکھیں، کشادہ وفراخ پیشانی، طویل مگر ستواں بینی، بڑے بڑے کان، پر گوشت اور فربہ چہرہ، ابریشم اور حریر کی مانند نرم وسبک جلد چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک کوہ گراں سبک گامی کررہا ہے بیٹھتے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم وفضل کا ایک آفتاب نظام شمس سے وابستہ ستاروں کو اپنے اردگرد لے کر بیٹھ گیا ہے، کبھی سفید اور کبھی سبز عمامہ اور وہ قامت بالا پر سبز قبا، دیکھنے والے ڈر ڈر کر دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کہ فرمان نبوی ہے **العین حق**۔

غرض کوئی ایک ادا ہو تو اس کا ذکر کیجئے، کوئی ایک خوبی ہو تو اس کو بیان کیا جائے، جہاں عالم ہو کہ:ـ

زفرق تا بقدم ہر کجا می نگرم ۞ کرشمہ دامن می کشد کہ جا ایں جاست

وہاں خاموشی کو ہی ترجمانی دل کا منصب تفویض کردینے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

لطافتِ طبع

اسی حسن وجمالِ ظاہری وباطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی بہت زیادہ تھی، بہت صاف اور اجلے کپڑے پہنتے تھے، غذا میں بھی روٹی، گوشت وغیرہ جیسی چیزیں رغبت سے نہیں کھاتے تھے، البتہ تازہ پھلوں اور طیور کے عاشق تھے۔ایک مرتبہ فرمایا کہ بیس سال میری زندگی میں ایسے گذرے ہیں کہ میں نے پرندوں کے علاوہ کوئی اور دوسرا گوشت کھایا ہی نہیں۔ ۱۹۲۸ء میں حضرت الاستاذ اپنی جماعت کے ساتھ جس میں حضرت الاستاذ مولانا

شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید سراج احمد صاحب رشیدی، مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاری، مولانا بدر عالم مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا محمد ادریس سکروڈوی شامل تھے۔ راقم الحروف کی شادی میں شرکت فرمانے لیے آگرہ تشریف لائے (چناں چہ اس خاکسار کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ نکاح حضرت الاستاذ ہی نے پڑھا تھا) تو اگر چہ والد صاحب قبلہ مرحوم نے اس جماعت مقدسہ کی ضیافت کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کے باورچی کا الگ انتظام کر دیا تھا، جو دونوں وقت عمدہ قسم کے کھانے تیار کرتا تھا، لیکن آگرہ کے نواح میں ایک مقام مئو سے، یہاں کے خربوزے مشہور ہیں، اتفاق سے یہ موسم انھیں خربوزوں کی فصل کا تھا، حضرت شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ ایک خربوزہ کھایا تو بے حد پسند آیا اور والد صاحب سے فرمایا بس ڈاکٹر صاحب! اگر آپ میری خاطر تواضع کرنی چاہتے ہیں تو سن لیجیے، مجھ کو آپ کی بریانی، قورمہ اور کوفتوں وغیرہ سے کوئی غرض نہیں، آپ میرے لیے تو یہ انتظام کیجیے کہ مئو کے خربوزوں کا ایک ٹوکرہ ہر وقت بھرا ہوا میرے پاس رکھا رہے اور ساتھ ہی ایک چھری دو پلیٹیں اور ایک طشت اور ایک بالٹی یہ چیزیں بھی رکھی رہیں تاکہ جس وقت اور جس قدر بھی کھانا چاہوں کھا سکوں! والد صاحب قبلہ نے اس ارشاد کی تعمیل کی، اور پھر تو حضرت الاستاذ کا حال یہ تھا کہ کھانا برائے نام کھاتے تھے اور شکم سیری خربوزوں سے کرتے تھے، بھنے ہوئے مرغ کے بھی بڑے قدر داں تھے، چناں چہ ڈابھیل میں ہم نے دیکھا ہے کہ خونی بواسیر کے شدید دورے پڑ رہے ہیں چہرہ بالکل زرد ہو گیا ہے، لیکن اس عالم میں بھی ناظم مطبخ کو ہدایت ہے تو یہی کہ بھنا ہوا مرغ تیار کیا جائے، ہم خدام ہر چند بڑے ادب سے عرض کرتے ہیں کہ بواسیر کے دورہ کی حالت میں تو مرغ نقصان کرے گا، مگر نہ مانتے تھے، اور ایسے موقع کے لیے حضرت کا ایک خاص جملہ تھا جو فرمایا کرتے تھے اور وہ یہ کہ ''طبیعت بہترین حاکم ہے'' یعنی طبیعت جب کسی چیز کو قبول کر رہی ہے تو وہ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اخلاق

علم و فضل میں اللہ تعالیٰ نے جو سربلندی و سرفرازی عطا فرمائی تھی اسی کے تناسب سے

اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی سائل حضرت الاستاذ کے پاس آیا ہو اور وہ نامراد گیا ہو۔ جیب میں اس وقت جو کچھ ہوتا، روپیہ ہو یا اٹھنی سائل کے حوالہ کر دیتے، ایسی بات کہنے سے احتراز فرماتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے، وہاں کے ایک نامی گرامی بیرسٹر صاحب بھی بر بنائے عقیدت خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، بیرسٹر صاحب ڈاڑھی مونچھ صاف رکھتے تھے اس لیے حضرت الاستاذ کے سامنے بیٹھتے ہوئے شرمندگی سی محسوس کر رہے تھے، اور بھنچے بھنچے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت الاستاذ نے ان کی یہ دلی کیفیت بھانپ لی، اور فرمایا ”بیرسٹر صاحب! آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں! ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے لیکن غرض و غایت دونوں کی ایک ہی ہے، یعنی دنیا کمانا! میں اگر مولوی ہو کر ڈاڑھی نہ رکھوں تو مجھے کوئی روٹی نہ دے، اسی طرح اگر آپ بیرسٹر ہو کر ڈاڑھی صاف نہ کرائیں تو ہر شخص کہے گا کہ او بے ان کو بیرسٹر کس نے بنایا، یہ تو ملاجی ہیں تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام کی روٹی نہ ملے۔ پس جب ہم دونوں کی غرض ایک ہی ہے تو محض اختلافِ فعل پر آپ کیوں شرمندہ ہوں۔

مزاح

مزاح لطافتِ طبع کی نشانی ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب بھی گاہے گاہے بہت لطیف قسم کا مزاح فرماتے تھے۔

ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ کو مزاح کے ساتھ ساتھ چھوٹوں کی دلجوئی اور ان کی دلدہی کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت الاستاذ میری شادی میں شریک ہوئے اور حضرت نے میرا نکاح پڑھا تھا۔ یہ مہینہ مئی کا تھا، جو آگرہ کے لیے بہت ہی شدید اور انتہائی سخت موسم ہے۔ بارات کو اعتماد پورہ جو آگرہ سے تین چار اسٹیشنوں کے فاصلہ پر ہے، وہاں جانا تھا، ریل کے اوقات کی مجبوری کی وجہ سے دوپہر کو تقریباً دو ڈھائی بجے کے قریب ہم لوگ آگرہ سے روانہ ہوئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اعتماد پور کے اسٹیشن پر پہنچ گئے، مگر منزل ابھی دو میل دور تھی، اسٹیشن سے قیام گاہ

تک جانے کے لیے اس نواح کی مخصوص اور سخت تکلیف دہ سواری یعنی یکہ میں بیٹھنا تھا پھر اس پر لطف یہ کہ راستہ نہایت ناہموار اجگہ جگہ گڈھے اور نشیب و فراز وہ کہ الامان! گرمی شباب پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قافلہ یکوں پر سوار ہو کر اسٹیشن سے شہر کی جانب روانہ ہوا تو راستہ کی ناہمواری اور گڈھوں کی فراوانی کی وجہ کے باعث براحال ہو گیا حضرت شاہ صاحب ٹھیرے ایک نہایت ہی لطیف اور نازک مزاج بزرگ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ رکوایا اور پاپیادہ ہو گئے چلچلاتی دھوپ پڑ رہی ہے اور لو چل رہی ہے چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضا میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں۔ اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحب منہ اور کانوں کو رومال میں لپیٹے ہوئے حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جا رہے ہیں آخر خدا خدا کر کے مقام آیا۔ ایک بڑے مکان میں انتظام تھا وہاں ہم لوگوں کو پہنچا دیا گیا۔ یہاں لوگ پہلے سے موجود تھے، کوئی پنکھا لے کر دوڑا، اور کوئی پانی سے بھرا لوٹا لے کر آیا کہ سخت گرمی میں چل کر آئے ہیں۔ ذرا منہ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو لیجئے حضرت شاہ صاحب کو صدر مجلس میں ایک قالین پر بٹھا دیا گیا اور دو تین آدمی بڑے بڑے پنکھے لے کر جھلنے کھڑے ہو گئے، جب ذرا پسینہ خشک ہو گیا اور دم میں دم آ گیا تو دودھ کے شربت کا ایک بھرا ہوا گلاس میں خود لے کر حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں آنے کو تو آ گیا، ورنہ حق یہ ہے کہ شرم کے مارے نگاہ نہیں اٹھتی تھی، کہ میری وجہ سے مولانا شبیر احمد صاحب اور دوسرے حضرات کو عموماً اور حضرت الاستاذ کو خصوصاً کس قدر شدید تکلیف پہنچی ہے۔ اسی قسم کی خیالات اور احساس ندامت و شرمندگی تھا جن سے میں اس وقت دوچار ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں دودھ کے شربت کا گلاس حضرت الاستاذ کی طرف بڑھایا۔ حضرت میرے چہرے بشرے سے سمجھ گئے، گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور خوش مزاجی کے ساتھ فرمایا:۔

الا یا ایہا الساقی اَدِرْ کاساً وناولہا

پھر ایک دو گھونٹ لینے کے بعد میری طرف دیکھ کر ذرا تبسم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اور مولوی صاحب ''کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا''

اللہ اکبر کیا اخلاق تھے؟ ایک عبد حقیر و بے مایہ کی کیسی دلجوئی و دلدہی تھی! ایک بندۂ گنہگار و ہیچمدان پر کیسی بزرگانہ شفقت کہ مسکراتے ہوئے متوجہ کر کے ایک خاص انداز سے حافظ شیرازی کا یہ مصرعۂ دوم پڑھنا تھا کہ میری ساری ندامت و شرمندگی اسی وقت کافور ہوگئی اور پھر حضرت شاہ صاحب نے اپنی کسی بات سے یہ قطعاً محسوس نہیں ہونے دیا کہ سفر کی شدید صعوبتوں کی وجہ سے حضرت کے دل پر ناگواری کا کوئی بھی اثر ہے۔

خودداری

عام اخلاق وفضائل کے ساتھ حضرت میں خودداری بھی انتہا درجہ کی تھی، برار کے قضیہ کے سلسلہ میں نظام حیدر آباد دہلی میں آئے ہوئے تھے کہ نظام کی خواہش پر حضرت شاہ صاحبؒ بھی دیو بند سے دہلی تشریف لائے اور ایک وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہنچے، خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلالیا لیکن حضرت شاہ صاحب پہنچے تو عام آداب وشرائط کا لحاظ اور نہ کسی شاہی دستور آئین کی پابندی۔ روبرو ہوتے ہی شاہ صاحب نے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ پر "السلام علیکم" کہا نظام پیشوائی کے لیے آگے بڑھے اور وعلیکم السلام کہہ کر شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑا اور ایک کرسی پر لے جا کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر دائرۃ المعارف کے کام سے ہی متعلق تھی، حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی اہم کتابوں اور ان کے قلمی نسخوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر آپ ان کو بھی حاصل کر کے دائرۃ المعارف کی طرف سے شائع کر دیں تو بے شبہ علم حدیث کی اور اس کے واسطہ سے اسلام کی یہ بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی، اس زمانہ میں دیو بند سے ایک ہفتہ وار اخبار مہاجر نکلتا تھا، جو دار العلوم دیو بند کی اصلاح طلب جماعت کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کے اڈیٹر نے اس ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو عام ذہنوں کے مطابق "بارگاہِ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی" یا اسی مفہوم کی کوئی اور عبارت بطور عنوان خبر لکھی۔ اتفاق سے اخبار ابھی چھپا نہیں تھا کہ حضرت شاہ صاحب کو اس عنوان کی اطلاع ہوگئی تو حد درجہ برہم اور خفا ہوئے اور فرمایا کہ:

"میں ہر چند ایک مرد بے مایۂ و بے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی

نہیں کہ یہ عنوان گوارا کرلوں۔ کیسی بارگاہِ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؟ صاف لکھتے کہ نظام اور انور شاہ کی ملاقات''۔

ایک مرتبہ حیدرآباد کے مولوی نواب فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی لڑکی کی شادی میں بلایا۔ چوں کہ نواب صاحب اور ان کے خاندان کو علمائے دیوبند کے ساتھ قدیم رابطہ اور قلبی علاقہ تھا، اس لیے شاہ صاحب حیدرآباد تشریف لے گئے۔ دوران قیام میں بعض لوگوں نے چاہا کہ حضرت شاہ صاحب اور نظام کی ملاقات ہو جائے، حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا ''مجھ کو ملنے میں عذر نہیں ہے، لیکن اس سفر میں میں نہیں ملوں گا، کیوں کہ اس سفر کا مقصد نواب صاحب کی بچی کی تقریب میں شرکت تھا، اور بس! اور میں اس مقصد کو خالص ہی رکھنا چاہتا ہوں''۔ چناں چہ ہر چند لوگوں نے کوشش کی اور ادھر نظام کا بھی ایما تھا مگر شاہ صاحب کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔

اسی قیام حیدرآباد کے زمانہ کا واقعہ ہے جو مجھ کو میرے ماموں قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی نے سنایا تھا، موصوف اس زمانہ میں مستقلاً نواب فیض الدین صاحب کے مکان پر ہی رہتے تھے۔ ماموں کہتے تھے کہ شاہ صاحب کے قیام کے دنوں میں ایک روز سر اکبر حیدری کا ٹیلیفون آیا کہ میں مولانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کو یہ پیغام پہنچایا گیا تو فرمایا ''میں تو یہیں ہوں ابھی کہیں جانا نہیں۔ حیدری صاحب آنا چاہتے ہیں تو آجائیں''۔ حیدری صاحب کو یہ پیغام پہنچا تو انھوں نے پھر ٹیلیفون پر کہا کہ بہت اچھا میں حاضر ہوتا ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ میرے پہنچنے پر شاہ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو ان کو اٹھا دیا جائے میں تنہائی میں شاہ صاحب سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت الاستاذ کو حیدری صاحب کا یہ پیغام پہنچایا گیا تو فوراً ارشاد فرمایا: ''یہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لیے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ جا بیٹھوں یا ان لوگوں سے میں کہوں کہ چلے جائیں''۔

اسلامی غیرت وحمیت

حضرت شاہ صاحب طبعاً بڑے حلیم اور بردبار تھے۔ لیکن اسلامی اور دینی معاملات

میں وہ کسی طرح کے تہاون وتکاسل یا غفلت شعاری کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈابھیل سے دیوبند تشریف لے جارہے تھے، میں اس زمانہ میں مدرسہ فتح پوری دہلی میں مدرس تھا۔ حضرت کو دہلی کے اسٹیشن پر دیوبند کے لیے گاڑی بدلنی پڑتی تھی اور کئی گھنٹہ وہاں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اس فرصت کو غنیمت جان کر میں چند احباب کے ساتھ اسٹیشن پہنچ گیا اور جب تک دیوبند والی گاڑی چھوٹ نہیں گئی اسٹیشن پر حضرت الاستاذ کے ساتھ ہی رہا۔ اس موقع پر دوران گفتگو میں حضرت الاستاذ کو معلوم ہوا کہ ابھی حال میں دہلی میں قادیانیوں کا ایک جلسہ تین دن تک ہوتا رہا، جس میں ہر قسم کی تقریریں کی گئیں۔ لیکن علمائے اسلام میں سے کسی شخص نے قادیانیوں کے جلسہ میں پہنچ کر ان کو مناظرہ کی دعوت نہیں دی، قادیانی فتنہ کا استیصال حضرت شاہ صاحب کے دل کو لگا ہوا تھا۔ یہ سن کر بھی انھیں بے حد صدمہ ہوا، اور خصوصاً اس بناء پر کہ دہلی میں دیوبند کے پڑھے ہوئے بیسیوں علماء موجود ہیں لیکن اس کے باوجود قادیانی تین دن تک اطمینان سے اپنا جلسہ کر گئے اور کسی عالم دین کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ تقریراً یا تحریراً مسلمانوں کو اس فتنہ کی ہلاکت انگیزی سے باخبر کر دیتا۔ اس مجمع میں غالباً میں ہی ایسا شخص تھا جو حضرت الاستاذ کی توجہاتِ عالیہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے ''مولوی صاحب! کسی شریف آدمی کی توہین گالی سننے سے نہیں ہوتی، بلکہ اگر وہ کوئی اپنے مرتبہ سے گرا ہوا کام کرے تو اس سے بھی اس کی توہین ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ گالی وغیرہ سے۔

اس پر ایک واقعہ سنایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں ایک متمول اور باعزت شخص نے ایک شاعر زبرقان نامی کے خلاف شکایت کی کہ اس نے ایک شعر میں اس کی بڑی شدید ہجو کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے شاعر سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا ''امیر المؤمنین! میں نے تو اس کی مدح کی ہے نہ کہ مذمت۔ چناں چہ دیکھئے کہ میں کہتا ہوں:

دع المکارم لا ترحل لبغیتھا ۞ اقعد فانک انت الطاعم الکاسی

ترجمہ: -تو چھوڑ بزرگیوں اور بڑی طاقتوں کو مت سفر کران کی طلب میں۔ تو بیٹھا بھی رہ (اپنے گھر کے اندر) کیوں کہ تو کھانے والا بھی ہے اور پہننے والا بھی۔ ماشاء اللہ خوب

کھاتا پیتا آدمی ہے۔

حضرت عمر نے یہ شعر سنا تو فرمایا کہ استغاثہ بالکل صحیح ہے۔ درحقیقت ایک شریف انسان کی توہین اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ حصول مکارم کو غریبوں کے ساتھ مخصوص کردیا جائے۔

بہر حال یہ چند سطریں صرف اس مجلس میں شرکت کی غرض سے لکھی ہیں، جو میاں ازہر سجا رہے ہیں، ورنہ میں خود اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے حضرت الاستاذ کا حق کیا ادا ہوسکتا ہے۔

اللہ اکبر کیسے مبارک تھے وہ لمحاتِ زندگی جو اس علم وعمل کے ایک زندہ پیکر کی معیت وصحبت میں بسر ہوئے اور کیسی لطف آفریں وروح پرور ساعتیں تھیں وہ جو اس شجرۂ صلاح وتقویٰ کے زیر سایہ گذریں۔ فرحمه الله رحمةً واسعةً ونور برهانهٗ.

حضرت امام العصر شاہ صاحبؒ اور انکی تصانیف

از: مولانا محمد یوسف صاحب بنوری

علمی دنیا کی تاریخ میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کمالات وعلوم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دنیا ان کے کمالات سے واقف بھی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق میں اور اللہ تعالیٰ کی اس وسیع سرزمین میں کتنی ایسی ہستیاں گذری ہوں گی جن کا صحیح علم اور ان کی علمی گہرائیوں کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہوا ہو۔

اور یہ بھی ایک مسلم امر ہے کہ کوئی شخص تصانیف کے محض عددی کمیت واکثریت کی بناء پر علامۂ عصر بن جائے ایسا نہیں ہوسکتا۔ علماء اسلام کے علمی سمندر میں کثرت سے ایسے بیش بہا موتی موجود ہیں جو کبھی کسی تاج مرصع کی زینت نہیں بنے۔

قدرت کے معدنی کائنات میں ایسے بے بہا جوہرات موجود ہیں کہ ''کوہ نور'' نامی ہیرے اس کی چمک وتابانی کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ وانْ مِنْ شیئ الّا عندنا خزائنہ ومانُنزّلہ الا بقدر معلوم (حجر - ۲۱)

حافظ حدیث امام تقی الدین ابن دقیق العید رحمہ اللہ جیسے محقق عصر جن کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ میں ایسا دقیق النظر محدث نہیں گذرا۔ اگر ان کی کتاب ''احکام الاحکام'' یا ''کتاب الامام'' شرح الالمام کی ناتمام نقول کتابوں میں نقل نہ ہوتیں تو شاید موجودہ نسل کو ان کے کمالات کا کچھ علم بھی نہ ہوتا۔

کیا کوئی یہ گمان کرسکتا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی مصری اپنی کثرت مصنفات کی وجہ سے ابن دقیق العید جیسے محقق روزگار سے سبقت لے جائیں گے؟!

بسا اوقات دفتر تاریخ کی ورق گردانی سے بھی اس کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، معاصرین، فیض یافتہ، اور چشم دید کمالات کے مشاہدہ کرنے والوں کو جن علمی حقائق کا

انکشاف ہوتا ہے، ان کے مؤلفات کے صفحات پڑھنے والوں کو پورا احساس بے حد مشکل ہے، پھر قدرت کا عجیب نظام ہے کہ علماء امت اور ارباب ولایت کے مزاج بھی اتنے مختلف ہیں کہ عقل نارسا حیران رہتی ہے، کوئی دینی خدمت، تعلیم وارشاد، افادہ وافاضہ کے پیش نظر تالیف وتصنیف میں مشغول نظر آتا ہے، کوئی اصلاح وتربیت کے حرص کی خاطر حلقۂ صحبت واستفادہ کو وسیع کرنے کی فکر میں مصروف ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ خمول پسندی وتواضع و شہرت سے نفرت کی بناء پر گم نامی کو اپنا شیوۂ امتیاز بنائے ہوئے ہے، نہ نظام قدرت کے عجائبات کی انتہاء ہے، نہ کائنات کی نیرنگیوں کا شمار ؎

رتَبٌ تقصر الامانیّ حَسْریٰ ❁ دُوْنها ما وَرائهن وراء

امام العصر حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک طرف علمی تبحر، محیر الافکار جامعیت، حیرت افزا دقت نظر، فوق العادۃ حافظہ، کتب بینی ومطالعہ کا عجیب شوق وذوق عطا فرمایا۔ دوسری طرف خمول پسندی، وجاہت وشہرت سے نفرت اور تواضع وفروتنی کے کمالات سے سرفراز فرمایا۔ حضرت امام العصر کی پوری زندگی مطالعۂ کتب میں گذری اور ساری زندگی میں کچھ نہ کچھ جواہر ریزے قلم سے نکلتے رہے، مشکلات وحقائق پر یادداشتیں لکھتے رہے اور علمی افکار ونظریات بھی قلمبند کرتے رہے، لیکن کبھی مستقل تالیف وتصنیف کا شوق دامنگیر نہ ہوا۔

کاش! اگر حضرت کو اپنے علوم ومعارف کے پیش نظر تصنیف وتالیف کا سواں حصہ بھی شوق ہوتا تو آج علمی دنیا کا دامن ان کے علوم وتحقیقات سے پر ہوتا۔ اور ان کے علمی جواہرات سے اہل علم مالا مال ہوتے۔ اور آئندہ کی نسلیں صحیح معنی میں ان کی معرفت وقدردانی میں کوتاہی نہیں کرتیں۔

لیکن تاہم الحمد للہ قرآن کریم واحادیث وفقہ اسلامی کے بعض مشکلات علم کلام کے مشکل ترین مسائل، خلافیات امت کے معرکۃ الاراء مسائل پر اور عقائد محمدیہ کے امہات واصول پر چند ایسے رسائل یادگار چھوڑ گئے جن کی نظیر علمی ذخائر میں مشکل سے ملے گی۔ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا کیا مجال ہے کہ بعید سے بعید نقل، دقیق سے دقیق نکتہ، عقلی ونقلی کوئی پہلو تشنہ رہ جائے دنیائے اسلام کے وسیع النظر محقق عالم شیخ محمد زاہد کوثری مرحوم نے

قاہرہ میں ایک دفعہ دوران ملاقات میں فرمایا کہ احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث و عالم امت میں نہیں گذرا اور فرمایا کہ یہ کوئی کم زمانہ نہیں۔ غالباً موصوف کے الفاظ یہ تھے:

"لم یأت فی الأمة بعد الشیخ ابن الهمام مثله فی استثارة الابحاث النادرة من الاحادیث ولیست هذه المدة بقصیرة اھ". اور حیرت یہ ہوتی تھی کہ کسی موضوع پر جب کچھ تحریر فرمایا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ساری زندگی اسی ایک موضوع کی نذر ہوئی ہے۔

ایک دفعہ ۱۳۴۷ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی مرحوم حیدر آباد سے دیوبند تشریف لائے تھے اس وقت مرحوم امور مذہبی کے صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ حضرت کی زیارت کے لیے قیام گاہ پر تشریف لائے۔ حضرت شیخؒ نے مشکلات القرآن کا کچھ تذکرہ فرمایا اور بطور مثال سورہ مزمل کی پہلی آیتوں میں علماء کو جو علمی اشکال تھا اس کا ذکر فرما کر اپنی طرف سے ایک ایسی تفسیر بیان کر کے ایسی تحقیق کی کہ وہ مشکل حل ہو جائے۔ شیروانی صاحب نے حیران ہو کر بے ساختہ فرمایا کہ حضرت بات بالکل صاف ہوگئی۔ ۱۳۴۸ھ کا واقعہ ہے کہ کشمیر سے واپسی پر حضرت لاہور ایک دو روز کے لیے اترے۔ آسٹریلیا بلڈنگ میں قیام تھا، میزبان نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے حضرت شاہ صاحب نے بہت سے علمی جواہرات بیان فرمائے، ان میں ایک موضوع یہ تھا کہ امت میں سائنس وطبعیات میں جو حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں ان کی نظیریں موجود ہیں اور انبیاء کرام کے معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لیے ظاہر کرائیں کہ یہ آئندہ امت کی ترقیات کے لیے تمہید ہوں۔ اور فرمایا کہ "ضرب الخاتم" میں اسی کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے راقم الحروف نے حضرت کی ایماء پر یاد سے وہ شعر سنائے جن میں ایک شعر یہ تھا:

وقد قیل ان المعجزات تقدمٌ ❁ بما یرتقی فیه الخلیفة فی مدی

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم بے حد محظوظ ہوتے رہے۔

بارہا یہ دیکھا گیا کہ کسی مصنف نے بقصد تقریظ لکھوانے کوئی کتاب حضرت کے سامنے پیش اور ظاہر ہے کہ کسی اہم موضوع پر کوئی محقق سنجیدہ اہل قلم یا معیاری مصنف علمی کتب خانوں کی اس فراوانی میں کیا کسر باقی رکھے گا۔ لیکن دیکھا گیا کہ حضرت سرسری نظر میں اہم ترین اصلاحات فرما کر بیش قیمت اضافہ بھی فرمادیا کرتے تھے جس سے مصنف حیرت میں پڑ جاتا تھا۔افسوس کہ میں اس مختصر مقالے میں اس کے نظائر پیش نہیں کرسکتا۔ راقم الحروف کی کتاب ''نفحۃ العنبر'' میں اس کی کچھ مثالیں ملیں گی جو امام العصر کی حیات کے چند صفحے اب اسے اٹھارہ بیس برس قبل راقم کے قلم سے بطور نقش اول نکل چکے ہیں۔ اور اس حیرت انگیز کمال پر یہ کمال کہ جب تک کوئی شخص خود مسئلہ نہ دریافت کرے اپنی طرف سے کبھی سبقت نہ فرماتے تھے۔ درحقیقت اس حیرت ناک علمی تبحر کے ساتھ۔ یہ وقار وسکون اور علم کے اس متلاطم سمندر کے ساتھ یہ خاموشی امام العصر کی مستقل کرامت ہے۔

مخدوم ومحترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا ایک بلیغ جملہ اس حقیقت کے چہرے سے پوری نقاب کشائی کرتا ہے، فرماتے ہیں:

مرحوم کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں (معارف غالباً جون ۱۹۳۳ء) غرض کہ حضرت امام العصرؒ نے باوجود اس محیر العقول جامعیت، تبحر، کثرت معلومات، وسعت مطالعہ، حیرت ناک استحضار وقوت حافظہ کے شوق سے کبھی تالیف وتصنیف کا ارادہ نہیں فرمایا۔ اور امت کے دل میں یہ تڑپ رہی کہ کاش کسی اہم کتابِ حدیث پر کوئی خدمت یادگار چھوڑ جاتے۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرمادیتے تو پس ماندگان کے لیے سرمایہ ہوتا، غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو پڑھا کر پیٹ پالا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد میری حدیث کی خدمت بکتی رہے۔ ہاں دینی اور کچھ علمی شدید تقاضوں کی وجہ سے چند رسائل یادگار چھوڑ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ علمی دنیا کچھ نہ کچھ ان کی علمی تحقیقات وخصوصیات سے مستفید رہے، نیز ان کے تلامذہ واصحاب کی

وساطت سے بھی اچھا خاصا ان کے علمی کمالات کا ذخیرہ امت کے ہاتھ آیا۔ اس طرح یہ محقق یگانہ عصر حاضر کا جامع الکمالات امام، دنیا میں علم کا آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا، میرے ناقص علم میں غیر منقسم ہندوستان کی سرزمین میں جامعیت وتبحر کے اعتبار سے ایک حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اوران کے بعد حضرت امام العصر کشمیری کی نظیر نہیں ملے گی۔ ہندوستان کے غیر مقلد حضرات کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر بھی چند رسائل کی تالیف کی نوبت آئی۔ جن میں ''فاتحہ خلف الامام''، ''رفع یدین''''مسئلہ وتر'' زیر بحث آئے ہیں۔ ضمناً اور بہت سے مسائل آ گئے ہیں۔ فتنۂ قادیانیت کی تردید کے سلسلہ میں چند تالیفات فرما چکے ہیں جن میں امت محمدیہ کا قطعی عقیدہ ''ختم نبوت'' کی تحقیق بھی آ گئی ہے جو دین کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس طرح کفر وایمان کا مدار جن امور پر ہے اس کی تحقیق واضح طور سے ہوگئی۔ حیات مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کی تفصیلات بھی آ گئی ہیں۔ اس طرح علم کلام کے چند مشکل ترین مسائل کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں۔

حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات

''فیض الباری'' کے مقدمہ ص/۲۱ پر راقم نے لکھا تھا:

ومنها انه كان عنى بحل المشكلات اكثر منه بتقرير الابحاث وتكرير الالفاظ.

ومنها انه كان يهمه اكثار المادة فى الباب دون الاكثار فى بيانها وايضاحها ......ثم ان هذا الايجاز فى اللفظ والغزارة فى المادة اصبح له دابا فى تدريسه وتاليفه وكان كما قال على رضى الله عنه مارأيت بليغاً قط الاوله فى القول ايجاز وفى المعانى اطالة حكاه ابن الاثير الاديب فى المثل السائر، وكأن رأيه ماكشف عنه ابن النديم فى الفهر ست النفوس (اطال الله بقاءك) تشرئبّ الى النتائج دون المقدمات وترتاح الى

الغرض المقصود دون التطويل فی العبارات اھ.

وبلغنی ان حکیم الأمة الشیخ التھانوی یقول ان جملة واحدة من کلام الشیخ ربما تحتاج فی شرحھا وایضاحھا الیٰ تالیف رسالة اھ.

من جملہ حضرت شیخ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ زیادہ تر اہتمام مشکلات کے حل کرنے پر فرماتے تھے۔ بحثوں کو پھیلانے اور الفاظ بار بار استعمال کرنے پر زیادہ توجہ نہیں فرماتے تھے۔

نیز یہ کوشش فرماتے تھے کہ موضوع کے متعلق مادہ زیادہ پیش کیا جائے اس کی توضیح وتشریح کے زیادہ درپے نہیں ہوتے تھے، لفظوں میں اختصار اور معانی میں کثرت ان کی طبیعت وعادت بن گئی تھی، خواہ تدریس میں ہو یا تالیف میں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جب کسی بلیغ کو دیکھا تو یہ دیکھا کہ الفاظ کے اختصار کے ساتھ معانی میں تفصیل کرتا ہے۔ ابن ندیم اپنی کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں: طبیعتیں نتائج کی منتظر رہتی ہیں نہ کہ مقدمات کی، اور مقاصد سے خوش ہوتی ہیں نہ کہ صرف عبارت کی طوالت سے۔

مجھے پہنچا ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ بسا اوقات حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ایک جملہ کی تشریح میں ایک رسالہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

یتیمة البیان مقدمہ مشکلات القرآن ص/۸۳ میں اور **نفحة العنبر** ص ۱۵۰ میں راقم الحروف نے حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات کو وضاحت وتفصیل سے بیان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

جامعیت ودقت نظر وسرعت انتقال ذہنی وکثرت آمد کی بناء پر طبیعت اختصار کی عادی بن گئی تھی۔ معلومات کی فراوانی کی وجہ سے ضمنی مضامین کثرت سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ حدیث کے لطائف میں جب علم عربیت وبلاغت کے نکات کا بیان شروع ہو جاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علوم عربیت کی تحقیقات ہی شاید کتاب کے اصلی موضوع ہیں، بعید ترین وعمدہ ترین مأخذ سے وہ نقول پیش فرمایا کرتے جن سے محققانہ شروحِ حدیث

کا دامن بھی خالی ہوتا تھا۔ افسوس کہ اختصار کی وجہ سے اس کی مثالیں پیش نہیں کرسکتا۔

اس لیے عام نگاہیں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اور بہ مشکل عام طبیعتیں لذت اندوز ہوتی تھیں، حضرت کے مختصر سے مختصر رسالے کے لیے بھی سارے علوم سے نہ صرف مناسبت بلکہ مہارت ان میں ضروری ہے، ان تصانیف کی صحیح قدردانی وہی عالم کرسکتا ہے کہ کسی موضوع میں اس کو مشکلات پیش آئی ہوں اور پورے متعلقات کی چھان بین کر چکا ہو اور تشفی نہ ہوئی ہو، پھر حضرت امام العصر کی تالیف کا غور سے مطالعہ کی توفیق ہو اس وقت قدرشناسی وقدردانی کی نوبت آئے گی اور حقائق مطلوبہ کے چہرے سے پردے ہٹتے چلے جائیں گے۔ خالی ذہن غیر مقلد شخص جس کو کبھی کسی مشکل کی خلش ہی پیش نہ آئی۔ سطحی مضامین وشگفتہ عبارت سے مانوس ہو وہ کبھی قدر نہیں کرسکتا۔

حضرت استاذ محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کی کتاب ''کشف الستر عن صلاۃ الوتر'' کی قدر اس وقت ہوئی کہ اس مسئلے پر جتنا ذخیرہ حدیث کا مل سکا سب کا مطالعہ کیا پھر رسالہ مذکورہ کو اول سے آخر تک بار بار پڑھا اس وقت اس کی صحیح قدر ہوئی۔ اب میں اس مختصر تمہیدی مضمون کو امام مسروق بن الاجدع التوفی ۶۳ھ کے ایک تاریخی کلام پر ختم کرتا ہوں جس کو امام تاریخ ابن سعد نے اپنی کتاب ''الطبقات'' میں ذکر کیا ہے، طبقات ابن سعد (جلد ۲/ صفحہ ۱۱۵) باسناد صحیح مسروق سے روایت ہے، مسروق (کوفہ کے کبار تابعین میں سے ہیں، مخضرم ہیں یعنی عہد نبوت کو پا چکے ہیں) فرماتے ہیں:

لقد جالست اصحاب محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم فوجدتھم کالاخاذ فالاخاذ یروی الرجل، والاخاذ یروی الرجلین، والاخاذ یروی العشرۃ، والاخاذ یروی المائۃ، والاخاذ لو نزل بہ اھل الارض لا صدرھم فوجدت عبد اللّٰہ بن مسعود من ذلک الاخاذ اھ.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی مثال تالابوں (حوضوں جیسی ہے) یعنی چھوٹا وبڑا تالاب ایک آدمی کی سیرابی کے لیے کافی ہوتا ہے، کوئی دو کے لیے کوئی دس کے لیے کوئی سو کے لیے اور بعض ایسے تالاب ہیں اگر روئے زمین والے سب پینے کے لیے

آئیں تو سب سیراب ہو جائیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی مثال اسی تالاب کی ہے۔
راقم الحروف کہتا ہے کہ علمائے امت کی مثال بھی یہی ہے، اور حضرت امام العصر شاہ صاحب کی مثال عبداللہ بن مسعود کی ہے کہ انکا وجود باجود پوری امت کی سیرابی کیلئے کافی تھا۔
اب ان تصانیف کی فہرت پیش کرتا ہوں جو حضرت اپنے قلم حقیقت رقم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر کی تصانیف

(۱) عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام

یہ کتاب ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، عقیدۂ حیات مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی کیا ہدایات ہیں، اس کی تفصیل ہے۔ اس میں احادیث کا استقصاء و استیفاء نہیں کیا گیا ہے، بقدر ضرورت ضمناً احادیث کا ذکر ہے اس لیے اس کا دوسرا نام حیاۃ المسیح بمتن القرآن والحدیث الصحیح ضمنی مسائل کی کئی تحقیقات آ گئی ہیں۔
عقیدہ حدوث عالم، عقیدہ ختم نبوت، کنایہ حقیقت یا مجاز؟ ذوالقرنین و یاجوج و ماجوج کی تحقیق، سد ذی القرنین کی تعیین وغیرہ وغیرہ۔ حضرت شیخ عثانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب شاہ صاحب کی سب کتابوں میں واضح و مفصل و شگفتہ ہے۔

(۲) تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات کی ہے "عقیدۃ الاسلام" کی تعلیقات اور اس پر اضافات ہیں، ادب و بلاغت کی عجیب و غریب ضمنی تحقیقات آ گئی ہیں۔

(۳) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح

نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق احادیث و آثار صحابہ کو اس میں بہت تفتیش و دیدہ ریزی سے جمع کیا گیا ہے، جن کی تعداد تقریباً سو تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا اس پر ایک نفیس مقدمہ بھی ہے۔

(۴) اکفار الملحدین فی ضروریات الدین

۱۲۸صفحہ کا ایک عجیب وغریب رسالہ ہے، جس میں کفر وایمان کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اصولی طور پر بحث کی گئی ہے کہ مدار ایمان کیا کیا امور ہیں اور کن عقائد واعمال کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور کس قسم کے عقائد میں تاویل کرنا بھی موجب کفر ہے۔

اس موضوع پر امت میں سب سے پہلے امام غزالی رحمہ اللہ نے قلم اٹھایا تھا۔ ''فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ'' ان کا رسالہ مصر وہندوستان میں عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالے کی عمدہ تحقیقات حضرت شیخ نے چند سطرون میں نقل فرمائی ہیں، عصر حاضر میں یہ ایک اہم ترین دینی خدمت تھی وہ حضرت نے پوری فرمادی۔ اس پر سارے علمائے دیوبند کی رائیں اس لیے لکھوادی ہیں تاکہ اہل حق جماعت میں اس اہم ترین مسئلہ کوئی مسئلہ میں اختلاف باقی نہ رہے۔

(۵) خاتم النبیین

یہ عقیدۂ ''ختم نبوت'' میں عجیب رسالہ ہے، جو ۹۶ صفحات پر پھیل گیا ہے، فارسی زبان میں ہے، لیکن دقیق۔ حضرت کا خاص اسلوب، علمی کمالات اور وہبی علوم کے نمونے پورے طور پر جلوہ آرا ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب نے بھی ایک دفعہ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ بہت دقیق ہے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

(۶) فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب

مسئلہ ''فاتحہ خلف الامام'' جو عہد صحابہ سے لے کر آج تک معرکۃ الآراء موضوع رہا ہے۔ اس پر ۱۰۶ صفحات کا محققانہ رسالہ ہے۔ حدیث عبادہ بروایت محمد بن اسحاق کی عجیب وغریب تحقیق کی گئی، بڑی تدقیق کے ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کردیا گیا ہے لفظ فصاعداً کی تحقیق میں ۱۲-۱۳ صفحات پر مشتمل دقیق ترین مضمون آ گیا ہے، یہ مضمون چوں کہ عام دسترس سے بالکل باہر تھا راقم الحروف نے اپنی کتاب معارف السنن شرح ترمذی (مخطوط) میں اس کی جدید اسلوب عصری سے تحلیل تشریح کی ہے، اور شگفتہ عربی میں اس کی تسہیل کی کوشش کی ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کو ڈابھیل میں جب یہ مضمون سنایا تو نہایت محظوظ ہوئے، اور بے ساختہ فرمایا کہ حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، کہ اس مشکل ترین دقیق وغامض مضمون کی ایسی افصاح کی کہ شاید مقدور میں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔

(۷) خاتمة الخطاب فی فاتحة الکتاب

مسئلہ ''فاتحہ خلف الامام'' پر فارسی زبان میں لطیف رسالہ ہے، بلا مراجعت کتاب دو روز میں محرم ۱۳۲۰ھ میں تالیف فرمایا ہے، مسئلہ پر جدید انداز میں استدلال ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ کی اس پر تقریظ بھی ہے حضرت شیخ نے دقت نظر کی خوب داد دی ہے۔

(۸) نیل الفرقدین فی مسئلة رفع الیدین

۱۵۴ اصفحات پر مشتمل ہے، مسئلہ خلافیہ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو اٹھانے کے موضوع پر نہایت عجیب انداز میں تحقیق فرمائی ہے، اور نہایت انصاف سے محققانہ انداز میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف عہد صحابہ سے ہے اور اس میں اولویت کا اختلاف ہے، جائز ناجائز کا اختلاف نہیں ضمنی طور پر بہت نفیس مباحث آ گئے ہیں۔

(۹) بسط الیدین لنیل الفرقدین

سابق الذکر موضوع پر ۶۴ صفحہ کا رسالہ ہے، یہ رسالہ سابق ''نیل الفرقدین'' کا تکملہ ہے۔ اس موضوع پر قدماء محدثین سے لے کر متاخرین اور عصر حاضر تک بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے، اس موضوع پر قدماء محدثین سے لے کر متاخرین اور عصر حاضر تک بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ اس پائمال موضوع پر ایسے محققانہ اسلوب میں جدید استدلالات دقیق استنباطات پیش کرنا یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ الشیخ الامام محمد زاہد الکوثری اپنی کتاب ''**تأنیب الخطیب فی ما ساقه فی ترجمة ابی حنیفة من الاکاذیب**'' ص/۸۴ میں رقم طراز ہیں:

وهذا البحث ای رفع الیدین طویل الذیل الفت فیه کتب خاصة من الجانبین ومن احسن ما الف فی هذا الباب نیل الفرقدین وبسط

الیدین کلاهما لمولانا العلامة الحبر البحر محمد انور شاه الکشمیری وهو جمع فی کتابه لب اللباب فشفی و کفی اهـ.

رفع یدین کے موضوع پر جانبین سے مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس موضوع پر بہترین کتابیں علامہ حبر و بحر مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی دو کتابیں ہیں نیل الفرقدین وبسط الیدین جن میں سارا لب لباب آ گیا ہے اور یہ شافی وکافی ہیں۔

درحقیقت صحیح قدردانی ایسے محققین ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۰) کشف الستر عن صلاۃ الوتر

مسئلہ ''وتر'' کے بارے میں امت میں جو اختلافات چلے آئے ہیں، کل خلافیات سولہ سترہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں جو مشکل ترین وجوہ ہیں ان کی ایسی تحقیق وفیصلہ کن تدقیق فرمائی ہے کہ کسی منصف مزاج کو مجال انکار نہیں رہتا۔ رسالہ ۹۸ صفحوں میں تمام ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں بمقدار ایک ثلث تعلیقات کا اضافہ فرمایا ہے، مسئلہ آمین بالجہر، وضع الیدین علی الصدر وغیرہ سائل کی تشفی کن تحقیق فرمائی گئی ہے، شروع میں خطبہ کے بعد ایک فصیح وبلیغ عربی کا قصیدہ جو نہایت ہی مؤثر اور رقت انگیز ہے، ہر حیثیت سے قابل دید ہے۔

(۱۱) ضرب الخاتم علی حدوث العالم

''حدوث عالم'' علم کلام وفلسفہ کا معرکۃ الآراء موضوع ہے متکلمین فلاسفۂ اسلام نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ مستقل رسائل کا موضوع بحث رہا ہے۔ شیخ جلال الدین دوانی نے بھی اس پر ایک رسالہ ''الزوراء'' کے نام سے تصنیف کیا ہے، حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہے اور الٰہیات وطبیعیات اور قدیم وجدید فلسفہ کی رو سے اتنی کثرت سے دلائل وبراہین قائم کیے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، اور ''حدوثِ عالم'' کا مسئلہ نہ صرف یقینی بلکہ بدیہی بن جاتا ہے لیکن افسوس کہ حضرت نے ان براہین ودلائل وشواہد کو چار سو شعر میں منظوم پیش کیا ہے ظاہر ہے کہ شعر کا دامن تفصیلات سے خالی رہتا ہے، لیکن اس کے ایضاح وحل کے لیے ہزاروں حوالے کتب متعلقہ کے دے دیئے گئے جن میں صدر شیرازی کی ''اسفار اربعہ'' فرید وجدی، وبستانی کی دائرۃ المعارف خصوصیت رکھتی

ہیں راقم الحروف نے حضرت کے حکم سے متعلقہ حوالہ جات تقریباً ایک سو صفحات میں بڑی عرق ریزی سے جمع کیے تھے جس سے حضرت بے حد مسرور تھے، اور میری اس ناچیز خدمت کو ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے سامنے بہت سراہا تھا، فرماتے تھے کہ اصل موضوع تو ''اثبات باری'' تھا۔ لیکن عنوان میں ایک قسم کی شناعت تھی، اس لیے ''حدوث عالم'' کا عنوان تجویز کیا۔ اور آخر میں دونوں کا مفاد ایک نکلتا ہے۔

(۱۲) مرقاۃ الطارم لحدوث العالم

سابق الذکر موضوع پر ۶۲ صفحات میں رسالہ ہے، رسالہ کیا ہے دریا کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس رسالے میں ادلہ و براہین کے استقصاء کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ یہ ''ضرب الخاتم'' کے لیے مقدمات وتشریح کا کام دیتا ہے۔ نظائر وشواہد موضوع پر اتنے پیش کیے ہیں کہ عقلی برہان سے پہلے ذوق ووجدان فیصلہ کر لیتا ہے، ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مقیم تھے اور رد مادیین ودہریین میں نہایت ہی متخصص جلیل القدر عالم تھے، ترکی وعربی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تالیف فرما چکے تھے۔

۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں یہ رسالہ ان کو راقم الحروف نے دیا تھا، مطالعہ فرمانے کے بعد اتنے متأثر ہوئے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں زندہ ہے، اور پھر فرمایا:

''انی افضل هذه الوريقات على جميع المادة الذاخرة فی هذا الموضوع وانی افضلها على هذا الاسفار الاربعة للصدر الشيرازی.

یعنی جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور یہ اسفار اربعہ (ان کے سامنے رکھی ہوئی تھی) اتنی بڑی کتاب پر اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں وہ اس وقت ''القول الفیصل'' کے نام سے رد دہریین ایک مبسوط کتاب تالیف فرما رہے تھے، اس میں اس رسالہ سے بہت نقول لیے اور اس کتاب میں اس رسالہ کی بڑی تعریف کی۔

ایک حصہ اس کا طبع ہو چکا ہے، نہ معلوم یہ عبارت اس حصہ میں آ گئی یا نہیں، ضمناً اس رسالہ میں کلام وتصوف اور الٰہیات وطبیعیات کے بہت سے حقائق کا فیصلہ فرمایا گیا ہے۔

(۱۳) ازالۃ الرین فی الذب عن قرۃ العینین

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتاب قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین کا حیدر آباد دکن میں کسی شیعی مزاج عالم نے رد لکھا تھا۔ حضرت امام العصر نے شاہ دہلوی کی تائید میں اس کی تردید لکھی۔ نہایت عمدہ کتاب ہے ۱۹۶ صفحات میں پھیل گئی ہے، اس میں قال المولی المؤلف کہہ کر شاہ دہلوی کی عبارت نقل فرماتے ہیں۔ قال المعترض سے تردید کرنے والے کی عبارت اور اقول سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کشمیر میں ملا تھا ابتداء سے ۸ صفحے غائب ہیں اس لیے نام مجھے معلوم نہ ہوسکا، اور سوئے اتفاق سے حضرت شیخ سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی ''ازالۃ الرین'' میرا تجویز شدہ نام برائے نام ہے۔

(۱۴) سھم الغیب فی کبد اھل الریب

ہندوستان کی سرزمین میں جہاں بدقسمتی سے بہت سے بدعات اور عقائد شرکیہ بعض سادہ لوح مسلمانوں میں رائج ہوگئے ہیں۔

ایک ان میں سے ''علم غیب'' کا عقیدہ اور احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور ان کے اتباع نے اس کو علمی رنگ میں پیش کیا، اور ایک عرصہ تک ہندوستان میں یہ موضوع بحث رہا ہے ایک شخص بریلوی نے اس میں ایک رسالہ لکھا اور اہل حق کے مسلک کے خلاف اپنے نامۂ عمل اور نامۂ قرطاس کو سیاہ کیا۔ اور اپنا نام عبدالحمید دہلوی ظاہر کیا، حضرت شیخ کا قیام اس زمانہ میں دہلی میں تھا، آپ نے جواب ترکی بہ ترکی عبدالحمید کے نام سے منسوب کر کے اس کا جواب شائع فرمایا۔ رسالہ کے آخر میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہما اللہ کے مناقب میں عربی میں ایک قصیدہ ہے رسالہ کی زبان حضرت شیخ کے عام تصنیفی مذاق کے خلاف اردو ہے۔

یہ چودہ تصانیف تو امام العصر شاہ صاحب کی وہ ہیں جو کہ اپنے قلم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر حضرت شاہ صاحب کی دوسری قسم کی مصنفات

دوسری قسم کی وہ تصنیفات ہیں کہ آپ کی یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہیں، اس کا

ذکر کرنا بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔

(۱) مشکلات القرآن

قرآن کریم کی جن آیات کو مشکل خیال فرمایا تھا، خواہ وہ اشکال تاریخی اعتبار سے ہو یا کلامی حیثیت سے، سائنس کی رو سے ہو یا کسی عقلی پہلو سے، یا علوم عربیت و بلاغت کی جہت سے ہوان پر یادداشت مرتب فرمائی تھی، اگر کہیں اس پر عمدہ بحث کی گئی ہے، اس کو نقل فرمایا، یا حوالہ دیا اور نہیں تو خود غور وفکر کے بعد جو حل سانح ہوا تحریر میں لایا گیا۔ یہ یادداشت بہ شکل مسودات مختلف اوراق میں موجود تھی، مجلس علمی ڈابھیل نے مرتب کر کے اسے شائع کیا، اور راقم الحروف نے مجلس علمی کی خواہش پر ''یتیمیۃ البیان'' کے نام سے ۸۴ صفحہ کا اس کا مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ اصل کتاب ۲۸۷ صفحات پر ختم ہوئی۔ قرآنی علوم اور قرآنی معارف کا نہایت بیش قیمت گنجینہ ہے، اگر جدید اسلوب سے اس کو پھیلایا گیا تو ایک ہزار صفحات میں کہیں جا کر یہ کتاب ختم ہوگی، بعد میں معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے متعلق کچھ اور مسودات بھی نکل آئے تھے، جن کی زیور طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت ابھی نہیں آئی۔

(۲) خزینۃ الاسرار

یہ ایک رسالہ ہے جس میں کچھ اوراد وادعیہ کچھ مجربات واذکار وغیرہ جمع کیے گئے ہیں، یہ سب علامہ دمیری کی کتاب ''حیاۃ الحیوان'' کے اقتباسات ہیں، کہیں کہیں حضرت شاہ صاحب کی طرف سے اضافات بھی ہیں، یہ رسالہ حضرت کے قدیمی مسودات جو کشمیر میں تھے ان میں دستیاب ہوا تھا، مجلس علمی ڈابھیل نے اس نام سے شائع کیا۔

(۳) فیض الباری بشرح صحیح البخاری

یہ حضرت شاہ صاحب کے درس صحیح بخاری کی املائی شرح ہے جس کو حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدینہ نے کئی سال کی محنت وعرق ریزی کے بعد فصیح وبلیغ عربی زبان میں مرتب کیا ہے، یہ حضرت امام العصر کے علوم وکمالات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے، جہاں حافظ شیخ الاسلام بدرالدین عینی اور قاضی القضاۃ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ محققین شارحین عاجز آ گئے ہیں وہاں شیخ کے خصائص وکمالات جلوہ آرا نظر آئیں گے،

زیادہ تر اعتنا انہی معارف حدیث کا کیا گیا۔ جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں، حضرت شیخ کے آخری عمر کے مجرب علوم واذواق خصوصی احساسات وعلمی خصوصیات، دقت نظر و تحقیق معیار کے نمونے اہل علم و یاران نکتہ داں کے لیے صلائے عام دے رہے ہیں۔ یہ چار ضخیم جلد کا بحر بیکراں مصر میں آب وتاب سے شائع ہوا ہے۔ قرآن وحدیث فلسفۂ وکلام ومعانی وبلاغت وغیرہ کے نہایت بیش بہا ابحاث سے مالا مال ہے۔ (اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع ومرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہیں) عام عبارت نہایت شگفتہ سلیس ہے۔ بعض بعض مقامات میں خاصی ادبی لطافت ہے۔

(۴) العرف الشذی بشرح جامع الترمذی

یہ حضرت شاہ صاحب کی درس جامع ترمذی کی املائی شرح ہے، جس کو جناب مولانا محمد چراغ صاحب ساکن گجرات نے بوقت درس قلم بند کیا ہے، اور زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے، جامع ترمذی کے مشکلات احادیث احکام پر محققانہ کلام ہر موضوع پر عمدہ ترین کبار امت کے نقول اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے۔ طلبۂ حدیث اور اساتذۂ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے۔

(۵) انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد

یہ سنن ابی داؤد کے درس کی املائی تقریر وشرح ہے جس کو مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے جمع کر کے شائع کیا ہے، کل دو جلدوں میں ہے مرتب وجامع نے بہت سی کتابوں کی اصلی نقول کو مراجعت کر کے لفظ بلفظ درج کر دیا ہے، کتاب کے تسمیہ میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے شیخ حضرت شیخ الہند کے نام کی تلمیح کی گئی ہے۔

(۶) صحیح المسلم کی املائی شرح

سنا ہے کہ ہمارے محترم دوست فاضل گرامی جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے صحیح مسلم کے درس کی تقریر قلم بند فرمائی تھی، یہ اب تک نہ طبع ہوئی، نہ راقم الحروف کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

(۷) حاشیہ سنن ابن ماجہ

جناب محترم مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی سے سنا تھا کہ آپ نے سنن ابن ماجہ پر کتاب کے حواشی وہوامش پر تعلیقات اپنے قلم سے لکھی تھیں، راقم الحروف کو اس کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

یوں تو حضرت نے جن کتابوں پر تعلیقات لکھی ہیں، اگر استقصاء کیا جائے تو متعدد کتابیں نکل آئیں گی۔

''الاشباہ والنظائر'' جو ابن نجیم کی فقہ میں مشہور کتاب ہے، اس پر تعلیقات حضرت کے قلم سے خود میں نے کشمیر میں دیکھی ہیں۔

یہ کل اکیس کتابیں ہوئیں جن سے حضرت امام العصر کے کمالات کے کچھ پہلو نمایاں ہوسکتے ہیں۔ کتاب کی پوری حقیقت اس وقت منکشف ہوتی کہ کتاب کے مضامین یا خصوصیات کا واضح تعارف کراتا اور جن مشکل ابحاث میں حضرت کے کمالات نظر آرہے ہیں ان کی تفصیلات سامنے آتیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسی مقالے کے لیے موزوں نہیں تفصیلی تبصرہ اور علوم ومعارف کے نمونے پیش کرنے کے لیے ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے

راقم الحروف کی کتاب ''نفحة العنبر'' جو حضرت کی حیات طیبہ کے چند صفحے ہیں اس میں کچھ تفصیلات ناظرین کو ہاتھ آئیں گی، تالیفات کے متعلق جو کچھ وہاں لکھا ہے اس کی تشریح ہی کی جائے تو اس مقالہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس وقت بہت عجلت اور ارتجال میں چند سطریں لکھنے کی توفیق ہوئی۔ حضرت امام العصر کے کمالات کا کوئی گوشہ بھی لیا جائے تو تفصیل کے لیے داستان کی ضرورت ہے اور جی چاہتا ہے کہ قلم اپنی جولانیاں دکھلاتا رہے۔

مدحتک جھدی بالذی انت اھلہ ۞ فقصّرَ عمّا صالح فیک من جھدی

میں نے چاہا کہ جس تعریف کے مستحق ہیں اتنی تعریف کرسکوں لیکن میری کوشش ناکام رہی۔

فما کل مافیہ من الخیر قلتہ ۞ ولا کل ما فیہ یقول الذی بعدی

جو کمالات ان میں ہیں نہ میں کہہ سکا اور نہ میرے بعد آنے والا کہہ سکے گا۔

نور الانور الاستاذ الامام السید محمد انور شاہ الکشمیری نور اللہ ضریحہ

از: حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند

الحمد اللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی دارلعلوم دیوبند نے اپنی نوے سالہ زندگی میں علم وفضل کے ایسے ایسے رجال پیدا کیے ہیں کہ ان آخری صدیوں میں دور دور تک تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز نظر آتی ہے۔ ہر ایک اپنے فن، کردار، سیرت اور بلند ذوقی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہی تھا۔ جو حضرات نصف صدی پیشتر گذر چکے ہیں ان سے شاید نئی دنیا واقف نہ ہو، اور ممکن ہے کہ تعارف کرانے کے باوجود وہ ان سے متعارف نہ ہوسکے۔ لیکن ماضی قریب کے مشاہیر دیوبند کی ایک بڑی جماعت ہے جو اپنی شہرۃ العامہ کے لحاظ سے محتاج تعارف نہیں، ان کے علم وسیرت کی مثالیں بھی دور دور تک نہیں ملتیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ، حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا عبدالحق مفسر حقانیؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہ حضرات اپنے شہرۂ آفاق علم وفضل اور کردار وسیرت کے لحاظ سے عزت وشہرت کی اونچی سطح پر پہنچے ہیں۔ قلم وزبان انھیں عام طور پر جانتے پہچانتے ہیں، پھر ایسی تعداد کی تو کوئی شمار ہی نہیں جو مشاہیر میں نہیں، لیکن اپنی مضبوط علمی واخلاقی سیرت کے ساتھ وہ زمینوں سے زیادہ آسمانوں میں مشہور ہیں۔ اور وہاں اچھے القاب سے یاد کیے جاتے ہیں، اور زمین کے کتنے ہی خطوں کے ایمانوں کو نبھائے ہوئے ہیں۔

بہر حال دار العلوم دیوبند ایک شجرۂ طیبہ ہے، جس کے خوش ذائقہ اور خوشبو دار پھل پھول سے دنیائے اسلام کا دل ودماغ معطر اور پر کیف بنا ہوا ہے، اور اس آخری صدی میں

اس کی جماعت مجموعی حیثیت سے اٹھی تو اس نے مجددانہ اور اسلامی علم وعمل کو غیر اسلامی اثرات کی آمیزشوں اور شرک وبدعات کے لوث سے پاک کر کے نکھار دیا اور ستھرا کر کے دنیا کے آگے رکھ دیا۔

دیوبند کی ان آفتاب وماہتاب ہستیوں میں نہایت تیز اور شفاف روشنی کا ایک جلیل المرتبت ستارہ حضرت الاستاذ علامۂ دہر فرید عصر حافظ الدنیا محدثِ وقت مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی مبارک ہستی بھی ہے جو مجموعی حیثیت سے آیت من آیات اللہ اور اپنے غیر معمولی علم وفضل کے لحاظ سے دین کا ایک روشن منارہ تھے۔ اور آپ کی ذات بلا مبالغہ عالم جلیل، فاضل نبیل، تقی ونقی، محدث مفسر ومتکلم، ادیب وشاعر، صوفی صافی اور فانی فی السنۃ ذات تھی۔

لیس علی اللّٰہ بمستنکر ۞ ان یجمع العالم فی واحد

آپ ۱۳۱۰ھ میں داخل ہوئے جب کہ منشی فضل حق صاحب دیوبندی کا دور اہتمام تھا اور ۱۳۱۴ھ میں تمام علوم وفنون کی تکمیل سے فارغ ہوکر جب کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا زمانہ اہتمام تھا، یہاں سے واپس ہوئے، چند سال مدرسہ امینیہ میں مسند درس پر متمکن رہے اور وہاں سے اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے، وہاں سے بہ نیت ہجرت حجاز مقدس کے قصد سے روانہ ہوئے۔ دیوبند میں اپنے اساتذہ وشیوخ سے ملنے کے لیے اترے۔

آپ کے شیوخ واساتذہ نے جو آپ کے جوہروں کو جانے اور پہچانے ہوئے تھے یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی مسند درس کے شایان شان یہ ایک ہستی ہے جسے دارالعلوم نے گویا اپنے ہی لیے پیدا کیا ہے، آپ کو دیوبند روک لیا اور آپ نے بھی غایت تواضع وانکسارِ نفس سے اپنے اساتذہ کی بات اونچی رکھتے ہوئے قیام دیوبند کا ارادہ فرما لیا۔

حضرت ممدوح کے ٹھہرانے سے ابتدائی منصوبہ اور مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح حضرت ممدوح سے لکھوائی جائے، لیکن عملاً یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا، جس کی وجوہ نامعلوم ہیں، شاید یہ ہوں کہ درس کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ واللہ اعلم۔

بہر حال آپ نے بامتثال اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرما دیا، البتہ غلبۂ زہد

وقناعت سے مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے، اور لوجہ اللہ کام شروع کر دیا۔ اس اصرار پر ان کے اکابر نے بھی سکوت رضا سے کام لیا۔ اور تنخواہ کا مسئلہ کلیۃً انہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

لیکن حضرت والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے اس کے بعد یہ گوارہ نہیں کیا کہ طعام وضروریاتِ طعام کے مصارف خود ان کے سر ڈالے جائیں، اور فرمایا کہ اگر مدرسہ سے حضرت ممدوح لینا نہیں چاہتے تو ان کے سر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تیسری متعین صورت یہ ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں، اسے حضرت ممدوح نے منظور فرمالیا۔ اور اس طرح تقریباً دس برس تک یہ صورت قائم رہی۔ حضرت والد ماجد علیہ الرحمہ نے بھی اپنی معروف آبائی اور روایتی مہمان نوازی سے آپ کو مثل اپنے اہلیت کے سمجھا اور نہایت انشراح وانبساط کے ساتھ یہ دور پورا ہوا۔

اس دور میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو بھی حضرت شیخ الہند اور حضرت والد ماجدؒ نے یاد فرمایا اور قیام دیوبند پر مجبور کیا، ممدوح بھی یہاں رک گئے اور وہ بھی اس پوری مدت میں حضرت والد ماجد ہی کے مہمان رہے۔ یہ دستر خوان بظاہر کھانے کا دستر خوان ہوتا تھا لیکن حقیقتاً اہل علم وفضل کی ایک پاکیزہ مجلس ہوتی تھی، جس میں حضرت والد ماجدؒ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور اکثر وبیشتر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور متعدد دوسرے اکابر اساتذۂ دار العلوم شریک رہتے تھے۔ علمی مسائل میں مکالمے ہوتے، بحثیں ہوتیں معارف وحقائق کھلتے اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحب اور مولانا سندھی مختلف علوم وفنون کے کافی دلچسپ مباحث چھیڑتے۔ اور آخرکار بزرگان مجلس کی طرف سے کبھی مزاحی رنگ میں اور کبھی سنجیدہ اور متین رنگ میں فیصلے اور مکالمے سنائے جاتے۔ حاضر الوقت خدام وطلبہ کو شاید درس وتدریس کی لائن سے برسہا برس میں وہ تحقیقات ہاتھ نہ لگ سکتی تھیں جو اس حلقۂ طعام میں یکایک اک دم مل جاتی تھیں، ان دونوں بزرگوں میں حاضر الوقت اکابر کے کمالِ ادب واحترام کے ساتھ سلسلۂ مسائل حق گوئی میں کبھی کوئی ادنیٰ اضمحلال یا تہاون پیدا نہ ہوتا تھا، اور ہر ایک کے خلاف برملا اور بہت صاف ریمارک کرتا۔

اس طرح کھانے پینے کا یہ دستر خوان مائدۂ علم وفضل بن جاتا، اور اس دستر خوان پر صرف بدنی غذا ہی جمع نہ ہوتی تھی، بلکہ روحانی غذاؤں کے قسم قسم کے الوان جمع ہو جاتے تھے اور دستر خوان اس شعر کا مصداق بن جاتا۔

بہارِ عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد ☆ برنگ اصحابِ صورت را بہ بوار باب معنی را

حضرت شاہ صاحبؒ میں غذا کے بارہ میں لطافت تھی مگر شوقینی نہ تھی۔ غذاؤں کے تنوع اور کھانے کے الوان کی طرف طبیعت جھکی ہوئی نہ تھی، جو مل گیا کھا لیا جو آ گیا شکر ورضاء سے اسے قبول کر لیا۔ میری جدۂ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا (جن کی مہمان نوازی اپنے دور میں مشہور تھی، اور خود حضرت نانوتوی قدس سرہ نے بھی اس بارہ میں یہ کہہ کر شہادت دی تھی کہ ''ہماری مہمان نوازی تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے''۔

کبھی کبھی حضرت شاہ صاحبؒ سے میری معرفت یہ کہلا کر بھیجتیں کہ حضرت کبھی تو اپنے کسی مرغوب کھانے کی فرمائش کر دیا کیجیے، تو متاثرانہ لب ولہجہ سے جواب دیتے کہ میری طرف سے سلام گذارش کیجیے اور یہ عرض کیجیے کہ ''دستر خوان پر ہمہ نعمت موجود ہوتے ہوئے میں کاہے کی فرمائش کروں، مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں جنت کی نعمتیں یہیں تو نہیں تمام کی جا رہی ہیں''۔

قیام دیوبند کی یہ صورت قائم ہو جانے پر حضرت شاہ صاحب نے باشارۂ اکابر درس وتدریس کا مستقل سلسلہ جاری تو فرما دیا۔ لیکن ہجرت کی پاک نیت سے دست بردار نہ ہوئے، اور برابر حاضریٔ حرم نبوی وحرم الٰہی کا جذبہ آپ کو دیوبند چھوڑنے کی طرف مائل کرتا رہتا تھا جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا، اور یہ اکابر بلطائف تعبیرا سے ٹلاتے جاتے۔ لیکن خطرہ انھیں بھی رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت یہ جذبہ غالب ہو جائے۔ اور دارالعلوم کو ایسی جامع اور مستقبل کی بڑی بڑی امیدوں کی محور ہستی سے دست بردار ہونا پڑ جائے۔ اس لیے یہ حضرات بھی انھیں مستقل جما دینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

آخر کار انھیں پابند بنانے کے لیے ان بزرگوں نے ان کے پیروں میں بیڑی ڈالنے کی تدبیر سوچ ہی لی۔ اور ارادہ کیا کہ حضرت ممدوح کا نکاح کر دیا جائے۔ گو اس سے

حضرت ممدوح کا انکار تھا، مگر بلطائف تدبیر انھیں راضی کر کے گنگوہ کے سادات کے ایک خاندان میں نکاح کر دیا گیا۔ میری دادی صاحبہؒ اور حضرت والد ماجد قدس سرہ نے اس کی کفالت فرمائی، اور نکاح کی اس تقریب کو اسی طرح انجام دیا جس طرح وہ اپنی اولاد کی کوئی بھاری تقریب کر سکتے تھے، بھوپال بارات گئی، علماء کی ایک جماعت ساتھ تھی، بڑی پر مسرت فضا میں نکاح ہوا، دلہن آئی تو حضرت جدہ مرحومہ نے اسی طرح گھر میں اتارا جیسے اپنے گھر کی دلہن اتاری جاسکتی تھی۔ ولیمہ کی لمبی چوڑی دعوت کی، اور احقر کے زنانہ مکان کے بالا خانے پر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ مع اہلیہ محترمہ فروکش ہوئے۔

اس پر تقریباً ایک دو ہی سال گذرے تھے کہ اولاد کی امید ہوئی، ہمارے گھر میں اس کی وہی خوشی تھی جو اپنے گھر میں اہل بیت کی اولاد ہونے کی ہوتی ہے اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، گھر میں عرصہ مدید گذر چکا تھا کوئی بچہ نہیں تھا، جس کی سب کو تمنا تھی اس امید سے کہ حضرت ممدوح کے یہاں بچہ ہونے والا ہے، سب گھر والوں کو بالخصوص میری دادی صاحبہ مرحومہ کو بے حد خوشی تھی۔ اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہوتا ہے، انھوں نے عقیقہ کی تقریب کا سامان بھی شروع کر دیا تھا، کہ اچانک حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو مشورہ دیا گیا اور ممکن ہے کہ خود ان کے قلب میں ہی یہ داعیہ از خود پیدا ہوا ہو انھوں نے حضرت جدہ مرحومہ سے عرض کیا کہ دس سال تک تو میں تنہا تھا، اب دو سال سے متأہل ہوں اور آپ ہی کے یہاں مقیم ہوں، اب اولاد کی امید ہے تو اب میں ایک اور دو کے ساتھ ایک عائلہ کا بار ڈالنے اور ڈالتے رہنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے کہ الگ مکان لے کر رہوں، حضرت ممدوحہ اور والد ماجد اس پر راضی نہیں ہوئے، لیکن ادھر سے اصرار بڑھا تو انھوں نے بادل ناخواستہ اسے قبول فرمالیا، اور حضرت شاہ صاحبؒ دیوان کے محلہ کے ایک مکان میں فروکش ہو گئے۔

اس صورتِ واقعہ کے بعد ذمہ دارانِ مدرسہ کے لیے موقع آ گیا کہ وہ تنخواہ لینے کے لیے حضرت ممدوح پر اصرار کریں، چناں چہ کیا، اور تاہل کی زندگی اور اس کے وسیع ہوتے رہنے کی صورت حال کے ماتحت طوعاً و کرہاً حضرت ممدوح کو بھی یہ اصرار قبول کر کے تنخواہ

لینے پر راضی ہو جانا پڑا، اور اب ایک گھرستی کی طرح ان کی عائلی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔

اس مکان کی رہائش کے بعد اسی میں عزیزم مولوی ازہر شاہ سلمہ کی بہن عابدہ مرحومہ پیدا ہوئی اور پھر میاں ازہر شاہ سلمہ معرض وجود میں آئے۔ تجرد سے تاہل ہوا تھا اور اب تاہل سے عائلی اور خاندانی زندگی کی داغ بیل پڑ گئی اور زندگی کے علائق ایک ایک کر کے بڑھتے رہے، اس کا قدرتی نتیجہ وہی نکلا جو ایک تدبیر کے اختیار کرنے والے بزرگوں نے سوچا تھا کہ حضرت شاہ صاحب مقید ہو گئے، اور ہجرت کرنے کا وہ جذبہ سست پڑ گیا، بالآخر ترک کر دینا پڑا، اور باطمینان خاطر دار العلوم میں مسند نشین درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔

اسی دوران میں حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز مقدس کا قصد فرمایا، اور شہرت ہوئی کہ حضرت بہ نیت ہجرت تشریف لے جا رہے ہیں، یہ شہرت تو غلط ثابت ہوئی لیکن تشریف بری محقق تھی، مگر شیخ زمانہ اور دار العلوم کے شیخ الحدیث کا دار العلوم سے جانے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، زمانہ بھی پر آشوب ہو گیا تھا، حضرت کی نسبت برطانوی حکومت کو شکوک وشبہات پیدا ہو چکے تھے اور حضرت شیخ اور دار العلوم کے بہی خواہوں کو ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں گورنمنٹ آپ کو تھام لے۔ اور اوپر سب سے بڑا خطرہ دار العلوم کی ایسی فرد فرید شخصیت کا نمونۂ اکابر واسلاف اور یگانۂ روزگار ہستی سے محروم ہو جانے کا تھا، جو کچھ کم حادثہ نہ تھا، لیکن دار العلوم کے ذمہ دار مبصرین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو دار العلوم میں روک کر پہلے ہی آنے والے خطرہ کی روک تھام کر لی تھی۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ جیسی یکتائے زمانہ ہستی کو دار العلوم میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ کی دار العلوم سے اس عارضی جدائی اور مخصوص روحانی برکات سے برائے چندے محرومی کا اثر تو ضرور ہوا، لیکن علمی حلقہ کے خلاء کا خطرہ روبراہ نہ آ سکا۔ مسند بھری بھرائی گویا موجود تھی، اگر شیخ الہند برائے چندے سامنے نہ رہے تو شیخ کے مثل سامنے تھے۔

چناں چہ حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے درس ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا اور علمی پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحر ذخار سے محروم ہو گئے ہیں، بلکہ انھیں محسوس ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا

تو اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل الغلط نہیں بلکہ بدل صحیح ہے جس سے بلا تامل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبِ حیات سے قدیم وجدید سیرابی میں انھیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔

بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہ تھیں، اور حضرت شاہ صاحب کا اندازِ درس درحقیقت دنیائے درس وتدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا۔

اولاً آپ کے درس حدیث میں رنگ تحدیث غالب تھا۔ فقہ حنفی کی خدمت وتائید وترجیح بلاشبہ ان کی زندگی تھی، لیکن رنگ محدثانہ تھا، فقہی مسائل میں کافی سیر حاصل بحث فرماتے، لیکن انداز بیان سے یہ کبھی مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ حدیث کو فقہی مسائل کے تابع کررہے ہیں اور کھینچ تان کر حدیث کو فقہ حنفی کی تائید میں لانا چاہتے ہیں بھلا اس کا قصد وارادہ تو کیا ہوتا؟ بلکہ واضح یہ ہوتا تھا کہ آپ فقہ کو بحکم حدیث قبول کررہے ہیں، حدیث فقہ کی طرف نہیں لے جائی جارہی ہے، بلکہ فقہ حدیث کی طرف لایا جارہا ہے وہ آرہا ہے اور کلیۃً حدیث کے موافق پڑتا جاتا رہا ہے، بالفاظ دیگر گویا حدیث کا سارا ذخیرہ فقہ حنفی کو اپنے اندر سے نکال نکال کر پیش کررہا ہے، اور اسے پیدا کرنے کے لیے نمودار ہوا ہے۔

۱۳ھ میں علامہ رشید رضا مدیر المنار مصر جب بسلسلہ صدارت اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان آئے اور دیوبند کی دعوت پر دار العلوم میں بھی تشریف لائے، حضرت شیخ الہند کی موجودگی میں خیر مقدم کا عظیم الشان جلسہ نودرہ ہال میں منعقد ہوا، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی برجستہ عربی تقریر میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے دار العلوم کے علمی مسلک پر روشنی ڈالی، جس کا اہم جز یہ تھا کہ ہم تمام مختلف فیہ مسائل میں فقہ حنفی کے مسائل کو ترجیح دیتے ہیں اور تمام متعارض روایات کی تطبیق وترجیح کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید حاصل کرتے ہیں تو علامہ رشید رضا نے حضرت شاہ صاحب کی تقریر کے دوران ہی میں تعجب آمیز لہجہ سے کہا

کیا سارا ذخیرۂ روایاتِ حدیث صرف فقہ حنفی ہی کی حمایت کے لیے اتارا گیا ہے؟

اس پر حضرت شاہ صاحب نے تقریر کے رخ کو پھیرتے ہوئے اس متعجبانہ استفسار

کے جواب کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ ہمیں تو ہر حدیث میں وہی نظر آتا ہے جو ابو حنیفہ نے سمجھا اور کہا ہے اور اس پر بطور دلیل حنفیہ شافعیہ کے مشہور مختلف فیہ مسائل کی مثالیں دیتے ہوئے تطبیق روایات اور ترجیح راجح کے اپنے اصول بیان فرمائے اور واضح کیا کہ ان اصول کے تحت ہمیں ذخیرۂ حدیث سے کس طرح فقہ حنفی نکلتا ہوا نظر آتا ہے؟۔

فقہ حنفی کی عظمت شان کو نمایاں کرتے ہوئے دکھلایا کہ ہم محض قیاسی طور پر نہیں بلکہ نصوص حدیث کے سارے ہی ذخیرہ میں عیاناً وہ بنیادیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن پر فقہ حنفی کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے۔

بہرحال درس حدیث میں آپ کے یہاں محدثانہ رنگ غالب تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے مؤید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے منشاء کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہاتھ در ہاتھ اس کے دلائل وشواہد سے اس دعوی کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔

متون حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارہ میں جو دعوی کرتے اسے دوسری احادیث سے مؤید اور مضبوط کرنے کے لیے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کر دکھائے جاتے تھے۔ اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تھا تو نتیجتاً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا، اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے، یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر حدیثوں کو پیش کیا جارہا ہے، یعنی گویا اصل تو مذہب حنفی ہے محض مؤیدات کے طور پر روایات حدیث سے اسے مضبوط بنانے کے لیے یہ ساری جدوجہد کی جارہی ہے، نہیں بلکہ یہ کہ حدیث اصل ہے لیکن جب بھی اس کے مفہوم کو اس کے فحوی اور سیاق وسباق نیز دوسری احادیث باب کی تائید و مدد سے اسے مشخص کر دیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی نکلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے، اس لیے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں، اور حدیث کا جو مفہوم ابو حنیفہ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشاء ہے جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایت حدیث

سے امام ابوحنیفہ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے، بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کررہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جو یا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرض حضرت شاہ صاحب کے درسِ حدیث کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ تحدیث واخبار کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید ہوتی نظر نہیں آتی تھی، بلکہ فقہ حنفی حدیث سے نکلتا ہوا نظر آتا تھا جس سے حدیث مؤید فقہ نہیں بلکہ منشاء فقہ ثابت ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرت ممدوح اور ایک عالم اہل حدیث کے مابین ہوا، اہل حدیث عالم نے پوچھا کیا آپ ابوحنیفہ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں، میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں۔

اس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقہ حنفی کی تائید کررہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا اجتہاد کلیۃً ابوحنیفہ کے اجتہاد کے مطابق پڑتا ہے، اس طرز جواب سے سمجھانا یہی منظور تھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لیے حدیث کا استعمال نہیں کرتے، بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اس کا استخراج سمجھا دیتے ہیں اور طریق استخراج پر مطلع کردیتے ہیں۔

بہرحال اکابر دیوبند کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقلد بھی تھے، مگر اس تقلید میں محقق بھی تھے، وہ مسائل میں پابند فقہ حنفی بھی تھے مگر اس پابندی کو مبصرانہ تحقیق سے اختیار کیے ہوئے تھے، جیسے مسئلہ تقدیر میں اہل سنت کا مذہب بندہ کے جبر واختیار کو جمع کرکے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے، مگر مجبور فی الاختیار ہے، اسی طرح مسائل فقہیہ میں حضرت شاہ صاحب کا رنگ یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں مگر محقق فی التقلید ہیں، اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں وہاں مسائل کی تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کی تحقیق بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

ایک امریکن مصنف نے اپنی معروف کتاب ''ماڈرن ان انڈیا'' میں زیر عنوان ''دیوبند کا اسلام'' اہل دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقہ اپنے مختصر عنوان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ:

''حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل دیوبند) اپنے کو مقلد کہتے ہیں، مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے محققانہ انداز سے کہتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی تنقیح و تحقیق کرتے ہیں کہ اس دعوائے تقلید کے ساتھ وہ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں''۔(انتھی بمعناہ)

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ یہ حضرات مجتہد فی التقلید اور محقق فی الاتباع ہیں کورانہ تقلید یا جامد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں اور لم یخروا علیها صما وعمیانا کے سچے مصداق ہیں۔

بہر حال یہ عنوان حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں اس لیے کافی بکھرا ہوا نظر آتا تھا کہ ان کا غالب رنگ محدثانہ تھا اور ہر ہر مسئلہ میں حدیثی مسئلہ کی تائید حدیث ہی سے کر جاتے تھے، لیکن نتیجہ میں پہنچ کر وہ مسئلہ حنفی فقہ کا مسئلہ بن جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کا منشا فلاں حدیث ہے جسے امام ابوحنیفہ نے باتباع حدیث، حدیث سے نکال کر پیش کر دیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحر ذخائر ہونے کی وجہ سے درس حدیث صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا اس میں استطرادا لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی، اگر معانی و بلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم معانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لیے واضع نے وضع کیا تھا۔ معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لیے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی۔

غرض اس نقلی اور روایتی فن (حدیث) میں نقل و عقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔

سال بھر تک یکسانی کے ساتھ مسائل پر یہ محققانہ بحثیں جاری رہتیں، یہ ضرور تھا کہ ششماہی امتحان کے بعد عصر سے مغرب تک کا وقت طلبہ کا مزید لیتے تھے جس سے رجب کے اواخر تک یعنی امتحان سالانہ شروع ہونے سے پہلے پہلے ترمذی و بخاری یکساں شان

تحقیق کے ساتھ ختم ہو جاتی تھیں۔

میں نے ان مختلف الانواع تحقیقات کو دیکھ کر ایک املائی کاپی تیار کی، جس کے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے یعنی مباحث حدیث، مباحث تفسیر، مباحث عربیت (نحو وصرف) مباحث فلسفہ ومنطق، مباحث ادبیات (جن میں اشعار عرب اور فصاحت وبلاغت کی بحثیں آتی تھیں) مباحث تاریخ وغیرہ، پھر فنون عصریہ کے لیے ایک کالم رکھا، کیوں کہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس، فلسفہ جدید اور ہیئت جدید وغیرہ کے مباحث بھی بذیل بحث حدیث درس میں آتی تھی، میں کالم واران مباحث کو املا کرتا تھا، ان فنی مباحث کے کالموں کے بعد کاپی کے کنارہ کا کالم حضرت ممدوح کی رائے اور محاکمہ کا تھا جس کے سرنامہ پر عنوان تھا قال الاستاذ اس میں وہ فیصلے درج کرلیا کرتا تھا جو مسائل کی تدقیق وتنقیح کے بعد بطور آخری نتیجہ کے حضرت یہ کہہ کرارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ''میں کہتا ہوں''۔

افسوس کہ یہ بیاض جو تقریباً چار پانچ سو صفحہ پر مشتمل تھی، ایک کرم فرما طالب علم نے مستعار مانگی اور میں نے اپنی طالب علمانہ ناتجربہ کاری سے چند روز کے لیے ان کے حوالہ کردی، انھوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریۃً مانگنے والے طلبہ کرتے ہیں یعنی چند دن کے بعد میرے مطالبہ پر فرمایا کہ میں تو دے چکا ہوں آپ کو یاد نہیں رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغالطوں سے عاجز ہوکر میں نے اس ذخیرہ سے صبر کرلیا، جس کو کافی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ چوری کا یہ علم خود ان کے کام بھی آیا یا ان کے پاس سے بھی یوں ہی نکل گیا جسے انھوں نے میرے ہاتھ سے نکالا تھا، یہ سانحہ یاد آنے پر اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ انھیں جزا دے۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا، بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور سائنس وغیرہ تمام علوم جدیدہ وقدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا، اور اس لیے اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لے کر اٹھتا تھا، اور اس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی کہ وہ بضمن کلام خدا اور رسول ہر فن

میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے، یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیری نے اختیار فرمایا، چناں چہ کبھی کبھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ''بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے'' بالخصوص فقہ حنفی کے ماخذ و مناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں، کافی سے زائد جمع فرما دیا۔

پھر بھی قیام ڈابھیل کے زمانہ میں آخری سال جس کے بعد پھر درس دینے کی نوبت نہیں آئی اور وصال ہو گیا، درس حدیث میں فقہی و حدیثی تحقیقات کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا، اور ترجیح مذہب حنفی اور تطبیق روایات میں عمر بھر کے علم کا نچوڑ پیش فرمایا جس کو املا کرنے والوں نے املا کیا۔

''تائید مذہب حنفی'' کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہ کرتے ہوئے گاہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابو حنیفہ کی نمک حرامی کی ہے، اب مرتے وقت جی نہیں چاہتا کہ اس پر قائم رہوں، چناں چہ کھل کر پھر ترجیح مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نادر روزگار علوم و معارف اور نکات و لطائف ارشاد فرمائے، جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ منجانب اللہ آپ پر مذہب حنفی کی بنیادیں منکشف ہو گئی تھیں اور ان میں شرح صدر کی کیفیات پیدا ہو چکی تھیں جس کے اظہار پر گویا آپ مامور یا مجبور تھے، ان علوم و معارف کے ذخیرہ کو حضرت ممدوح کے دو رشید شاگردوں مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے الواحِ اوراق میں جمع کر کے اہل علم پر ایک ناقابل مکافاۃ احسان فرمایا ہے، حق تعالیٰ ان دونوں محقق فاضلوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی روحانیت سے ان کی نسبت کو اور زیادہ قوی فرمائے''۔ آمین۔

حضرت ممدوح کا یہ جملہ کہ عمر بھر ابو حنیفہ کی نمک حرامی کی شاید اس طرف مشیر ہے کہ حضرت ممدوح جہاں روایاتِ حدیث میں تطبیق و توفیق روایات کا اصول اختیار فرمائے ہوئے تھے وہیں روایات فقہیہ میں بھی آپ کا اصول تقریباً تطبیق و توفیق ہی کا تھا، یعنی مذاہب فقہاء

کے اختلاف کی صورت میں حنفیہ کا وہ قول اختیار فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے اور دونوں فقہ باہم جڑ جائیں، اگر چہ یہ قول مفتی بہ بھی نہ ہو اور مسلک معروف کے مطابق بھی نہ ہو۔ نظر صرف اس پر تھی کہ دو فقہی مذہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبین کا قول زیر اختیار آ جاتا تھا، یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے باہر نہیں جاتے تھے، مگر ابوحنیفہ کے بلا واسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے، خواہ وہ بواسطہ صاحبین ابوحنیفہ ہی کا قول ہو، شاید اس کو حضرت ممدوح نے ابوحنیفہ کی نمک حرامی سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع کر کے کھلے طور پر مذہب کے معروف و مفتی بہ حصے بلکہ اقوال ابی حنیفہ کے اختیار و ترجیح کی طرف طبیعت آ چکی تھی اور یہ بلاشبہ اس کی دلیل ہے کہ ابو حنیفہ کی خصوصیات کے بارہ میں حق تعالیٰ نے انھیں شرح صدر عطا فرما دیا تھا اور وہ بالآخر اسی ٹھیٹھ لکیری پر جم کر چلنے لگے تھے، جس پر ان کے شیوخ سرگرم رفتار رہ چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الہند ؒ کا مقولہ سنا ہے فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ منفرد ہوتے ہیں اور ائمہ ثلاثہ میں سے کوئی ان کی موافقت نہیں کرتا اس میں ضرور بالضرور پوری قوت سے ابوحنیفہ کا اتباع کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ضرور کوئی ایسا دقیقہ ہے جس تک امام ہی کی نظر پہنچ سکی ہے اور پھر حق تعالیٰ اس دقیقہ کو منکشف بھی فرما دیتا تھا۔ یہ مقولہ امام ابوحنیفہ کے اس مسلک کے ذیل میں فرمایا کہ قضائے قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ اس مسئلہ میں میں بالضرور ابوحنیفہ ہی کی پیروی کروں گا، کیوں کہ اس میں صرف امام ہی متفرد ہیں اور یہ تفرد اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بنیاد ان پر منکشف ہوئی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکیں ہیں۔

اسی قسم کا مضمون حضرت نانوتوی قدس سرہ کے بارے میں میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم سے سنا ہے کہ حضرت والا نے مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی سے گفتگو فرماتے ہوئے کہا تھا کہ میں ابوحنیفہ کا مقلد ہوں، صاحب ہدایہ اور درمختار کا مقلد نہیں ہوں، اس لیے میرے مقابلہ میں بطور معارضہ جو قول بھی آپ پیش کریں وہ ابوحنیفہ کا ہونا

چاہئے، دوسروں کے اقوال کا جوابدہ نہ ہوں گا۔ اس سے بھی یہی نکتہ نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول ان حضرات کے نزدیک خود امام کا ہوتا تھا اور وہی درحقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔

پس ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ پر آخری عمر میں یہی نکتہ منکشف ہوا ہو جواُن کے شیوخ پر منکشف ہوا تھا۔ اوراس کے خلاف توسع کو وہ ابوحنیفہ سے نمک حرامی کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرما رہے ہوں۔

اسی کے ساتھ درس حدیث کے سلسلہ میں مذاہب اربعہ کے اختلافات بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورت حال پیدا ہوجاتی تھی۔ ان مناظرانہ مباحث اور فرعیاتی اختلافات سے کتاب وسنت کے ہزارہا مکنون علوم واشگاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل ہونے ممکن نہ تھے، اور پھر ان فرعیات کا تزاحم اور تزاحم کے بعد قول فیصل حضرت ممدوح کے قلب ولسان سے ظاہر ہوتا تو ظرف کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب وغریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوتے پھر ان تزاحمات میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ سے جو تنقیحات بیان ہوتیں وہ خود مستقل علوم ومعارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔

غرض ایجابی اور سلبی دونوں قسم کے علوم کی نیرنگیاں حلقۂ درس کو ایک رنگین گلدستہ بنائے ہوئے تھیں، جس میں رنگ رنگ کے علمی پھول چنے ہوئے ہوتے تھے۔ تفنن علوم کی رنگینیوں کے ساتھ آپ کے درس میں ایک خاص شوکت بھی ہوتی تھی، کلام میں تمکن اور قوت الفاظ میں شوکت وحشمت اور کلام کے وقت حضرت ممدوح کی ہیئت کذائی کچھ ایسے انداز کی ہوجاتی تھی جیسے کوئی بادشاہ اپنا حاکمانہ فرمان سنا رہا ہے، بالخصوص ائمہ مجتہدین کے متبعین علماء کے کلام پر بحث وتنقید چھڑ جاتی تو اس وقت معارضانہ اور ناقدانہ کلام کی شوکت اور بھی زیادہ ابھری ہوئی دکھلائی دیتی تھی، نگاہیں تیز ہوجاتیں آواز قدرے بلند ہوجاتی اور گردن اٹھا کر بولتے تو ایک عجیب پرشوکت اور رعب افزا کلام معلوم ہوتا تھا۔

بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے تفردات کا ذکر آتا تو پہلے ان کے علم وفضل اور تفقہ وتبحر کو سراہتے ان کی عظمت وشان بیان فرماتے۔ اور پھر ان کے کلام پر بحث

ونظر سے تنقید فرماتے جس میں عجیب متضاد کیفیات جمع ہوتی تھیں، ایک طرف ادب وعظمت اور دوسری طرف ردوقدح یعنی بے ادبی اور جسارت کے ادنی سے ادنی شائبہ سے بھی بچتے، اور راجح اور صواب میں کتمان صواب سے بھی دور رہتے، کبھی کبھی علمی جوش میں آ کر بر نگ مزاح بھی ردوقدح فرماتے تھے، جو بجائے خود ہی ایک مستقل علمی لطیفہ ہوتا تھا۔

ایک بار غالباً استواء علی العرش کے مسئلہ پر کلام فرماتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ اور ان کے مسلک اور دلائل کا تذکرہ آیا تو پہلے اسے شرح وبسط سے بیان فرمایا۔ پھر ان کے علم کی عظمت وشان کو کافی وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ حافظ ابن تیمیہ جبال علوم میں سے ہیں، ان کی رفعت شان اور جلالت قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو سر اٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے کی طرف گر جائے گی اور پھر بھی نہ دیکھ سکوں گا۔ لیکن بایں ہمہ مسئلہ استواء علی العرش میں اگر وہ یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درسگاہ میں نہیں گھسنے دوں گا۔ یا کبھی ان اکابر متقدمین کے کسی موہم یا شرح طلب کلام کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے کہ ہر شخص اپنی ہی جلالت شان کے مطابق کلام کرتا ہے اسے کیا خبر ہوتی ہے کہ بعد میں ہم جیسے گھس کھدے بھی آنے والے ہیں جو اس کلام کی عظمت میں غلطاں وپیچاں ہو کر رہ جائیں گے؟۔

بہر حال درس کا انداز ایک عجیب نیرنگی کا رنگ لیے ہوئے تھا جو بالکل انوکھی تھی جس میں علوم وفنون بھی ہوتے تھے، تائید وتنقید بھی ہوتی تھی، علوم ومعارف کے ساتھ علمی مزاح اور لطائف وظرائف بھی ہوتے تھے جس سے ہر استعداد کا طالب علم لطف اندوز ہوتا تھا۔ حتی کہ کبھی کبھی خود طلبہ کے ساتھ بھی علمی رنگ کا مزاح فرما لیتے تھے۔

عصر مغرب کے درمیان ایک دن بخاری کا درس زور وشور سے ہو رہا تھا۔ احقر بھی اس سال بخاری میں تھا اور شریک درس بھی تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین رخصت ہو گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا، جاؤ تم بھی گھر کا رستہ لو۔

ہم سب حیران ہوئے کہ کون بھائی شمس الدین اور وہ آئے کب تھے، اور رخصت کب ہو گئے؟ ہماری حیرانی کو دیکھ کر سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو غروب ہو رہا

تھا فرمایا کہ جاہلین دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین جارہے ہیں۔ اب کیا اندھیرے میں سبق پڑھو گے؟ کیا وہ لطف کا سبق ہوگا؟

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے فرمایا کہ جاہل تجھے معلوم نہیں میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں، جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو مارے گا وہ اپنے پاس والے کو رسید کرے گا، یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلۂ سند تجھ تک پہنچ جائے گا۔

یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصطلاحات میں ایک مزاح بھی تھا، جس سے طلبہ کی تنشیط (نشاط میں لانا) مقصود تھا۔

ایک دفعہ مسائل فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، فرمانے لگے کہ مسئلہ تو یہی ہے، مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے (اس زمانہ میں حضرت ممدوح ہی مسجد دارالعلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے کہ تم نے کبھی پیر نابالغ کو بھی دیکھا ہے؟ جو ساٹھ برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی؟ جاہلین وہ ساٹھ برس کا نابالغ میں ہوں (اس وقت حضرت ممدوح کی شادی نہیں ہوئی تھی) اشارہ اسی طرف تھا۔

ایک دفعہ ملا علاء الدین میرٹھی جو اس زمانہ میں قلفی کا برف بیچا کرتے تھے اور آج کل وہ دودھ کی مٹھائی کی دوکان کرتے ہیں، نہایت دیندار اور وضع دار آدمی ہیں، قلفی برف کا مٹکا لے کر دارالاہتمام میں پہنچ گئے جہاں حضرت والد ماجد کے پاس اس وقت حضرت شاہ صاحب اور چند اکابر مدرسین تشریف فرما تھے۔ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ملا جی کو روک کر برف کی قلفیاں کھولنے کے لیے فرمایا، یہ سب حضرات قلفیاں تناول فرماتے رہے، کھانے کے دوران میں حضرت شاہ صاحب نے ملا جی سے پوچھا کہ آپ اس برف کی تجارت سے ماہانہ کتنا پیدا کر لیتے ہیں؟ کہا کہ ساٹھ روپیہ ماہورا۔ اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب کی تنخواہ بھی ساٹھ روپیہ ماہورا تھی۔ مسکرا کر فرمانے لگے تو پھر تمھیں دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ضرورت نہیں۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب کا حلقۂ درس اور ساتھ ہی دوسری مجالس علم و کمال کے

ساتھ ظرافت سے بھی معمور ہوتی تھیں جوان کی زندہ دلی اور فقہ نفس کی دلیل تھی، اور اس ذیل میں کتنے ہی علوم و معارف بیساختہ نکلے ہوئے اربابِ مجلس کے ہاتھ پلے پڑ جاتے تھے۔

مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھر پور ہوتی تھی جس میں غیر متعلق یا فضول اور لایعنی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا۔

اگر کسی شخص نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معا فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ جاؤ۔ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لیے فارغ نہیں۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت فرماتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصہ مطالعہ کتب میں گذرتا تھا۔ ذوقِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ فتح الباری کا (جو تیرہ جلدوں کی کتاب ہے) تیرہویں مرتبہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لیے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا۔ مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل اس لیے ہر سال درس میں نئی نئی تحقیقات آتی رہتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس درس کے لیے مطالعہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جب وقت کے تمام گوشے مطالعہ سے پر تھے، گویا مطالعہ لامحدود تھا تو محدود مطالعہ کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کتب درسیہ اور بالخصوص کتب حدیث کے فنی مباحث طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔ اور ہمہ وقت کے مطالعہ سے ان میں روز بروز بسط و انبساط کی کیفیات پیدا ہوتی چلی جارہی تھیں اور مباحث درس گھٹنے یا قائم رہنے کے بجائے خود ہی یوماً فیوماً بڑھتے رہتے تھے تو انھیں جزوی مطالعہ سے بڑھانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ بلکہ شاید یہ مقررہ جزوی مطالعہ علوم کے بڑھتے ہوئے بسط میں کچھ نہ کچھ حارج اور حد بندی ہی کا سبب بن جاتا۔

پھر یہ عام مطالعہ محض کتب درسیہ یا شروح و حواشی اور منہیاتِ درس تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ تمام فنون کی ہر میسر آمدہ کتاب تک پھیلا ہوا تھا جن میں کسی علم وفن کی تخصیص نہ تھی۔ ذہن کسی ایک فن کے ساتھ مقید نہ تھا بلکہ مطلقاً علم کے بارہ میں ھل من مزید کا ذوق رکھتا تھا۔ اور حدیث میں منھومان لایشبعان کا صحیح مصداق تھا۔ مصر تشریف لے

گئے تو اوقات کا بڑا حصہ کتب خانہ خدیویہ کی کتب کے مطالعہ میں صرف ہوتا۔ حجاز حاضر ہوئے تو حرمین کے کتب خانے کنگھال ڈالے اور فرائض وتطوعات کے بعد گویا آپ کی عبادت یہ تبحر اور کتب بینی تھی۔ مرض وفات میں اطباء نے مطالعہ کی ممانعت کردی۔ لیکن جب بھی موقع ملا جب ہی کتب بینی شروع کردی اطباء نے کہا کہ حضرت اس سے مرض بڑھ جائے گا، فرمانے لگے کہ بھائی یہ کتب بینی خود ہی میرا مستقل مرض ہے اور لا علاج ہے۔

مطالعہ کے سلسلہ میں فن عصریہ فلسفۂ جدید حتیٰ کہ فن رمل اور جفر کی کتابوں کو بھی مطالعہ سے نہ چھوڑا۔

جب بھوپال شادی کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک جماعت نے عصری فنون کی کچھ بحثیں چھیڑ دیں، آپ نے انہی فنون کی اصطلاحات میں بحوالۂ کتب جوابات دیئے اور فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ ہم لوگ اس فن سے نابلد ہیں۔ ہم ان عصری فنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی کافی کیے ہوئے ہیں، اور ان فنون کی بنیادوں کو بھی جانتے ہیں، یہی صورت مسائل حاضرہ کے مطالعہ کی بھی تھی۔

سفر پنجاب کے سلسلہ میں جب لاہور پہنچے تو یہ زمانہ سود کی تحریک کا تھا مسلمانوں کی ایک جماعت اقتصادی وجوہ پر سودی بینکوں کا قیام مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھ رہی تھی، مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری رسالہ ''سودمند'' نکال رہے تھے اور جواز سود کا پرچار شد ومد سے کیا جارہا تھا۔ لاہور پہنچنے پر حضرت کے قیام گاہ پر لوگ ملنے کے لیے آنے لگے مجمع ہوگیا۔ مولانا ظفر علی خاں بھی آگئے اور جواز سود کے بارہ میں اقتصادی دلائل سے بھری ہوئی ایک تقریر کی جس میں ضرورت سود پر کلام کیا گیا تھا۔

مقصد یہ تھا کہ حضرت ممدوح بھی اس کی تائید میں کچھ فرمادیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ساری بسیط تقریر سن کر جواب میں فرمایا کہ بھائی جسے جہنم میں جانا ہو وہ خود جائے ہماری گردن کو پل نہ بنائے کہ اس سے لانگھ کر پہنچے۔ اور اس کے بعد سودی کاروبار کے مضرات اور اس تحریک کے غلط ہونے پر سیر حاصل بحث فرمائی جس سے لوگوں کے خیالات میں کافی حد تک اصلاح ہوئی۔

علامہ اقبال مرحوم کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح کے ارشادات سے ہوئی، ان کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پُر آتے تھے اور حضرت ان کے شافی جوابات لکھتے جس سے ان کے قلب کی راہ بنتی چلی گئی۔

غرض کثرت مطالعہ صرف درسی علوم کی کتب تک محدود نہ تھا، عصری علوم وفنون کا مطالعہ بھی جاری رہتا تھا، جس سے نو تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ بھی مرعوب اور مستفید تھا۔

میں نے ۱۳۵۲ھ میں اپنے عربی قصیدے ''نونية الاحاد'' کے طبع کرانے کا ارادہ کیا۔ اس قصیدہ میں امت کے مشاہیر علم وفن کی مختصر سوانح نظم ونثر میں جمع کی گئی ہے، جسے اس زمانہ میں طبع کرایا گیا تھا، اور اب چھوٹی خوبصورت تقطیع پر برخوردار مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہ نے اپنے ادارہ تاج المعارف کی طرف سے دوبارہ طبع کرایا ہے، اس قصیدہ میں ابوالحسن کذاب کا نام بھی مشاہیر کے سلسلہ میں آیا کہ یہ صفت کذب اور دروغ گوئی میں مشہور اور یکتائے روزگار تھے مجھے ان کی تاریخ نہ ملی جو اس قصیدہ میں درج کرتا۔ اس صورت میں ہم لوگوں کے آخری دوڑ یہ ہوتی تھی کہ حضرت شاہ صاحب تک پہنچ جاتے تھے، اور اس سلسلہ میں بلا محنت ومشقت علم کا نایاب اور وسیع ذخیرہ لے کر گھر آجاتے تھے جو برسہا برس کے ذاتی مطالعہ سے بھی حاصل ہونا دشوار تھا۔

میں اپنے اسی معمول بہ دستور کے مطابق حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں ان کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ مرض وفات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور دو تین ہفتہ بعد ہی وصال ہونے والا تھا، کمزور بے حد ہو چکے تھے لیٹنے بیٹھنے میں بے حد تکلف ہوتا تھا، اطلاع کرنے پر مجھے حسب معمول گھر میں بلالیا، اور عادت تھی کہ جب بھی میں پہنچتا تو کسی نہ کسی چیز سے تواضع فرماتے، فوراً چائے بنانے کا حکم دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت ممدوح کا دارالعلوم سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور میں اس زمانہ میں عہدۂ اہتمام دارالعلوم پر تھا، لیکن حضرت ممدوح کے اس رسمی تعلق کے انقطاع بلکہ اس سے بھی پہلے فتنۂ ۱۳۴۲ھ کے زمانہ میں میرا تعلق ان سے وہی رہا جو پہلے تھا۔ حتی کہ آمد ورفت بھی منقطع نہیں ہوئی، اسے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی محسوس فرماتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے، پھر یہ تعلق کوئی رسمی یا دنیوی نہ تھا جو قطع ہو جاتا،

بلکہ روحانی تھا اور قدیم تھا جو ناممکن الانقطاع تھا، گو درمیانی مدت میں قضاء وقدر سے وہ مستور اور مغلوب سا ہو گیا تھا اور تکوینی طور پر اَنْ نَزَغَ الشَّیْطَانُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ فتنہ زا منظر کا ظہور ضرور ہوا تاہم یہ سب سطحی بات تھی قلبی طور پر محبت وعقیدت کا علاقہ بدستور قائم تھا اور اس میں جتنا کچھ رخنہ پڑ گیا تھا مرور ایام سے اس میں بھی اضمحلال آچکا تھا اس لیے از اول تا آخر میرے لیے حضرت ممدوح کے قلب مبارک میں کافی گنجائش تھی جس کا ظہور میری گاہ بگاہ حاضری پر ہوتا رہتا تھا، اس موقع پر بھی حسب معمول اس بزرگانہ شفقت سے پیش آئے۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد متوجہ ہوئے، فرمایا مولوی صاحب کیسے تشریف لائے۔

میں نے عرض کیا حضرت ابو الحسن کذاب کا ترجمہ نہیں ملتا اس کے بارہ میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں، فرمایا ادب وتاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجئے تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیئے، اور ان کے مظان ومواقع کی نشاندہی فرمادی، میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس شخص کی پوری تاریخ معلوم کرنی نہیں ہے، صرف اس کی صفت کذب ودروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں مگر ان کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اس کے نیچے ان خاص واقعات کا مطالعہ کرلوں۔

فرمایا مولوی صاحب آپ نے بھی کمال کیا صفت کذب کونسی صفت مدح ہے کہ لوگ اس پر عنوانات قائم کر کے اس کے واقعات دکھلائیں ایسی مذموم صفات افعال کا تذکرہ ضمناً اور استطراداً آجاتا ہے۔ عنوان ہمیشہ کمالات پر قائم کیے جاتے ہیں نہ کہ نقائص وعیوب پر، ان کتب پر فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے، ضمناً اس کی صفت کذب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہ رہیں گے چہ جائیکہ ان کے یہ مظان اور مواقع محفوظ رہیں۔ نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لیے اتنا طویل وعریض مطالعہ کروں۔ بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے متعلقہ واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرمادیں، میں انہی کو آپ کے حوالہ سے جزو کتاب بنادوں گا، اس پر مسکرا کر ابو الحسن کذاب کی تاریخ اس کے سن ولادت سے سن وار بیان فرمانی شروع کر دی جس میں اس کے جھوٹ

کے عجیب وغریب واقعات بیان فرماتے رہے، آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا، پھراس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہورہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جواس بسط سے سن وار واقعات بیان فرمائے ہیں۔

میں نے تعجب آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ حضرت شاید کسی قریبی ہی زمانہ میں تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی؟ سادگی سے فرمایا جی نہیں، آج سے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا، خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لیے پہنچا اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آ گیا اوراس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا۔ بس اسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہوگئیں اورآج آپ کے سوال پر مستحضر ہوگئیں، جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا۔

اللہ اکبر! یہ واقعات حدیث وتفسیر اورفقہ واصول کے مباحث سے تعلق نہ رکھتے تھے جوان کے متداول فنون اورروزمرہ کے مشاغل میں سے تھے بلکہ ایک غیر متعلق اور وہ بھی چالیس سالہ مدت کی ذہن میں آئی ہوئی اوراوپر سے وہ بھی کسی اہتمام سے نہیں محض اتفاقی طور پراورسرسری انداز سے ذہن میں آئی ہوئی چیز تھی، اس کا اتنا استحضار عام معتاد حافظہ سے بالاتر کراماتی حافظہ سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جس علم وفن میں بھی گفتگو فرماتے، تبحر واستحضار کی یہی نوعیت ہوتی تھی، کہ گویا اس مسئلہ کوابھی دیکھ کراورذہن میں سمیٹ کرآ رہے ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء دہلی کا حضرت ممدوح کو ''چلتا پھرتا کتب خانہ'' کہنا حقیقتاً اظہار حقیقت پر مبنی ہے اور حضرت ممدوح اس لقب کے جائز طور پر ہی نہیں، بلکہ واجبی طور پر مستحق ہیں۔

وفورِ مطالعہ اوراس کے ساتھ قوت حافظہ ایسا ہی ہے جیسے سرمایہ دار سرمایہ کے ساتھ سخی دل بھی ہو، بخیل سرمایہ دار ہوتو بے فیض اور بے نتیجہ ہے، جیسے بعض کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے، لیکن قوت حافظہ نہ ہونے کے سبب ان کا وقتی شوق مطالعہ تو پورا ہوجاتا ہے مگر خود ان کو یا

دوسروں کو اس مطالعہ کی کاوشوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جس درجہ مطالعہ وسیع تھا اسی درجہ حافظہ بھی قوی تھا، گویا ذہن و حافظہ ہر وقت تیار رہتے تھے کہ آنکھیں یا کان کچھ لائیں تو وہ فوراً اسے جمع کرلیں، بلاشبہ حضرت ممدوح کے اس غیر معمولی حافظہ سے حفاظ سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، انھیں غیر متداول بلکہ غیر معروف کتب کی عبارتیں بھی اس درجہ مستحضر رہتی تھیں کہ وقت پڑنے پر بے تکلف پیش کردیا کرتے تھے، اور علماء حیرت زدہ ہوکر رہ جاتے تھے۔

تحریک خلافت کے دور میں جب امارت شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خاں صاحب گورکھپوری نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقاط نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطۂ نظر کی مؤید تھی مگر مسلک جمہور کے خلاف تھی، یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اسے پیش کیا، تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحب کے کمرہ میں جمع تھے حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد ہی کرسکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی، اور نہ اسے قبول ہی کرسکتے تھے کہ مسلک جمہور کے صراحۃً خلاف تھی، یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اسے کسی تاویل و توجیہ سے بھی مسلک جمہور کے مطابق نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب استنجاء کے لیے تشریف لے گئے تھے، وضو کے لیے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق و توفیق بھی نہیں بن پڑتی۔ حضرت ممدوح حسب عادت حسبنا اللہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کردیا گیا ہے، درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے، اسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی دیکھا گیا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان میں سے حذف ہوئی تھی، جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلک جمہور کے موافق ہوگیا اور سب کا تحیر رفع ہوگیا۔

بہرحال حافظہ و انتقال ذہنی کے لحاظ سے حضرت ممدوح آیۃ من آیات اللہ تھے،

جس کی نظیر ان قریبی زمانوں میں نہیں ملتی۔

حضرت ممدوح کی اس تبحر پسندی اور ذوق زیادت علم کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ میں بھی وہی ذوق تبحر پیدا ہونے لگا، ہر طالب علم کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتب کا مطالعہ کرے، زیادہ سے زیادہ تحقیق کے ساتھ مسئلہ کی تہ تک پہنچے اس دور میں ہر چھوٹے بڑے کا یہ ذہن بن گیا تھا۔ اور اس کے آثار زمانۂ طالب علمی ہی میں نمایاں ہونے لگے تھے۔

چناں چہ اس زمانہ کے متعدد طلباء دورۂ حدیث نے اچھے اچھے قابل قدر رسالے اور مضامین سے اپنے علمی تبحر کا ثبوت دیا۔ میں نے ادب و تاریخ کے سلسلہ میں رسالہ ''مشاہیر امت'' لکھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب حال ساکن پاکستان نے ختم النبوۃ فی القرآن اور ختم النبوۃ فی الحدیث کا رسالہ دو جلدوں میں مرتب کیا، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے التصریح بما تواتر فی نزول المسیح لکھا، مولانا بدر عالم میرٹھی نے بھی کئی رسالے لکھے، اور تقریباً دو تین سال کے عرصہ میں احاطۂ دار العلوم سے اٹھارہ انیس رسالے شائع ہوئے۔

یہ درحقیقت وہی ذوق تھا جو حضرت ممدوح کے درس حدیث سے طلبہ لے کر اٹھتے تھے اور علمی طور پر اپنے اندر زمانۂ طالب علمی ہی میں ایک ایسی قوت محسوس کرنے لگتے تھے کہ گویا وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہیں اور علم ان کے اندر سے خود بخود ابھر رہا ہے، وہ کتب بینی محض عنوان بیان تلاش کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔

حضرت ممدوح کے یہاں علم کے اس غیر معمولی شغف و انہماک اور ہمہ وقت کے شغل کے باوجود عمل بالسنۃ اور اتباع سلف کے اہتمام میں ذرہ برابر بھی کمی اور کوتاہی نہ ہوتی تھی۔

ہم بہت سی سنتیں ان کے عمل دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے، کھانا کھانے کے بعد تولیہ یا رومال سے ہاتھ پونچھنے کے بجائے ہمیشہ حسب معمول نبوی پاؤں کی تلووں سے ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے تھے، اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے، بائیں ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے، لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کرتے تھے، یہی صورت لباس کی تھی پاجامہ نیم ساق سے کبھی نیچا نہ ہوتا تھا، عمامہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا سردیوں میں

اکثر و بیشتر سبز یا سادہ رنگ کا عمامہ استعمال فرماتے تھے، زہد وتقویٰ حضرت ممدوح کے روشن اور کھلے ہوئے چہرے پر برستا تھا۔ ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقعہ پر حضرت ممدوح کے سرخ وسفید رنگ کی کشادہ پیشانی اور ہنس مکھ چہرے نیز چہرہ کی مجموعی وجاہت وعظمت کو دیکھ کر کہا تھا کہ ''اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے'' جمعہ کے لیے جاتے تو فاسعوا الی ذکر اللّٰہ کا منظر سب کو نظر آتا، سعی اور دوڑ کی شان تیز رفتار اور لمبے لمبے قدم ڈالنے کی چال سے نمایاں ہوتی تھی، حسبنا اللّٰہ تکیۂ کلام تھا، اٹھتے بیٹھتے اکثر و بیشتر حسبنا اللّٰہ فرماتے اور ایسے ہی موقع بموقع اللّٰہ اجل فرماتے رہتے تھے۔ درس میں بعض اوقات غایت خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی، جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے انشاء وقصائد اور وعظ میں خوف وخشیت کے اشعار اکثر تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ مظہر خشیت الٰہی نظر آتا تھا اور سامعین کی آنکھیں تر ہو جاتی تھیں، ٹھیک طریقۂ نبوی کے مطابق کن انکھیوں سے دیکھتے اور جدھر متوجہ ہوتے پورے متوجہ ہوتے تھے۔

ادب علم کا یہ عالم تھا کہ خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا، بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں۔

چناں چہ سفر وحضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں، بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدب انداز سے بیٹھتے، گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ ''میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا'' سبحان اللّٰہ کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور دوام ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہ وہی کرسکتا ہے جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لیے موفق اور میسر کر دیا ہے، اور وہ گویا بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس سے دینی آداب کے عملی نمونے پیش کرائے جائیں، کُلٌّ میسَّرٌ لما خُلق لہٗ۔

ہر کسی را بہر کارے ساختند ❁ میل اور ادر ویش انداختند

ادب شیوخ واکابر کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر یا آنکھ ملا کر گفتگو نہ فرماتے۔

فتنہ ۱۳۴۲ھ میں جب معاملہ حدود سے بڑھنے لگا اور حضرت ممدوح نے مدرسہ میں آنا اور درس دینا چھوڑ دیا جس سے طلبہ میں انتشار پھیل گیا اور اسٹرائک کی صورت پیدا ہوئی تو حضرت والد ماجدؒ نے بلا واسطہ اس مسئلہ کو سلجھانے کی سعی فرمائی، اور ایک دن اچانک صبح کے وقت حضرت ممدوح کے مکان پر تن تنہا پہنچ گئے اور اطلاع ہونے پر اک دم گھبرا کر حضرت ممدوح باہر تشریف لائے اور اسی سابقہ نیاز مندی کے ساتھ بہت ہی مؤدبانہ انداز سے پردہ کرا کر گھر میں لے گئے، گردن جھکا کر عرض کیا کہ حضرت اس وقت اچانک کیسے تکلیف فرمائی؟ حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ حضرت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میرا ابھی آپ پر کوئی حق ہے؟ فرمایا ہے اور یہ ہے کہ آپ اگر میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ والد ماجد نے فرمایا کہ بارک اللہ بس تو میری گذارش یہ ہے کہ آپ ان قصوں کو چھوڑ دیں اور مدرسہ میں چلیں اور میرے ساتھ چلیں، فرمایا بہت اچھا حضرت نے چند معاملات پیش فرمائے کہ حضرت انھیں یوں کر دیا جائے۔

والد ماجد نے فرمایا کہ آپ کا منصب مطالبہ کرنے کا نہیں مطالبے پورا کرنے کا ہے، آپ اپنے قلم سے جو مناسب سمجھیں چل کر خود کر دیں، اس پر ساتھ ہو لیے اور مدرسہ میں پہنچ گئے، سب کو حیرت اور بے انتہا مسرت ہوئی کہ سارا فتنہ ختم ہو گیا، والد ماجد نے فرمایا کہ یہ سب مطالبے آپ خود ہی جاری کر دیں اور درس شروع کرا دیں، فرمایا کہ حضرت اتنی اجازت دیں کہ ظہر کے بعد حاضر ہو کر درس شروع کروں، فرمایا مضائقہ نہیں، حضرت ممدوح تشریف لے گئے، مگر پھر ظہر کے بعد تشریف نہیں لائے اور معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجبور کر کے روک دیا۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ زمانۂ اختلاف میں ادب وتوقیر اور تسلیم ورضاء کا بذاتِ خود یہ عالم تھا جو اس واقعہ میں آپ نے دیکھا۔

تقریری افادہ کے ساتھ تحریری افادہ یعنی تصنیف کا بھی آپ میں کافی ذوق تھا، حدیث میں متعدد نافع اور نادرۂ روزگار رسالے تالیف فرمائے اور علمی ترکہ میں چھوڑے جیسے نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین، فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب، رفع الستر عن

مسئلۃ الوتر، اکفار الملحدین خاتم النبیین (فارسی) مرض وفات میں روکر فرمایا ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لیے نہ کیا، یہ رسالہ ''خاتم النبیین'' اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے توقع ہے کہ شاید یہ رسالہ میری نجات کا ذریعہ ہوجائے۔

دارالعلوم کے سنین قیام میں سے تقریباً اواخر سنین میں کلامی مسائل کی طرف توجہ ہوئی، ابتدائی ایام میں کلامی مسائل میں زیادہ ذوق سے کلام نہیں فرماتے تھے، نقل وروایت کا غلبہ تھا، آخر عمر میں یہ ذوق ابھرا تو خارج اوقات میں دوپہر کے ابتدائی حصہ میں کتاب شروع کرائی، احقر بھی اس میں شریک تھا، اس میں بالخصوص حضرت نانوتوی قدس سرہ کی کتب کے حوالہ سے کلامی مسائل میں ان کے علوم بیان فرماتے اور ان کی شرح فرماتے اور آخرکار ان علوم کے عنوانات منضبط کرنے کے لیے عربی کا ایک بلیغ قصیدہ خود ہی موزوں فرمایا جو ''ضرب الخاتم علی حدوث العالم'' کے نام سے چھپ چکا ہے، اس کے ایک ایک شعر میں بہت سے مسائل کھپا دیئے ہیں، ساتھ ہی ان کی تشریحات کے لیے مآخذوں کے حوالے دیتے گئے ہیں، جن میں تمام کتب معقول وفلسفہ کے حوالوں کے ساتھ علوم قاسمیہ کی کتب مثلاً تقریر دل پذیر، انتصار الاسلام، مباحثہ شاہ جہان پور وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں، خط نہایت پاکیزہ تھا، حرف موتیوں کی طرح کاغذ پر جڑے ہوئے نظر آتے تھے اور بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ باریک قلم سے لکھتے تھے اور مختصر نویسی کے ساتھ لکھنے کی عادت تھی، اکثر تحریریں اشارات ہوتے تھے جن کو صاحب ذوق ہی سمجھ سکتا تھا۔

فن ادب اور شاعری کا ذوق بہت بلند پایہ تھا، دارالعلوم میں عام اجتماعات یا کسی بڑی شخصیت کے قدوم یا کسی اہم حادثہ کے وقوع پر قصائد قلمبند فرماتے اور انھیں مجمع میں سناتے، پڑھنے کا طرز نہایت دلکش تھا، ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا، عربی اور فارسی کی بلاغت اعلیٰ مقام تک پہنچی ہوئی تھی۔

فرماتے کہ مقامات حریری جیسی کتاب ایک گھنٹہ میں چار ورق برجستہ لکھ سکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی عبارت چار مہینوں میں بھی چار سطر نہیں لکھ سکتا، اردو سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا لیکن کلام بہرحال بلیغ ہوتا تھا مگر عربیت آمیز۔

اس اردو اجنبیت کی وجہ سے ہم لوگوں میں اردو کی ایک گونہ تحقیر قائم ہوگئی تھی اردو کتابوں کو دیکھنا عیب سا معلوم ہوتا تھا حتی کہ خود اپنے اسلاف صالحین کے علوم و معارف سے بھری ہوئی اردو تصنیفیں دیکھنے میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی، خواہ اسے محسوس کر کے یا از خود داعیۂ قلب سے ایک دن تفسیر بیان القرآن اردو از حضرت تھانوی قدس سرہ کے بارہ میں فرمایا کہ اردو میں اتنی چست تفسیر آج تک نظر سے نہیں گذری، اس تفسیر نے بہت سی پرانی تفاسیر سے مستغنی کر دیا ہے۔

اس کے بعد ہم لوگ اردو کی کتابیں دیکھنا بھی گویا جائز سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ کہ اردو زبان بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکتا ہے۔

اثنائے سال تعلیمی میں گاہ بگاہ سفر بھی فرماتے تھے، اور سال بھر میں سفروں کی تعداد خاصی ہو جاتی تھی اس میں بعض سفر لمبے لمبے بھی ہوتے تھے جیسے پنجاب و سرحد وغیرہ کے اسفار سے رد قادیانی کے سلسلہ میں پنجاب کے مستقل دورے بھی فرمائے، خاص قادیان کا سفر بھی ہوا، جس میں ایک بڑی جماعت ساتھ تھی اور ہم لوگ بھی ہم رکاب تھے، اور سفروں میں بھی احقر ساتھ رہا ہے۔

تقریر علمی ہوتی تھی جس سے علماء استفادہ کر سکتے تھے، لیکن عوام بصد عقیدت سن کر برکت حاصل کرتے تھے۔

کھوٹہ ضلع راولپنڈی کے سفر میں احقر اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور اور دوسرے بعض اور مستفیدین بھی ساتھ تھے۔ حضرت مولانا مرتضی حسن صاحب ؒ بھی ہمراہ تھے۔ راولپنڈی پہنچے بڑے بڑے اجتماعات ہوئے اور بڑی بڑی عالمانہ تقریریں ہوئیں، مجلسی خوش مذاقی اور ظرافت کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حضرت مولانا مرتضی حسن صاحب مرحوم وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ ناشتہ آ گیا حضرت ممدوح نے زور سے فرمایا کہ شیخ وظیفہ کا مقصد آ چکا ہے دستر خوان پر آ جائیے۔

کھوٹہ کے اسی سفر میں حضرت ممدوح نے مجھے ''فقیر صاحب'' کا خطاب عطا فرمایا صورتِ واقعہ یہ ہوئی کہ بارش بہت زیادہ ہوگئی جلسہ گاہ شہر سے میل بھر کے فاصلہ پر تھی، راستہ

میں بھی بارش آ گئی اور میں سر سے پیر تک پانی میں مع کپڑیوں کے نچڑ گیا۔ جلسہ گاہ کے قریب ایک مسجد میں پہنچ کر بھیگے ہوئے کپڑے اتارے، ایک صاحب نے اپنی چادر لنگی کے طور پر دی اور ایک صاحب نے اوڑھنے کے لیے دوسری چادر دے دی میں لنگی باندھ کر اور چادر اوڑھ کر ننگے سر ننگے پاؤں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچا، حکم فرمایا کہ اس وقت جلسہ میں تقریر تجھی کو کرنا ہوگی، چناں چہ مجھے اسٹیج پر کھڑا کر کے خود ہی میرے تعارف کی تقریر کی اور فرمایا کہ ''یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے حلہ میں ننگے سر ننگے پاؤں کھڑے ہیں فلاں کے بیٹے اور فلاں کے پوتے ہیں، علمی سواد خاصا رکھتے ہیں، مجمع میں بولنے کا ڈھنگ انھیں آ گیا ہے یہ جیسے باہر سے فقیر نظر آتے ہیں ویسے ہی اندر سے بھی فقیر صاحب ہی ہیں آپ ان کی تقریر سے فائدہ اٹھائیں گے'' ملتان میں بھی شیخ زکریا بہاؤالدین ملتان رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے احاطہ میں جلسہ ہوا، میں ساتھ تھا تو مجھے بھی تقریر کرنے کا حکم دیا، اور جب میں تقریر ختم کر چکا تو اس تقریر کی تائید میں بار بار میرا ذکر فرما فرما کر خود بھی تقریر فرمائی، اور کافی حوصلہ بڑھایا۔ اصاغر کی حوصلہ افزائی کی خاص عادت تھی جس سے چھوٹے اپنے حوصلہ سے زیادہ کام کر جاتے تھے اور ان میں ترقی پذیری کی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔

درس وتدریس کے ساتھ ارشاد وتلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، بیعت بھی فرما لیتے تھے۔ اپنے اکابر سے سنا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی طرف سے مجاز بیعت بھی تھے۔ دیوبند کے بھی بعض لوگ بیعت تھی، الہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دیکھنے والوں میں تھا، حضرت ممدوح ہی سے بیعت تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مفتی محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان مقیم کراچی نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کی طرف رجوع کیا ہمیں طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اس میں کھلی تاثیر وتصرف محسوس کرتے تھے۔

علم واخلاق کے ان اونچے مقامات کے ساتھ سیاسیات سے بھی آپ کو لگاؤ تھا اور ملکی معاملات میں شرعی اصول پر جچی تلی رائے ظاہر فرماتے تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کی صدارت فرمائی، خطبۂ صدارت ارشاد

فرمایا، جس میں وقت کے تمام مسائل پر بحث فرمائی، انگریزوں سے کافی تنفر تھا، ایک دفعہ مرض وفات میں ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے سولہ سترہ سال پہلے عزیزی مولوی حامد الانصاری غازی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ بھائی ہمیں اب یقین ہوگیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیوں کہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کردیئے ہیں، ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے جس کے بعد زیادہ دیر تک بقاء نہیں ہوسکتی، اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اب انگریز کے جانے کے دن قریب آگئے ہیں، حضرت ممدوح کی ان گوناگوں علمی عملی اور اخلاقی خصوصیات کے سبب خود ان کے اکابر ان کی عظمت کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ استاذ ہونے کے باوجود توقیر کے کلمات ان کے بارہ میں استعمال فرماتے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے کہ جب مولوی انور شاہ میری پاس آکر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب ان کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔ میرے والد ماجد باوجود استاذ ہونے کے ان کی انتہائی توقیر فرماتے تھے اور غائبانہ بھی ان کے لیے کلمات تعظیم استعمال فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کی عظمت اس کے بڑوں کے دل میں بھی ہو اس کی عظمت اس کے چھوٹوں کے دلوں میں کتنی ہوگی؟

ایک مقتدر ہستی، ایک یگانۂ روزگار ہستی کے فضائل ومناقب ان سطور میں کیا آسکتے ہیں، بڑی بڑی تصنیفیں بھی ایسے لوگوں کی سوانح کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں۔

اس لیے یہ مضمون تو کیا ان کی سمائی کرسکتا ہے لیکن اس کی نگارش بطور سوانح کے ہوئی ہی نہیں، یہ سطریں صرف بطور تذکرۂ کاملین اپنے دل کی تسلی یا اپنے استادزادہ عزیزی مولوی سید ازہر شاہ قیصر سلمہ اللہ تعالیٰ مدیر ماہنامہ ''دارالعلوم'' کے ایماء کی تعمیل کے لیے لکھی گئی ہیں، ورنہ کجا سوانح خاتم المحدثین اور کجا یہ اجہل الجاہلین؟ بس جهد المقل دموعه کے طور پر یہ بضاعت (مزجاۃ جو آج بتاریخ ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۷۲ھ کو بعد نماز صبح بیٹھ کر لکھنی شروع کی اور مسلسل لکھتے لکھتے ٹھیک گیارہ بجے دن کو ختم کردی) بطور ایک ہدیۂ ناچیز عزیز محترم وممدوح کی خدمت میں پیش ہے، گر قبول افتد زہے عز وشرف۔ والحمدللہ اولاً وآخراً۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب قدس سرہ

از: حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب۔ سابق نائب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند

اعانتِ مدرسین کی حیثیت میں

حضرات مدرسین کی امداد دو طرح ہوسکتی ہے ایک تو یہ کہ ان کی مالی خدمت کی جاوے ان کے اخراجات میں امداد کی جاوے۔ اس صورت میں تو مدرسین کا لفظ کچھ زیادہ ضروری اور مفید نہ ہوا، بلکہ امدادِ غرباء یا اعانت مفالیس بھی کام دے سکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فرائض تدریس میں ان کا ہاتھ بٹایا جاوے، دماغی محنت سے ان کو ہلکا کیا جاوے، اور یہی معنی ان دیار میں مروج تھے جہاں اردو کی حکمرانی تھی۔ مددگار مہتمم، مددگار ناظم، مددگار ناظم مدرس وغیرہ وغیرہ ان کا مطلب یہی تھا کہ ان کے فرائض ملازمت میں کوئی شخص ساجھی ہو اور امورِ متعلقہ میں تخفیف کا باعث ہو۔

دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین ایک عہدہ جو بہت زیادہ مفید اور مقبول تھا، اچھے اچھے ذی استعداد اور سرگرم کار علماء اس میں اپنے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ قدوۂ مھتممین مدارس اسلامیہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کو ذاتی طور پر جانچتے اور پرکھتے تھے، اس بارے میں مسموعات اور سفارشوں کا ان کے یہاں اعتبار زیادہ نہ تھا اور جب کسی طالب علم کی اہلیت ان کے معیار پر صحیح اترتی تھی تو وہ اس پر بلاتوسط اپنا منشاء ظاہر کرتے تھے کہ تم اگر یہاں رہ کر علمی ترقی کرنا چاہو تو یہ ممکن ہے کہ تم یہاں دو چار سال مختلف قسم کے علوم اور فنون کی کتابیں پڑھا لو۔ تمھارے علم کی پختگی بھی ہوگی، یہاں سیکڑوں طلبہ تم سے پڑھیں گے، تمھاری شہرت بھی ہو جاوے گی اور پھر کسی بڑے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دے سکو گے، مشورہ نہایت صحیح تھا اس لیے عموماً سلیم الطبع طلبہ اس پر راضی ہی نہ ہوتے تھے، بلکہ

شکر گذار ہوتے تھے حضرت ممدوح مدرسہ کی سابق مالی امداد کے علاوہ دس پانچ روپے ماہانہ ان کی تنخواہ مقرر کر دیتے تھے، ان کو آرام سے نہ رکھا جاتا تھا بلکہ فی الواقع ہر قسم کے چھوٹے بڑے اسباق مختلف فنون کی کتابیں پڑھانے کے لیے حوالہ کی جاتی تھیں، اور یہ لوگ ان کو باحسن وجوہ پڑھانے پر مجبور ہوتے تھے، کیوں کہ نہ صرف پڑھنے والے طلبہ سے خفت اور سبکی زیر خیال ہوتی تھی، بلکہ اپنے معاصرین کی شماتت کا بھی اندیشہ ہوتا تھا، اور اس لیے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیتے تھے۔ اور بسا اوقات اپنے اساتذہ سے مراجعت کرتے اور دشوار مقامات کو حل کرتے تھے۔ اس صورت میں ان کا نفع تو ظاہر ہے کہ سالہا سال کی طلب علم میں نہ اس قدر محنت کی ہوگی جواب کرنے پڑی اور نہ اس قدر علوم حاصلہ و مکتسبہ میں زیادتی ہوگئی ہوگی جواب ہوئی، اور یہی وجہ تھی کہ ایسے طلبہ جب کسی مدرسہ میں فرائض و تدریس کی انجام دہی کے لیے منجانب دارالعلوم بھیجے جاتے تو وہ ایک لائق اور تجربہ کار مدرس ثابت ہوتے تھے اور مدارس میں ان کی شہرت ہوتی تھی، اس وقت بھی ایسے حضرات مدارس اسلامیہ کی صدارت اور خدمت اہتمام وغیرہ انجام دے رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسی کے مرہون منت ہیں، میں اس خوف سے کسی کا نام ظاہر نہیں کرتا ہوں کہ مبادا وہ اس کو اپنی توہین خیال کریں۔ دوسری جانب دارالعلوم دیوبند کا یہ نفع تھا کہ تھوڑی تھوڑی تنخواہ میں اس کو بیک وقت متعدد اصحاب درس حاصل ہوتے تھے اور بوڑھے بوڑھے پرانے مدرسوں جیسے کام کرتے تھے۔

معین المدرس کے ایک معنی اس کے سوا بھی ہوسکتے تھے جو شاید خیال میں نہ ہوں ان کو سمجھنے کے لیے حضرت میاں سید اصغر حسین صاحبؒ کی زبان سے واقعہ سنئے۔ فرماتے تھے کہ گجرات میں ایک مرتبہ معین المدرسین دارالعلوم دیوبند کا ذکر آیا تو ایک صاحب نے فرمایا کہ میاں صاحب! یہ لوگ جب اس درجہ کے تھے کہ جہاں حضرات مدرسین و اساتذہ سے کام نہ چلے وہاں یہ کام کریں اور کتاب کے جن جن مقامات کو مدرسین حل نہ کرسکیں ان کے حل کرنے میں یہ لوگ ان کی امداد کریں تو یہ حضرات مدرسین سے زیادہ عالم ہوتے ہوں گے۔ معین المدرسین کے یہ معنی کتنے ہی عجیب کیوں نہ ہوں مگر ان الفاظ میں ان معنی کی

گنجائش ہے اور میں اسی معنی میں حضرت علامہ سید محمد انور شاہ قدس سرہ کو معین المدرسین سمجھتا ہوں اور یہ ایک حیثیت ہے کہ شاید دوسرے حضرات کے خیال میں نہ ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی زیارت اول مرتبہ میں نے اس وقت کی جب کہ میں میرٹھ کے مدرسہ قومی میں حضرت مولانا عبدالمومن صاحب نوراللہ مرقدہ سے پڑھتا تھا۔ تاریخ اور سنہ تو یاد نہیں، یہ یاد ہے کہ جمعہ کا دن تھا اور دورۂ حدیث کی کتاب کا درس تھا کہ کسی نے آکر اثنائے سبق میں کہا کہ حضرت مولانا انور شاہ دہلی سے آگئے ہیں اور خندق کی مسجد میں جو کہ غیر مقلدین کا حصن حصین ہے بیٹھے ہوئے قرأۃ خلف الامام پر غیر مقلدین کے مجمع میں تقریر فرمارہے ہیں۔ یہ زمانہ تقلید وعدم تقلید کے مباحث پر جوش کا زمانہ تھا۔ صرف اشتہار بازی پمفلٹ بازی نہ ہوتی، بلکہ دست درازی بھی ہوتی تھی اور نوبت جہالت کی انتہا تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ حضرت الاستاذ گھبرا گئے اور کہا کہ کیسی بڑی غلطی کی، ہم لوگ مقامی ہیں ان کو اولاً ہم سے مشورہ کرنا تھا، جو کچھ ہم لوگوں کا مشورہ ہوتا اس پر عمل کرنا چاہئے تھا، ان کو کیا خبر کہ یہاں کیا ہوتا ہے اگر خدانخواستہ کوئی دوسری بات ہو تو ہم کو سب کی ذلت ہو۔ سبق پورا ہونے سے پہلے ختم ہو چکا تھا اور حضرت الاستاذ اس پر برہم تھے کہ خبر آئی کہ حضرت شاہ صاحب چار گھنٹہ تک تقریر فرما کر خاموش ہو گئے اور مولوی حمید اللہ صاحب غیر مقلدین کے راس رئیس جمعہ کی نماز کے بعد جواب دیں گے۔ حضرت الاستاذ نے الحمدللہ کہہ کر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے اس وقت تو اطمینان ہوا، اس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی شاید بیس برس کی عمر بھی نہ ہو، میں نے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اور اکیلا خندق کی مسجد میں پہنچ گیا زیادہ مجمع نہ تھا اور دو چار آدمی بیٹھے تھے مولانا حمید اللہ صاحب بھی تشریف فرماتے تھے کہ یکا یک کسی نے حضرت شاہ صاحب کی آمد کی خبر کی، مسجد سے باہر نکلا تو حضرت شاہ صاحب "اذا مشی یتکسفا کانما ینحط من صبب" کی شان سے آتے ہوئے نظر آئے آپ سب سے آگے تھے اور پیچھے کثیر مجمع تھا، میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، آپ نے تبسمانہ انداز میں مصافحہ کر کے سلام کا جواب دیا، میں بھی ساتھ ساتھ ہولیا۔

اس مناظرہ کا حال بیان کرنا میرا مقصد نہیں ہے مگر جب اس کا ذکر آ ہی گیا تو اس کو

ناتمام چھوڑنا بھی مناسب نہیں، حضرت شاہ صاحب مسجد میں تشریف فرما ہوئے، اور مولوی حمید اللہ صاحب مسجد کے حجرے میں رہے جو کہ ان کا کتب خانہ بھی تھا۔ بار بار بلانے پر تشریف لائے تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ لمبی لمبی تقریروں میں فائدہ کم ہے۔ اب میں اپنے مطالبہ کو مختصر کر کے کہتا ہوں کہ ایک ایک جملہ پر بحث ہو جاوے آپ سوال کریں میں جواب دوں، اور میں سوال کروں آپ جواب دیں اس سے ان حاضرین کو صحیح اندازہ ہو سکے گا، مولوی حمید اللہ صاحب خود چاہتے تھے کہ کچھ تاخیر ہو، فرمایا کہ اچھا میں کتابیں لے آؤں، حضرت شاہ صاحب نے منظور فرمالیا، حجرے میں گئے خدا جانے کہ کتابیں ملتی نہ تھیں یا فی الحقیقت ڈھونڈی یہ نہ گئی تھیں کہ یکا یک ہیڈ کانسٹبل مع دو کانسٹبلوں کے آ گیا اور اس نے کہا کہ کوتوال صاحب (اس زمانہ میں دیو بند کے ایک صاحب شیخ احمد نامی اس عہدے پر فائز تھے) نے حکم دیا ہے کہ چوں کہ نقض امن کا اندیشہ ہے، اس لیے مناظرہ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے، اس کے بعد اس نے کچھ نام بھی اپنی ڈائری میں شرکائے جلسہ کے لکھے ۔

تھی گرم کہ مجنوں کے اڑیں گے پرزے ❁ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اس کے بعد بھی متعدد مرتبہ میں نے جلسوں وغیرہ میں آپ کی زیارت کی۔

وہ وقت آیا کہ میں بچوں کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیو بند میں بلایا گیا۔ اعانت مدرسین کا نقشہ اس روز سے میرے سامنے ہے۔ بریلی، نگینہ، گلاؤٹھی وغیرہ اطراف کے حضرات مدرسین آتے تھے اور کتب درسیہ غیر درسیہ کے مشکل مشکل مواقع حضرت ممدوح سے حل کرتے تھے اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ حضرت ممدوح نے کتاب دیکھ کر تقریر کی ہو، جو کچھ فرماتے کتاب دیکھے بغیر اور برجستہ فرماتے تھے۔ میں دارالعلوم دیو بند کے مدرسین میں حل مشکلات کا زیادہ محتاج تھا اور اس لیے مجھ کو حاضری کی نوبت بہت زیادہ آتی تھی، آپ کبھی مطالعۂ کتب میں مصروف ہوتے تھے، کبھی آرام فرما ہوتے تھے، جس وقت میں پہنچتا تھا تو متوجہ ہو کر بات سنی اور جواب دیا۔ میں واپس ہو گیا اور آپ اپنے کام میں مشغول ہو گئے، چوں کہ دن اور رات کے اکثر اوقات میں میرے اسباق تھے۔ اور اسباق کا ناغہ میرے نزدیک بہت بڑا جرم تھا۔ اس لیے ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ بعد نماز صبح مجھ کو سبق پڑھانا ہے اور مطالعہ کتب میں کوئی اشکال پیش آیا تو میں نصف شب کے بعد حضرت ممدوح

کے حجرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، سخت سردی کا زمانہ تھا تھوڑی دیر بعد کے اندر سے روشنی ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ جاگ رہے ہیں، میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی، گھبرا کر فوراً کواڑ کھول دیئے اور حیرت سے پوچھا کہ کیا ہے؟ میں نے کتاب سامنے رکھی اور اشکال کا جواب لیا اور واپس ہو گیا۔ اس ساری تگ و دو میں نے کبھی چہرے پر کبیدگی کا اثر نہ دیکھا۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ کسی وقت کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں یا کسی اور ذاتی کام میں مصروف ہوتا ہوں اور کوئی دوسرے صاحب آ جاتے ہیں اور ضروری یا غیر ضروری بات شروع کر دیتے ہیں تو چوں کہ ذہن میں سارا اجمع کردہ مواد ضائع ہو جاتا ہے اس لیے سخت افسوس ہوتا ہے، مگر حضرت ممدوح پر اس کا اثر کبھی نہ دیکھا۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب ؒ خود بھی فن ہیئت کے اچھے ماہر تھے، ایک قلمی رسالہ اس فن کا ان کو ملا۔ حضرت شاہ صاحب سے اس کو سبقاً سبقاً ان کے کمرے پر جا کر پڑھا، ساتھ ساتھ میں بھی چلا جاتا تھا۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب ؒ نے تھوڑی سی عبارت پڑھ کر کتاب بند کر دی اور حضرت ممدوح نے اس کے متعلق تقریر شروع کر دی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ تک تقریر کی سبق ختم ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب اور ان کے معاصرین بلکہ دارالعلوم دیوبند کے مدرسین بھی مدحاً حضرت ممدوح کو کتب خانہ کہا کرتے تھے اور فی الحقیقت یہ لقب غیر موزوں نہ تھا۔ وہ کتابوں کے حوالے زبانی اس طور پر دیتے تھے کہ گویا ان کے سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے۔

فقہ کی بعض کتابوں پر میں حاشیہ لکھ رہا تھا، اس میں متعدد جگہ ''کاکی'' کے نام سے عبارت نقل کرنے کی نوبت آئی، حاشیہ مکمل ہو چکا، تو فہرست میں یہ ظاہر کرنے کا ارادہ کیا کہ کن کن کتابوں سے عبارتیں لی گئی ہیں اور چند اصحاب کے نام لکھ دیئے مگر یہ معلوم نہ کر سکا کہ ''کاکی'' کون ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔ حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا تو فوراً نام بتا دیا۔ میں نے بغیر کسی تحقیق کے وہی لکھ دیا۔ مختصر یہ ہے کہ حضرت ممدوح کی زندگی میں اشاعت علوم کا فیض صرف طلبہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ آسمانِ علم کے بڑے بڑے درخشاں ستارے بھی اس سے مستفید ہوتے تھے۔

کیسی کیسی صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں ❁ کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں

قادیانی فتنہ اور
حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

از: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ

باز گواز نجد واز یارانِ نجد ۞ تا در و دیوار را آری بوجد
کز برائے صحبتِ حق سالہا ۞ باز گو رمزے ازاں خوش حالہا

امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی امتیازی فضیلت ہے کہ پوری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی اور امت میں تا قیامت ایک ایسی جماعت قائم رہنے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر دی ہے جو دین حق کی اصلی ہیئت پر قائم رہ کر اس کے اندر پیدا ہونے والے رخنوں کی اصلاح کرتی رہے گی۔ اس کو اللہ کی راہ میں نہ کسی کا خوف مانع ہوگا نہ طمع۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان اللّٰہ لیغرس لھٰذا الدین غرساً

اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت کے لیے پودے لگاتا رہیگا۔

یہ ضروری نہیں کہ اس جماعت کے افراد سب کسی ایک ہی جگہ یا کسی ایک بستی یا ایک ملک میں ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس جماعت کے افراد کو ہر زمانہ اور خطہ میں پیدا فرماتے رہتے ہیں۔

ان کی خصوصی علامت یہ ہوتی ہے کہ دین کے فروغ اور اس میں پیدا شدہ رخنوں کی اصلاح، عام مسلمانوں کی خیر خواہی، ان کو دین کے صحیح راستہ پر چلانے کا داعیہ ان کے قلوب میں ایسا رچا ہوا ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ان کے حوائج ضروریہ انسانیہ کا درجہ لے لیتا ہے۔ ان مقاصد میں کسی جانب سے خلل آتا ہے تو انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا گھر جل گیا۔ ہم لٹ گئے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر ۞ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خدمت خلق اور اصلاح خلق ان کے لیے طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزاروں شکر ہے کہ اس نے جن بزرگوں کی صحبت کا شرف عطا فرمایا، ان میں کافی تعداد ایسے حضرات کی تھی جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آئے۔ جن کی زندگی کو دیکھنے والا بے تأمل یہ کہہ اٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دین کی اور مسلمانوں کی خدمت ہی کے لیے چن لیا ہے۔

انا اخلصناهم بخالصة ذكرى الدار.

ہم نے ان کو ایک خاص کام کے لیے مخصوص کرلیا ہے یعنی ذکر وفکر آخرت کے لئے۔

انہی مقدس بزرگوں میں سے میرے استاذ محترم استاذ الاساتذہ بحر العلوم والفنون ذہبیٔ زمانہ، رازیٔ وقت حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی ذات گرامی ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اس ناکارہ کو آپ کی خدمت وصحبت میں رہنے اور بقدر ظرف استفادہ کرنے کے لیے تقریباً بیس سال کی طویل مدّت عطا فرمائی۔ آپ کے پورے فضائل وکمالات کو تو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو علم کا حظّ وافر حاصل ہے۔ یہ ناکارہ اپنی کم ہمتی اور کم حوصلگی کی بناء پر اس درجہ سے محروم رہا۔ ؎

ماندا ریم مشامے کہ تو انست شنید ❁ ورنہ ہر دم وزد از گلشن وصلت نفحات

مگر اس پر بھی جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا اس کو ضبط بیان میں لانا آسان نہیں خصوصاً اس وقت کہ ہجوم مشاغل وذواہل نے دل ودماغ کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ❁ بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

مگر صاحب زادۂ محترم ومخدوم بن المخدوم مولوی سیّد محمد از ہر شاہ صاحب قیصرؔ سلمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ممدوح کے کچھ حالات طیبہ اردو (۱) میں لکھنے کا سلسلہ شروع فرمایا تو احقر سے فرمائش کی کہ قادیانی فتنہ کے استیصال میں حضرت ممدوح کی مساعیٔ جمیلہ سے متعلق میں اپنی معلومات کو ضبط کر کے پیش کروں۔ اول تو مسئلہ خود اہم تھا پھر صاحب زادۂ محترم کی تعمیل حکم بڑی سعادت تھی اس لیے کچھ وقت نکال کر اپنی ناتمام معلومات کا ایک

(۱) عربی میں اس سے پہلے آپ کا تذکرہ بنام نفحۃ العنبر شائع ہو چکا ہے ۱۲ محمد شفیع۔

حصّہ آپ کی زندگی کے ایک مختصر گوشہ پر اپنی یادداشت کے مطابق پیش کرتا ہوں۔

فتنۂ مرزائیت کی شدت اور اسکے بعض اسباب

تقریباً ۱۳۴۰ھ کا واقعہ ہے کہ فتنۂ قادیانیت پورے ہندوستان کے اطراف و جوانب میں خصوصاً پنجاب میں ایک طوفانی صورت سے اٹھا۔ اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ ۱۹۱۹ء کی جنگ عظیم میں قادیانی مسیح کی امت نے مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں (انگریزوں) کو کافی مدد بہم پہنچائی جس کا اعتراف خود قادیانیوں نے اپنے اخبارات میں کیا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب بغداد سات سو سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر انگریزوں کے تسلّط میں داخل ہوا تو جہاں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری امت ان کے رنج وغم میں مبتلا تھی وہیں قادیانی مرزا کی امت قادیان میں چراغاں کر رہی تھی (الفضل قادیان)۔

اس جنگ عظیم میں امداد دینے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں انگریزوں کو کامیاب بنانے کے صلہ میں انگریزوں کی حمایت (بقول مرزا صاحب) اپنے اس خود کاشتہ پودے کو زیادہ حاصل ہوگئی۔ اور اس کا یہ حوصلہ ہوگیا کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے مقابلہ میں آجائے اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی اسباب ہوں۔

یہ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں میرے درس وتدریس کا ابتدائی دور تھا۔ اور میں اس بسم اللہ کے گنبد میں اپنی کتاب اور سبق پڑھانے کے سوا کچھ نہ جانتا تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

لیکن ہمارے بزرگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے فروغ اور اسلام کی خدمت ہی کے لیے پیدا فرمایا تھا قادیانیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے سخت تشویش واضطراب محسوس فرمارہے تھے اور تبلیغ واشاعت کے ذریعہ اس کے مقابلے کی فکر کر رہے تھے۔ بالخصوص حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ پر اس فتنہ کا بہت اثر تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلے کے لیے ان کو چن لیا ہے۔ جیسا کہ ہر زمانہ میں عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ ہر فتنہ کے مقابلے کے لیے اس وقت کے علمائے دین میں سے کسی کو منتخب کرلیا گیا اور اس کے قلب میں اس کی اہمیت ڈال دی گئی۔ فتنۂ قادیانیت کے استیصال میں

حضرت ممدوح کی شبانہ روز جد جہد اور فکر و عمل سے ہر دیکھنے والے کو یقین ہو جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لیے آپ کو چن لیا ہے۔

مصر و عراق وغیرہ ممالک اسلامیہ میں فتنۂ قادیانیت کا انسداد

میں حسب عادت ایک روز استاذِ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی دائمی عادت کے خلاف یہ دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی کتاب زیر مطالعہ نہیں خالی بیٹھے ہوئے ہیں اور چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیسا مزاج ہے؟ فرمایا کہ بھائی مزاج کو کیا پوچھتے ہو، قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب امنڈتا چلا آتا ہے۔ صرف ہندوستان میں نہیں عراق و بغداد میں ان کا فتنہ سخت ہوتا جاتا ہے اور ہمارے علماء و عوام کو اس طرف توجہ نہیں۔ ہم نے اس کے مقابلے کے لیے جمعیۃ علماء ہند میں یہ تجویز پاس کرائی تھی کہ دس رسالے مختلف موضوعات متعلقہ قادیانیت پر عربی زبان میں لکھے جائیں اور ان کو طبع کرا کر ان بلاد اسلامیہ میں بھیجا جائے مگر اب کوئی کام کرنے والا نہیں ملتا۔ اس کام کی اہمیت لوگوں کے خیال میں نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اپنی استعداد پر تو بھروسہ نہیں۔ لیکن حکم ہو تو کچھ لکھ کر پیش کروں۔ ملاحظہ کے بعد کچھ مفید معلوم ہو تو شائع کیا جائے ورنہ بےکار ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

ارشاد ہوا کہ مسئلہ ختم نبوت پر لکھو۔ احقر نے استاذ محترم کی تعمیل ارشاد کو سرمایۂ سعادت سمجھ کر چند روز میں تقریباً ایک سو صفحات کا ایک رسالہ عربی زبان میں لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح رسالہ دیکھتے جاتے تھے اور بار بار دعائیہ کلمات زبان پر تھے۔ مجھے کوئی تصور نہ تھا کہ اس ناچیز خدمت کی اتنی قدر افزائی کی جائے گی پھر خود حضرت ممدوح نے اس رسالہ کا نام "ھدایۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین" تجویز فرما کر اس کے آخر میں ایک صفحہ بطور تقریظ تحریر فرمایا۔ اور اپنے اہتمام سے اس کو طبع کرایا۔ مصر، شام، عراق، مختلف مقامات پر اس کے نسخے روانہ کئے۔

خاص قادیان میں پہنچ کر اعلانِ حق اور ردّ مرزائیت

اسی زمانہ میں حضرت ممدوح کے ایماء پر امرتسر و پٹیالہ ولدھیانہ کے چند علماء نے یہ

تجویز کیا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لیے خاص قادیان میں ایک تبلیغی جلسہ سالانہ منعقد کیا جائے تا کہ قضیۂ زمین برسرِ زمین طے ہو سکے۔ یہ عوام کو فریب میں ڈالنے والے مناظرے اور مباہلے کے چیلنج جو اکثر اس فرقہ کی طرف سے چھپتے رہتے ہیں ان کی حقیقت لوگوں پر واضح ہو جائے۔ چنانچہ چند سال مسلسل یہ جلسے قادیان میں ہوتے تھے اور حضرت ممدوح بذاتِ خود ایک جماعت علمائے دیوبند کے ساتھ اس میں شرکت فرماتے تھے۔ احقر ناکارہ بھی اکثر ان میں حاضر رہا ہے۔

قادیانی گروہ نے اپنے آقاؤں (انگریزوں) کے ذریعہ ہر طرح اس کی کوشش کی کہ یہ جلسے قادیان میں نہ ہو سکیں۔ لیکن کوئی قانونی وجہ نہ تھی جس سے جلسے روک دیئے جاویں کیوں کہ ان جلسوں میں عالمانہ بیانات تہذیب و متانت کے ساتھ ہوتے اور کسی نقضِ امن کے خطرہ کو موقع نہ دیتے تھے۔ جب قادیانی گروہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو خود تشدد پر اتر آیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ اور ان کے رفقاء کو قادیان جانے سے پہلے اکثر ایسے خطوط گمنام ملا کرتے تھے کہ اگر قادیان میں قدم رکھا تو زندہ واپس نہ جا سکو گے۔ اور یہ صرف دھمکی ہی نہ تھی بلکہ عملاً بھی اکثر اس قسم کے حرکتیں ہوتی تھیں کہ باہر سے جانے والے علماء و مسلمانوں پر حملے کیے جاتے تھے ایک مرتبہ آگ بھی لگائی گئی۔

لیکن حق کا چراغ کبھی پھونکوں سے بجھایا نہیں گیا اس وقت بھی ان کے اخلاق سوز حملے مسلمانوں کو ان جلسوں سے نہ روک سکے۔

تردیدِ مرزائیت میں تصانیف کا سلسلہ

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم چند خدام جلسۂ قادیان میں حضرت ممدوح کے ساتھ حاضر تھے۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے مخصوص تلامذہ حاضرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ زمانہ کو الحاد کے فتنوں نے گھیر لیا اور قادیانی دجال کا فتنہ ان سب میں زیادہ شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی عمر و توانائی کا بڑا حصہ اور درس حدیث کا اہم موضوع حنفیت و شافعیت کو بنائے رکھا۔ ملحدین

زمانہ کے وساوس کی طرف توجہ نہ دی۔ حالانکہ ان کا فتنہ مسئلہ حنفیت وشافعیت سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ اب قادیانی فتنہ کی شدّت نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا تو میں نے اس کے متعلقہ مسائل کا کچھ مواد جمع کیا ہے اگر اس کو میں خود تصنیف کی صورت سے مدون کروں تو میرا طرز ایک خالص علمی اصلاحی رنگ کا ہے اور زمانہ قحط الرجال کا ہے اس قسم کی تحریر کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا فائدہ بھی بہت محدود رہ جاتا ہے۔ میں نے مسئلہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام پر ایک جامع رسالہ ,,فصل الخطاب،، بزبان عربی تحریر کیا۔ اہل علم اور طلباء میں عموماً مفت تقسیم کیا۔ لیکن اکثر لوگوں کو یہی شکایت کرتے سنا کہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے اگر آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو یہ مواد میں آپ کو دیدوں۔ اس وقت حاضرین میں چار آدمی تھے۔ احقر ناکارہ اور حضرت مولانا سیّد مرتضیٰ حسن صاحبؒ سابق ناظم شعبہ تعلیم وتبلیغ دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا بدر عالم صاحب سابق مدرس دار العلوم دیوبند وجامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت ودار العلوم ٹنڈو الہیار سندھ وحال مہاجر مدینہ طیبہ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سابق مدرس دار العلوم دیوبند وشیخ الجامعہ بھاولپور وحال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ادام اللہ تعالیٰ فیوضھم۔ ہم چاروں نے عرض کیا کہ جو حکم ہو ہم امتثالِ امر کو سعادتِ کبریٰ سمجھتے ہیں۔

اسی وقت فرمایا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لیے علمی طور پر تین کام کرنے ہیں۔ اول مسئلہ ختم نبوت پر ایک محققانہ مکمل تصنیف جس میں مرزائیوں کے شبہات واوہام کا ازالہ بھی ہو۔

دوسرے حیاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کی مکمل تحقیق قرآن وحدیث اور آثارِ سلف سے مع ازالہ شبہاتِ ملحدین۔

تیسرے خود مرزا کی زندگی، اس کے گرے ہوئے اخلاق اور متعارض ومتہافت اقوال اور انبیاء واولیاء وعلماء کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں، اس کا دعویٰ نبوت ووحی اور متضاد قسم کے دعوے۔ ان سب چیزوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کرنا جس سے مسلمانوں کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو۔ اور اصل یہ ہے کہ اس فتنہ کی مدافعت کے لیے یہی چیز اہم اور کافی ہے۔ مگر چونکہ مرزائیوں نے

مسلمانوں کو فریب میں ڈالنے کے لیے خواہ مخواہ کچھ علمی مسائل میں عوام کو الجھا دیا ہے اس لیے ان سے بھی اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ پھر فرمایا کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق تو یہ صاحب (احقر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) ایک جامع رسالہ عربی زبان میں لکھ چکے ہیں اور اردو میں لکھ رہے ہیں اور آخر الذکر معاملہ کے متعلق مواد فراہم کر کے مدون کرنے کا سب سے بہتر کام حضرت مولانا سیّد مرتضیٰ حسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کر سکیں گے کہ اس معاملہ میں ان کی معلومات بھی کافی ہیں اور مرزائی کتابوں کا پورا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہے وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے کر جلد پورا کریں۔

اب مسئلہ رفع و حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام رہ جاتا ہے اس کے متعلق میرے پاس کافی مواد جمع ہے۔ آپ تینوں صاحب دیوبند پہنچ کر مجھ سے لے لیں اور اپنے اپنے طرز پر لکھیں۔

یہ مجلس ختم ہو گئی مگر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے قلبی تاثرات اپنا ایک گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گئے۔ دیوبند واپس آتے ہی ہم تینوں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلہ حیات عیسیٰ سے متعلقہ مواد حاصل کیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب مدظلہ نے آیت **انی متوفیک ورافعک الی** کی تفسیر سے متعلقہ مواد لے کر اس پر ایک مستقل رسالہ اردو میں بنام **الجواب الفصیح لمنکر حیات المسیح** تحریر فرمایا جو علمی رنگ میں لاجواب سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے پسند فرما کر اس پر تقریظ تحریر فرمائی۔ یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں شعبۂ تبلیغ دار العلوم دیوبند سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اسی مسئلہ پر اردو زبان میں ایک جامع اور محققانہ رسالہ بنام **کلمۃ السر فی حیوۃ روح السر** تصنیف فرما کر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح نے بے حد پسند فرما کر تقریظ تحریر فرمائی اور ۱۳۴۲ھ میں دار العلوم دیوبند سے شائع ہو کر مقبول مفید خلائق ہوا۔

احقر ناکارہ کے متعلق یہ خدمت کی گئی کہ جتنی مستند و معتبر روایات حدیث حضرت عیسیٰ کی حیات یا نزول فی آخر الزمان کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان سب کو ایک رسالہ میں جمع کر

دے۔ احقر نے تعمیل حکم کے لیے رسالہ **التصریح بماتواتر فی نزول المسیح** بزبان عربی لکھا اور حضرت ممدوح کی بے حد پسندیدگی کے بعد اسی سال شائع ہوا۔

اس کے بعد حسب ارشاد ممدوح مسئلہ ختم نبوت پر ایک مستقل کتاب اردو زبان میں تین حصوں میں لکھی:۔

پہلا حصہ **ختم النبوۃ فی القرآن** جس میں ایک سو آیات قرآنی سے اس مسئلہ کا مکمل ثبوت اور ملحدوں کے شبہات کا جواب لکھا گیا ہے۔

دوسرا **ختم النبوۃ فی الحدیث** جس میں دو سو دس احادیث معتبرہ سے اس مضمون کا ثبوت اور منکرین کا جواب پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا **ختم النبوۃ فی الآثار** جس میں سیکڑوں اقوال صحابہ و تابعین اور ائمہ دین سے اس کے ثبوت اور منکرین اور ان کی تاویلات باطلہ پر رد کے متعلق نہایت صاف وصریح نقل کیے گئے ہیں یہ تینوں رسالے پہلی مرتبہ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک شائع ہوئے۔ اسی کے ساتھ مختصر رسالہ دعاوی مرزا اور مسیح موعود کی پہچان اردو زبان میں احقر نے لکھ کر پیش کیے۔ ان رسائل کا جو کچھ نفع مسلمانوں کی اصلاح وہدایت اور ملحدین منکرین پر اتمام حجت کے سلسلہ میں ہوا یا ہوگا اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے مجھے تو اپنی محنت کا نقد صلہ حضرت شاہ صاحبؒ کی مسرت وخوشنودی اور بے شمار دعاؤں سے اسی وقت مل گیا اور جوں جوں ان رسائل کی اشاعت سے مسلمانوں کی ہدایت بلکہ بہت سے قادیانی خاندانوں کی توبہ ورجوع الی الاسلام کے متعلق حضرت کو معلوم ہوئے اسی طرح اظہار مسرت اور دعا کے انعامات ملتے رہے۔

مخدومنا حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ جو عمر اور طبقہ کے اعتبار سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے مقدم تھے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے محیر العقول علم کے بے حد معتقد اور آپ کے ساتھ معاملہ بزرگوں کا سا کرتے تھے جو خدمت اس سلسلہ کی ان کے سپرد فرمائی تھی اس کو آپ نے بڑی سعی بلیغ کے ساتھ انجام دینا شروع کیا اور مرزا قادیانی کی پوری زندگی، اس کے اخلاق واعمال اور عقائد وخیالات، دعوائے نبوت ورسالت اور تکفیر عام اہل اسلام، گستاخی در شان انبیاء واولیاء کو مرزا کی اپنی کتابوں سے

بحوالہ صفحہ سطر نہایت انصاف اور احتیاط کے ساتھ نقل کر کے بہت سے رسائل تصنیف فرمائے اور حضرت شاہ قدس سرہٗ کے سامنے پیش فرما کر ان کی مراد پوری فرمائی۔ ان رسائل میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:۔

قادیان میں قیامت خیز بھونچال۔ اشد العذاب علی مسیلمۃ الپنجاب۔ فتح قادیان مرزائیوں کی تمام جماعتوں کو چیلنج۔ مرزائیت کا خاتمہ۔ مرزائیت کا جنازہ بے گور وکفن۔ ہندوستان کے تمام مرزائیوں کو چیلنج۔ مرزا اور مرزائیوں کو دربارِ نبوت سے چیلنج۔ یہ سب رسائل ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۴۴ھ تک شائع ہوئے۔

فیروز پور پنجاب میں تاریخی مناظرہ

اسی زمانہ میں چھاؤنی فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں کا ایک خاصا جتھا جمع ہوگیا تھا۔ یہ لوگ وہاں کے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور اپنے دستور کے موافق عوام مسلمانوں کو مناظرہ ومباحثہ کا یہ چیلنج کیا کرتے اور جب کسی عالم سے مقابلہ کی نوبت آتی تو راہِ گریز اختیار کرتے۔ اسی زمانہ میں ضلع سہارنپور کے رہنے والے کچھ مسلمان جو فیروز پور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے ان لوگوں نے روز روز کی جھک جھک کو ختم کرنے کے لیے خود قادیانیوں کو دعوتِ مناظرہ دیدی۔

قادیانیوں نے سادہ لوح عوام سے معاملہ دیکھ کر بڑی دلیری اور چالاکی کے ساتھ دعوتِ مناظرہ قبول کر کے بجائے اس کے کہ مناظرہ کرنے والے علماء سے شرائط مناظرہ طے کرتے انھیں عوام سے ایسی شرائط مناظرہ پر دستخط لے لیے جن کی رو سے فتح بہر حال قادیانی گروہ کی ہو۔ اور اہل اسلام کو مقررہ شرائط کی پابندی کی وجہ سے ہر قدم پر مشکلات درپیش ہوں۔

ان عوام مسلمین نے مناظرہ اور شرائط طے کرنے کے بعد دار العلوم دیوبند سے چند علماء کو دعوت دی جو قادیانیوں سے مناظرہ کریں۔

مہتمم دار العلوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے سے اس کام کے لیے حضرت مولانا سید مرتضٰی حسن

صاحبؒ ۔حضرت مولانا بدر عالم صاحب ۔حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور احقر تجویز ہوئے ۔ادھر قادیانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ہم نے اپنی من مانی شرائط میں مسلم مناظرین کو جکڑ لیا ہے اپنی قوت محسوس کی اور قادیان کی پوری طاقت فیروز پور میں لا ڈالی ۔ان کے سب سے بڑے عالم اس وقت سرور شاہ کشمیری اور سب سے بڑے مناظر حافظ روشن علی اور عبدالرحمٰن مصری وغیرہ تھے یہ سب اس مناظرہ کے لیے فیروز پور پہنچ گئے ۔

ہم چار افراد حسب الحکم دیوبند سے فیروز پور پہنچے تو یہاں پہنچ کر چھپا ہوا پروگرام مناظرہ اور شرائط مناظرہ کا نظر سے گذرا ۔شرائط مناظرہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان میں ہر حیثیت سے قادیانی گروہ کے لیے آسانیاں اور اہل اسلام کے لیے ہر طرح کی بیجا پابندیاں عوام نے اپنی ناواقفیت کی بناء پر تسلیم کی ہوئی ہیں ۔اب ہمارے لیے دو ہی راستے تھے کہ یا ان مسلمہ فریقین شرائط مناظرہ کے ماتحت مناظرہ کریں جو ہر حیثیت سے ہمارے لیے مضر تھیں یا پھر مناظرہ سے انکار کر دیں کہ ہم ان شرائط کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے جو بغیر ہماری شرکت کے طے کر لی گئی ہیں ۔لیکن دوسری شق پر مقامی مسلمانوں کی بڑی خفت اور سبکی تھی اور قادیانیوں کو اس پروپیگنڈے کا موقع ملتا کہ علماء نے مناظرہ سے فرار کیا اس لیے ہم سب نے مشورہ کر کے مناظرہ کرنے کا تو فیصلہ کر لیا اور بذریعہ تار صورت حال کی اطلاع حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو دے دی ۔

اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا ۔ابھی شروع ہی تھا ،عین مجلس مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما مع چند دیگر علماء کے تشریف لا رہے ہیں ۔ان کی آمد پر ہم نے کچھ دیر کے لیے مجلس مناظرہ ملتوی کی اور ان حضرات کو صورت حال بتلائی ۔حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جایئے ان لوگوں سے کہد یجئے کہ تم نے جتنی شرطیں اپنی پسند کے موافق عوام سے طے کرالی ہیں اتنی ہی اور لگا لو ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں ۔تم چوروں کی طرح عام ناواقف مسلمانوں کے دین وایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے عادی ہو ۔کسی شرط اور کسی طریق پر ایک مرتبہ سامنے آکر اپنے دلائل بیان کرو اور ہمارا جواب سنو ،پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو ۔

حضرتؒ کے ارشاد کے موافق اسی کا اعلان کر دیا گیا۔ اور مناظرہ جاری ہوا۔ ان اکابر کو مناظرہ کے لیے پیش کرنا ہماری غیرت کے خلاف تھا۔ اس لیے پہلے دن مناظرہ مسئلہ ختم نبوت پر احقر نے کیا۔ دوسرے تیسرے دن حضرت مولانا بدر عالم اور مولانا محمد ادریس صاحب نے دوسرے مسائل پر مناظرہ کیا۔

یوں تو مناظرہ کے بعد ہر فریق اپنی اپنی کہا ہی کرتا ہے، لیکن اس مناظرہ میں چونکہ عموماً تعلیم یافتہ طبقہ شریک تھا اس لیے کسی فریق کو دھاندلی کا موقع نہ تھا۔ پھر اس مناظرہ کا کیا اثر ہوا۔ اس کا جواب فیروز پور کے ہر گلی کوچہ سے دریافت کیا جا سکتا تھا کہ قادیانی گروہ کو کس قدر رسوا ہو کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خود اس گروہ کے تعلیم یافتہ و سنجیدہ طبقہ نے اس کا اقرار کیا کہ قادیانی گروہ اپنے کسی دعوے کو ثابت نہیں کر سکا اور اس کے خلاف دوسرے فریق نے جو بات کہی قوی دلیل کے ساتھ کہی۔

مناظرہ کے بعد شہر میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما کی تقریریں قادیانی مسئلہ کے متعلق ہوئیں۔ یہ تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے اس مناظرہ اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا دورۂ پنجاب

۱۳۴۳ھ میں جب کہ حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی کوشش سے بذریعہ تصنیف و تحریر قادیانی دجل و فریب کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا گیا اور قادیانیت سے متعلق ہر مسئلہ پر مختلف طرز و انداز کے بیسیوں رسائل شائع ہو چکے تو آپ نے اس کی بھی ضرورت محسوس فرمائی کہ ناخواندہ عوام کا طبقہ جو زیادہ کتابیں نہیں پڑھتا اور قادیانی مبلغین چل پھر کر ان میں اپنا دجل پھیلاتے ہیں اور مناظرہ و مباہلہ کے جھوٹے چیلنج ان کو دکھاتے پھرتے ہیں ان لوگوں کی حفاظت کے لیے پنجاب کے مختلف شہروں کا ایک تبلیغی دورہ کیا جائے۔

پنجاب و سرحد کے دورہ کا پروگرام بنا۔ علمائے دیوبند کی ایک جماعت ہمرکاب

ہوئی۔ اس جماعت میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ اکابرین میں سے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ شریک تھے۔ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا بدر عالم صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی اور احقر ناکارہ شامل تھے۔ یہ علم کے پہاڑ اور تقوے کے پیکر پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہنچے اور مرزائیت کے متعلق اعلانِ حق کیا۔ منکرین کو رفع شبہات کی دعوت دی۔ لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ ہزارہ کھوٹہ وغیرہ میں ان حضرات کی بصیرت افروز عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ مرزائی دجال جو آئے دن مناظرہ ومباہلہ کے چیلنج عوام کو دکھانے کے لیے پھرا کرتے تھے ان میں سے ایک سامنے نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہان میں نہیں ہیں۔

اس پورے سفر میں عام مسلمانوں نے جاء الحق وزھق الباطل کا منظر گویا آنکھوں سے دیکھ لیا۔

بھاولپور کا معرکۃ الآراء تاریخی مقدمہ

حضرت شاہ صاحب اور دیگر اکابر علماء کے بیانات، مرزائیوں کے مرتد ہونے کا فیصلہ:

۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ ریاست بھاولپور کی ایک مسلمان عورت کا دعویٰ اپنے شوہر کے مرزائی ہو جانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہونے کے متعلق بھاولپور کی عدالت میں دائر ہوا۔ اور سات سال تک یہ مقدمہ بھاولپور کی ادنیٰ اعلیٰ عدالتوں میں دائر رہتے ہوئے آخر میں دربار مغلی بھاولپور میں پہنچا۔ ۱۹۳۲ء میں دربار مغلی نے پھر عدالت میں یہ لکھ کر واپس کیا کہ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق وتنقیح کرنا ضروری ہے۔ دونوں فریق کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کی شہادتیں پیش کریں اور دونوں طرف کے مکمل بیانات سننے کے بعد اس مسئلہ کا کوئی آخری فیصلہ کیا جائے۔

اب مدعیٰ علیہ مرزائی نے اپنی حمایت کے لیے قادیان کی طرف رجوع کیا۔ قادیان کا

بیت المال اور اس کے رجال کار مقدمہ کی پیروی کے لیے وقف ہو گئے۔ ادھر مدعیہ بیچاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی نہایت کس مپرسی میں وقت گذار رہی تھی۔ اس کی قدرت سے قطعاً خارج تھا کہ ملک کے مشاہیر علماء کو جمع کر کے اپنی شہادت میں پیش کر سکے یا اس مقدمہ کی پیروی کر سکے۔ مگر الحمد للہ بھاولپور کے غیور مسلمانوں کی انجمن مؤید الاسلام نے زیر سرپرستی حضرت مولانا محمد حسین صاحب شیخ الجامعہ بھاولپور اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا۔ اور ملک کے مشاہیر علماء کو خطوط لکھ کر اس مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لیے طلب کیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور کچھ عرصہ سے علالت کے سبب رخصت پر دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ طولِ علالت سے نقاہت بے حد ہو چکی تھی۔

لیکن جس وقت یہ معاملہ آپ کے سامنے آیا تو مسئلہ کی نزاکت اور ہیئت کے قوی احساس نے آپ کو اس کے لیے مجبور کر دیا کہ اپنی صحت اور دوسری ضرورتوں کا خیال کیے بغیر وہ بھاولپور کا سفر کریں۔

آپ نے نہ صرف اپنے آپ کو شہادت کے لیے پیش فرمایا بلکہ ملک کے دوسرے علماء کو بھی ترغیب دے کر شہادت کے لیے جمع فرمایا۔

یہ واقعہ تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ہے جب کہ احقر ناکارہ بحیثیت مفتی دار العلوم دیوبند فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

انجمن مؤید الاسلام بھاولپور کی دعوت کے علاوہ استاذِ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا ایماء بھی میری حاضری کے متعلق معلوم ہوا۔ احقر نے حاضری کا قصد کر لیا۔

لیکن حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو جو خداداد شغف دینی ضرورتوں کے ساتھ تھا اور آپ کو بے چین کیے رکھتا تھا اس کی وجہ سے آپ نے تاریخ مقدمہ سے کافی روز پہلے بھاولپور پہنچ کر اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دینے کا فیصلہ فرما کر سب بیانات کے اختتام تک تقریباً بیس پچیس روز بھاولپور میں قیام فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا پرشوکت عالمانہ بیان جو کمرۂ عدالت میں ہوا اس کی اصل

کیفیت تو صرف انھی لوگوں کے دل سے پوچھیے جنھوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس وقت کمرۂ عدالت دارالعلوم دیوبند کا دارالحدیث نظر آتا تھا۔ عدالت اور حاضرین پر ایک سکتہ کا عالم تھا۔ علومِ ربانی کے حقائق و معارف کا دریا تھا جو اُمڈا چلا جاتا تھا۔

تین روز مسلسل بیان ہوا۔ تقریباً ساٹھ صفحات پر قلم بند ہوا۔ یہ بیان اور دوسرے حضرات کے بیانات جو ایک مستقل جلد میں طبع ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ردّ مرزائیت کے لیے بلکہ اسلام و ایمان اور کفر و ارتداد کی پوری حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک نادر مجموعہ ہیں۔

اس مقدمہ میں کیا ہوا؟ اس کی پوری تفصیل تو اس مفصّل فیصلہ سے معلوم ہو سکتی ہے جو عدالت کی طرف سے ۷/فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۳/ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ کو دیا گیا۔ اور جو اسی وقت بزبان اردو ایک سو باون صفحات پر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام حضرت مولانا محمد صادق صاحب استاد جامعہ عباسیہ بھاولپور و حال ناظم امور مذہبیہ بھاولپور کے دست مبارک سے ہوا۔ اس مقدمہ کی پیروی، علماء کے اجتماع، ان کی ضروریات کا انتظام بھی مولانا موصوف ہی کے ہاتھوں انجام پایا تھا اور مولانا سے میرا پہلا تعلق اسی سلسلہ میں پیدا ہوا۔ آپ نے اس فیصلہ کے شروع میں ایک مختصر تمہید لکھی ہے۔ اس کے چند جملے نقل کر دینے سے کسی قدر حقیقت پر روشنی پڑ سکتی ہے، وہ یہ ہیں:۔

مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، حضرت مولانا محمد نجم الدین صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور و مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لیے جذب مقناطیسی کا کام کیا۔ اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔ حضرات علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دیئے اور فرقۂ ضالہ مرزائیہ کا کفر و ارتداد روزِ روشن کی طرح ظاہر کر دیا اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت مسکت جواب دیئے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ نے ایمان، کفر، نفاق، زندقہ، ارتداد، ختم

نبوت، اجماع، تواتر، متواترات کے اقسام، وحی، کشف اور الہام کی تعریفات اور ایسے اصول وقواعد بیان فرمائے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علی وجہ البصیرت بطلان مرزائیت کا یقین کامل حاصل کرسکتا ہے۔ پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروکار اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل وتزویر کو آشکارا کرنے کے لیے شہرۂ آفاق مناظر، حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب نعمانی شاہ جہانپوری تشریف لائے۔ مولانا موصوف مختار مدعیہ ہوکر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروکاری فرماتے رہے۔ فریق ثانی کی شہادت پر ایسی باطل شکن جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل وفریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے فرقۂ مرزائیہ ضالہ کا ارتداد آشکار عالم کردیا۔

فریقین کی شہادت ختم ہونے کے بعد مولانا موصوف نے مقدمہ پر بحث پیش کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا۔ کامل دوسال کی تحقیق وتنقیح کے بعد عالی جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر نے اس تاریخی مقدمہ کا بصیرت افروز فیصلہ ۷/فروری ۱۹۳۵ء بحق مدعیہ سنایا۔ یہ فیصلہ اپنی جامعیت اور قوت استدلال کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر وبے عدیل ہے۔ مسلمانان ہند کی بہرہ اندوزی کی خاطر اس فیصلہ کو ایک کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ مواد مقدمہ کی تیسری جلد ہے اس سے پہلے دوجلدیں اور ہوں گی۔

جلد اول میں حضرات علماء کرام کی مکمل شہادتیں اور جلد ثانی میں حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہ جہانپوری کی بحث اور جواب الجواب شائع کیا جائیگا۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ دونوں جلدیں کب شائع ہوں گی۔ اس کا جواب مسلمانان ہند کی ہمّت افزائی پر موقوف ہے۔ یہ تیسری جلد جتنی جلدی فروخت ہوگی اسی انداز سے پہلی دوجلدوں کی اشاعت میں آسانی ہوگی۔ حضرات علماء کرام کے بیانات اور بحث اور جواب الجواب تردید مرزائیت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ اگر خداتعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ تینوں جلدیں شائع ہوگئیں تو تردید مرزائیت میں کسی دوسری تصنیف کی قطعاً حاجت نہ رہے گی۔،،

اس مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے حکم کی بناء پر پہلا بیان اس احقر کا

ہوا۔ تین روز بیان اور ایک دو روز جرح ہو کر تقریباً ساٹھ صفحات پر بیان مرتب ہوا۔

پہلا پہلا بیان تھا۔ ابھی لوگوں نے اکابر کے بیان سنے نہ تھے۔ سب نے بیحد پسند کیا۔ مجھے یاد ہے کہ دورانِ بیان میں بھی اور مکان پر آنے کے بعد بھی حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ اور اس ناکارہ وآوارہ کے پاس دین ودنیا کا صرف یہی سرمایہ ہے کہ اللہ والوں کی رضا، رضائے حق کی علامت ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ امثال ان یلحقنی بالصالحین.

فتنۂ مرزائیت پر حضرت شاہ صاحب کی اپنی تصانیف

مرزائیت کے متعلق تمام ضروری مسائل پر کافی سے زائد رسائل وکتب حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد وایماء کی بناء پر لکھے جا چکے تھے۔ لیکن ایک مسئلہ ہنوز تشنہ باقی تھا کہ مرزائیوں کے نماز روزہ اور تلاوتِ قرآن اور کلمۂ اسلام پڑھنے سے عام مسلمانوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کو سخت اشتباہ تھا کہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے ان کو اسلام سے خارج کیسے کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں بعض اہل علم کو بھی یہ اشکال تھا کہ اہل قبلہ اور کلمہ گو کی تکفیر نیز جو شخص کسی تاویل کی بناء پر خلافِ شرع عقیدہ کا قائل ہو اس کی تکفیر میں علمائے اہل حق نے بہت کلام کیا ہے۔ اس لیے اس مسئلہ پر حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے خود قلم اٹھایا اور ایک رسالہ بنام اکفار الملحدین والمتاولین فی شئی من ضروریات الدین جس میں اس مسئلہ کو قرآن وحدیث اور تصریحاتِ سلف کی روشنی میں آفتابِ نصف النہار کی طرح واضح فرما دیا۔

بلکہ کفر وایمان کی مکمل حقیقت، اہل قبلہ اور کلمہ گو کی شرعی تعریف پر ایک نہایت جامع تصنیف فرما دی۔ جس میں اس بات کو بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر کسی عقیدۂ کفریہ میں مطلقاً تاویل کو مانع کفر قرار دیا جائے تو دنیا میں کوئی کافر کافر نہیں رہ سکتا کیوں کہ ہر کافر کچھ نہ کچھ تاویل اپنے عقیدۂ فاسدہ کی کرتا ہے۔ بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کے وہ احکام جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں (جن کو اصطلاحِ فقہ وکلام میں ضروریات دین کہا جاتا ہے)

جیسے ان کا انکار صریح کفر وارتداد ہے اسی طرح تاویل کر کے جمہور امت کے خلاف ان کے نئے معنی بتانا بھی کفر وارتداد ہے (یہ کتاب عربی زبان میں ہے)۔

ایک دوسری مستقل کتاب مسئلہ حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اپنے قلم سے بزبان عربی تصنیف فرمائی جس کا نام "عقیدۃ الاسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام" رکھا۔ یہ کتاب کہنے کو تو اسی ایک مسئلہ کی بہترین وجامع تحقیق ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر وتحریر کو جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک مسئلہ کے ضمن میں کتنے علوم ومعارف کے ابواب آجاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی عجیب وغریب تصنیف ہے۔

مقدمہ بھاولپور سے واپسی کے بعد مرض روز بروز شدت پکڑتا گیا۔ لیکن اسی حالت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے درس حدیث کو جاری رکھا۔ تا آنکہ قویٰ نے بالکل جواب دے دیا اور آپ دیوبند تشریف لا کر گویا صاحبِ فراش ہو گئے۔ اور یہی مرض مرض الموت ثابت ہوا۔

لیکن قدرت نے جو دینی خدمت کا جذبۂ بے پایاں آپ کے قلب مبارک میں ودیعت فرمایا تھا وہ بسترِ مرگ پر بھی چین سے نہ لیٹنے دیتا تھا۔ افاداتِ علمیہ اور کتب بینی کا سلسلہ اس حالت میں بھی اسی طرح جاری تھا۔

تا آنکہ یہ ارادہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سفر کیا جائے، وہاں اپنے اعزہ واقارب کی ملاقات کے علاوہ پیش نظر یہ تھا کہ کشمیر میں قادیانی فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ ابتک وہاں پہنچ کر اس کے انسداد کے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس سفر کا قصد کرنے کے ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ کشمیر کے عوام اردو یا عربی کے رسائل تو پڑھ نہ سکیں گے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت کے متعلق لکھ کر طبع کر کے وہاں ساتھ لے جائیں اور مفت تقسیم کریں۔ اس ارادہ کے ساتھ ہی خود ایک رسالہ کی تصنیف شروع فرمادی۔ ابھی یہ تصنیف تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ مرض کے اشتداد نے بالکل ہی قویٰ کو معطل کر دیا۔ تو ایک طالبعلم کے ذریعہ اس ناکارۂ خلائق کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے کشمیر کی ضرورت سے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا تھا مگر اب میں اس کی تکمیل سے معذور ہوں تجھ سے ہو سکے تو اس کی تکمیل کر دے۔

احقر ناکارہ نے تعمیل ارشاد کو سعادت عظمیٰ سمجھ کر شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی حالت بدلنا شروع ہوئی اور یہ علم وتقویٰ کا آفتاب عالمتاب غروب کے کنارے آلگا۔ یہاں تک کہ ۲ر ماہ صفر ۱۳۵۲ھ شب دوشنبہ کے اس پیکرِ علم وتقویٰ مجسّم دین ودیانت نے دین ہی کی فکر میں اپنی عمر کا آخری سانس پورا کر دیا۔ آپ کے گردوپیش سے گویا بزبانِ حال یہ سنا جاتا تھا: ؎

اگر چہ خرمن عمرم غمِ تو داد بباد ❁ بخاک پائے عزیزت عہد نہ شکستم

اب وہ کشمیر کا قصد اور وہاں رسالہ فارسی کی اشاعت بھی ایک خواب وخیال ہوگیا۔ عرصہ کے بعد آپ کے مسودات میں سے وہ منتشر اوراقِ فارسی جمع کر کے مجلس علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت نے بنام خاتم النبیین شائع کیا۔ اور یہی اوراق آپ کا خاتمۃ التصانیف قرار پائے۔

فجزاه عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء ووفقنا لاتباع سنته في خدمة الدين المتين وهو الموفق والمعين.

حضرت شاہ صاحبؒ اور دارالعلوم دیوبند

از: حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند، دہلی

طالبعلم کی حیثیت سے داخلہ، مشہور اساتذہ اور پہلا سالانہ امتحان

۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) میں یہ نیر تاباں علوم مشرقیہ کے اس عظیم الشان مرکز میں داخل ہوا۔ جو اس وقت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری حضرت مولانا عبد العلی صاحب محدث مدرسہ عبد الرب دہلی، حضرت مولانا غلام رسول صاحب، حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب جیسے اکابر علماء اور ماہرین اساتذہ کے فیوض وبرکات کا کوثر و تسنیم بنا ہوا تھا۔ اور ماہ شعبان ۱۳۱۱ھ میں حسامی اور ہدایہ اولین کے سالانہ امتحان میں شریک ہوکر اس کا نام نامی (انور شاہ مظفر آبادی) زیب روئداد بنا۔ (ملاحظہ ہو، سالانہ روئداد، دارالعلوم دیوبند بابت ۱۳۱۱ھ)۔

قیام وطعام کا انتظام

اس وقت تک دارالعلوم میں مطبخ نہیں تھا۔ مستطیع طلبہ جو اپنے کھانے کا خرچ خود برداشت کرتے تھے، اور وہ طلبہ جن کو دارالعلوم سے وظیفہ ملتا تھا۔ یہ سب ہی اپنے طور پر کسی نان پز کے یہاں کھانے کا انتظام کرتے تھے۔

طلبہ کی کثرت اور دارالاقامہ (ہوسٹل) میں کمروں کی کمی کی شکایت (جو بہت زیادہ وسعت کے باوجود آج بھی موجود ہے) نئی شکایت نہیں۔ اس کی عمر دارالعلوم کی عمر کے برابر ہی ہے۔ کیونکہ علم وعمل کے اس سرچشمہ پر ابتداء ہی سے تشنگانِ علوم کا ایسا ہجوم رہا کہ اس کی روز افزوں وسعت، طلبہ کی کثرت کے مقابلہ میں اپنی عاجزی تسلیم کرتی رہی ہے۔

چنانچہ اس تنگ دامانی کی تکلیف ابتداء میں اس نو وارد طالبعلم کو بھی برداشت کرنی پڑی۔اور اس غریب الدیار نونہال کو سب سے پہلے بجنور کے ایک زمیندار کے فرزند نوخیز کے ساتھ جس کا نام مشیت اللہ تھا۔ دار العلوم سے تقریباً چار فرلانگ فاصلہ پر ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرنا پڑا۔ جو اسٹیشن کی جانب اسٹیشن جانے والی سڑک کے کنارے اس مقام پر ہے جس کے قریب آج کل گؤ شالہ اور اسکے سامنے دھرم شالہ ہے۔

یہ مشیت اللہ جس کی خاموش اور سادہ زندگی، تقویٰ و عبادت، خدا ترسی اور پاک بازی کے جواہر سے مرصع ہو کر یہاں تک بلند ہوئی کہ اکابر دار العلوم نے اس کو مجلس شوریٰ دار العلوم کا رکن منتخب کیا۔اور اس دار فانی کی پر آشوب ہنگامہ آرائیوں سے جب وہ گذشتہ سال پردہ پوش ہوا تو مجلس شوریٰ کے باضابطہ اجلاس نے اس کو حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب کے پر شوکت الفاظ سے یاد کرتے ہوئے تجویز تعزیت میں اس کے اوصافِ حمیدہ، سلامت روی اور استقامت حال کا اعتراف کیا۔اور آج ہمارے مخلصانہ جذبات کی تسکین اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ دعاء: رحمۃ اللہ و اکرمہ مثواہ، کو اس کے تذکرہ کا لازمی جزو قرار دیں۔

یہ مولانا مشیت اللہ بجنوری حضرت شاہ صاحب کے صرف ساتھ ہی نہیں رہے، بلکہ پہلے ہی دن ارادت مند اور معتقد بھی بن گئے۔ پھر شاہ صاحب سے کچھ سبق بھی پڑھنے شروع کر دیئے۔

مولانا مشیت اللہ صاحب نے دیکھا کہ یہ کشمیری ہم عمر نوجوان رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہا، اور نصف شب کے بعد جب نیند کا غلبہ ہوا تو وہیں گنڈلی مار کر پڑ گیا اور تھوڑی دیر آنکھ جھپک کر اٹھا اور وضو کر کے نوافل تہجد میں مشغول ہو گیا، نوافل سے فراغت ہوئی تو پھر مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

مولانا مشیت اللہ صاحب کی یہ ارادت و عقیدت ایسی پائدار تھی کہ آخر عمر تک حضرت شاہ صاحب کے مخلص جاں نثار بنے رہے۔اور حضرت شاہ صاحب کی انسیت کا بھی یہ عالم تھا کہ تعطیلات کے زمانہ میں وطن عزیز کی طرح آپ مولانا مشیت اللہ صاحب کے یہاں قیام فرما کر راحت محسوس فرماتے تھے۔اس مسجد کے علاوہ زمانۂ طالب علمی میں آپ کا قیام

محلّہ پٹھان پورہ میں بھی رہا اور ایک عرصہ تک جامع مسجد کے حجروں میں بھی مقیم رہے۔

درسی کتابیں اور ان کی ترتیب

دارالعلوم دیوبند کے عربی درجات میں دفعہ بندی کا قاعدہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ دارالعلوم کے نصاب میں ہر ایک فن کی خاص خاص کتابیں متعین ہیں جو طالب علم کو پڑھنی پڑتی ہیں۔ کچھ فنون اور کچھ کتابیں اعطائے سند کے لیے لازمی ہیں۔ باقی فنون اور کتابوں کے پڑھنے نہ پڑھنے کا طالب علم کو اختیار ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے خود اپنی رائے سے یا اپنے اساتذہ کے مشورہ سے جس ترتیب سے کتابیں پڑھیں وہ دورِ حاضر کے طلبہ کے لیے حیرت انگیز ہے۔

دارالعلوم کی سالانہ رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دارالعلوم میں داخلہ سے اگلے سال یعنی ۱۳۱۱/۱۲ھ میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی۔

حدیث کی ان کتابوں کے ساتھ ہی آپ نے تفسیر میں جلالین شریف اور فقہ میں ہدایہ جلد ثانی پڑھی۔ اور اسی سال منطق میں قاضی مبارک پڑھا۔ (روئداد ۱۳۱۲ھ)

بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھ چکنے کے بعد آمدہ سال ۱۳۱۳ھ میں آپ نے حدیث میں ابوداؤد شریف مسلم شریف پڑھی۔ تفسیر میں بیضاوی شریف، ہیئت اور فلسفہ میں تصریح۔ شرح چغمنی اور صدرا پڑھا۔ امتحانات میں درجہ اول کی کامیابی حاصل کی۔ (روئداد ۱۳۱۳ھ)۔

۱۳۱۴ھ میں آپ نے موطأ امام مالک۔ نسائی شریف اور ابن ماجہ شریف پڑھا۔ اور فنون میں شمس بازغہ اور نفیسی کا امتحان دیا۔

معاصر طلبہ

آپ کے سہ سالہ دورِ طالب علمی میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ طلبہ نے دارالعلوم میں داخل ہو کر تعلیم پائی۔ ان میں سے چند نام جانے پہچانے ملتے ہیں۔ محمد کفایت اللہ شاہ

جہانپوری۔ عبید اللہ سندھی۔ محمد ضیاء الحق دیوبندی، ضرغام الدین مظفر نگری۔ محمد صادق سندھی۔ صدیق احمد فیض آبادی۔ سید احمد فیض آبادی۔ حسین احمد فیض آبادی۔ محمد شفیع دیوبندی۔ وارث حسن فتح پوری۔

کس کو معلوم تھا کہ یہی نوخیز اپنے مستقبل میں علم وعمل کے آفتاب وماہتاب ہوں گے اور پچاس سال زہد وتقوی، عبادت وریاضت کے مشاہدوں اور تجربوں کے بعد دنیا انکو ''حضرت مولانا'' کے القاب وآداب کے ساتھ اس طرح یاد کرے گی:

حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند وسابق صدر جمعیۃ علماء ہند قدس سرہٗ العزیز۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی۔ حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلیؒ۔ حضرت مولانا ضرغام الدین صاحب صدر مدرس وبانی مدرسہ حنفیہ فیض آبادؒ حضرت مولانا محمد صادق صاحب بانی مدرسہ اسلامیہ عربیہ کھڈا کراچیؒ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب صدر مدرس مدرسہ عبد الرب دہلی دام ظلہم العالی مہاجر مدینہ (۱) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب قدس سرہٗ العزیز۔ حضرت مولانا سیّد احمد صاحب مہاجر بانی مدرسہ الشرع مدینہ منورہ۔ شیخ الاسلام (۲) حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند دامت برکاتہم۔

دار العلوم میں بحیثیت مدرس وصدر مدرس

یہی کشمیری نوجوان جو دار العلوم کے میخانۂ علم میں ۱۳۱۴ھ تک جام پر جام نوش جان کر رہا تھا۔ ۱۳ سال بعد (۳) ۱۳۲۷ھ میں ساقی علم بن کر اس مقدس خمخانہ میں داخل ہوا۔ اور

(۱) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب اور حضرت مولانا سیّد احمد صاحب۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ تذکرۃ الرشید جلد دوم ونقش حیات جلد اوّل وغیرہ۔ ۱۲

(۲) حضرت مدنی مدظلہٗ العالی کسی سبق میں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ نہیں رہے۔ آپ نے دورۂ حدیث بھی ۱۳۱۵ھ میں پڑھا ہے۔ جب کہ حضرت شاہ صاحب ۱۳۱۴ھ میں تمام فنون سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ ۱۲

(۳) یہ تیرہ سال بجنور اور دہلی میں گذرے۔ مولانا مشیت اللہ صاحب بجنور سے دوستانہ تعلق اخوت اور بھائی چارہ کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ فراغت کے بعد کشمیر کے بجائے آپ نے بجنور کا رخ کیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کیا پھر مولانا

بزم درس میں بے پناہ فیاضیوں کے مظاہرے کرنے لگا۔

ذکاوت و ذہانت فطری تھی۔ قوت حافظہ لفظ فراموشی کی حقیقت سے ناآشنا تھی۔ شب و روز مطالعہ طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ انھیں اوصاف نے آپ کو مدرسہ امینیہ دہلی کا مشہور استاذ بنا دیا تھا۔ اور انھیں خصوصیات نے آپ کو دارالعلوم دیوبند میں طبقۂ علیا کے اساتذہ میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز کر دیا۔

صدر مدرسی

یہاں تک کہ جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز ۱۳۳۳ھ میں اپنے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے مطابق دفعۃً مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر محبوس و اسیر ہو گئے تو ذمہ دارانِ دارالعلوم کو آپ کا جانشین منتخب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ حضرت شاہ صاحب کی اعلیٰ شخصیت اس منصب کے لیے پہلے سے منتخب اور موزوں تھی۔ اور یہ ایسا قبا تھا جو بلا کسی قطع و برید کے حضرت شاہ صاحب کے قامت موزوں پر راست آ کر رہا تھا۔

اس سات سالہ قیام میں ایک ناگوار واقعہ ضرور پیش آیا اور اس کا باعث وہ تصادم تھا جو اس دور کی سیاسی فضا میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہی زمانہ تھا جب روس، برطانیہ، فرانس اور ان کی ہمنوا حکومتوں کا بلاک (جو دُوَلِ متحدہ کے خطاب سے موسوم تھا) یورپ کے مرد بیمار یعنی

امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ دہلی، بجنور پہنچے اور مدرسہ امینیہ میں درس دینے کے لیے دہلی لے آئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے خادم اور رفیق خاص مولانا ادریس صاحب سکروڈوی کی روایت ہے کہ خود حضرت شاہ صاحب کو یقین نہیں تھا کہ مولانا امین الدین صاحب کی کوشش کامیاب ہوگی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب مولانا امین الدین صاحب مجھے لینے کے لیے بجنور پہنچ گئے تو چونکہ زمانہ قیام دارالعلوم میں مولانا امین الدین صاحب بہت اخلاص اور محبت سے پیش آتے رہے تھے تو یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دلشکنی نہ ہو، میں مولوی صاحب کی ساتھ ہولیا اور دہلی پہنچ کر سولہ سترہ روپے جو میرے پاس تھے وہ بھی میں نے مولانا کے حوالے کر دیئے۔ یہی روپے مدرسہ کا سب سے پہلا مالی سرمایہ تھا۔ چنانچہ مولانا امین الدین صاحب نے اس رقم ہی سے کاغذ لا کر مدرسہ کے لیے رجسٹر بنائے اور طلبہ کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ مولانا کا توکل خدا کے فضل سے کامیاب رہا۔ کسی انتظار کے بغیر طلبہ کا اچھا خاصہ اجتماع ہو گیا۔ مسلمانوں نے بھی توجہ کی اور مدرسہ کی مالی حالت قابل اطمینان ہو گئی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے کھانے کا انتظام مدرسہ ہی کی طرف سے تھا اور نقد تنخواہ تین روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی۔ ۱۲

ترکی حکومت کے ہر ایک عضو کو یورپ سے نکال پھینکنے کی آخری کوشش کر رہا تھا۔ اور دُولِ متحدہ کے بھیڑیئے یورپ اور افریقہ کے ہر ایک محاذ سے دولت آل عثمان پر حملہ آور تھے۔ چنانچہ جنگ پلونا، جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کے طوفان اسی زمانہ میں اٹھے جن کو خرمن سوز بجلیوں نے ترکی کی طاقت کو نذر آتش کر دیا۔

دوسری جانب ہندوستان برطانوی سامراج کے بندھنوں سے جنگ آزادی کے میدان کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب جیسے ذکی الحسن خوددار، بہادر، جن کی فطرت دردمند تھی اور جن کے رگ و پے ابتدائے شعور سے جذبۂ حریت سے سرشار تھے۔ جنگ آزادی کے لیے تیر کمان اور توپ و تفنگ سنبھال رہے تھے۔

دارالعلوم دیوبند جو تقریباً پچاس سالہ عظیم الشان علمی خدمات کے باعث پورے ہندوستان کا علمی مرکز بن گیا تھا۔ ملک کی اس متصادم فضاء سے اس کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔

لیکن دارالعلوم دیوبند نے ابتداء سے اپنا تعارف ایک مذہبی علمی مرکز کی حیثیت سے کرایا تھا۔ اور اس نے اپنا نصب العین یہی مقرر کیا تھا کہ مسلمانوں میں مذہبی علوم کو زندہ اور مذہبی روح کو باقی رکھے۔

اس بناء پر ذمہ داران اہتمام کی کوشش یہ تھی کہ اس دور میں بھی سامراجیت کا بے پناہ حربہ ہر ایک مسئولیت سے آزاد ہے۔ اور وہ چشم زدن میں دارالعلوم کی بلند عمارتوں کو زمیں دوز کر سکتا ہے۔ دارالعلوم کا دامن سیاسی یا انقلابی جد جہد کے ہر ایک شبہ سے پاک رہے۔

مگر مولانا عبیداللہ سندھی جیسا گرم مزاج نوجوان جس کی انقلاب پسند فطرت سب سے پہلے اس کے مذہبی جذبات میں انقلاب پیدا کر کے اپنے خاندانی مذہب کے بجائے اس کو حلقہ بگوش اسلام بنا چکی تھی۔ وہ اس مذہبی یونیورسٹی کو ایسی سطح پر دیکھنا چاہتا تھا کہ انقلاب پسند نوجوانوں کی پیشانیاں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مسلمانوں کی سیاسی لیڈر شپ اس کے سایہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو۔

نیتیں دونوں کی بخیر تھیں۔ مگر طبعی رجحانات کے اختلاف نے دارالعلوم میں خاموش تصادم کی شکل پیدا کر دی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا عبیداللہ سندھی قدس اللہ سرہٗ العزیز کو دار

العلوم سے علیحدہ ہونا پڑا۔

حضرت شاہ صاحب جن کی تمام راحت وتفریح مطالعۂ کتب میں منحصر تھی۔ دائرۂ اہتمام کے ہموار رہے۔ لیکن بعد میں جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیئے گئے تو حضرت شاہ صاحب کو غلطی کا احساس ہوا۔ یہ آپ کی بزرگانہ صداقت تھی کہ جیسے ہی غلطی کا احساس ہوا آپ نے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کو معذرت نامہ لکھا اور پہلی باتوں کی صفائی چاہی۔ (ملاحظہ ہو نقش حیات جلد دوم ص ۱۴۴)

انتظامی معاملات

حضرت شاہ صاحب کا علمی ذوق اور شوقِ مطالعہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ آپ کی دلچسپیاں دارالعلوم کے انتظامی معاملات سے وابستہ ہوں۔ صدر مدرس کی حیثیت سے آپ مجالس مشورہ میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ اور دارالعلوم دیوبند سے باہر علمی مجالس اور مذہبی اجتماعات میں بھی کسی شدید اصرار پر تشریف لے جاتے تھے۔ مگر یہ تمام نقل وحرکت قسری اور جبری ہوتی تھی۔ احقر کو یاد ہے کہ پرچۂ امتحانات کا مطالعہ بھی آپ کے لیے باعثِ کوفت ہوتا تھا۔ آپ اس کو ''بے حظ مشغلہ'' فرمایا کرتے تھے۔

دارالعلوم سے علیحدگی

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محتاط بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور جو شخص زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیتا ہے وہی ابتلا میں پڑ جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کے ساتھ یہی سانحہ پیش آیا(۱)۔

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق اس موقع پر ''محتاط'' کا لفظ اس معنی میں استعمال نہیں ہوا کہ حضرت مرحوم دینی اور اصلاحی امور میں بھی شرکت نہیں فرماتے تھے اور ان کے یہاں ذاتی مصالح دوسرے امور پر مقدم تھے۔ بلکہ مولانا محمد میاں صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ امور دنیاوی سے حضرت شاہ صاحب کو کوئی رغبت نہیں تھی اور حضرت مرحوم کے علمی مشاغل اتنے کثیر تھے کہ انھیں دوسری چیزوں پر نہ توجہ ہوتی تھی اور نہ فرصت ملتی تھی وہ اپنے تمام اوقات علمی مشاغل ہی میں صرف فرماتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت مرحوم نے جب عملی میدان میں اپنی سعی وجدوجہد کی ضرورت کسی دینی یا اخلاقی تقاضے سے محسوس فرمائی تو اس کو بھی پورا کیا۔ قیصر

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب خلف حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب مہتمم تھے اور طبقۂ علماء کے بہترین مدبر و مفکر حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی، نائب مہتمم اور دار العلوم کے مدار المہام تھے۔ ان دونوں بزرگوں کا دور اہتمام دار العلوم کا تابناک دور مانا جاتا ہے۔ اسی دور میں اس نے ایک مدرسہ کی حیثیت سے ترقی کر کے ہندوستان بلکہ ایشیاء کے مرکز العلوم اور علوم مشرقیہ کی آزاد یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔ اور دار العلوم نظامیہ اور جامعہ قرطبہ کا نمونہ چودھویں صدی کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے لگا۔ لیکن فروگذاشتوں اور عملی غلطیوں سے معصومیت فطرتِ انسان کا حصہ نہیں ہے۔ (الامن عصمۃ اللّٰہ)

اہتمام اور نظم و نسق کی ذمہ داری کی عمر جتنی دراز ہوتی ہے وہ محاسن اور مناقب کے ساتھ غلطیوں کی بھی ایک فہرست مرتب کر دیتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہتمام و نظامت کی درازیٔ عمر وجہِ شکایت بن جاتی ہے۔ اس پر نظر نہیں کی جاتی کہ کیا کیا۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نہیں ہوا۔ اور اسی پر گرفت کی جاتی ہے۔ اور اس طرح ایک مخالف پارٹی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

بہر حال اصلاحات کے نام پر ایک تحریک دار العلوم میں شروع ہوئی۔ اور اس نے اپنے دامنوں کے تار رفتہ رفتہ حضرت شاہ صاحب جیسے عظیم الشان بزرگ کے قبائے عظمت سے جوڑ دیئے۔

داستان بہت طویل ہے۔ اور اس کا آخری باب استعفاء ہے۔ جو تحریک کے رہنماؤں نے بطور احتجاج پیش کیا۔ اور اہتمام کے تدبیر قلم نے اس پر منظوری صادر کر کے احتجاج کو ناکام بنا دیا۔

اسباب و وجوہات کی تحقیق و تنقیح اور مخطی و مصیب کی تشخیص ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ موضوع کا آخری فقرہ یہ ہے کہ ۷ سال طبقۂ علیاء کے مدرس اور تیرہ سال صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۴۶ھ میں آپ نے دار العلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کی اور دیوبند کے بجائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔

دار العلوم کی علمی زندگی میں تغیر و اضافہ

حضرت شاہ صاحب کے علمی فیوض سے دار العلوم دیوبند کی علمی زندگی میں کیا اور

اضافہ ہوا۔ یہ بہت ہی دلچسپ موضوع ہے۔ مگر اس کے لیے ایسے عالم کے قلم کی ضرورت ہے جو درس تدریس کا پورا تجربہ رکھتا ہو اور جس نے حضرت شاہ صاحب سے پہلے بھی دارالعلوم کی علمی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو۔ احقر ان دونوں سعادتوں سے محروم ہے۔ لہٰذا اس موضوع کا حق تو ادا نہیں کر سکتا تاہم اپنی فہم ناقص و استعدادِ ناتمام کے مطابق آپ کے درس کی چند خصوصیات قلم بند کرتا ہے انھیں کو تغیر و اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱ تحقیق و تفتیش

حضرت شاہ صاحب کا درس اس پر قناعت نہیں کرتا تھا کہ عبارت کا مطلب سمجھا دیا جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ سے متعلق تحقیق و تدقیق کا سیر حاصل خلاصہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں ہر دعوے کی دلیل کتاب کے حوالہ سے پیش کی جاتی تھی۔ یہ خصوصیت حضرت شاہ صاحب ہی کی تھی کہ آپ کے سامنے ایک بینچ پر کتابوں کا انبار رہتا تھا۔ اور مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ زبانی حوالہ پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کھول کر اصل عبارت پیش فرما دیتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس کتاب کا حوالہ دیا جاتا وہ انبار میں موجود نہ ہوتی تو اس کو منگوا کر وہ عبارت پیش فرماتے۔

اور اگر وہ کتاب اس وقت دستیاب نہیں ہوسکتی تو اگلے روز وہ کتاب اپنے ساتھ لاتے اور عبارت پڑھکر سنا دیتے۔

یہ حضرت شاہ صاحب کے قوتِ حافظہ کا کمال تھا کہ جس عبارت کا حوالہ دیتے تھے اس کے صفحات بھی گویا آپ کو محفوظ ہوتے تھے۔ چنانچہ فہرست مضامین سے آپ شاذ و نادر ہی مدد لیتے تھے۔ بلکہ عام طریقہ یہی تھا کہ سیکڑوں صفحات کی کتاب میں بھی عبارتِ محولہ کو اس طرح پیش کر دیتے تھے جیسے پوری کتاب آپ کو حفظ ہے۔ اور اس کے مضامین کے صفحات آپ کے ذہن میں مستحضر ہیں۔ اس کمال کا حیرت انگیز مظاہرہ اس وقت ہوتا تھا جب طلبہ کے سوالات پر کوئی تازہ بحث شروع ہو جاتی اور حوالہ کے لیے کوئی

ایسی کتاب منگائی جاتی جس کا مطالعہ سالہا سال پہلے کیا ہو۔ یہ کتاب خواہ کتنی ضخیم ہوتی۔ محولہ عبارت اس طرح پیش کر دی جاتی گویا اس کے صفحات اور سطور آئینہ قلب پر نقش ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کے اس طریق کار نے تلامذہ میں تحقیق و تفتیش کا نیا ذوق پیدا کر دیا۔ یہ ذوق فقط حوالۂ کتاب سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اس کی کاوش اس وقت ختم ہوتی ہے جب اصل عبارت کتاب میں مطالعہ کر کے بحوالۂ صفحات اس کو نوٹ کر لیا جائے۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا محمد شفیع صاحب۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی جیسے ارباب قلم کی تصانیف میں آپ یہ ذوق کارفرما پائیں گے۔ یہ حضرات اپنی تصانیف میں جس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں اس کے صفحات اور جلد کا حوالہ بھی قلمبند کر دیتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل عبارت اصل کتاب میں مطالعہ کر کے یہ حوالہ دیا گیا ہے خود احقر اپنے اس ذوق کے باعث کافی پریشانی برداشت کر چکا ہے۔ جس وقت جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں ترمذی شریف احقر سے متعلق ہوئی تو اگرچہ زمانۂ درس کے نوٹ میرے پاس تھے اور حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کا مجموعہ ''عرف الشذی'' بھی زیر مطالعہ رہتا تھا۔ مگر احقر کو نہ اپنی لکھی ہوئی تقریروں پر اطمینان ہوتا۔ اور نہ عرف الشذی کے مبہم حوالوں سے دل مطمئن ہوتا تھا۔ بلکہ جو کتابیں بھی دستیاب ہو سکیں احقر نے ان کا مطالعہ کیا۔ اور اصل عبارت مطالعہ کرنے کے بعد حرف بحرف اپنے پاس قلمبند کر لی۔ چونکہ اصل عبارت نقل کرنے اور قابل یادداشت مسائل قلمبند کرنے کے لیے ''عرف الشذی'' کا حاشیہ کافی نہیں تھا تو سرِ ورق کے ساتھ ایک سادہ ورق لگا کر عرف الشذی کی جلد بندھوانی پڑی۔ یہ اوراق بھی عموماً یادداشتوں سے بھر گئے ہیں اور اس طرح معلومات کا ایک ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ سینہ میں کچھ بھی نہیں صرف سفینہ ہی ہے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے نئے فضلاء کی کوتاہ ہمتی کی مذمت کرتے ہوئے شکایت فرمائی کہ

نئے مدرسین صرف ''عرف الشذی'' پر اعتماد کر لیتے ہیں اور ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے حوالوں میں بہت کچھ غلطیاں ہیں۔ جب کاتب الحروف نے عرض کیا کہ یہ خادم صرف حوالوں پر اعتماد نہیں کرتا، بلکہ حوالوں کی تصحیح کرتا ہے اور اصل عبارت بھی نوٹ کر لیتا ہے تو حضرت شاہ صاحب بہت خوش ہوئے اور پھر دوسرے حضرات کے سامنے احقر کے اس فعل کو نظیر پیش فرمائی۔

۲ تاویل کے بجائے تطبیق وتوجیہ

فن حدیث وسعت نظر چاہتا ہے۔ روایت ,, بالمعنی،، کرتے ہوئے ایک ہی مفہوم کو راوی حضرات نے موقع اور محل کے لحاظ سے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اختلافِ الفاظ کے ساتھ بسا اوقات انداز میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک بات جو ترغیب وتشویق کے طور پر لسانِ رسالت سے صادر ہوئی تھی اس کو قطعی حکم کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ حدیث طویل تھی۔ راوی نے کسی وقتی ضرورت کی بناء پر پوری حدیث نہیں بیان کی، بلکہ ضرورت کے مطابق اس کا ایک حصہ نقل کر دیا ہے۔ راوی نے اس جملہ کا وہی مفہوم لیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک تھا لیکن بعد کے راویوں نے جب تنہا اس جملہ کو نقل کیا تو اصل مفہوم ذہن میں نہیں رہا۔

اس طرح بعد کے علماء میں ایک اختلاف کی بنیاد پڑ گئی۔ اب اس جملہ کا صحیح منشاء وہی معلوم کر سکتا ہے جس کی نظر ذخیرۂ احادیث پر ہو اور جس نے کتب حدیث کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے یہ سمجھ لیا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ اور فقط اس ایک جملہ کے نقل کر دینے سے کیا فرق پیدا ہو گیا ہے۔

لیکن قاصر الہمت اور کوتاہ دست ایک ہی روایت کے الفاظ لیکر اپنی مرضی کے مطابق ان میں معنی ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ بدعت اس امت میں بہت ہی زیادہ قابل ملامت بن جاتی ہے۔ جب کسی دوسری روایت میں اس کے خلاف الفاظ واقع ہوں۔

حضرت شاہ صاحب اس قسم کے معنی پہنانے کے سخت مخالف تھے۔ اس کو مدرسین کا

طریقہ فرمایا کرتے تھے۔یعنی جو محض کارگذاری کے لیے درس دیتے ہیں درس میں اپنی ذاتی تحقیق پیش نہیں کرتے۔

اس معنی پہنانے کو ,,تاویل،، فرمایا کرتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا کہ میں ,,تاویل،، نہیں کرتا بلکہ توجیہ یا تطبیق کرتا ہوں۔یعنی روایت کے تمام الفاظ جو مختلف انداز میں ذخیرۂ احادیث میں وارد ہوئے ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر ایک معنی معین کیا کرتا ہوں۔اور جس جملہ کا جو حقیقی محل ہے اس پر منطبق کیا کرتا ہوں۔

[۳] احترامِ فن حدیث واحترامِ ائمہ مجتہدین وعلمائے حدیث

حضرت شاہ صاحب کے اس طرز نے تلامذہ میں دو باتیں خاص طور پر پیدا کیں:۔

(الف) وہ مثلاً ترمذی شریف پڑھاتے وقت یہ جائز نہیں سمجھتے کہ ترمذی شریف کی روایت کے الفاظ پر ان کی نظر منحصر رہے، اور اس موقع کے لحاظ سے حدیث کے معنی پہنا کر سبکدوش ہو جاتے، بلکہ اس روایت کے وہ الفاظ لامحالہ ان کے پیش نظر رہیں گے جو کم از کم صحاحِ ستہ میں وارد ہوئے ہیں۔اس طرح شوقِ مطالعہ کے ساتھ فن حدیث کا خاص احترام ان کے دل دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

(ب) جب وہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے ناپیدا کنار کے ساحل پر کھڑے ہو کر اس کی وسعتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو جس طرح امام ابوحنیفہؒ کی عظمت ان کے دل میں گھر کرتی ہے۔اسی طرح ان کے قلوب امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ۔امام مالکؒ وغیرہ ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے احترام سے بھی لبریز ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح اس بحر محیط، اور اس قلزم اعظم میں ساری عمر شناوری کر کے اس کی گہرائیوں سے فقہی مسائل کے موتی برآمد کیے ہیں اور کس طرح اس سمندر کی لہروں کو کتب احادیث کے آبگینوں میں سمویا ہے۔(فجزاھم اللہ وشکر سعیھم)

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ائمہ کے مقلدین یا علمائے حدیث سے نفرت نہیں کرتے، ان کی تحقیر وتوہین سے ان کے ذہن پاک ہوتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ فقہی مسائل کا یہ اختلاف ایک علمی بحث اور خوشگوار نظریاتی اختلاف بن جاتا ہے جو ''اختلاف امتی رحمة'' کی تصدیق پیش کرتا ہے، جو متعصبانہ جنگ وجدال اور نفرت وحقارت کے بجائے وسعتِ مطالعہ اور تحقیق وتفتیش کی دعوت دیتا ہے۔

۴ تحقیق فن

شرح ملا جامی، ایک تصنیف کی حیثیت سے قابل قدر کتاب ہے، مگر درسیات میں اس کا شمول دماغوں میں ایک خطرناک مرض کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے۔ طلبہ کی توجہ فن سے ہٹ جاتی ہے، اور ان کے دماغ اس قیل وقال اور عبارت سے متعلق بحث ومباحثہ میں پھنس جاتے ہیں جس کا تعلق فن کے بجائے منطقی موشگافیوں سے ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منطقی موشگافیوں میں تو مہارت ہو جاتی ہے۔ لیکن فن سے متعلق مسائل میں مہارت تو درکنار ان پر پوری طرح عبور بھی نہیں ہوتا۔ منطقی موشگافیوں کی گرم بازاری حضرات مدرسین کے دماغوں کو بھی متاثر کرتی ہے، اور وہ فن کے متعلق وسعت نظر پیدا کرنے کے بجائے پوری توجہ شروح، حواشی، اور منہیات وغیرہ متعلقات عبارت میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور انھیں چیزوں کے استحضار کو مدرسی کو مہارت مانا جاتا ہے۔ اس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضرات مدرسین کا علم درسیات کے حواشی، شروح اور منہیات تک محدود ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب اس مرض سے بہت زیادہ بیزار تھے، الفاظ کی ژولیدگی میں مشغول ہونا آپ کے نزدیک تضییع اوقات تھا۔ آپ کی تمام توجہ فن کی تحقیق پر مبذول رہتی تھی، اسی کا مظاہرہ آپ کے درس میں ہوتا تھا۔ آپ کی تقریر شروح اور حواشی کے اقتباسات کا مجموعہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ مسئلہ پر محققانہ تبصرہ ہوتا تھا۔

املاء اور درس

آج ہمارے مدرسوں میں درس کا طریقہ جاری ہے یعنی کتاب سامنے رکھ کر اس کی

عبارت کی تفہیم میں وقت صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن سلف کا طرز یہ نہیں تھا۔ ان کے یہاں طریقۂ املاء جاری تھا یعنی وہ مسئلہ کے متعلق اپنی تحقیق پیش فرمایا کرتے تھے، طلبہ اس کو نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ عبارت کا سمجھنا اور اس مطلب اخذ کرنا طالب علم کا کام ہوتا تھا۔ اس سے طلبہ میں مطالعہ کے اضافہ کے ساتھ فنی واقفیت پیدا ہوتی تھی اور وہ اپنے زمانہ کے ابن ہمام وابن حجر بن جاتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں کتابیں بیشک نکلی رہا کرتی تھیں۔ طلبہ عبارت بھی پڑھتے تھے۔ مگر حضرت شاہ صاحب کی تقریر کا تعلق عبارت سے زیادہ تحقیق و تنقیح مسئلہ سے ہوتا تھا۔ آپ الفاظ کی بندشوں سے بلند ہو کر مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق پیش فرماتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے اس طرز کے لیے مناسب یہ تھا کہ ,,درس،، کے بجائے ,,املاء،، کا طریقہ اختیار کیا جاتا۔ تاکہ طلبہ کی توجہ بھی تقریر کے قلمبند کرنے کی طرف رہتی اور اسطرح معلومات کا ایک نادر ذخیرہ فراہم ہو جاتا، اور آئندہ کے لیے مدارس عربیہ میں سلف کا طریقۂ "املاء" دوبارہ جاری ہو جاتا۔ جس سے حضرات مدرسین میں وسعت نظر، اور طلبہ میں قوتِ مطالعہ پیدا ہوتی۔

حضرت شاہ صاحب کے اساتذۂ حدیث (شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ) وسعت نظر، مہارت فن حدیث، تفقہ اور حذاقت میں یکتائے روزگار تھے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ان کی جلالت وعظمت اور تبحر علمی کے قائل تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ "آپ سے زیادہ ائمہ اربعہ کے مذہب کا ماہر میں نے نہیں دیکھا"۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحقیقات اپنی تقریروں میں پیش فرمایا کرتے تھے۔ مگر ان بزرگوں کا طریقۂ درس بالکل مختلف تھا۔ ان بزرگوں کی ابتدائی تقریر عبارت کتاب سے متعلق نہایت مختصر ہوتی تھی۔ ان کی مفصل تقریر اس وقت ہوتی تھی جب طلبہ سوال کرتے اور طلبہ کے سوالات کا تقاضا ہوتا کہ مطمئن کرنے کے لیے مفصل تقریر کی جائے۔ مگر حضرت شاہ صاحب طلبہ کو اصرار کی زحمت نہیں دیتے تھے، بلکہ

آپ کی ابتدائی تقریر ہی مفصل ہوتی اور پہلے ہی مرحلے میں آپ طلبہ کو موقع دیتے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرلیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا طرزِ عمل طلبہ کے ساتھ

اس عنوان پر روشنی ڈالنے کے لیے صرف ایک جملہ کافی ہے کہ آپ کی ساری زندگی طالب علمانہ تھی۔ علوم وفنون کا یہ جوہر تاباں۔ جس کو ''ایت من ایات اللّٰہ''۔ اور ''اسلام کا ایک معجزہ'' مانا جاتا تھا۔ مدرس، اور پھر شیخ الحدیث ہونے کے بعد بھی دارالعلوم دیوبند کے احاطہ ہی میں اقامت گزیں رہا۔

وہی دارالمطالعہ تھا، وہی آرام گاہ، اور وہی ملاقات کا کمرہ۔

مہتمم صاحبان اوران دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر (جن کا احترام حضرت شاہ صاحب ضروری سمجھتے تھے) تقریباً چالیس سال کی عمر میں شادی کرلی تھی۔ شادی کے بعد ایک زنانخانہ بھی ہوگیا تھا۔ مگر روز وشب کے اوقات میں حضرت شاہ صاحب کا قیام زیادہ تر اسی حجرہ میں رہتا تھا۔

ایشیائی اور مشرقی تہذیب استاذ کو باپ اور شاگردوں کو اولاد کا درجہ دیتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب، اس کا عملی نمونہ تھے۔ آپ کی بے پناہ شفقت ہر وقت طلبۂ علوم کے استقبال کے لیے وقف تھی۔ آپ کا دروازہ طلبہ کے لیے ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ بدشوق طلبہ کو بھی آپ محبت وشفقت ہی سے گرویدہ کرنے کے عادی تھے۔

احقر وہ بدنصیب ہے جو حضرت کی نجی مجلس میں کبھی حاضر نہیں ہوا۔ حضرت کے حجرہ میں بھی شاید ایک مرتبہ ہی حاضری ہوئی ہے۔ حلقۂ درس میں بھی کوئی ممتاز حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس اجنبیت اور بعد کے باوجود جب بھی حضرت شاہ صاحب سے واسطہ پڑا احقر نے محسوس کیا کہ حضرت کی بے پناہ شفقت اس ناکارہ کے شامل حال ہے۔

۱۔ سب سے پہلے ایک درخواست کے سلسلہ میں حاضر خدمت ہوا۔ اس وقت احقر درجۂ وسطیٰ کی کتابیں پڑھتا تھا۔ حضرت کے حلقۂ درس میں شرکت کے لیے ابھی ایک

دوسال باقی تھے۔ذاتی تعارف کچھ نہ تھا۔دارالعلوم کے سینکڑوں طلبہ میں سے ایک میں بھی تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند، ۔ ,,محاکم شرعیہ ریاست حیدرآباد،، کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کی حیثیت سے حیدرآباد میں مقیم تھے۔اور نظام حیدرآباد کی نظر میں دارالعلوم کی خاص عظمت تھی۔متعدد طلبہ ریاست کے وظائف سے فیضیاب ہورہے تھے احقر کو بھی چند دوستوں نے مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک درخواست نہایت خوشخط ایک کاتب صاحب سے احقر نے بھی لکھوالی۔اور حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اس پر سفارش تحریر فرمادیں۔

حضرت شاہ صاحب کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کی درخواستیں بے سود ہیں وہاں کسی خاص تعلق کے بغیر صرف سفارشی الفاظ سے کام نہیں چلتا۔(چنانچہ نتیجۂ درخواست سے اس کی تصدیق ہوگئی کہ آج تک اس کی رسید بھی نہیں آئی) مگر آپ کے لطف بیکراں نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اپنی رائے کو بالا رکھتے ہوں، سفارش لکھنے سے معذرت فرمادیں۔ جیسے ہی احقر نے درخواست پیش کی، آپ نے بلا تامل مؤثر انداز میں پرزور سفارش تحریر فرمادی سفارش کے تمام الفاظ یاد نہیں رہے البتہ ایک مصرع یاد ہے جو آخر میں تحریر فرمایا تھا۔ع ,,خسرواں چہ عجب ار بنوازند گدارا،،

۲۔اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ احقر کی پھوپی کا انتقال ہوگیا۔احقر کا مکان اسٹیشن کی جانب دیوبند کے آخری کنارہ پر دارالعلوم دیوبند سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت شاہ صاحب کو معلوم ہوا، تو آپ پاپیادہ تشریف لائے۔اور جہاں تک یاد پڑتا ہے، نمازِ جنازہ آپ نے ہی پڑھائی۔

۳۔دورۂ حدیث میں احقر کے ساتھ ختم سال پر ستاسی طلبہ تھے۔عبارت عام طور پر مولانا احمد اشرف صاحب راندیری، مولانا اشفاق صاحب سنبھلی، مولانا محمود الرحمٰن صاحب جالونی (مرحوم) مولانا عبدالمتین صاحب ہزاروی، مولانا سیف اللہ برادر خورد حضرت شاہ صاحب (احقر کے مشفق دوست)، مولانا مسعود احمد صاحب مرادآبادی وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ایک مرتبہ بخاری شریف کے سبق میں اس مسابقت میں شرکت کا شوق احقر کو بھی

ہوا۔سب سے پہلی صف میں جا کر بیٹھا۔اور سب سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر اپنا حق قائم کر لیا۔مگر عبارت پڑھی تو چند فاحش غلطیاں ہوگئیں۔حضرت شاہ صاحب کو نحوی یا صرفی غلطیوں سے بہت کوفت ہوتی تھی، اور سختی سے تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔مگر حضرت نے محسوس فرمایا کہ یہ غلطیاں گھبراہٹ میں ہوئیں ہیں، تو نہایت شفقت اور نرمی سے اصلاح فرمائی چند سطریں پڑھی تھیں کہ ایک بحث شروع ہوگئی، اور اسی بحث میں گھنٹہ ختم ہوگیا جان بچی لاکھوں پائے۔پھر کبھی اس اقدام کی جرأت نہیں کی۔

۴۔ششماہی امتحان تھا۔اس زمانہ میں سہ ماہی یا ششماہی امتحان تقریری ہوا کرتے تھے۔چند روز پہلے احقر کی شادی ہوئی تھی۔امتحان دینے کے لیے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوا۔عبارت پڑھی۔شاید عبارت میں کوئی غلطی بھی کی، پھر مضمون حدیث پر کوئی بحث نہیں کر سکا۔خاموش بیٹھ گیا۔

حضرت شاہ صاحب نے ایک سوال کیا۔احقر یہی سمجھتا ہے کہ اس کا جواب الٹا سیدھا دیا۔مگر تعجب ہوا کہ احقر کو نمبر پورے عطا فرمائے۔احقر کا خیال ہے کہ حضرت نے نمبر دیتے وقت وقتی صورتِ حال کا خیال نہیں فرمایا بلکہ نظر شفقت صلاحیت پر تھی اور اسی لحاظ سے نمبر عطا فرمائے۔اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے یہاں بھی چند سال پہلے پیش آچکا تھا۔

حضرت مولانا کے یہاں مقامات حریری کا درس ہوتا تھا۔احقر کو اور مولانا اشفاق حسین صاحب سنبھلی کو مقامات سے اتنا شغف تھا کہ حافظ مقامات مشہور ہوگئے تھے۔سہ ماہی امتحان کی نوبت آئی۔امتحان تقریری تھا۔اور اتفاق سے احقر اور مولانا اشفاق صاحب دونوں کا امتحان ساتھ ہوا۔اور کچھ ایسی صورت ہوئی کہ اس وقت درس گاہ میں ہم دو کے علاوہ اور کوئی طالب علم نہیں تھا۔حضرت مولانا نے ساتویں مقامہ کی عبارت پڑھوائی، اور نحوی سوال کر لیا۔جس کے جواب میں ہم دونوں قابل ترین طالب علم بغلیں جھانکنے لگے۔حضرت مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔''مولانا! ہم تو سمجھے تھے کہ آپ مقامات خوب یاد کرتے ہیں، بڑی محنت کرتے ہیں''۔

حضرت مولانا کے ان ملامتی ارشادات کے جواب میں ہم دونوں دم بخود تھے۔ یقین تھا کہ ہم دونوں فیل کر دیئے جائیں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں کو پورے نمبر عطاء فرمائے۔ یہ بزرگانہ شفقت اس لیے تھی کہ ہماری محنت کا یقین تھا۔

۵۔ کتب درسیہ سے فارغ ہوا، تو ملازمت کے سلسلہ میں بھی حضرت شاہ صاحب کی خاص شفقت نے دستگیری فرمائی۔

آرہ ضلع شاہ آباد، صوبہ بہار میں ایک بہت پرانا مدرسہ ہے، مدرسہ حنفیہ، اس نے گورنمنٹ سے ایڈ حاصل کرنی شروع کی اور مولوی فاضل وغیرہ کے درجات کھولے۔ تو ان کو ایسے مدرس کی ضرورت ہوئی جو ادب، تاریخ اور ہیئت وغیرہ کی کتابیں پڑھا سکے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کسی تقریب سے بہار تشریف لے گئے تو اراکین مدرسہ حنفیہ کے ایک وفد نے حضرت سے ملاقات کی اور مدرسہ حنفیہ کے لیے ''ادیب'' کی فرمائش کی۔ یہاں جس طرح استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی عنایت خصوصی نے سبقت فرما کر احقر کا نام پیش کیا ایسے ہی حضرت شاہ صاحب کی خاص شفقت تھی کہ باوجودیکہ نہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں کا حاضر باش تھا، اور نہ اور کوئی خاص تعلق تھا، محض از راہ شفقت احقر کے نام کو منظور فرمایا۔

یہ ۱۳۴۴ھ، ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت احقر کی عمر تقریباً بیس سال تھی، داڑھی نہیں تھی۔ صرف سبزہ آغاز تھا۔ مدرسہ حنفیہ کے عمر رسیدہ مدرسین اور اراکین کے لیے عجیب سی بات تھی کہ ایک لڑکے کو اس خدمت کے لیے بھیج دیا گیا۔ مگر ان بزرگوں کی دعاؤں نے امداد فرمائی اور چند اجتماع جو اسی ہفتہ میں ہوئے۔ ان میں اردو، اور عربی کی تقریروں نے اس خلجان کو رفع کر دیا۔ اور وہ بجائے تحقیر کے احقر کی عزت کرنے لگے۔ پھر تقریباً تین سالہ قیام میں ایسی مقبولیت حاصل ہوگئی کہ اگر وہاں کچھ اور عرصہ قیام رہتا، تو شاید اس حلقہ کی معراج احقر کو حاصل ہو جاتی یعنی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا پرنسپل بنا دیا جاتا۔ مگر ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا ✿ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انگریزی سرکار کی وظیفہ خواری کے ساتھ علم دین کی خدمت گوارا نہ ہوئی گلو خلاصی کی

کوشش کرنے لگا۔ ۱۹۲۹ء میں وہاں سے علیحدہ ہوکر جب مدرسہ شاہی مرادآباد میں تقرر ہوا، تو اس موقع پر بھی ان دونوں بزرگوں کی شفقت کارفرما تھی۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے کوشش فرمائی اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے نہایت شاندار الفاظ میں احقر کی سفارش فرمائی۔

اہتمام دارالعلوم سے وہ اختلاف جس کا اشارہ پہلے گزر چکا ہے احقر کے دیوبند سے چلے جانے کے بعد رونما ہوا۔ عملی طور پر میں نے کسی پارٹی کی حمایت میں کچھ نہیں کہا البتہ میرے رجحانات اہتمام کی حمایت میں تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب کو اس کا علم تھا۔ مگر آرہ یا مرادآباد سے دیوبند حاضر ہوکر جب بھی خدمت اقدس میں حاضری ہوئی، تو احقر نے حضرت کے مشفقانہ طرز میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا۔

طریقۂ اصلاح

ایک بات اور یاد آ گئی۔ دیوبند کے طلبہ اس زمانہ میں صافہ باندھا کرتے تھے۔ یہ صافے گاڑھے، گبرون یا ململ کے ہوتے تھے۔ بھاگل پوری سبز صافے خاص مقبولیت رکھتے تھے۔ احقر کے پاس ایک بنارسی صافہ تھا، جس کے پلّوں پر تقریباً چھ چھ انگل سنہری کام تھا۔ ایک مرتبہ یہ صافہ باندھے ہوئے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب کی نظر زرکار پلوں پر پڑ گئی۔ اثناء گفتگو میں آپ نے مسئلہ بھی بیان فرمادیا ''کہ مرد کے لیے چار انگل سے زیادہ سنہری کام جائز نہیں ہے'' بیان کا پیرایہ اتنا لطیف تھا کہ اس وقت احقر کو یہ احساس بھی نہیں ہوا، کہ تنبیہ اور اصلاح مقصود ہے۔ حضرت سے رخصت ہونے کے بعد غور کرتا رہا کہ اس مسئلہ کو گفتگو کے سیاق وسباق سے کیا تعلق ہے۔ بہت دیر بعد خود اپنے صافہ کا خیال آیا۔ اور پھر پلے کے کام کو ناپا تو چار انگل سے زائد تھا۔ اس کے بعد اس صافہ کے زنانہ کپڑے بنوادئے گئے۔ طلبہ کے ساتھ لطف وکرم کی یہ چند مثالیں ہیں، جن کا تجربہ خود احقر کو ہوا۔ ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا''

تلامذہ

دارالعلوم کے تقریباً ۱۸ سالہ قیام میں کم از کم دو ہزار طلبہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بلا واسطہ مستفیض ہوئے۔ ان کی مکمل فہرست کے لیے ایک مستقل جلد درکار ہے۔ بہت سے حضرات وہ ہیں جو گمنامی کے گوشوں میں چھپ کر خاموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ تلامذہ، جن کی خدمات نے شہرت حاصل کرلی، انھیں کے نام یہاں بھی درج کیے جاتے ہیں:

(۱) مولانا فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔ (آپ نے دورۂ حدیث شریف حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب سے پڑھا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب سے بھی آپ نے اتنا استفادہ کیا ہے کہ آپ تلامذہ کے زمرہ میں سب سے پہلے نمبر پر شمار کیے جاتے ہیں۔

(۲) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند۔ (۳) مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ (۴) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بانی و ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین (دہلی) (۵) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیخ الحدیث (مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ) (۶) مولانا محمد بن موسیٰ، سملکی۔ بانی مجلس علمی۔ (۷) مولانا بدر عالم صاحب مؤلف فیض الباری وغیرہ، نزیل مدینہ منورہ۔ (۸) مولانا مناظر احسن گیلانی۔ سابق صدر دینیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن)۔ (۹) مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ صدر جامعہ اشرفیہ، لاہور۔ (۱۰) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، سابق مفتی دارالعلوم دیوبند۔ (۱۱) مولانا محمد صادق صاحب نجیب آبادی، مؤلف انوار المحمود۔ (۱۲) مولانا قاضی سجاد حسین صاحب، صدر مدرس مدرسہ فتحپوری، دہلی۔ (۱۳) مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، پرنسپل مدرسہ عالیہ، کلکتہ۔ (۱۴) مولانا محمد یوسف صاحب بنوری۔ (۱۵) مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈوی، مدرس مدرسہ حسین بخش، دہلی۔ (۱۶) مولانا محمد چراغ صاحب (گوجرانوالہ) (۱۷) مولانا احسان اللہ خاں صاحب تاجور مرحوم۔ (۱۸) مولانا مصطفٰے حسن صاحب علوی (پروفیسر یونیورسٹی لکھنؤ) (۱۹) مولانا میرک شاہ صاحب کشمیری۔ (۲۰) مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی۔ (۲۱) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔ (۲۲) مولانا حمید

الدین صاحب فیض آبادی، شیخ الحدیث مدرسہ کلکتہ۔ (۲۳) مولانا محمود احمد صاحب نانوتوی، مفتی مدھیہ بھارت (مہوکینٹ) (۲۴) مولانا حامد الانصاری صاحب غازی، سابق مدیر مدینہ بجنور و جمہوریت بمبئی وغیرہ۔ (۲۵) مولانا منظور احمد صاحب نعمانی (مدیر الفرقان) (۲۶) مولانا سلطان محمود صاحب سرحدی۔ (۲۷) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی۔ (۲۸) مولانا محمد تقی صاحب دیوبندی۔ (۲۹) مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی۔ (۳۰) قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی۔ (۳۱) مولانا محمد صاحب انوری، لائل پوری۔ (۳۲) مولانا غلام غوث صاحب سرحدی (۳۳) مولانا عبد الرحمٰن صاحب کامل پوری۔ سابق صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور۔ (۳۴) مولانا شائق احمد صاحب عثمانی، ایڈیٹر عصر جدید، کراچی۔ (۳۵) مولانا قاری اصغر علی صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔ (۳۶) مولانا عبد الحق صاحب نافع سابق استاذ دار العلوم۔ (۳۷) مولانا عبد الوہاب صاحب مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔ (۳۸) مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔ (۳۹) مولانا فیض اللہ صاحب مفتی مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔ (۴۰) مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی مرحوم۔ (۴۱) مولانا محمد یوسف صاحب سابق میر واعظ کشمیر۔ (۴۲) احقر محمد میاں دیوبندی۔ (۴۳) مولانا سیّد اختر حسین صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔ (۴۴) مولانا یعقوب الرحمان صاحب عثمانی۔ (۴۵) مولانا فیوض الرحمٰن صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور۔ (۴۶) مولانا عبد الحنان صاحب ہزاروی۔ (۴۷) مولانا آل حسن صاحب دیوبندی مقیم میرٹھ۔ (۴۸) حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائپوریؒ۔ (۴۹) حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ۔ (۵۰) مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی۔ (۵۱) مولانا غلام اللہ خاں صاحب راولپنڈی۔

حضرت شاہ صاحب سے دو ملاقاتیں

(از: (پروفیسر) سیّد ابوظفر ندوی ریسرچ اسکالر گجرات وِدّیا سبھا (احمد آباد)

حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب محدث کشمیری دیوبند سے میری پہلی ملاقات جامع مسجد احمد آباد میں اس وقت ہوئی، جب مولانا حسین احمد صاحب مدنی احمد آباد کی سابر متی جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب بھی تھے۔ دونوں حضرات کو (یاد آتا ہے) قصبہ آنند میں کسی تبلیغی ضرورت سے دعوت دی گئی تھی۔ اور وہاں سے فارغ ہو کر، احمد آباد تشریف لائے۔

جامع مسجد میں پہلے مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے کچھ تقریر کی اور پھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کا بیان ہوا۔ جس کو عوام نے بہت پسند کیا۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کچھ نہ بولے۔

خاکسار اس وقت عربی، مصری لباس میں تھا، جو جاذب نظر تھا، اور جناب شاہ صاحب سے قریب تر، اس لیے حضرت شاہ صاحب نے مجھ ہی سے تخاطب کی ابتداء کی۔ میرا نام اور کام پوچھ کر خاموش ہو گئے۔ پھر خاکسار نے کچھ باتیں دریافت کیں، جن کا جواب دے کر حضرت موصوف پھر خاموش ہو گئے اور مجھے افسوس ہے کہ وہ باتیں اب مجھے یاد نہیں رہیں۔

اس زمانہ میں جمعیۃ العلماء کا ناظم بندہ تھا، اور خلافت آفس میں اس کا بھی دفتر تھا، سہ پہر کالج سے آ کر اسی جگہ شام تک جمعیۃ کا کام انجام دیتا تھا۔

جامع مسجد میں حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کے دوسرے دن جب جمعیۃ کے دفتر پہنچا، تو حضرت شاہ صاحب کو دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھا دیکھا، خاکسار بھی پاس ہی جا بیٹھا، سلام مسنون اور مصافحہ کے بعد میری خیریت دریافت کی، اور پوچھا کہ کالج میں آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ عرض کیا کہ عربی، فارسی اور اردو، پوچھا کہ فارسی کی کون کتاب؟ جواب دیا کہ دیوان حافظ، ایف، اے کو، اور، شاہنامہ فردوسی، بی، اے، کو، ارشاد ہوا کہ شاہ نامہ کا کونسا

حصّہ؟ عرض پرداز ہوا کہ سہراب اور رستم کا بیان۔ حضرت شاہ صاحب اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ اور منتظر رہا کہ شاید کچھ اور ارشاد فرمائیں گے۔ لیکن جب دیر تک سکوت رہا تو خاکسار نے خود ہی ابتداء کی، اور مختلف مسائل پر گفتگو کی، اور اس وقت آنجناب کی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ تھوڑا بہت ہوا۔ اور میرے دل میں اسی دن سے آپ کی وقعت پیدا ہو گئی۔

میں جب رنگون میں تھا، تو نوجوانوں نے "مجمع الاحباب" نامی ایک انجمن قائم کی اور اس کے ماتحت ایک تبلیغی کمیٹی قائم کی۔ خاکسار اس کا صدر تھا۔ اس کمیٹی نے رنگون سے متصل "جوگاؤں" بستی میں ایک عربی مدرسہ تبلیغیہ، کی بنیاد رکھی تاکہ مبلغین پیدا کیے جائیں۔ چھٹا درجہ پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ طلبہ دیو بند، مدرسہ امینیہ دہلی اور ندوہ بھیجے گئے، خاکسار ان دنوں رنگون سے واپس آکر احمد آباد کے مہاودیالیہ میں فارسی، عربی کا پروفیسر تھا۔ سال میں دو دفعہ طویل چھٹیوں میں وطن جایا کرتا۔ دہلی راستہ میں ہونے کے باعث میرے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ دہلی اور دیو بند، میں قیام کر کے رنگونی طلبہ کی علمی حالت کی رپورٹ بھیجا کروں۔

اسی سلسلہ میں ایک دفعہ دیو بند جانا ہوا۔ مولوی جعفر رنگونی کے یہاں قیام کیا، طلبہ کے اخلاقی اور علمی معلومات حاصل کئے، اور ان کی ضرورتوں کو بھی رپورٹ میں شامل کر لیا۔ فرائض منصبی سے فارغ ہونے کے بعد بغرض تفریح باہر نکلا، نماز عصر مسجد میں ادا کر کے باہر سائبان میں ایک طالب علم سے باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے میرے مونڈھے پر ہاتھ رکھا، اور السلام علیک کی سریلی آواز کان میں گونجی، آواز آشنا معلوم ہوئی، پھر کر دیکھا تو ایک فرشتہ صورت و سیرت مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔ میں ادب سے کھڑا ہو گیا، اور سلام کے بعد مزاج پرسی کی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا، کہ احمد آباد سے آپ کب آئے؟ عرض کیا کہ آج ہی حاضر ہوا، ارشاد ہوا کہ آپ کہاں ٹھیرے ہیں؟ میرا غریت خانہ حاضر ہے۔ یہ سن کر محوِ حیرت ہو گیا، میری اور حضرت کی ملاقات احمد آباد میں ایک سرسری ملاقات تھی۔ کوئی گہری ملاقات نہ تھی، جو اپنے دولت کدہ پر قیام کی دعوت دیتے، اور پھر حافظہ کا یہ عالم کہ برسوں کے بعد یہ ملاقات ہوئی تھی، اور مجھے بھولے نہیں اور دیکھتے ہی شناخت کر لیا، بیشک!

حافظ حدیث کا حافظہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ چند منٹ کے بعد مجھے سکون ہوا، تو سر سے قدم تک میں نے ایک نظر دیکھا، سفید ریش، بڑی بڑی آنکھیں، نکلتا قد، کیا کہوں آپ سے، بس دل میں کھپ گئے، اور تاریخوں میں صحابہ کے جو حالات پڑھے تھے اس کا ایک نمونہ سامنے کھڑا نظر آیا، پھر کمال اخلاق سے کھڑے کھڑے تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے، اس دن سے میرے دل میں آپ کی عظمت کا جو سکّہ بیٹھا، اس کا اثر آج تک ہے۔ اسی اخلاق حمیدہ نے میرے لیے آئندہ ملاقات کا دروازہ کھول دیا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق مجھ سے مضمون لکھنے کی جو فرمائش کی ہے اس سے میں فائدہ اٹھاؤں۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق اپنے تأثرات کو تفصیل سے بیان کروں۔ مگر یہ مختصر تحریر میں تکلیف دہ علالت کی حالت میں لکھ رہا ہوں، میرے لیے بصورت موجودہ ممکن نہیں کہ طویل مضمون لکھ سکوں۔ سردست ان ملاقاتوں کے ذکر پر اپنا سلسلۂ گفتگو ختم کرتا ہوں۔

حضرت الاستاذ محدث کشمیری رحمہ اللہ

از: جناب مولانا محمد صاحب انوری رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للّٰہ و کفٰی و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی.

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی شاہجہان پوری کا ایک رسالہ ,,روض الریاحین،، ہے جو عربی فصاحت و بلاغت کا قابل قدر آئینہ اور علم و علماء کا تذکرۂ مبارک اور مدرسہ امینیہ دہلی کی مختصر تاریخ ہے۔ یہ رسالہ حضرت مولانا امین الدین صاحب مرحوم کے ارشاد پر لکھا گیا۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ اسرارہم کی منقبت و فضائل میں بھی ایک طویل عربی قصیدہ اس سے ملحق ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ امینیہ کے علماء کے مناقب بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ

و نختم ذا الکلام بذکر حبر ۞ فقید المثل علام فرید

اب ہم ایک بڑے عالم کے ذکر پر کلام کرتے ہیں، وہ بے نظیر علامہ یکتائے زمانہ ہیں۔

مریغ العلم مقتض الفنون ۞ لہ کل المزایا کالمصید

وہ علم کو ڈھونڈ نکالنے والے فنون کو شکار کرنے والے ہیں، تمام فضیلتیں ان کے فتراک کا شکار ہیں۔

نبیہ فائق الاقران یدعیٰ ۞ بانور شاہ موموق الحسود

بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جن کو انور شاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے حاسدوں کے محبوب ہیں۔

فھذا الحبر غارس ذا النخیل ۞ و اول موقظ القوم الرّقود

کیوں کہ یہ علامہ اس درخت کے لگانے والے ہیں، اور سوتی قوم کو اول اول جگانے والے۔

اسی رسالہ کے ص ۸ کی شکل میں اپنے قلم سے حضرت مفتی صاحب نے حضرت شاہ

صاحب رحمہ اللہ کے حالات لکھے ہیں:

''علامہ فہامہ جناب مولانا مولوی سید محمد انور شاہ صاحب ساکن کشمیر ؒ بے نظیر شخص ہیں، ذہن وذکاء، ورع وتقویٰ میں فرد کامل، مدرسہ ہذا میں ابتداءً مدرس اول تھے، بلکہ جیسا کہ آئندہ اشعار میں ذکر کیا گیا ہے اس شجر علم کے لگانے والے آپ ہیں، کیوں کہ مولانا محمد امین الدین صاحب جب دہلی تشریف لائے اور مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے پاس نہ سامان تھا نہ روپیہ آپ نے محض متوکلاً علی اللہ سنہری مسجد میں پڑھانا شروع کیا، مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب آپ کے شریک تھے، دونوں صاحبوں نے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں، فاقے کیے، مگر استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آہستہ آہستہ اہل دہلی کو خبر ہوئی اور لوگ متوجہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مدرسہ اس حالت کو پہنچا جو آپ کی نظر کے سامنے ہے۔ غرض کہ ابتدائی زمانہ کی کس مپرسی کی حالت میں مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب اس مدرسہ کے اعلیٰ واوّل محسن ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرنا اور ہمیشہ ان کو یاد رکھنا اہل مدرسہ پر فرض ہے، مولانا نے ایک عرصہ تک مدرسہ ہذا میں درس دیا، اور طلبہ کو مستفید فرمایا۔ پھر والدین سلمہما اللہ تعالیٰ کے تقاضے اور اصرار سے وطن تشریف لے گئے، ۱۳۲۵ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ واپسی پر دہلی میں دو ماہ قیام فرمایا، اور اب بھی وطن میں تشریف رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ مولانا کو تا دیر سلامت رکھے، اور ان کے بے نظیر علمی کمال سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے''۔ آمین!

حضرت رائپوری مدظلہٗ نے فرمایا کہ میں جن ایام میں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں مدرسہ امینیہ میں پڑھتا تھا حضرت شاہ صاحب ؒ ڈیڑھ پیسہ کی روٹی منگا کر کھایا کرتے تھے، سارا دن درس متعدد علوم فنون کا دیتے، دوپہر کو شدت گرما جون اور جولائی کے مہینے میں کتب بینی فرماتے جبکہ ہر شخص دوپہر کی نیند کے مزے لیتا ہوتا تھا۔ موسم سرما میں دیکھا گیا ہے کہ بعد نماز عشاء صبح صادق تک مطالعہ فرما رہے ہیں اور اوپر کی رضائی کہیں سے کہیں پڑی ہوئی ہے، مغرب سے عشاء تک ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے۔

آہ! اب حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی بھی نور اللہ مرقدہم ہو چکے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

بگذ از از یادگل و گلبن کہ ہیچم یادنیست ❁ در زمین وآسماں جز نام حق آباد نیست

بررواں رہ رواں ہم رحمتے بفرستہ باش ❁ حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست

شرح حال خود نمودن شکوۂ تقدیر نیست ❁ نالہ بر سنت نمودن نوحہ و فریاد نیست

(مرثیہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ)

میر تقی میرؔ کہتے ہیں ؎

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں ❁ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا یک بارگی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ❁ کلی نے یہ سنکر تبسّم کیا

سحر گوش گل میں کہا میں نے جاکر ❁ کھلے بند مرغ چمن سے ملا کر

لگا کہنے فرصت ہے یاں اک تبسّم ❁ سو وہ بھی گریباں میں منہ کو چھپا کر

(میرؔ)

ہر آنچہ زاد بناچار بایدش نوشید ❁ زجام دہر مئے کلّ من علیہا فان

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ فرماتے ہیں ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی ❁ کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

حال دنیا رابہ پرسیدم من از فرزانۂ ❁ گفت یا خواب است یا باد است یا افسانۂ

باز پرسیدم بحال آنکہ در وے دل بہ بست ❁ گفت یا غول است یا دیوے است یا دیوانۂ

موت العالم موت العالم حضرت مفتی صاحب کا وصال فرد واحد کا مرنا نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی موت ہے ؎

وماکان قیس ہلکہ ہلکُ واحدٍ ❁ ولـکـنـہ بنیان قوم تہدّما

عالم میں بہت سے ایسے نفوس قدسیہ ہوتے ہیں جن کی زندگی مرکز ثقل کا حکم رکھتی ہے، ان کا عالم بقاء کو کوچ ستون کا مرکز ثقل سے ہل جانا ہے۔ تدریس حدیث وافتاء وارشاد و تلقین ہی یتیم نہیں ہوئے، بلکہ سیاست کا بہت بڑا امام، معاشرت کا عظیم الشان حکیم، رخصت ہوا۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہٗ العالی نے فرمایا، ابھی ابھی لائل پور میں کسی

نے سوال کیا کہ صاحب حکمت کون لوگ ہوتے ہیں؟ فرمایا: ۔ مثلاً ''حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب'' اسکے ایک ہفتہ بعد وصال کی خبر شائع ہوگئی۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؎

کفایت اللہ استاذ افاضل ۞ کہ چشمِ جہان مثل اودید کمتر (۱)

حضرت مفتی صاحب سے ہمارے شاہ صاحب قدس سرہٗ کو بہت تعلق اور شغف تھا بھاول پور کے مقدمہ پر جب حضرت تشریف لے گئے، احقر بھی ہمراہ تھا۔ لاہور پہنچ کر فرمایا، مولانا کفایت اللہ صاحب ملتان جیل میں ہیں ان سے مل کر آگے جانے کا خیال ہے۔ چنانچہ ملتان کا ٹکٹ لیا گیا۔ اسٹیشن پر خدام کا مجمع استقبال کے لیے موجود تھا شہر میں تشریف لے جاتے ہی تقاضا فرمایا کہ ہمیں سنٹرل جیل مولانا سے ملاقات کرنا ہے، مجلس احرار کے کارکنوں نے اجازت حاصل کرنے کا انتظام کیا، احقر کو بھی ساتھ لیا۔ جیل تشریف لے گئے۔ حضرت مفتی صاحب کو جب معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں، گویا عید ہوگئی، اپنی کوٹھری سے ملاقات کے کمرے میں تشریف لائے، معانقہ مصافحہ ہوا، دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ بار بار حضرت سے خیریت دریافت کرتے تھے، بڑی ہی مسرت کا اظہار فرمایا، احقر سے بار بار پیار فرماتے۔ پھر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولانا قاری عبدالرحمٰن مرحوم، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا داؤدغزنوی۔ مظہر علی اظہر، چودھری افضل حق صاحبان یہ سب حضرات بھی چوں کہ اسی جیل میں نظر بند تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی زیارت کے لیے جمع ہوگئے عجیب مجلس تھی۔ مولانا داؤد صاحب غزنوی نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کی وساطت سے حضرت شاہ صاحبؒ سے عرض کیا کہ وہ مفردات القرآن علامہ راغب اصبہانی کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں، حضرت بہت خوش ہوئے اور مولانا کے دریافت کرنے پر بہت سی کتب کے نام نوٹ کروادیئے جن سے امداد لی جاسکے۔ زمانہ جیل میں علمی و دینی خدمات تحریری کے متعلق سب حضرات سے فرداً فرداً بھی گفتگو فرماتے رہے، ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی آخر میں فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہؒ کو حکومت نے جب جیل بھیجا تو

(۱) یہ حضرت شیخ الہند کا شعر ہے، مولانا غلام رسول مرحوم کے مرثیہ میں ہم نے نام بدل دیا ہے۔

آپ سے دریافت کیا کہ شاگردوں میں کون صاحب زیادہ محبوب ہیں؟ آپ نے حافظ ابن قیمؒ کا نام لیا، ان کو بھی ساتھ ہی نظر بند کردیا گیا، کسی چیز کو ضرورت ہو تو کہئے۔ آپ نے کاغذ، قلم، دوات طلب کی، یہ سامان دیدیا گیا، آپ نے لکھ لکھ کر سب کاغذات پر کردیئے، اس کے بعد جیل کی دیواروں پر لکھنا شروع کردیا۔ یہ حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب مرحوم اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی طرف اشارہ تھا کہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ ان کے محبوب شاگرد کو بھی نظر بند کیا گیا۔ حضرت مفتی صاحب جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس منتظمہ کا کوئی اجلاس کامیاب نہیں سمجھتے تھے جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی شمولیت نہ ہو، اکثر مشاورت کے لیے خود دیوبند تشریف لاتے یا حضرت کو تار دے کر دہلی بلاتے۔ رسالہ فصل الخطاب فی مسئلة ام الکتاب جب مطبع قاسمی والوں نے جلد طبع کر کے نہ دیا تو کاپیاں احقر اور مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈوی کے ہاتھ حضرت مفتی صاحب کے پاس دہلی بھیجیں تاکہ اپنی نگرانی میں طبع کرادیں۔ حضرت مفتی صاحب اکثر علمی تحقیقات حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش فرماتے رہتے تھے۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب حقانیت اسلام کی زندہ حجۃ ہیں، ان کا اسلام میں وجود دین اسلام کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ فرماتے تھے، مولانا انور شاہ صاحب کے ایک ایک فقرے پر ایک رسالہ تصنیف کیا جاسکتا ہے۔

حضرت تھانویؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے میں نے اس قدر استفادہ کیا ہے کہ میرے قلب میں ان کا احترام اسی طرح ہے جیسا کہ اپنے اساتذہ کا، گو میں نے ان کی باقاعدہ شاگردی نہیں کی۔

شوال ۱۳۳۸ھ میں جب احقر دورۂ حدیث میں شامل ہونے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا تو سامان دارالعلوم کے حجرے میں رکھتے ہی حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لیے حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوا، دیکھا کہ علماء و صلحاء کا عظیم اجتماع ہے، گرمی کا وقت ہے، ایک بزرگ چھت کے پنکھے کا رسہ کھینچ رہے ہیں اور نرم نرم مترنم آواز میں فرما رہے ہیں، بھائی بیٹھ جاؤ حضرت کے ارد گرد بھیڑ نہ کرو، ہوا لگنے دو۔ وہ بزرگ حضرت شاہ صاحب

" تھے۔ بعد عصر شیخ الہندؒ کی سہ دری کے سامنے چار پائی بچھائی جاتی، چاروں طرف کرسیاں رکھی جاتیں، چار پائیاں بچھ جاتیں علماء صلحاء وطلباء دار العلوم بقصد زیارت جمع ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب بھی دبے پاؤں آ کر دور بیٹھ جاتے، حضرت کی جب نظر پڑتی تو اپنے پاس والی کرسی پر بٹھاتے حضرت شیخ الہندؒ جب مسائل بیان فرمانے لگتے۔ سبحان اللہ علوم و معارف کا بحر زخار موجیں مارنے لگتا۔ کبھی کسی مسئلہ پر فرماتے، بھئی اسکے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے پوچھنا چاہئے، کیوں شاہ صاحب یہ مسئلہ یوں ہی ہے؟ عرض کرتے، ہاں حضرت فلاں محقق نے یوں ہی لکھا ہے۔ مالٹا سے جب حضرت واپس تشریف لائے تو نصاریٰ سے ترکِ موالات کا مسئلہ زیر غور تھا۔ قرار پایا کہ حضرت شاہ صاحب سے یہ مسئلہ تحریر کرایا جائے۔ حضرت نے فتویٰ لکھا اور حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہو کر نہایت ادب سے بیٹھ کر سنایا۔ احقر نے دیکھا کہ صرف دس سطور تھیں لیکن ایسا جامع مانع کہ حضرت شیخ الہندؒ نہایت محظوظ ہوئے۔ احقر کے والد ماجد مرحوم چوں کہ اس روز زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے تھے، اس لیے احقر بھی وہاں حاضر تھا۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی۔ بس یہ حضرات حاضر تھے۔

جس روز احقر دیوبند حاضر ہوا تو حضرت شیخ الہندؒ کی دعوت مع خدام زائرین، حضرت شاہ صاحبؒ کے ہاں تھی، بعد نماز مغرب تین صد سے زائد مہمان حضرت کی معیّت میں نودرہ کی چھت پر تشریف فرما ہوئے۔ عجیب انوار و برکات کا نزول ہو رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحب وجد کے عالم میں تھے، کھانے سے فراغت کے بعد حضرت دیر تک تشریف فرما رہے۔

ایک دفعہ احقر حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر تھا، دن کے دس بجے ہوں گے، بارش ہو رہی تھی، فرمانے لگے، بھائی مولوی محمد حسن صاحب! شاہ صاحب کے ہاں چلنا ہے آج انہوں نے ہمیں مہمانوں سمیت مدعو کیا ہے۔ حکیم صاحب فرمانے لگے، حضرت بارش تو ہو رہی ہے، کھانا یہیں منگا لیا جائے گا۔ فرمایا، نہیں بھائی میرے ایک مخلص نے دعوت کی ہے، وہیں جاؤں گا۔ چنانچہ بارش ہی میں چل دیئے راستے میں سامنے سے شاہ صاحب تشریف لا رہے تھے، عرض بھی کی کہ کھانا، در دولت پر پہنچا دیا جائے۔ فرمایا، کچھ تکلیف

نہیں، آپ کے گھر پر کھانا کھائیں گے۔

احقر ایک دفعہ ہوشیار پور میں مولانا گرامی سے ملنے گیا (۱۹۲۵ء میں احقر چھ ماہ ہوشیار پور میں ایک عربی مدرسہ میں مدرس رہا تھا) گرامی صاحب کہنے لگے کہ آپ نے حدیث مولانا محمود الحسن صاحب سے پڑھی یا مولانا انور شاہ صاحب سے؟ میں نے عرض کیا، حدیث تو شاہ صاحب مدظلہٗ ہی سے پڑھی ہے، ہاں بیعت حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے دست مبارک پر کی ہوئی ہے۔ خوش ہوئے، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر فرمانے لگے، میں نے شاہ صاحب کی شان میں بہت سے اشعار کہے ہیں، ایک شعر یہ ہے ۔

چہ فصاحت چہ بلاغت چہ معانی چہ بیاں ❁ جلوہ فرمائے در آغوش زبانِ انور

اسی شعر کو جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے گئے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا مرثیہ بھی سنایا ۔

ماتم عشق دل زندہ تماشا دارد ❁ خضر از خویش شد و مرگ تمنا کرد

از کجا تا بکجا ماتم شیخ الہند است ❁ نالہ برخورد بگوشم کہ مسیحا می کرد

حضرت مولانا سیدنا شاہ عبد القادر رائپوری دام ظلہم العالی فرماتے تھے کہ کچھ دنوں میں نے بھی حضرت شاہ صاحب سے پڑھا ہے، ابھی میں سنہری مسجد میں، مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل نہ ہوا تھا دوسری درسگاہوں میں پڑھتا تھا، پتہ چلا کہ حضرت مولانا کریم بخش صاحب مرحوم لدھیانوی (جو مدرسہ عربیہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں تیس سال مدرس اول رہے، ہر فن میں کمال تھا خصوصاً علم ہیئت اور ریاضی کے تو امام تھے) گلاؤٹھی سے حضرت شاہ صاحب کے پاس آئے ہوئے ہیں، میں ملاقات کے لیے مسجد سنہری میں گیا، دیکھا ایک حجرے میں دروازہ بند کر کے اندھیرے میں حضرت شاہ صاحب ذکر دوضربی جہر کے ساتھ کر رہے ہیں اللہ اللہ اللہ، دیر تک اسم ذات کا ذکر کرتے رہے۔ اس وقت عمر شریف اکیس بائیس سال کی ہوگی فرمایا، جب حضرت شاہ صاحبؒ بازار نکلتے، تو سر پر رومال ڈال کر آنکھوں کے سامنے پردہ کر کے نکلتے مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔ فرمایا، میں نے ملاحسن، میبذی حضرت سے پڑھی ہیں۔ جب تقریر کرتے تو کہیں سے کہیں، نکل جاتے، ایسا معلوم ہوتا کہ ساری عمر فلسفہ اور منطق میں صرف کردی ہے۔ حضرت شاہ صاحب بھاول پور کے سفر میں

احقر سے فرماتے تھے مولانا عبدالقادر جو حضرت رائپوری خلیفہ ہیں، ترمذی شریف مجھ سے پڑھا کرتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالقادر دام ظلہ فرماتے ہیں کہ واقعی حضرت شاہ صاحب آیۃ من آیات اللّٰہ تھے۔ فرمایا میں تو غیر مقلد ہو گیا تھا حضرت شاہ صاحب کی برکت سے حنفی مذہب پر استقامت نصیب ہوئی۔ فرمایا ایک مشہور اہلحدیث عالم سے حضرت شاہ صاحبؒ کا مناظرہ ہوا، غالباً گلاؤٹھی ہی کا واقعہ ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور دیگر بزرگار دین جمع تھے۔ حضرت نے ان سے دریافت فرمایا، کہ آپ کو محدث ہونے کا دعویٰ ہے صحیح بخاری کی وہ طویل حدیث جس میں ہرقل اور ابوسفیان کا مکالمہ مذکور ہے جتنے طریق سے امام نے نقل کی ہے سنادو، وہ بیچارے سنا نہ سکے، کہنے لگے، کہ آپ ہی سنادو، تو شاہ صاحب نے ساری حدیث سنادی، بلکہ دور تک پہنچ گئے حتی کہ نصف پارہ تک پہنچ گئے۔ وہ صاحب فرماتے ہیں کہ بس کافی ہے۔

حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمہ اللہ کندیاں ضلع میانوالی کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ حضرت مولانا احمد خاں صاحبؒ قصبہ سلیم پور ضلع لدھیانہ تشریف لائے، احقر کو پتہ چلا، زیارت کے لیے حاضر ہوا، مولانا عبداللہ سلمہٗ کے، مکان پر قیام تھا، مولانا عبداللہ صاحب اور مولانا عبدالغنی صاحب مفتی مالیر کوٹلہ مرحوم نے تعارف کرایا، اور مولانا عبداللہ صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کا خادم ہے اور حضرت بھی اس پر خاص نظر عنایت رکھتے تھے، اور میں نے بھی ان سے کچھ پڑھا ہے میرے استاذ ہیں، حضرت مولاناؒ نے بہت ہی شفقت فرمائی، آدھی رات تک گفتگو فرماتے رہے، حضرت شاہ صاحب کا بھی ذکر شروع رہا۔ دوسرے روز پھر بعد نماز فجر احقر سے حضرت ہی کا تذکرہ فرماتے رہے۔ فرمایا کہ جب مولانا حسین علی صاحب نے حضرت شاہ صاحب کو میانوالی جلسہ پر مدعو کیا، حضرت تشریف لائے نہایت بصیرت افروز تقریر فرمائی، میں بھی حاضر ہوا، مجمع کثیر تھا ہزارہا مخلوقِ خدا جمع تھی۔ سینکڑوں علماء زیارت کے لیے حاضر ہوئے تھے، میں نے کندیاں کا عرض کیا۔ درخواست قبول فرما کر میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ میں نے اپنے کتب خانہ کی سیر کرائی، نہایت مسرور ہوئے۔ میں نے سب لوگوں کو کمرہ سے باہر بٹھا

دیا، اور حضرت کئی گھنٹے مختلف کتب کا مطالعہ فرماتے رہے اور ''نوادر الاصول'' حکیم ترمذی کی نکال کر فرمایا کہ یہ کتاب مستعار دیوبند لے جانے کے لیے عنایت کریں، دو ماہ تک واپس ارسال کردی جائے گی۔ کندیاں میں علماء نے حضرت سے علمی استفادے کیے لیکن میں حضرت کی میزبانی میں مصروفیت کے باعث استفادہ سے محروم رہا، اس کا افسوس رہا فرمایا، کہ ایک صاحب نے حاضرین میں سے عرض کیا مولانا نے مسئلہ خضاب پر ایک تحقیقی تحریر لکھی ہے، حضرت نے مجھے فرمایا کہ سنا ہے کہ آپ نے کوئی تحقیق، خضاب پر فرمائی ہے، میں نے لاکر پیش کی، غور سے ملاحظہ فرماتے رہے لیکن زبانِ مبارک سے کچھ نہ فرمایا۔

فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب کاملین میں سے تھے، آپ کے وصال سے علماء یتیم ہوگئے، طلبہ کو تو حدیث پڑھنے کے لیے اساتذہ مل سکتے ہیں۔ لیکن علماء کی پیاس کون بجھائے گا۔ غرض کئی گھنٹے حضرت مرحوم حضرت شاہ صاحب ہی کا ذکر خیر فرماتے رہے(۱)۔

حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ والی بھچران ضلع میانوالی خدام الدین لاہور کے جلسہ پر تشریف لائے چونکہ حضرات علماء دیوبند کثر اللہ سوادہم بھی تشریف فرما تھے حضرت شاہ صاحبؒ۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم مرحوم، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم، مولانا مرتضٰی حسن صاحب مرحوم وغیرہم سب ایک مکان میں قیام پذیر تھے۔ حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ ملاقات کے لیے تشریف لائے، دو گھنٹے تک ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے ملاقات کرکے بہت متاثر ہوئے، اپنے شاگردوں کو حدیث کا درس دے کر کتب حدیث ختم کرانے کے بعد فرمایا کرتے، اگر فن حدیث میں بصیرت حاصل کرنے کی آرزو ہے تو حضرت شاہ صاحب کے پاس جاؤ، دیوبند، پھر ڈابھیل طلبہ کو اہتمام سے بھیجتے۔ احقر پر بڑی شفقت فرمایا کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ مولانا انور شاہ صاحب بڑے محدث ہیں۔

حضرت مولانا خود بھی بلند پایہ کے بزرگ علامہ محدث اور مفسر تھے، ترجمۃ القرآن کا

---

(۱) یہ بزرگ بہت بڑے علامہ محدث مفسر اور عارف باللہ تھے۔ سلسلۂ ارشاد و تلقین بہت وسیع تھا مجددی سلسلہ میں بیعت لیتے تھے، نہایت بلند پایہ اخلاق کے مالک تھے، کتب خانہ عظیم الشان فراہم فرمایا تھا، نظیف اور نہایت زکی تھے۔۱۲

درس مشہور تھا علماء دور دور سے آپ کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتے۔ حضرت خواجہ محمد عثمان موسیٰ زئی شریف کے اجلہ خلفاء میں سے تھے، حضرت شاہ صاحب سے فرمانے لگے، مولانا سراج احمد حضرت کے صاحبزادہ صاحب نے احادیث مبسوط سرخسیؒ کی تخریج کی ہے کچھ حصہ مکمل فرمالیا ہے، حضرت نے فرمایا، بدائع کی تخریج فرماتے تو بہت اچھا ہوتا۔ مولانا حسین علی رحمہ اللہ حضرت عالی مولانا گنگوہی قدس سرہٗ العزیز کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۳۰۲ھ میں حدیث، گنگوہ حاضر ہو کر پڑھی، خود اپنی زبان مبارک سے فرماتے تھے۔ معقولات رام پور میں پڑھیں فنافی التوحید تھے۔ طحاوی شریف کی تلخیص لکھی ہے، طبع ہو چکی ہے۔

عارف باللہ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرق پوریؒ نے جب حضرت شاہ صاحبؒ کا نام اور شہرت سنی تو دعاء فرمایا کرتے کہ زندگی میں شاہ صاحب کی زیارت ہو جائے۔

ایک دفعہ لاہور حضرت کی تشریف آوری سن لی، کار بھیج کر دعوت دی، حضرت نے پہلے تو انکار فرمادیا۔ لیکن مولانا احمد علی صاحب دام ظلہٗ کے اصرار پر منظور فرمالیا، شرق پور پہنچے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرق پور کو مشرف فرمایا، حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ بہت ہی ممنون ہوئے۔ حضرت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے کہ آپ نائب رسول ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ جناب کے چہرۂ مبارک پُر انوار کو دیکھتا ہی رہوں، گفتگو فرماتے رہے اور حضرت شاہ صاحب خاموش سنتے رہے، کہیں کہیں کچھ ارشاد بھی فرماتے رہے، میاں صاحب مرحوم نے فرمایا مجھے نجات کی انشاء اللہ تعالیٰ توقع ہو گئی ہے۔ حضرت جب واپس چلنے لگے تو برہنہ پاء پختہ سڑک تک ساتھ مشایعت کے لیے تشریف لائے، جب موٹر چلنے لگی تو پچھلے پاؤں واپس ہوئے، فرمانے لگے کہ دیوبند میں چار نوری وجود ہیں ایک ان میں سے حضرت شاہ صاحب ہیں۔ میرے ایک مخلص دوست کہتے ہیں کہ میں نے دیوبند میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کی، حضرت شرق پور تشریف لے گئے تھے، میاں صاحب کو کیسا پایا؟ فرمایا، میاں صاحب عارف ہیں اور صحیح معنی میں عارف ہیں۔

علامہ علی مصری حنبلی صحیحین کے تقریباً حافظ تھے، مصر سے سورت آئے، وہاں سے دہلی مولوی عبدالوہاب اہلحدیث کے پاس صدر بازار میں غالباً آئے، نماز کے اوقات کے

متعلق ان سے مناظرہ ہو گیا، مولوی عبدالوہاب صاحب نے ان کو نکلوا دیا، بیچارے نو وارد مسافر تھے پریشان تھے، سورت سے چوں کہ راندیر بھی گئے تھے اور مولانا مہدی حسن صاحب دام فیوضہم سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا نے ان کو دیوبند حاضری کا مشورہ دیا تھا۔ دہلی میں جب پریشان پھر رہے تھے تو کسی نے ان کو پھر دیوبند جانے کا مشورہ دیا۔ فرمانے لگے، میں دیوبند نہیں جاؤں گا، کیوں کہ اہلحدیث نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے حالانکہ حنابلہ کا مذہب اہلحدیث سے اقرب ہے، دیوبند تو حنفیہ کا مرکز ہے وہاں خدا جانے کیا سلوک ہوگا۔ آخر کسی سیٹھ کے پاس اپنا نقد اور سامان امانت رکھ کر دیوبند آنے جانے کا کرایہ لے کر چلے۔ دیوبند مدرسہ میں ظہر کی نماز سے قبیل پہنچ گئے، نماز کی جماعت کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کی عادت تھی کہ دائیں بائیں سامنے اور پیچھے چاروں طرف طائرانہ نظر ڈال کر دیکھا کرتے تھے، کئی ایک امور ان کے ذہن میں ہوتے تھے، ان میں سے ایک یہ کہ کوئی نو وارد ہوتا تو اس کی تحقیق فرماتے۔ چنانچہ علامہ علی کو بھی دیکھا پاس گئے، حالات پوچھے۔ مہمان خانہ میں جو صحن مسجد کے جانب جنوب ہے لے گئے۔ خدمت کی، علامہ خوش ہو گئے، عرب طلبہ جو اس وقت پڑھتے تھے ملنے آئے، اس پر ان کو مزید انبساط ہوا، وحشت اور اجنبیت دور ہوئی۔ فرمانے لگے، یہ علمائے دیوبند بہت بڑے مہمان نواز اور کریم النفس ہیں، یہ لوگ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قدم بقدم چلنے والے اور متبع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہوتے ہیں، میں یہاں آ کر محظوظ ہوا۔

مولوی محمد یحییٰ یمنی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یہ لوگ علوم وفنون میں بھی فائق الاقران ہیں، علامہ نے کہا یہ بات میں ماننے کو تیار نہیں "هم اعجام" یہ بے چارے تو عجمی ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد چند عرب طلبہ ان کو لے کر باہر سیر کے لیے نکلے، یہ حضرات مزارات کی طرف جا رہے تھے، ایک صاحب نے علامہ علیؒ کے ہاتھ میں "القاسم" کا وہ نمبر دیا جس میں شاہ صاحب کا عربی قصیدہ مرثیہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ درج تھا، یہ چالیس ابیات پر مشتمل ہے۔ علامہ نے دیکھا، فوراً فرمایا "اِنّی تبت من اعتقادیٔ" میں نے اپنے پہلے خیال سے رجوع کر لیا"۔ اس قصیدہ سے زمانۂ جاہلیت کی مہک آ رہی ہے بلیغ قصیدہ ہے،

میں اس عالمِ دین کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ سے سرسری ملاقات ہوئی۔ اگلے دن صبح کے وقت حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کے صحیح مسلم شریف کے درس میں جا بیٹھے، مولانا مرحوم نے عربی زبان میں تقریر فرمائی، علامہ علیؒ نے اعتراضات کرنا شروع کیے، مولانا جواب دیتے رہے، درس ختم ہوا، تو مولوی محمد یحییٰ یمنی سے فرمایا کہ یہ شخص بہت بڑا عالم دین ہے لیکن میری تسلی نہ ہوسکی، اس کے بعد بخاری شریف کے درس میں حاضر ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی بلیغ عربی میں تقریر فرمائی، علامہ نے کچھ سوالات کیے، حضرت جواب دیتے رہے، درس کے بعد فرمانے لگے، کہ میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علمائے زمانہ سے ملا ہوں، خود مصر میں کئی سال حدیث شریف کا درس دیا ہے میں نے شام سے لیکر ہند تک اس شان کا کوئی محدث اور عالم دین نہیں دیکھا، میں نے ان کو ہر طرح بند کرنے کی سعی کی، لیکن ان کے استحضار علوم اور تیقظ، حفظ اور اتقان، ذکاوت اور وسعت نظر سے میں حیران رہ گیا۔ بالآخر علامہ نے تین ہفتہ قیام فرمایا، حضرتؒ سے استفادہ فرماتے رہے سند حدیث بھی حضرت سے حاصل کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے، ان کو محدثین کے علوم اور شیخین کی کتب پر نظر ہے، علامہ علی کہنے لگے، ''لَوْ حَلَفْتُ اَنَّهٗ اَعْلَمُ مِنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ لَمَا حَنِثْتُ'' اگر میں قسم کھالیتا، کہ شاہ صاحب ابو حنیفہؒ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو میں حانث نہ ہوتا''۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو پتہ چلا تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور ارشاد فرمایا، ہمیں امام کے مدارک اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے۔ دیوبند سے علامہ کے واپس مصر ہونے پر درسگاہ نودرہ میں عظیم الشان جلسہ ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے عربی میں تقریر فرمائی۔ علامہ نے بھی جوابی تقریر فرمائی، حضرات دیوبند کے مکارمِ اخلاق، مہمان نوازی، تقویٰ وطہارت، بالخصوص علوم نبوی کی اشاعت وخدمت پر اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا۔ نیز یہ کہ اگر میں دار العلوم دیوبند میں حاضر نہ ہوتا تو ان فیوض وبرکات سے محروم جاتا، جو مجھے یہاں حاضری پر نصیب ہوئے، فرمایا، میں چونکہ حنبلی مذہب سے تعلق رکھتا ہوں اور حدیث لاتَشُدُّوا الرِّحَال الاالیٰ ثلٰثةِ مَسَاجِدَ (نماز کی فضیلت کے حصول کے لیے تین مساجد کے علاوہ سفر نہ کرو) کے پیش نظر مجھے خوف تھا کہ اگر قیامت میں سوال ہوا کہ تم

نے یہ سفر کیوں کیا، تو میرے پاس کوئی جواب نہیں، لیکن اب بفضلہٖ تعالیٰ امید قوی ہے کہ یہ میرا سفر عبادت میں گنا جائے گا کہ میں نے ایسی مقدس درسگاہ کی زیارت کی اور مولانا محمد انور شاہ جیسے محدث اور بزرگان دین کے علوم سے فیضیاب ہونے کا شرف حاصل کیا۔ واپسی پر راندیر میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب دام ظلہٗ سے پھر ملاقات ہوئی، تمام واقعات وحالات سنائے فرمانے لگے کہ مولانا انور شاہ صاحب اتنے بڑے امام وقت ہونے کے باوجود مقلد ابی حنیفہؒ ہیں۔ مولانا نے فرمایا، اس سے ہی ابی حنیفہؒ کے علوم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مصر پہنچ کر علامہ نے ''المنار'' میں اپنے اس سفر کو ذکر فرمایا، اور علماء دیوبند کے کمالات علمی اور عملی پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا۔

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ قاری مولوی محمد طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا، حضرت شاہ صاحب ایک روز فرمانے لگے کہ ''تفسیر بیان القرآن'' کو دیکھ کر معلوم ہوا، کہ اردو میں بھی علوم ہوتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ سنکر بہت مسرت ہوئی کہ ایک عالی قدر اہل علم نے تصدیق فرمادی۔

رائے کوٹ احقر کے پاس حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال کے ایام میں ایک نابینا عرب جو بہت بڑے فاضل تھے، تشریف لائے، فرمانے لگے، کہ ہند کے ایک بہت بڑے محدث اور عالم دین بزرگ کا انتقال ہو گیا ہے، میں ابھی ریاض نجد ہی میں تھا وہاں ان کے لیے دعائے مغفرت ہو رہی تھی، ان کا نام مولانا محمد انور لیا جاتا تھا۔

حضرت کے وصال پر خاص اہتمام اطلاعات کا نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن گرجرنوالہ، لاہور، لدھیانہ اور یوپی کے اضلاع سے، اور دور دراز علاقوں سے بھی لوگ جنازہ میں شامل ہو گئے۔

مولانا محمد یوسف بنوری سابق مدرس جامعۂ ڈابھیل، نے اپنی عالی قدر تالیف ''نفحة العنبر فی هدی الشیخ الانور'' میں علامہ رشید رضا مصری مدیر ''المنار''۔ ومصنف تفسیر المنار وکتب عدیدہ کے قدوم دیوبند کے موقعہ پر حضرت شاہ صاحبؒ کی وہ معرکۃ الآرا تقریر بلیغ ورشیق عربی درج فرمائی ہے۔ جس میں اکابر دیوبند کے حالات، طریق تدریس حدیث اور دیگر اہم مسائل ذکر فرمائے گئے تھے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی

ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں، کہ علامہ رشید رضا جھوم رہے تھے اور اپنی جوابی تقریر میں شاہ صاحبؒ کے کمالات علمیہ کا برملا اعتراف کیا، اور حضرات دیوبند کی خدمت حدیث نبوی پر ایک بسیط مضمون ,,المنار،، میں شائع فرمایا۔

بہاول پور کے تاریخی مقدمہ میں شہادت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانبدار ہوکر جب حضرت شاہ صاحب تشریف لے گئے، احقر حضرت کے ہمراہ تھا مولانا اسعد اللہ صاحب سہارنپوری اور احقر دونوں کو حضرت شاہ صاحبؒ نے مختارِ مقدمہ بنوایا۔ چنانچہ احقر کو ۱۹ ریوم سعادت رفاقت نصیب ہوئی، حضرت کو ان ایام میں مرض بواسیر کا دورہ شدید تھا، خون کثرت سے آتا رہا۔ صفرا کا غلبہ ہوگیا تھا۔ پیاس شدّت کی رہتی تھی، ضعف میں قوت اور قوت میں ضعف ہوگیا تھا۔ مولانا مولوی مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کا پہلے بیان ہوا، ایک دن بیان دوسرے دن جرح ہوئی، مولانا مرتضیٰ حسنؒ چاندپوری کا دو دن بیان ہوا، تیسرے دن جرح ہوکر پانچویں دن عدالت کا وقت شروع ہونے سے ایک گھنٹہ بعد تک رہی۔ پھر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں اطلاع دی گئی، کار سے تشریف لائے، زائرین کا ہجوم تھا۔ ڈسٹرکٹ جج صاحب مرحوم نے نہایت اعلیٰ انتظام فرمایا تھا، تاکہ کاروائی سننے والوں کو دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب حضرت شاہ صاحب نے کمرۂ عدالت میں قدم مبارک رکھا، تمام حاضرین اٹھ کھڑے ہوئے تاآنکہ مرزائی بھی کھڑے ہوگئے۔ احقر نے حضرت کے ضعف ونقاہت کے باعث جج صاحب سے عرض کر کے آرام کرسی کا انتظام کروایا تھا، کہ حضرت بیٹھ کر بیان دیں گے، ہم دونوں کے لیے بھی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن ہمیں تو ادباً کھڑے ہی رہنا تھا اور کام بھی کرنا تھا، اس لیے دونوں کرسیاں اٹھوادی تھیں، کمال یہ کہ مرزائی ہر دو مختاران مدعا علیہ بھی اپنی اپنی کرسیاں اٹھوا کر زمین پر بیٹھ گئے۔ حضرت کے حکم سے حوالجات کتب نکال کر پیش کرنا بھی احقر کے سپرد تھا اور حضرت کی بیّن کرامت تھی جس عبارت کے متعلق ارشاد فرماتے احقر فوراً نکال کر پیش کرتا تھا اور حضرت پڑھ کر جج صاحب کو سناتے تھے، بیان شروع ہوتے ہی تمام کچہری میں سناٹا چھا گیا تھا، حاضرین ہمہ تن گوش تھے، حضرت کا بیان نہایت سکون واطمینان سے سن رہے تھے، باوجود ضعف کے آواز اتنی بلند جاتی

تھی کہ عدالت کے اندر باہر سب کو پورا بیان سنائی دیتا تھا۔ مرزائی لوگ مولانا مرتضیٰ حسن کے بیان میں شور مچاتے تھے لیکن حضرت کے بیان میں سب کی زبانیں گنگ ہوگئی تھیں۔ ایسا منضبط اور اصولی بیان لاعَیْن رأت و لااذن سَمِعَتْ.

جج صاحب کی آرزو تھی کہ بیان ایسا ہونا چاہئے جس سے مجھے نتیجہ تک پہنچنا آسان ہوجائے کہ کن وجوہ کی بناء پر کسی کی تکفیر کی جاسکتی ہے، سو حضرت کا بیان ماشاء اللہ ایسا ہی تھا۔ جج صاحب نہایت محظوظ ہورہے تھے کہ ان کی مراد برآئی، وہ فرماتے تھے کہ جزئیاتِ منتشرہ کی بھرمار سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ ''بیانات علماء ربانی'' کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں وہ تفصیلات درج نہیں ہیں نیز جو عبارات اثناء بیان میں تشریحات وتفسیرات کے ساتھ پیش فرمائی جاتی تھیں، وہ بھی پوری درج نہیں کی گئیں۔ صرف اتنا بیان طبع ہوا جو حضرت شاہ صاحبؒ جج صاحب کو املا کرواتے تھے اس میں حوالجات کی عبارات کا صرف اول اور آخری لفظ لے لیا گیا ہے، حالانکہ حضرت شاہ صاحبؒ پوری عبارات معہ تشریح وتفسیر سناتے تھے، اگر ذرا تکلیف انجمن مؤید الاسلام بھاول پور کے منتظمین گوارا فرماتے، یا کم از کم احقر لائل پوری کو حکم فرماتے تو حضرت شاہ صاحبؒ کا پورا مشرح مفصل ومبسوط بیان ۱۶۰ صفحات پر آجاتا، اس لیے کہ احقر بھی پورا پورا بیان ساتھ ساتھ لکھتا جاتا تھا۔ فیصلہ مقدمہ پڑھئے معلوم ہوجائے گا کہ فاضل جج نے اپنے صادق مصدوق فیصلے کا مدار زیادہ تر حضرت شاہ صاحب ہی کے محققانہ بیان پر رکھا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان سننے کے لیے پنجاب، بلوچستان، کراچی اور دیگر دور دراز علاقوں کے علماء وفضلاء ورؤساء اور آفیسران ریاست آئے ہوئے تھے۔ انجمن مؤید الاسلام بھاول پور نے جو تمہیدی الفاظ حضرت کے بیان ,,البیان الازہر،، پر لکھے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. حامداً ومصلیاً.

شیخ الاسلام والمسلمین اسوۃ السلف وقدوۃ الخلف حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری قدس اللہ اسرارہم کی بلند ہستی کسی تعارف اور توصیف کی محتاج نہیں، آپ

کو مرزائی فتنے کے ردو استیصال کی طرف خاص توجہ تھی، حضرت شیخ الجامعہ صاحب کا خط شاہ صاحبؒ کی خدمت میں دیوبند پہنچا، تو ڈابھیل تشریف لے جانے کا ارادہ فرما چکے تھے اور سامانِ سفر باندھا جا چکا تھا، مگر مقدمہ کی اہمیت کو ملحوظ فرما کر ڈابھیل کی تیاری کو ملتوی فرمایا۔ اور ۱۹ راگست ۱۹۳۲ء کو بھاول پور کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا۔ حضرت کی رفاقت میں پنجاب کے بعض علماء مولانا عبدالحنان خطیب آسٹریلیا مسجد لاہور و ناظم جمعیۃ علماء پنجاب، و مولانا محمد صاحب لائل پوری فاضل دیوبند، و مولانا محمد زکریا صاحب لدھیانوی وغیرہم بھی تشریف لائے۔ ریاست بھاولپور اور ملحقہ علاقہ کے علماء اور زائرین اس قدر جمع ہوئے کہ حضرت کی قیام گاہ پر بعض اوقات بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی، اور زائرین مصافحہ سے مشرف نہ ہو سکتے تھے۔

۲۵ راگست ۱۹۳۲ء کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان شروع ہوا، عدالت کا کمرہ امراء ورؤسائے ریاست و علماء کی وجہ سے پر تھا، عدالت کے بیرونی میدان میں دور تک زائرین کا اجتماع تھا باوجودیکہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مبارک بہت ناتواں ہو چکا تھا۔ مگر متواتر پانچ روز تک تقریباً پانچ پانچ گھنٹے یومیہ عدالت میں تشریف لا کر علم وعرفان کا دریا بہاتے رہے، مرزائیت کا کفر وارتداد اور دجل وفریب کے تمام پہلو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن فرما دیئے، حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان ساطع البرہان میں مسئلہ ختم نبوت اور مرزا کے ادّعاء نبوت ووحی ومدعی نبوت کے کفر وارتداد کے متعلق جس قدر مواد جمع ہے اور ان مسائل وحقائق کی توضیح وتفصیل کے لیے جو ضمنی مباحث موجود ہیں شاید مرزائی نبوت کے ردّ میں اتنا علمی ذخیرہ کسی ضخیم سے ضخیم کتاب میں یکجا نہیں ملے گا، حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان پر تبصرہ کرنا خاکسار کے فکر کی رسائی سے باہر ہے ناظرین بہرہ اندوز ہو کر حضرت شاہ صاحبؒ کے حق میں دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے اعلیٰ علیین میں مدارج بلند فرمائیں۔ آمین!

حضرتؒ کا حافظہ اس وقت قابل دید وشنید تھا جب حوالہ دیتے وقت کتاب کھولتے ہی فوراً انگلی مبارک عبارت پر ہوتی، جج صاحب لکھئے! عبارت یہ ہے۔ بعض دفعہ احقر کو

فرماتے کہ عبارت نکال کر دے، تا کہ دکھاؤں، بعض دفعہ صفحہ بھی ارشاد فرماتے، بیان بیٹھ کر فرماتے لیکن حوالجات پیش فرماتے وقت کھڑے ہو جاتے، توراۃ شریف کی بعض آیات عبری الفاظ میں سنائیں اور اپنے دست مبارک سے لکھ کر جج صاحب کو دیں۔

چنانچہ ایک آیت احقر کو یاد ہے۔ نَابِی مِقُربخ مِیحیخ کاموخ یاقیم لَخ الُومخ اِلاَ وَتِشماعُون، نبیّ من قُربِکَ مِن اَخِیکَ کَاَخِیکَ یُقِیمُ لَکَ اِلٰھُکَ اِلَیہِ تَسمَعُونَ. ارشاد فرمایا، کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے لکھ کر اس آیت کا بنی اسرائیل میں اعلان فرمایا۔ فرمایا جج صاحب لکھئے، ہمارا دین متواتر ہے اور دنیا میں کوئی دین متواتر نہیں، تواتر کی تعریف بیان فرما کر اس کے اقسام تواتر اسناد، تواتر طبقہ، تواتر قدر مشترک، تواتر توارث بیان فرمائے، فرمایا، تواتر کی ایک قسم معنوی بھی ہے، اور تواتر کی کسی ایک قسم کا منکر کافر ہے۔ مرزا غلام احمد نے تواتر کے جمیع اقسام کا انکار کیا ہے، جرح کے روز جلال الدین شمس مرزائی مختار مدعا علیہ نے سوال کیا کہ آپ نے تواتر کے منکر کو کافر کہا ہے حالانکہ یہ تو ایک اصطلاح ہے جو علماء نے گھڑ رکھی ہے اس کا منکر کیسے کافر ہو سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ تم لوگ مانتے ہو یا نہیں کہ یہ قرآن مجید وہی قرآن ہے جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، اور ہم تک محفوظ چلا آیا، جلال الدین نے کہا کہ ہم مانتے ہیں، فرمایا اس حالت حفاظت کا نام تمہارے ہاں کیا ہے؟ جلال الدین نے کہا ''تواتر'' فرمایا اس کا منکر کافر ہوگا یا نہیں؟، مرزائی مختار نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ قادیانی مختار نے سوال کیا کہ امام رازیؒ نے تواتر معنوی کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، میں بحر العلومؒ نے تصریح کی ہے۔ فرمایا، جج صاحب ہمارے پاس فواتح الرحموت کتاب موجود نہیں ہے بتیس سال ہوئے میں نے یہ کتاب دیکھی تھی، ان صاحب نے حوالہ دینے میں دھوکا دیا ہے، بحر العلومؒ امام رازیؒ کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ یہ جو حدیث ہے لاتجتمع امتی علی الضلالة، یہ تواتر معنوی کے درجہ کو نہیں پہنچتی، یہ نہیں کہ تواتر معنوی کے حجۃ ہونے کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ جج صاحب نے قادیانی مختار

کو حکم دیا کہ اصل عبارت پڑھ کر سنایئے، اس نے ذرا تامل کیا تو حضرت شاہ صاحب نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی کہ لاؤ میں عبارت سناتا ہوں، اس نے کہا کہ میں ہی سنا دیتا ہوں جب سنایا، تو وہی عبارت تھی حضرت شاہ صاحب نے ارشاد فرمائی تھی۔ فرمایا، جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مفحم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں چوں کہ طالب علم ہوں دو چار کتابیں، دیکھ رکھی ہیں، میں ان سے انشاء اللہ مفحم نہیں ہونے کا۔

قادیانی مختار نے سوال کیا آپ نے فرمایا کہ مدعی وحی نبوت واجب القتل ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کو کیوں قتل نہ فرمایا بلکہ فاروق اعظمؓ کو بھی روک دیا، فرمایا، جج صاحب لکھئے، ابن صیاد نابالغ تھا، اور نابالغ کو شریعت میں قتل نہیں کیا جاتا۔ سوال آپ نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسیلمہ کذّاب کے دو قاصد آئے، حضور ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا، کہ کیا تم بھی مسیلمہ کا عقیدہ مانتے ہو؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا، تو فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی، کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کرتا، اب سوال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رواج کا اتباع کیا؟ فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا یہ بجائے خود تشریعی حکم ہے نبی رواج کا متبع نہیں ہوتا بلکہ حکم خداوندی کا متبع ہوتا ہے۔ حضرت کی قیام گاہ پر زائرین کا ہجوم رہتا تھا ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر تقریر فرماتے رہتے تھے، بہت سے لوگ حضرت سے بیعت بھی ہوئے رات دن یہی شغل تھا، رات کے ایک بجے تک بیٹھے رہتے قرآن وحدیث وفقہ، تصوف وغیرہا علوم وفنون کے دقیق دقیق مسائل علماء کرام وصوفیاء عظام دریافت کرتے رہتے ہر ایک جواب میں ایسی محقق اور مبسوط تقریر فرماتے گویا ساری عمر اسی میں لگائی ہے۔ ایک عالم دین نے مسئلہ وحدۃ الوجود، اور وحدتِ شہود کے متعلق سوال کیا، بس پھر کیا تھا تین دن عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک اسی پر بیان فرماتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی عبارات زبانی سنا رہے ہیں، معارف لدنیہ میں یہ فرماتے ہیں، مکتوبات شریفہ میں یہ فرماتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ تحقیق ہے، عبقات میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے یوں فرمایا، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ نے

فتوحات میں یہ فرمایا ہے، فصوص الحکم میں یہ ارشاد ہوتا ہے، حضرت مولانا حاجیؒ کی نظموں پہ نظمیں وحدۃ الوجود پر طویل طویل پڑھ کر سنا رہے ہیں، حضرت مولانا دین پوریؒ بھی مع اپنے خدام کے تشریف فرما رہتے تھے، مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی، حضرت مولانا عبداللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، حکیم عبدالرشید افسر الاطباء بھاول پور، غرض ہر طبقہ محظوظ ہوتا تھا، حضرت ناظم صاحب سہارنپوری بڑی عقیدت کے ساتھ دوزانو سامنے بیٹھے رہتے تھے اور استفادہ فرماتے رہتے تھے، مولانا شمس الدین بھاولپوری مرحوم کے کتب خانہ سے معجم کبیر طبرانیؒ کا قلمی نسخہ منگایا، حضرت ناظم صاحب لے کر آئے، احقر کو حکم فرمایا کہ روزانہ مجھے اس میں سے احادیث نقل کر کے دیا کر، چنانچہ نشان دہی فرمائی جاتی اور احقر کو یہ سعادت نصیب ہوئی، فرمایا کہ قلمی کتاب کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے میں آپ کو طریقہ سکھاتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی سی رہ نمائی سے احقر نے خوب سمجھ لیا۔ معجم کے اس نسخہ میں کہیں اعراب و نقاط کا نام و نشان بھی نہیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد مرتضیٰ حسن مرحوم کے بیانات پہلے خود ملاحظہ فرماتے، جگہ جگہ رہنمائی فرماتے جب خود تسلی فرما لیتے، تو کچہری میں جانے دیتے، لیکن خود حضرت کوئی تیاری نہ فرماتے، ایک بجے شب تک تو جیسے اوپر گزرا وعظ و تلقین و ارشاد و بیانِ مسائل ہوتا رہتا، صرف ایک گھنٹہ آرام فرماتے۔ دو بجے تہجد کے لیے اٹھتے، فجر کی نماز تک مراقب رہتے، پاس انفاس میں مشغول رہتے اول وقت نماز فجر کی امامت خود کرتے پھر سورج نکلنے تک کچھ پڑھتے رہتے، چائے پی کر موٹر سے تو کچہری تشریف لے جاتے، سات بجے سے ایک بجے تک بیان ہوتا رہتا۔ ضعف و نقاہت بغایت تھا لیکن تکان مطلقاً محسوس نہ فرماتے، تمام رفقائے سفر و دیگر علماء کا خوب اہتمام سے تفقد فرماتے رہتے، مجلس مشاورت میں خاص خاص علماء کو شامل فرماتے۔ احقر پر اتنی نوازشات و عنایات کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ احقر نے قادیانیوں کی کتب سے بعض نئی باتیں نکال کر پیش کیں، بہت خوش ہوئے اور بار بار علماء کو بلا کر دکھاتے۔ جب تک احقر مجلس مشاورت میں حاضر نہ ہوتا بات شروع نہ فرماتے، تخلیہ میں بھی مشورہ فرماتے اور باصرار فرماتے کہ تیری اس میں کیا رائے ہے۔ بھاول پور شہر میں جامع مسجد و دیگر مقامات پر

قادیانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لیے علماء کو بھیجتے رہتے تھے، دو دفعہ احقر کو بھی بھیجا، ان ایام میں اس قدر حضرتؒ کے چہرۂ مبارکہ پر انوارت کی بارش ہوتی رہتی تھی، ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں، حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی، بھاولپور جامع مسجد میں جمعہ کی نماز حضرت اقدس پڑھایا کرتے تھے۔ بعد نماز کچھ بیان بھی ہوتا تھا، ہزاراں ہزار کا مجمع رہتا تھا۔ پہلے جمعہ میں فرمایا،، کہ حضرات! میں نے ڈابھیل جانے کے لیے سامان باندھ لیا تھا کہ یکا یک مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کا خط دیو بند موصول ہوا، کہ شہادت دینے کے لیے بھاول پور آ یئے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بھاولپور کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی، شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانبدار ہو کر بھاولپور میں آیا تھا۔،، بس اس فرمانے پر تمام مسجد میں چیخ و چہاڑ پڑ گئی، لوگ دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ خود حضرت پر ایک عجیب کیفیت وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتام وعظ پر فرمایا، کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی ہے اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے۔ فرمایا حضرات ان صاحب نے غلط کہا ہے ہم ایسے نہیں ہیں، بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ،، ہم سے گلی کا کتا بھی اچھا ہے، بلکہ ہم اس سے گئے گذرے ہیں،، سبحان اللہ، انکسار اور تواضع کی حد ہو گئی۔ لاہور اسی سفر کے سلسلہ میں دو روز قیام فرمایا تھا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء، عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ بیان ہوتا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو'' غرض حضرت نے خطبہ شروع فرمایا۔ الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ الخ وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے، احقر کے دل میں وسوسہ سا گزرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوئے ادب ہو۔ حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا، فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک سائل کے جواب دینے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مدینہ کے بازار

سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے غالباً لوہے کے تھے، مصلے کے قریب رکھی گئی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر بیٹھ کر جوابات دیئے، یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرت نے وعظ کیا، احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔

قادیانی مختار نے کہا کہ تحذیر الناس میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی بعد خاتم النّبیین نبی کا آنا تجویز کیا ہے۔ فرمایا، جج صاحب لکھئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ نے اپنے الہامی مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے متعلق دلائل وبراہین ساطعہ بیان فرمائے ہیں، اور اثر عبداللہ بن عباسؓ کی علمی توجیہات فرمائی ہیں۔ ان لوگوں پر حیرت ہے جو تحذیر الناس کو بغور بالاستیعاب دیکھتے نہیں۔ اسی رسالہ میں جابجا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النّبیین زمانی ہونا اور اس کا اجماعی عقیدہ ہونا اور اس پر ایمان ہونا ثابت فرمایا ہے۔ رسالہ کے ص ۱۰ کی عبارت میں آپ کو لکھوانا چاہتا ہوں، حضرت مولانا فرماتے ہیں ,,سو اگر اطلاق اور عموم ہے، تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالۃ التزامی ضرور ثابت ہے، ادھر تصریحات نبوی مثل انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انهٗ لانبی بعدی او کما قال جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے، اس بات میں کافی ہے کیوں کہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہنچ گیا ہے اور اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے گو الفاظ مذکور بسند تواتر منقول نہ ہوں۔ سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ باوجودیکہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا''۔

اسی رسالہ کے دوسرے صفحات میں بھی جابجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی کا اقرار فرمایا ہے۔ نیز مناظرۂ عجیبہ جو صرف اسی موضوع پر ہے۔ نیز آب حیات، قاسم العلوم، انتصار الاسلام وغیرہا کتب مصنفہ حضرت نانوتویؒ دیکھنا چاہیئے۔ حضرت مولانا مرحوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین طرح کی خاتمیت ثابت فرماتے ہیں، ایک بالذات یعنی مرتبہ حضور ﷺ کا خاتمیت ذاتی کا ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

وصف نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام موصوف بالعرض اور آپ کے واسطے سے جیسا کہ عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے اس کے ذریعے سے تمام کواکب قمر وغیرہ اور دیگر اشیاء ارضیہ متصف بالنور۔ یہی حال وصف نبوت کا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے متصف بالذات ہیں اور اسی وجہ سے آنحضور ﷺ کو سب سے پہلے نبوت ملی۔ حدیث میں ہے کنت نبیّا و ادم منجدل بین الماء و الطین. اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے متصف بالنبوۃ ہوئے، حدیث میں ارشاد ہے ,,لو کان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی،، اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرے اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا،،۔ پارہ نمبر ۳ کے آخری رکوع میں ارشاد ہوتا ہے۔ و اذ اخذ اللّٰہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتابٍ و حکمۃٍ ثم جاء کم رسولٌ مصدقٌ لما معکم لتؤمنن بہٖ و لتنصرنہٗ. الآیۃ. اس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ جیسا کہ اس امت کے رسول ہیں نبی الانبیاء بھی ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت کو ایک طرف رکھا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف، اور سب سے حضور ﷺ پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا، آیت میں، ثم جاء کم فرما کر تصریح فرمادی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ ظہور سب سے آخر میں ہوگا۔

آیت میثاق در وے ثم ہست ❁ ایں ہمہ از مقتضائے ختم ہست

ثم عربی زبان میں تر اخی کے لیے آتا ہے، اسی واسطے علیٰ فترۃٍ من الرسل الآیہ فرمایا۔ حدیث میں ہے ,,انا دعوۃ ابی ابراھیم،، میں اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کی دعاء ہوں، تمام انبیاء علیہم السلام حضور ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت دیتے آئے۔ چنانچہ توراۃ شریف، انجیل شریف و دیگر صحف میں باوجود تحریف لفظی و معنوی ہو جانے کے اب بھی متعدد آیات موجود ہیں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت اور افضلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ تشریف لا کر اتباع شریعت محمدیہ کرنا اسی فضیلت اور خاتمیت کا عملی مظاہرہ ہوگا۔ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا صف بندی کر کے امام کا منتظر رہنا اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امامت کرنا بھی اسی امر کی صراحت کرتا ہے۔ واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا الآیہ بھی اسی کی طرف مشیر ہے کہ لیلۃ المعراج میں انبیاءؑ کا اجتماع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا۔ اور ابن حبیب عبداللہ ابن عباسؓ سے راوی ہیں کہ یہ آیت لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی (اتقان) اور انا خطیبھم اذا انصتوا، اور احادیث شفاعت بھی اسی فضیلت محمدیہ کا اعلان کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا اختتام ہوا اور پہلے انبیاءؑ میں سے کسی نہ کسی کا زندہ رہنا ضروری تھا، تاکہ بطور نمائندہ سب کی جانب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی نصرت کریں۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کا انتخاب ہوا، اس لیے کہ آپ انبیائے بنی اسرائیل کے خاتم ہیں اور سلسلہ اسحاقی، اور اسمٰعیلی کو جوڑ دینا منظور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین امور کا اعلان فرمایا۔

(۱) یابنی اسرائیل انی رسول اللّٰہ الیکم. ''اے بنی اسرائیل میں فقط تمہاری طرف مبعوث ہو کر آیا ہوں''۔

دوسری جگہ آل عمران میں ''ورسولاً الیٰ بنی اسرائیل'' فرمایا گیا ہے۔ ''صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر''۔

(۲) مصدقاً لمابین یدیّ من التوراۃ. (۳) ومبشراً برسولٍ یأتی من بعدی اسمہٗ احمد. ''میں ایک عظیم الشان رسول برحق کی خوشخبری سنانے آیا ہوں جو میرے بعد مبعوث ہوں گے ان کا نام احمد ہے''۔ قرآن عزیز اعلان کرتا ہے کہ وہ رسول برحق جن کے متعلق عالم ارواح میں انبیاء علیہم السلام سے عہد و پیمان ہوا، اور بشارات دی گئی تھیں آ چکا۔ ,,جاء الحق وصدق المرسلین.،، حدیث شریف میں ہے،،۔ انی اولی الناس بعیسیٰ بن مریم (۱)،، الحدیث. "مجھے زیادہ قریب ہے عیسیٰ علیہ السلام سے بہ نسبت تمام لوگوں کے اور بلاشبہ وہ نزول فرمائیں گے''۔

انبیائے بنی اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النّبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کے لیے تشریف لانا اور شریعت محمدیہ پر عمل فرمانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل

(۱) احمد ابوداؤد ابن ابی شیبہ ابن حبان نے روایت کیا مرفوعاً الانبیاء اخوان العلاّت امھاتھم شتّی و دینھم واحدٌ وانی اولی النّاس بعیسیٰ بن مریم لانہ لم یکن بینی وبینہٗ نبیٌّ وانہ خلیفتی علیٰ امّتی وانہ نازل الخ۔

الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے، فضیلت محمدیہ کو دنیا پر واشگاف کر دینا منظور ہے، آپ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تشریف لانا ایسا ہی ہے جیسے ایک نبی دوسرے نبی کے علاقہ میں چلا جائے۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے علاقہ میں تشریف لے گئے تھے، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبی ہی ہونگے لیکن بحیثیت حکماً عدلاً تشریف آوری ہوگی بطور جج منٹ فرمانے کے تشریف آوری ہوگی۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قرب قیامت میں عیسائی اقوام کی مسلمانوں سے مڈبھیڑ رہے گی، لہٰذا اہل کتاب کی اصلاح کے لیے تشریف لائیں گے، ثالث وہی ہوتا ہے جو ہر دو فریق کے نزدیک مسلم ہو۔ ہماری کتابیں عقیدۃ الاسلام تحیۃ اسلام، التصریح تما تواتر فی نزول المسیح، اس باب میں دیکھنا چاہئے۔

دوم خاتمیت زمانی یعنی آپ کا زمانۂ نبوت اس عالم مشاہدہ میں تمام انبیاء علیہم السلام کے آخر میں ہے، آپ کے بعد کسی کو نبوت کی تفویض نہ ہوگی۔ ابی بن کعبؓ سے مرفوعاً روایت ہے۔ بدئی بی الخلق و کنت اٰخر ھم فی البعث، واٰخرج جماعۃ عن الحسن عن ابی ھریرۃ مرفوعاً کنت اوّل النبیین فی الخلق و اٰخرھم فی البعث۔ (کذا فی روح المعانی: ص: ۱۱، ج: ۷)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبی بنائے جاچکے ہیں نزول عیسیٰؑ کا عقیدہ اسلام کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔ مرزا غلام احمد نے اجماع کو حجۃ مانا ہے اور اس کے منکر پر لعنت کا اعلان کیا ہے۔ انجام آتھم ص ۱۴۴ مرزا صاحب نے کفار کے تواتر کو بھی حجۃ مانا ہے چہ جائیکہ تمام امت محمدیہ کے تواتر سے ثابت شدہ عقیدہ (تریاق القلوب)۔

حضرت نانوتویؒ نے تیسری خاتمیت مکانیہ ثابت فرمائی ہے یعنی وہ زمین جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے اور اس کے اوپر کوئی زمین نہیں اس کو بدلائل ثابت فرمایا ہے۔

قادیانی مختار مقدمہ نے سوال کیا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے قائل ہیں۔ احقر سے فرمایا کہ ابی کی شرح مسلم شریف نکالو۔ چنانچہ ج ۱ ص ۲۲۶ مطبوعہ مصر سے ذیل کی عبارت پڑھ کر سنائی۔ وفی العتبۃ قال مالک بینا الناس قیامٌ یستمعون لاقامۃ الصلوٰۃ فتغشاھم غمامۃٌ فاذا عیسیٰ قد نزل الخ "عتبہ میں

ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا درانحالیکہ لوگ کھڑے نماز کی اقامت سن رہے ہوں گے کہ اچانک ان کو ایک بادل ڈھانپ لے گا یکایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے"۔

امام مالکؒ کا بھی وہی عقیدہ ہے جو ساری امت محمدیہ کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے، ہم نے تتبع کیا ہے کوئی تیس اکتیس صحابہ احادیث نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے راوی ہیں، تابعین کا تو احصاء بھی مشکل ہے۔ امام ترمذی نے پندرہ صحابہ گنوائے ہیں، ہم نے مزید پندرہ کا اضافہ کیا۔ چنانچہ مسند احمد و کنز العمال ودیگر کتب حدیث کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔ ہمارا رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" کا مطالعہ کیا جائے۔

قادیانی نے سوال کیا کہ علماء بریلوی، علماء دیوبند پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں اور علماء دیوبند علماء بریلوی پر۔ ارشاد فرمایا کہ جج صاحب! احقر بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی جانب سے گذارش کرتا ہے کہ حضرات دیوبند ان کی تکفیر نہیں کرتے، اہل سنت والجماعت اور مرزائی مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے، علماء دیوبند اور علماء بریلوی میں واقعات کا اختلاف ہے قانون کا نہیں۔ چنانچہ فقہائے حنفیہؒ نے تصریحات فرمائی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کلمۂ کفر کسی شبہ کی بناء پر کہتا ہے، تو اس کی تکفیر نہ کی جائے گی، دیکھو رد المحتار، وبحر الرائق:

احقر محمد لائل پوری عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز نے اپنی تقریر بخاری شریف فیض الباری میں فرمایا ہے کہ مقبلی اور محمد ابراہیم وزیر پہلے زیدی تھے اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن بھی کرتے تھے سب پر نہیں اور مقبلی نے امام بخاریؒ پر بھی طعن کیے ہیں۔ اس پر ایک غیر مقلد صاحب نے برافروختہ ہو کر اعتراضات کر دیئے کہ دیکھئے صاحب، شاہ صاحب نے علماء احناف کے قدیم اصول کے مطابق علماء اہلحدیث پر اعتراضات فرما دیئے۔ حالانکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے تو ان کے زیدی ہونے کے زمانہ کی بات ذکر فرمائی ہے اور فیض الباری میں متعدد مقامات پر ان کی تعریف بھی فرمائی ہے، چنانچہ مقبلی نے جو طعن امام بخاریؒ پر کیے ہیں اس کے متعلق ص ۲۸۵ ج ۲ فیض الباری میں فرماتے ہیں۔ "مقبلی کہتے ہیں کہ امام بخاری اپنے تعصب کی بناء پر مجہول رواۃ سے تو روایات لیتے ہیں لیکن امام محمدؒ جیسے امام سے نہیں لیتے اور یہ زیدی صاحب جب اشتغال بالحدیث فرمانے لگے تو زیدیت سے ہٹتے چلے گئے"۔ اور اکفار الملحدین میں کئی

مقامات پر محمد بن ابراہیم وزیر یمانی کی ''ایثار الحق'' سے حوالے پیش کیے ہیں اور جا بجا ان کی تعریف فرمائی ہے۔ چنانچہ اکفار الملحدین ص ٦٣ پر فرماتے ہیں:۔

''لان الکفر ھو جحد الضروریات من الدین اوتاویلھا''.

ایثار الحق علی الخلق ۔للمحقق الشھیر الحافظ محمد بن ابراھیم الوزیر الیمانی ص ۱۲۴۱، اکفار الملحدین کے ص ۳۲، ص ۳۳ پر متعدد عبارات ''ایثار الحق'' سے نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں: ''وقد قال ذالک المحقق محمد بن ابراھیم الوزیر الیمانی فی کتابہ'' (ایثار الحق: ص: ۲۲۰)

علاوہ بریں یہ کہ تحاف النبلاء میں ان کے زیدی ہونے کی تصریح موجود ہے اس کے بعد اس سے رجوع کرنا بھی مذکور ہے ان حالات میں رجوع کے بعد بھی انسان میں اپنی گذشتہ زندگی کے نشانات رہ جاتے ہیں، الروض الباسم، جو محمد بن ابراہیم وزیر یمانی کی تصنیف ہے، خیال پڑتا ہے کہ اس کے کچھ شواہد اس میں مل سکتے ہیں۔ رہے مقبلی صاحب، تو ''العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الأباء والمشائخ'' میں امام بخاریؒ پر ان کے مطاعن موجود ہیں، چوں کہ ان علماء کو رد تقلید سے شغف تھا، اس لیے غیر مقلدین کو ان کا دامن پاک کرنا ضروری ہے۔ البدر الطالع علامہ شوکانی کی تصنیف ہے وہ ان حضرات کی طرف سے جتنی بھی صفائی پیش کریں کم ہے، یہ صاحب (شوکانی) بھی زیدی رہ چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ معترض صاحب نے فیض الباری اور اکفار الملحدین وغیرہ کتب کا مطالعہ فرمانا گوارا نہ فرمایا، اعتراض کر کے محض اپنا دل ٹھنڈا کیا۔

دوسری بات یہ تھی کہ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فیض الباری ج ۴ ص ۹۳ میں فرمایا ہے کہ بخاری شریف میں ''أنت ابا جھل'' جو مذکور ہے یہ نظیر ہے امام ابی حنیفہؒ کے ''ولو ضرب بابا جھل'' کی اور یہ لغت اسماء ستہ مکبّرہ میں مطردّہ ہے، سو جس کسی نے امام ابی حنیفہؒ پر اس کے باعث اعتراض کیا ہے اس کو بخاری شریف ہی سے دیکھ لینے کی توفیق نہ ہوئی۔ چنانچہ ابو العلاء نحوی سے یہ نہ ہو سکا کہ بخاری شریف ہی سے دیکھ لیتے۔ معترض صاحب ارشاد فرماتے ہیں:۔

''کہ مولانا انور شاہ صاحب مرحوم اس کو نحوی غلطی بتاتے ہیں اور امام ابی حنیفہ

رحمہ اللہ سے اعتراض دور کرنے کے بجائے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غلطی نکال کر جو دراصل ان کی غلطی نہیں ہے، جواب دیا جاتا ہے حالانکہ حدیث کی توجیہ بیان کرنے کے بعد اگر مولانا عبدالحی لکھنوی کی وہ عبارت جوانھوں نے التعلیق الممجد کے مقدمہ میں لکھی ہے، لکھ دیتے تو اچھا تھا''۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے بجنسہٖ درج کیا جاتا ہے فیض الباری ج۴ص۹۲:قولہٗ انت اباجهل هذا نظير قول ابی حنیفةؒ ولو ضرب باباقبيس وهذه لغت فى الاسماء الستة المكبرة مطردة وجهل من طعن فيه علىٰ ابی حنیفةؒ ولم يوفق لحفظة مثله فى البخارى كما وقع لابى العلاء النحوى''۔

معترض صاحب سے کیا کہا جائے ولكن عين السخط تُبْدِي الْمَسَاوِيا کامظاہرہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ معترض صاحب نے ساری عبارت نقل نہیں کی، کہیں دیکھنے والے دیکھ نہ لیں کہ حضرت شاہ صاحب امام بخاریؒ پر اعتراض نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ امام ابی حنیفہ رحمہ اللہ کی تائید میں پیش کرنا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں کہ یہ لغت مطردہ نہیں ہے اور بخاری جیسی کتاب میں موجود ہے۔ معلوم نہیں، اعتراض کس لفظ سے سمجھ لیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ تقریر ترمذی میں فرماتے ہیں۔ وحقيقة الامران فى لغة فصيحة من لغات العرب يكون اعراب الاسماء الستة با لالف فى الاحوال الثلٰث كما هو مذكور فى الكتب النحو، وكما قال شاعرہ

ان اباها وابا اباها ۞ قد بلغا من المجد غايتاها

(العرف الشذی ص۴۱٦)

نطق الانور قلمی ص۶۲۹ مرتبہ محمد لائل پوری، وہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

''شاہ صاحب کو چاہئے تھا کہ التعليق الممجد کے مقدمہ میں جو عبارت ہے لکھ دیتے، اگر جناب ہی ذرا تکلیف فرمالیتے تو سامنے آجاتا کہ التعليق الممجد کے مقدمہ سے زیادہ زوردار عبارت میں فیض الباری اور تقریر ترمذی میں جناب کے ارشاد کی تعمیل فرمادی ہے اور اگر کتب نحو متداولہ ہی کا سرسری نظر سے مطالعہ فرمالیا ہوتا، تو شاید آپ بھی امام اعظمؒ پر اعتراض کرنے والوں پر تعجب فرماتے۔ دیکھو ابن عقیل شرح الفیہ ابن مالک

ص ۷۷ ۱۸ اشمونی مشرح الفیہ۔

آپ بھی فتح الباری سے یہی ثابت کر رہے ہیں کہ تینوں حالات میں منصوب پڑھنا مطرد ہے شاذ نہیں پھر آپ تو خود حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تائید کر رہے ہیں۔

''فصل الخطاب فی مسئلۃِ امِ الکتاب ''حضرت شاہ صاحبؒ کی بے نظیر کتاب ہے، بعض مدعیان عمل بالحدیث نے اس کا جواب بزعم خود لکھا ہے۔ لیکن علمی دنیا میں اس کو ایک محدث کے رسالہ کا جواب کہنا خود علم کی توہین ہے، ہاں عربی زبان میں مختلف عنوانات میں سوقیانہ دشنام طرازی کا خوب مظاہرہ کیا گیا ہے تقریباً دو سو مقام کتاب میں ایسے ملیں گے جہاں سوء ادبی کر کے اپنا دل ٹھنڈا کیا ہے ''سباب المسلم فسوق ''۔ از خدا جوئیم توفیق ادب بے ادب محروم ماند لطف رب۔ حالانکہ علماء اہل حدیث خود حضرت مرحوم کا نہایت احترام کرتے تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم نے اپنے اخبار اہلحدیث میں حضرت شاہ صاحب مرحوم کے وصال پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے اور اس میں اپنے درد دل کا اظہار کیا، اور حضرتؒ کے مناقب اور علمی فضائل بیان کیے اور محبت بھرے الفاظ میں متعدد ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ اور یہ کہ بے نظیر عالم دین رخصت ہو گیا۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے قادیان کے پہلے بے نظیر اجتماع میں جب حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر سنی تو فرمایا کہ اگر مجسّم علم کسی کو دیکھنا ہو تو مولانا انور شاہ صاحب کو دیکھ لے۔ مولانا عبد التواب ملتانی تلمیذ رشید حضرت مولانا عبد الجبار غزنوی نے علماء اہل حدیث کے مجمع میں حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات اور بزرگی کا برملا اعتراف کیا۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب گوجرانوالہ نے اسی مجمع میں کہا تھا کہ ,,مولانا انور شاہ صاحب تو حافظ حدیث ہیں''۔

مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم تو متعدد بار ملاقات فرما کر حضرتؒ سے علمی استفادات فرماتے رہے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب امرتسر تشریف لاتے رہے، علماء اہلحدیث، احناف کی نسبت زیادہ سے زیادہ تعداد میں حضرت کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے، اور اس کا اہتمام خصوصی رکھتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا تبحر علمی اور ذوقِ مطالعہ

از: جناب مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی

حضرت شاہ صاحبؒ لیل ونہار، صبح شام کتب بینی میں مصروف رہتے تھے۔ جس وقت بھی کوئی دیکھنا چاہتا تو کتاب کے مطالعہ ہی میں دیکھے گا کتاب سے الگ ہوکر بھی فکر، خیال کتاب ہی میں رہتا تھا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے غرضیکہ کوئی ساعت ایسی نہ تھی جس میں خالی الذھن ہوکر وقت گذارتے ہوں۔ شب میں چند گھنٹوں کے سواء جن میں آپ سو جاتے بیشتر حصہ کتب کے مطالعہ میں ہی صرف ہوتا تھا۔ ابتدائے شب میں ۱۲ بجے تک کتاب دیکھتے رہتے، نیند کے غلبہ سے جب عاجز ہوجاتے سو جاتے اور دو ایک گھنٹہ کے بعد اٹھ کر وضو فرماتے اور کتاب لیکر بیٹھ جاتے۔ صبح صادق ہونے تک مطالعہ میں گذار دیتے۔ اور صبح کی نماز کے بعد پھر کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوجاتے۔ ایک مرتبہ خود ہی مجھ سے فرمایا کہ میں کسی وقت بھی دماغ کو فارغ نہیں چھوڑتا ہوں ان چند گھنٹوں کے سوا جس میں مجھے نوم غرق ہوتی ہے میرا فکر کتاب یا کسی مسئلہ کی تحقیق میں رہتا ہے۔

بارہا ایسا دیکھا گیا کہ نماز کے لیے مسجد جارہے ہیں اور کوئی بات کسی حدیث یا کسی مسئلہ کے متعلق ذہن میں آئی تو مسکراتے ہوئے تشریف لیجارہے ہیں اور نماز کے بعد فوراً کتاب اٹھائی اور دیکھنا شروع کیا اور مسکراتے ہوئے ہی کچھ لکھنا شروع کردیا۔ کبھی کبھی بغیر کتاب کے بیٹھے ہوئے کسی فکر میں متفکر دیکھا تو جلدی جلدی کتاب اٹھائی اور مسکراتے ہوئے یادداشت کے طور پر لکھنے لگے۔ غرضیکہ دن رات تمام ساعتوں میں آپکا فکر کتاب اور علمی تحقیق کے باہر نہ ہوتا تھا۔

بڑی بڑی ضخیم کتاب کو ایک مرتبہ ابتداء سے دیکھنا شروع کیا اور دو دن میں از اول تا آخر دیکھکر ختم کردیا۔ ہزارہا صفحات کی کتاب جب تک ختم نہ فرمالیتے علیحدہ نہ فرماتے۔ اور بہت جلد ہی ختم کردیتے۔

میں ۱۳۲۸ھ کے ختم پر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی غالباً اسی کے ابتداء میں دارالعلوم میں بسلسلہ درس تشریف فرمائے ہوئے تھے۔ حسن اتفاق سے مجھے خدمت کا شرف مدرسہ میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد ہی حاصل ہو گیا تھا۔ میں نے لیل ونہار، صبح وشام، مرض وصحت، غرضیکہ ہر حال میں کتاب ہی کے ساتھ مشغلہ دیکھا، آپ کے پاس آنے والے آتے، کوئی بات دریافت کرتے جواب دے کر فوراً ہی کتاب پر نظر فرما لیتے۔

زیر مطالعہ کتب اور شوقِ کتب بینی

جہاں تک یاد کام کرتی ہے، زیر مطالعہ کتب دینیہ ہی ہوتی تھیں۔ درسیات میں حدیث وفقہ وتفسیر کی کتاب گاہ بگاہ ہی دیکھتے ہوئے پایا۔ بیشتر متقدمین کی کتب شروح احادیث زیر مطالعہ ہوتی تھیں، خصوصیت سے حافظ ابن قیم، حافظ ابن دقیق العید اور اسی قسم کے لوگوں کی کتابیں جو جدید طبع ہو کر آتی تھیں ان کو بڑے شغف کے ساتھ مطالعہ فرماتے تھے اور جس کتاب جدید کے طبع ہونے کا علم ہوتا فوراً اس کے حصول کی کوشش فرماتے اور حاصل کر لیتے۔ مستدرک جس وقت حیدرآباد میں طبع ہونی شروع ہوئی، یہ زمانہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم ومغفور کے حیدرآباد میں امور مذہبیہ کے عہدہ پر تقرر کا زمانہ تھا، کتاب موصوف کے طبع ہونے کا جب علم ہوا تو حیدرآباد کے اس ادارہ کو بہت دعائیں دیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں مرحوم نے جب ایک جلد طبع ہو گئی فوراً بھیج دی اور ساتھ ہی لکھا کہ اگرچہ کتاب پوری طبع ہونے پر شائع ہونے کا قاعدہ ہے مگر آپ کے ساتھ خصوصی رعایت کی وجہ سے ایک حصہ بھیج رہا ہوں اور باقی دوسری مرتبہ ارسالِ خدمت کر دی جائے گی۔ مجلد کرا کر بذریعہ رجسٹری یہ حصہ ارسال کیا۔ کتاب کے وصول ہونے پر جو خوشی چہرہ سے نمایاں ہو رہی تھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جو دعائیں زبان مبارک سے جاری تھیں سننے سے وابستہ ہیں۔

اسی طرح جب طنطاوی کی تفسیر مصر میں طبع ہونی شروع ہوئی ایک ایک پارہ کر کے اس کو منگایا۔ جتنا حصہ طبع ہوتا رہا وہ آتا رہا، اور جس وقت جو حصہ آتا سب مطالعہ چھوڑ کر

اس طرف متوجہ ہو جاتے۔

قلمی کتب جو طبع نہ ہوئی تھیں ان کی طبع اور اشاعت کا اشتیاق اکثر ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ تفسیر مظہری کے طبع کے انتظام کی طرف اکثر لوگوں کو توجہ دلاتے تھے اور بہت تعریف فرمایا کرتے اور تمنا تھی کہ یہ تفسیر کسی طرح طبع ہو کر معرضِ وجود میں آ جائے۔ الحمد للہ تفسیر مظہری دس جلدوں میں مکمل ہو کر طبع ہو گئی ہے۔ جس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے اپنی نگرانی میں طبع کرایا ہے حق تعالیٰ کارکنانِ ادارہ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جملہ علوم وفنون میں اقتدار کامل

جو کتاب زیر درس ہوتی اس کا مطالعہ محض درس کی غرض سے کبھی بھی نہیں دیکھتے تھے، اپنے ہی ذوق اور علمی تحقیق کے پیش نظر کتاب کا مطالعہ فرماتے تھے۔ جو مسئلہ زیر تحقیق ہوتا اس کی چھان بین میں دن رات ایک فرما دیتے، اور تنقیدی نظر سے دیکھتے۔ قادیانی فتنہ کی طرف جب توجہ فرمائی تو مسئلہ تکفیر میں ''اکفار الملحدین'' اور مسئلہ ختم نبوۃ میں ''خاتم النبیین'' مسئلہ حیات عیسیٰ میں۔ عقیدة الاسلام جیسی کتابیں تصنیف فرمائیں اور ہر مسئلہ کی تحقیق میں محققانہ بحث کر کے کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا، پوری سیر حاصل بحث کی۔ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے خاتم النبیین ۴۸ گھنٹہ کی میعاد میں اس طرح تحریر فرمایا کہ ایک ساعت بھی بستر پر کمر سیدھی نہ فرمائی، اور اس ۴۸ گھنٹہ کی مدت میں حسب معمول درس بخاری بھی مدرسہ کے اوقات میں جاری رہا اور ایک منٹ نیند نہیں فرمائی۔ قراءت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں ابتداءً ایک فارسی رسالہ جس کا نام غالباً فاتحۃ الخطاب تصنیف فرمایا تھا، پھر زمانۂ دارالعلوم میں دوسری بار فصل الخطاب تالیف کیا جس میں پورے بسط وتفصیل سے اس مسئلہ کو بیان کیا۔ یہ بیان اگرچہ سلسلہ تصنیفات میں ہوگا مگر یہاں یہ دکھلانے کے لیے مذکور ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا مذاق علمی تحقیقات اور مطالعہ کتب میں کس قدر انہماک سے تھا، اور آپ کے دن رات دینیات ہی میں مشغول رہتے تھے۔ دوسرے علوم وفنون کی کوئی کتاب کبھی نہیں دیکھتے تھے، زمانہ قیام دارالعلوم سے پہلے ہی کبھی دیکھی ہوں گی۔ جہاں تک اپنا علم ہے اس کے مطابق یہ کہنے کی جرأت ہے کہ کتب منطق وفلسفہ اور اسی قسم کی دوسرے علوم کی کوئی

کتاب آپ کے پاس نہیں دیکھی اور نہ کبھی مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ طالب علمی یا اس کے مابعد زمانہ اور قبل از قیام دارالعلوم ان علوم کو دیکھا ہوگا۔ مگر ان علوم میں بھی جس مسئلہ کو کبھی بیان فرماتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فنی مسائل کی تحقیقات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، اور ہر علم پر کافی وافی عبور ہے، اور محققانہ نظر ہے اور عام علوم پر پورا اقتدار اور حاکمانہ ملکہ حاصل ہے۔ کسی علم کے کسی مسئلہ پر جب بیان ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اس فن کے تمام ائمہ کے اقوال مستحضر ہیں، اور نیز تحقیقی نظر ہے اور حضرت شاہ صاحب کی رائے و تحقیق ان سب پر حاوی ہے اور بہت ہی عمیق نظر ہے۔ طالب علمی میں اسطرلاب اور ربع مجیب اور ربع مقنطر جیسے فن کے نایاب رسائل لکھے ہوئے قلمی حضرت شاہ صاحب نے احقر کو دیئے تھے جو میرے پاس موجود ہیں۔ علم ریاضی و علم نجوم میں پوری دسترس تھی حتیٰ کہ رمل و جفر کے قواعد کے ماہر تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ پنجاب کے ایک صاحب جو پیری مریدی بھی کرتے تھے، علم جفر کی بعض چیزیں دریافت کرنے کی غرض سے ہی پنجاب سے تشریف لائے اور دو تین روز قیام کرنے کے بعد اپنا مقصد حاصل کر کے واپس تشریف لے گئے۔ علم طب بھی شاہ صاحب نے بعد علوم دینیہ دہلی میں حکیم واصل خاں کے زمانہ میں پڑھا تھا اگرچہ مطب نہیں کیا مگر کتابوں پر پورا عبور تھا۔ نفیسی، شرح اسباب خارج اوقات میں دیوبند کے زمانہ قیام میں پڑھائی ہیں۔ ایک مرتبہ دیوبند میں حکیم رضی الدین دہلوی جن کو شفاء الملک کا خطاب ملا تھا، تشریف لائے، حضرت شاہ صاحب نے ایک گھنٹہ سے زیادہ برجستہ تقریر فرمائی۔ جس میں فن طب کے اصول بیان کئے، سننے والے حیرت میں تھے، عربی زبان پر تقریر اور تحریر دونوں طریقوں پر ملکہ و اقتدار تھا، فصاحت و بلاغت کے ماہر تھے۔

حفظ و ذکاء

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حفظ و ذکاء حق تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص موہبت تھی۔ صدیوں ہی میں کوئی ہستی ایسی پیدا ہوتی ہے۔ ہزاروں صفحات کی کتاب ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد (جہاں تک آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے) پھر ہاتھ میں نہیں اٹھاتے تھے۔ سالہا سال کے بعد جب بھی اس کتاب میں کسی مسئلہ کا حوالہ فرماتے تو چند

منٹ میں اس مسئلہ پر انگلی رکھ کر فرما دیتے کہ یہ ہے۔ نہ اس کی کوئی یادداشت کہیں لکھی ہوتی اور نہ ہی کہیں نوٹ ہوتا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی کچھ مدت پہلے یہ کتاب نظر سے گذری ہے اور مستحضر ہے۔ اور کتاب کے دائیں بائیں صفحات خیال مبارک میں موجود ہیں۔ مناظرہ ومباحثہ کی کسی مہم میں حضرت شاہ صاحبؒ کی معیت ایک ضخیم کتب خانہ کی معیت کا کام کرتی تھی۔ کسی بھی مسئلہ کی ضرورت پیش آتی آپ سے دریافت کرلیا جاتا اس میں کسی فن کی خصوصیت نہیں جس فن وعلم کا بھی ہو ہر فن کے مسئلہ میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ **ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشآء.** ہر فن میں جامعیت اور پورا اقتدار شاہ صاحبؒ کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور حفظ وذکاء کا معتد بہ حصہ عطا کیا تھا۔

جس زمانہ میں آپ دیوبند تعلیم کی غرض سے تشریف لائے تو مولوی امین الدین صاحب مرحوم (جن کے نام نامی سے مدرسہ امینیہ جو پہلے سنہری مسجد میں تھا اور اب کشمیری گیٹ دہلی میں ہے) اسی زمانہ میں دیوبند میں تعلیم پاتے تھے، اور حضرت شاہ صاحبؒ سے بیشتر استفادہ فرماتے اور خدمت کیا کرتے اور ایک خاص اُنس حضرت شاہ صاحبؒ سے رکھتے تھے۔ اور بعض خارجی کتابیں پڑھتے تھے۔ اسی طرح مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری جن کی وفات اسی سال ہوئی (حق تعالیٰ مغفرت فرمائے) ان کا تعلق بھی اسی زمانۂ تعلیم میں حضرت شاہ صاحبؒ سے ہوگیا تھا۔ مولوی مشیت اللہ زمانۂ تعلیم میں اکثر شاہ صاحبؒ کو بجنور لیجایا کرتے اور بعد فراغت مستقل قیام کی غرض سے بجنور لے گئے۔ ادھر مولانا امین الدین صاحب مرحوم نے بعد فراغت تحصیل علم سنہری مسجد دہلی میں مدرسہ عربیہ کے قیام کا ارادہ کیا تو درس کے لیے نظر انتخاب حضرت شاہ صاحب کی طرف ہوئی اور دہلی سے بجنور پہنچے اور حضرت شاہ صاحب سے اپنے ارادۂ قیام مدرسہ کا تذکرہ کیا اور فرمایا، کہ آپ دہلی تشریف لے چلئے میں آپ ہی کے لیے بجنور آیا ہوں، شاہ صاحب نے فرمایا، چوں کہ مولوی امین الدین صاحب نے زمانۂ قیام دارالعلوم میں میری بہت خدمت کی تھی اور مجھ سے مانوس تھے یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دل شکنی نہ ہو دہلی کے لیے بجنور سے مولوی صاحب کے ساتھ ہوگئے۔ یہ تو معلوم تھا ہی کہ مولوی صاحب کے پاس کوئی سرمایہ نہیں دہلی پہنچ

کر ۱۶یا ۱۷روپے اپنے پاس تھے مولوی صاحب کے حوالہ کر دیئے اور کہا مولوی صاحب ان کو خرچ کیجئے مولوی صاحب نے ان میں سے کچھ کھانے میں خرچ کیے اور کچھ کے کاغذ لا کر باقاعدہ رجسٹر بنوائے جس میں طلبہ کا داخلہ وغیرہ اور حساب وغیرہ لکھنا شروع کر دیا طلبہ بھی اچھی تعداد میں جمع ہو گئے چندہ بھی آنے لگا اور مدرسہ امینیہ کی بنیاد مستحکم ہونے لگی۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ خود حضرت شاہ صاحب نے بیان فرمایا کہ میرٹھ میں ایک مولوی صاحب غیر مقلد تھے غالباً ان کا نام مولوی احمد اللہ فرمایا تھا یہ مولوی صاحب غیر مقلد بیشتر حنفیوں کے ساتھ الجھتے اور دعوتِ مناظرہ دیتے رہتے تھے۔ میرٹھ میں حضرت شاہ صاحب کے نام کی شہرت ایک مناظرہ کی وجہ سے ہو چکی تھی جو تھوڑے ہی زمانہ پہلے مقام گلاؤٹھی میں ہو چکا تھا اور غیر مقلدوں کو سخت ہزیمت ہوئی تھی اور ایک ہی نشست کے بعد چپکے سے بھاگ نکلے تھے اس مناظرۂ گلاؤٹھی میں دیوبند کے علماء میں سے بڑے بڑے علماء جمع ہوئے تھے اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کی خاص توجہ اس مناظرہ کی طرف تھی۔ مولانا گنگوہیؒ نے دیوبند سے بحیثیت سرپرست دارالعلوم ہونے کے سب ہی کو گلاؤٹھی پہنچنے کا امر فرمایا تھا اس کے بعد بھی مولوی احمد اللہ غیر مقلد کا حنفیوں کو دعوت مناظرہ دینا باعث تعجب تھا۔ میرٹھ کے دو صاحب مولوی احمد اللہ صاحب سے دعوت مناظرہ کا کاغذ لے کر حضرت شاہ صاحب کے پاس دہلی سنہری مسجد میں قبل از عشاء پہنچے۔ اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو کاغذ دعوتِ مناظرہ دکھلایا۔ شاہ صاحب اسی شب میں دہلی سے میرٹھ کے لیے روانہ ہو گئے اور اخیر شب میں میرٹھ پہنچ کر مولوی احمد اللہ غیر مقلد کے محلہ کی مسجد میں قیام فرمایا۔ اور صبح قریب ہونے کو تھی لیٹ گئے۔ جو دو صاحب میرٹھ کے ساتھ تھے ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا، کہ شاہ صاحب کے ساتھ کوئی کتاب تو نہیں، دوسرے نے جواب دیا کہ ضرورت نہ ہوگی۔ جب صبح ہو گئی تو نماز صبح اسی مسجد میں پڑھی، مولوی احمد اللہ بھی نماز میں موجود تھے بعد اختتام نماز مولوی احمد اللہ سے ملاقات کی، اور فرمایا کہ یہ تحریر آپ کی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں میری ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا، بسم اللہ میں موجود ہوں بیٹھ جایئے اور مسئلہ معین فرما لیجئے اور جونسا بھی مسئلہ آپ چاہیں اختیار کر لیں۔ اور شروع کر دیں۔ مولوی احمد اللہ نے کہا، آپ ہی شروع فرمایئے۔ شاہ صاحب

نے فرمایا، فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ آپ کے خیال میں زیادہ زوردار ہے اس کو شروع کروں یا کوئی اور مسئلہ جو آپ کہیں؟ جواب دیا کہ اسی مسئلہ کے متعلق فرمایئے۔ جو لوگ نماز میں موجود تھے بیٹھ گئے اور کچھ لوگ جن کو اطلاع ہوئی وہ بھی آ گئے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں شروع کرتا ہوں، میری طرف سے صرف ایک شرط ہے کہ جب تک میں ختم نہ کرلوں آپ درمیان میں نہ بولیں جو کچھ اعتراض وسوال ہو بعد میں کہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے متواتر دو گھنٹے فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر پوری بسط وتفصیل کے ساتھ تقریر فرمائی اور کوئی حدیث موافق ومخالف، ضعیف وقوی معہ حوالۂ کتب نقل کیے بغیر نہ چھوڑی۔ تقریر ختم کرنے کے بعد فرمایا کہ اب آپ کو جو کچھ کہنا ہو فرمایئے۔ (کاتب الحروف نے یہ سنکر عرض کیا کہ اس کو کیا یاد رہا ہوگا، فرمایا یوں ہی ہوا) جواب میں کہنے لگا کہ مجھے تو کچھ یاد نہیں رہا۔ شاہ صاحب نے فرمایا، اسی پر حدیث دانی کا دعویٰ کرتے ہو، کہنے لگا، میں نے تو دعویٰ نہیں کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ لکھ دیجئے مجھے حدیث دانی کا دعویٰ نہیں۔ غرض لکھ کر نہ دیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بیشک جو ائمہ کی توقیر نہیں کرتا حق تعالیٰ اس کے حفظ کو سلب کر لیتے ہیں۔ یہ دن جمعہ کا دن تھا آپ نے جمعہ میرٹھ میں ادا کیا، تمام شہر میں رفتہ رفتہ اس مناظرہ کا چرچا ہو گیا، لوگوں نے جمعہ کے بعد جامع مسجد میں شاہ صاحبؒ کو گھیر لیا اور کہنے لگے کہ باقاعدہ مناظرہ ہو کر اس سے تحریر لیجائے۔ لوگوں کا مجمع کثیر شاہ صاحب کو لے کر مولوی احمد اللہ کے محلّہ کی مسجد میں جا پہنچا، مولوی احمد اللہ نے لیت ولعل کر کے پولیس بلوالی اور فتنہ کے خوف سے پولیس انسپکٹر نے مجمع کو منتشر کر دیا۔ یہ واقعہ خود شاہ صاحب کی زبانی سنا ہوا نقل ہے جس سے آپ کی یادداشت وحفظ اور احادیث پر کس قدر وسیع نظری کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرا واقعہ جس سے آپ کے حفظ وذکاء کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمدؒ جس زمانہ میں قرآن پاک کے فوائد تحریر فرما رہے تھے یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دار العلوم دیوبند کو چھوڑ کر مقام ڈابھیل ضلع سورت میں حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ وغیرہ تشریف لے گئے تھے اور اسی مقام ڈابھیل میں فوائد قرآن پاک کی تکمیل ہوئی۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی عادت تھی کبھی کبھی فوائد کے متعلق مزید تسکین خاطر وتوثیق کے پیش نظر فوائد کے متعلق لکھا ہوا حضرت شاہ صاحبؒ کو سنا دیا کرتے تھے اور اگر کوئی اشکال ہوتا تو دریافت بھی فرما لیا کرتے تھے۔

جس دن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا تار ڈابھیل پہنچا تو حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ پر بے صبری اور غم کے آثار زیادہ نمایاں تھے، بیساختہ چیخیں اور دہاڑے مار مار کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے آہ! ہمارے لیے موجب تسکین وطمانیت کون ہے، کس کے پاس جا کر اب تسکین خاطر کریں گے، کس سے اپنے علمی اشکالات حل کرائیں گے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو غم ورنج کا پہاڑ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ پر گرا ہے وہ غم ورنج کسی دوسرے کو نہیں۔

بعد وفات ہی یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں فوائد لکھتے لکھتے ان آیات پر پہنچا جو حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصہ میں ہیں:

"وَهَل اَتَاکَ نبؤ الخصم اذتسوروا المحراب اذادخلوا علیٰ داود ففزع منهم قالوا لاتخف خصمٰن بغٰی بعضنا علیٰ بعض فاحکم بیننا بالحق ولاتشطط واهدنا الیٰ سوآء الصراط. ان هذا اخی له تسع وتسعون نعجة ولی نعجة واحدة فقال اکفلنیها وعزنی فی الخطاب قال لقد ظلمک بسؤال نعجتک الیٰ نعاجه وان کثیراً من الخلطاء لیبغی بعضهم علیٰ بعض، الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات وقلیلٌ ماهم وظن داؤد انما فتناه فاستغفر ربه وخرّ راکعاً واناب۔"

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات کی تقسیم یوں کر رکھی تھی۔ ایک دن لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا۔ ایک دن اپنے اہل وعیال کے لئے، ایک دن اللہ کی عبادت کرنا۔ جس دن اللہ کی عبادت کرتے مکان بند کر دیا جاتا دربان پہرہ دیتے تاکہ عبادت الٰہی میں کسی قسم کی کھنڈت نہ ہو۔ عبادت کے دن ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ جب ان انتظامات کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے کہ ناگاہ کئی شخص دیوار پھاند کر ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ داؤد علیہ السلام باوجود اپنی قوت وشوکت کے یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا اٹھے کہ یہ آدمی ہیں یا اور کوئی مخلوق،

آدمی ہیں تو ناوقت آنے کی ان حالات میں جرأت کیسے ہوئی دربانوں نے کیوں نہیں روکا،
اگر دروازے سے نہیں آئے تو اتنی اونچی دیوار پھاند کر آنے کی کیا سبیل کی ہوگی۔ خدا جانے
ایسے غیر معمولی طور پر کس نیت اور کس غرض سے آئے ہیں۔ غرض اچانک یہ عجیب و مہیب
واقعہ دیکھ کر خیال دوسری طرف ہٹ گیا اور عبادت میں جیسی یکسوئی کے ساتھ مشغول تھے قائم
نہ رہ سکی۔ ان آیات کی تفسیر میں عام مفسرین متاخرین نے اسرائیلیات سے کچھ ایسے
واقعات لکھے ہیں جو ایک نبی کی شایانِ شان نہیں بلکہ ایک اچھے آدمی کے متعلق بھی مناسب
نہیں خیال کیے جاتے، چہ جائے کہ داؤد علیہ السلام جیسے نبی کے متعلق ان باتوں کا تصور کیا
جاسکے مفسرین متاخرین یہ لکھتے ہیں کہ داؤدؑ کی ننانوے بیبیاں تھیں اس کے باوجود داؤد علیہ
السلام نے ایک پڑوسی کی بیوی کو اپنے نکاح میں لیا، اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے اور اس کے
حاصل کرنے کے جو طریقے و واقعات لکھے ہیں وہ ایک صحیح طریق پر چلنے والے انسان کے
لیے نامناسب اور صحیح سمجھ والے کے لیے ناقابل تسلیم۔ ان آیات میں داؤد علیہ السلام کو ان
کے اس فعل پر متنبہ کرنا ہے متقدمین مفسرین اور ائمہ حدیث ان متاخرین کے درج ذیل
آیات واقعات کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ اسرائیلیات میں بیان کردہ ہیں جن کی کوئی سند
نہیں اور نہ ہی یہ قصے تسلیم کے قابل ہیں۔ اور کوئی بات متقدمین کے یہاں ایسی نہیں ملتی جس
سے یہ اشکال حل ہو سکے کہ آخر ان انتظامات کے باوجود کہ دربان مقرر ہیں مکان بند ہے کوئی
راہ اندر آنے کی نہیں ہے، اچانک دیوار پھاند کر چند آدمی کیوں آئے اور اس قصہ میں غرض
کیا ہے مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں ۱۵ دن ان آیات کے متعلق تفتیش و تحقیق میں
سرگرداں اور پریشان رہا۔ جہاں تک امکان میں تھا، قدیم و جدید تفسیریں اور شروح حدیث کو
چھان مارا اور کوئی بات ایسی قابل تسکین نہ ملی جس سے یہ خلش دور ہوتی کہ بالآخر یہ ایسا
کیوں ہوا جس سے داؤد علیہ السلام کی عبادت میں رخنہ اندازی ہوئی اور یکسوئی عبادت میں
نہ رہ سکی۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اس وقت بیمار تھے بیماری کا خیال کر کے حضرت شاہ
صاحب کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا، جب دیکھا کہ کوئی صورت تسلی و اطمینان کی نہیں
اور ان آیات کے تحت لکھوں تو کیا لکھوں۔ کام اٹکا ہوا ہے، ناچار حضرت شاہ صاحبؒ سے
عرض کیا کہ مجھے ۱۵ دن تفسیروں کے اوراق گردانتے ہوئے ہو گئے مگر ان آیات کا کوئی حل

نہیں ملتا۔شاہ صاحبؒ نے فرمایا، بیشک ان آیات میں اشکال ہے البتہ میری نظر سے ایک حدیث گذری ہے جو مستدرک حاکم میں ہے۔ضعف ہی کی حالت میں مستدرک اٹھائی اور دو چار منٹ میں کچھ ورق الٹ پلٹ کر انگلی رکھ کر ایک حدیث بتلادی اور فرمایا کہ اس حدیث میں ان آیات کے متعلق حل نکلتا ہے۔میں نے حدیث پڑھی، پیچھے سے کچھ ورق دیکھے کہ دیکھوں داؤد علیہ السلام کے متعلق کوئی باب ہو کچھ نہ ملا، اور نہ حدیث کو دیکھ کر کوئی بات سمجھ میں آئی۔حضرت شاہ صاحبؒ تو صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہوگئے کہ یہ حدیث ہے اور اس میں ان آیات کے متعلق جو اشکال ہے اس کا حل ہے۔میں نے عرض کیا کہ میں اس کتاب کو لیجاؤں، فرمایا، لے جایئے اور دیکھ لیجئے۔میں کتاب لیکر اپنی جگہ آیا، اور غور کیا تو مطلب کو پالیا۔حدیث کا مضمون یہ ہے، جس کو مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے فوائد میں نقل کیا ہے:

''ہمارے نزدیک اس قصہ میں اصل بات وہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے یعنی داؤدؑ کو یہ ابتلاء ایک طرح کے اعجاب کی بناء پر پیش آیا، صورت یہ ہوئی کہ داؤدؑ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا،،اے پروردگار! رات دن میں کوئی ساعت ایسی نہیں جس میں داؤد کے گھرانے کا کوئی فرد تیری عبادت (یعنی نماز یا تسبیح وتکبیر) میں مشغول نہ رہتا ہو،، یہ اس لیے کہا کہ انھوں نے روز شب کے چوبیس گھنٹے اپنے گھر والوں پر نوبت بہ نوبت تقسیم کر رکھے تھے، (تاکہ ان کا عبادت خانہ کسی وقت عبادت سے خالی نہ رہنے پائے) اور بھی کچھ اسی قسم کی چیزیں عرض کیں (شاید اپنے حسنِ انتظام وغیرہ کے متعلق ہوں گی) اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی، ارشاد ہوا کہ داؤد یہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے، اگر میری مدد نہ ہو تو تو اس چیز پر قدرت نہیں پاسکتا، (ہزار کوشش کرے نہیں نبھا سکتا) قسم ہے اپنے جلال کی میں تجھ کو ایک روز تیرے نفس کے سپرد کردوں گا! (یعنی اپنی مدد ہٹالوں گا، دیکھیں اس وقت تو کہاں تک اپنی عبادت میں مشغول رہ سکتا اور اپنا انتظام قائم رکھ سکتا ہے)،، داؤدؑ نے عرض کیا، اے پروردگار مجھے اس دن کی خبر کر دیجئے۔پس اسی دن فتنہ میں مبتلا ہوگئے۔(اخرج هذا امر الحاكم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد واقربه الذهبی فی التلخیص) یہ

روایت بتلاتی ہے کہ فتنہ کی نوعیت صرف اسی قدر ہونی چاہئے کہ جس وقت داؤد علیہ السلام عبادت میں ہوں باوجود پوری کوشش کے مشتغل نہ رہ سکیں اور اپنا، انتظام قائم نہ رکھ سکیں، چناں چہ آپ پڑھ چکے کہ کس بے قاعدہ اور غیر معمولی طریقے سے چند اشخاص نے اچانک عبادت خانہ میں داخل ہو کر حضرت داؤدؑ کو گھبرا دیا، اور ان کے شغل خاص سے ہٹا کر اپنے جھگڑ کی طرف متوجہ کر لیا بڑے بڑے پہرے اور انتظامات ان کو داؤدؑ کے پاس پہنچنے سے نہ روک سکے۔ تب داؤدؑ کو خیال ہوا کہ اللہ نے میرے اس دعوے کی وجہ سے اس فتنہ میں مبتلا کیا"۔

اس سے آگے مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے لفظ فتنہ کی تفسیر میں مزید کچھ لکھا ہے جو ان آیات کے فوائد دیکھنے سے متعلق ہے۔ مولانا موصوف نے جب حضرت شاہ صاحبؒ کی بتلائی ہوئی حدیث سے یہ فوائد لکھ لیے تو حضرت شاہ صاحبؒ کو سنائے، جس پر شاہ صاحب نے تصویب کی اور فرمایا، حدیث کا یہی مضمون ہے اور ان آیات کے درج ذیل یہی مناسب ہے۔ مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے حفظ وذکاء دو چیزوں کی داد دی اور فرمایا کہ اس حفظ کا کیا ٹھکانا کہ اتنی بڑی ضخیم کتاب سے ایک دو منٹ میں چند ورق اِدھر اُدھر کر کے حدیث پر انگلی رکھ کر بتلا دی گویا ابھی حال میں ہی دیکھی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ کب دیکھی ہوگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی عادت تھی (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا) کتاب ہاتھ میں اٹھائی اوّل سے آخر تک دیکھتے رہے جب تک ختم نہ کر لیتے چھوڑتے نہیں تھے۔ مستدرک غالباً تین چار سال پہلے زمانۂ قیام دار العلوم میں دیکھی تھی۔ اور فرمایا کہ ذکاوت اور سرعتِ انتقالِ ذہنی پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کتاب دیکھتے دیکھتے جب حدیث سامنے آتی ہے تو فکر کس سرعت سے اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ کے متعلق آیات میں مفید مطلب ہوگی (جن کی تفسیر میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ جیسے عالم کو پندرہ دن سرگرداں و پریشان رہنا پڑا)۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔